شرح رسالة الحقوق

امام زین العابدین علیہ السلام

تالیف قدرت اللہ مشایخی

مترجم نثار احمد زین پوری

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
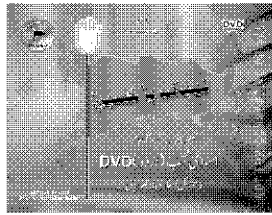
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان
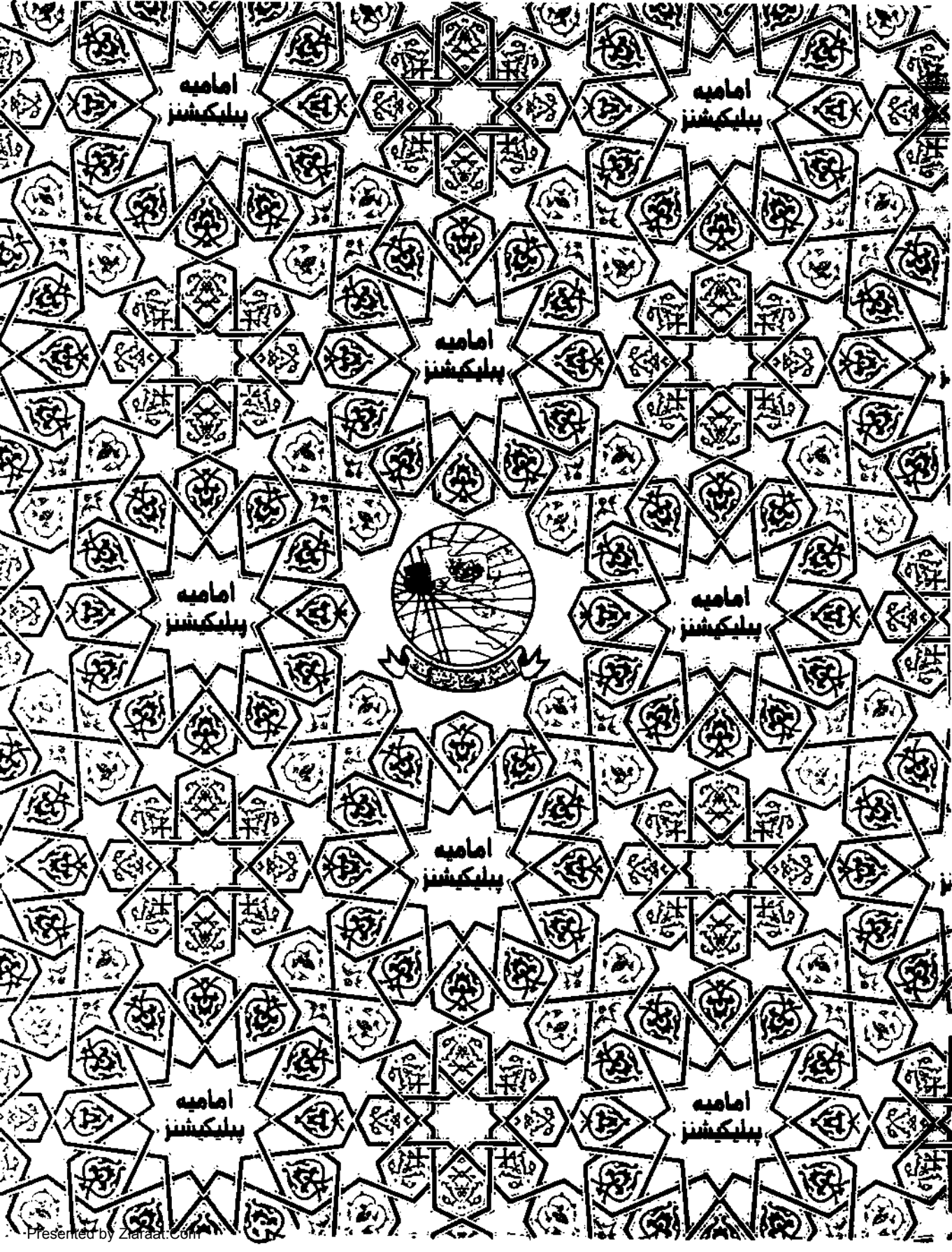
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آئینۂ حقوق

اردو ترجمہ

حقوق امام زین العابدین علیہ السلام کی نظر میں

رسالۃ الحقوق کی تشریح

تالیف

استاد قدرت اللہ مشایخی

1

ترجمہ

نثار احمد زین پوری

آئینۂ حقوق

حقوق امام زین العابدین علیہ السلام کی نظر میں
رسالۃ الحقوق کی تشریح

مؤلف: استاد قدرت اللہ مشائخی

مترجم: نثار احمد زین پوری

تعداد: ۵۰۰

مطبع: مکتبہ جدید پریس، ۱۴، ایمپریس روڈ، لاہور

ناشر

امامیہ پبلی کیشنز

۳۵، حیدر روڈ، اسلام پورہ، لاہور

فون: 042-6174960, 7158717

قرآن پاک معرا

ہدیہ انتہائی کم۔ گھر گھر پہنچانے کا عزم

صفحات ۱۰۰۰ | آفسٹ پیپر | ھدیہ 225 روپے

پختہ جلد، عمدہ کتاب، اعلیٰ طباعت

ملنے کا پتہ:

العصر بک سنٹر

۳۵، حیدر روڈ، اسلام پورہ، لاہور

فون: 042-6174960, 7158717, 7159188

Email: ippakistan@hotmail.com

Website: www.immamiapublication.com

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ ترجم

شرح رسالۃ الحقوق کا اردو ترجمہ آئینہ حقوق، ادارۂ ''القائم'' کی اولین پیشکش ہے امید ہے بارگاہ رب العزت، خدمت امام زمانہ اور قارئین کی نظر میں شرف قبولیت حاصل کرے گی۔

جیسا کہ نام ہی سے واضح ہے رسالۃ الحقوق مختصر کتاب ہے لیکن زیر نظر کتاب جناب مستطاب قدرت اللہ مشایخی کی شرح کا ترجمہ ہے۔ امام زین العابدینؑ نے پچاس حق بیان فرمائے ہیں، ان میں دوسرے حقوق کے ساتھ اعضاء انسانی کے حقوق کے ذیل میں ان کی ساخت اور حساسیت و نزاکت اور ان کی فعالیت کی بھی وضاحت کر دی ہے جس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان ایک چلتی پھرتی کائنات ہے شاید خداوند عالم نے اسی لئے ایک طرف پوری کائنات اور ایک طرف انسان کو رکھا ہے۔ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

اتزعم انك جرم صغير   وفيك انطوى عالم الاكبر

کیا تم خود کو چھوٹا سا وجود سمجھتے ہو، حالانکہ تمہارے اندر عالم اکبر سمایا ہوا ہے۔

اس عالم اکبر پر کتنے حقوق واجب ہیں، ان کو کیسے ادا کیا جا سکتا ہے، ان کے ادا نہ کرنے کی صورت میں انسان کن آفتوں اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، یہ باتیں قارئین کو اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو جائیں گی، انشاء اللہ۔

ادارۂ القائم'' میں میرے شریک کار جناب مولانا غلام عباس صاحب زین پوری ہیں جو کہ جامعۃ المنتظر نوگانواں سادات میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

نثار احمد زین پوری
مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

اپنی بات

میرے تعلیمی سفر کا ابتدائی زمانہ تھا، حوزۂ علمیہ جامعۃ المنتظر میرا علمی گہوارہ تھا، ایک روز کچھ فارغ التحصیل طلبہ میز پر رکھی ہوئی ایک ضخیم و دقیع کتاب کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، میں نے کتاب کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آیت اللہ العظمٰی شہید سعید قاضی نور اللہ شوستری کی تالیف احقاق الحق ہے، اس زمانہ میں میری اتنی استعداد نہیں تھی کہ اس بحر بیکراں میں شناوری کر سکوں لہذا جہاں سے کتاب اٹھائی تھی وہیں رکھدی، جب کچھ عربی سمجھ میں آنے لگی تو اس کی عظمت و آفاقیت کا اندازہ ہوا، اسی زمانہ سے میرے دل میں یہ جذبہ مچلنے لگا کہ کاش جوانوں کے لئے اس کا ترجمہ اردو میں ہو جاتا اوران کو اپنے مذہب کی حقانیت و آفاقیت کا علم ہو جائے۔ ظاہر ہے اس اہم کام کے لئے ایک خطیر رقم اور طویل مدت درکار ہے لہذا فی الحال اس کام کو ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا۔ اپنی اس دلی خواہش کی تسکین کے لئے جوانوں کی خدمت میں بطور خاص رسالۃ الحقوق کی شرح کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ اس کار خیر میں میرے شریک کار حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا نثار احمد صاحب زین پوری ہیں۔

غلام عباس
حوزۂ علمیہ جامعۃ المنتظر نوگانواں سادات

مقدمہ

حق اور حقوق، انسانی معاشروں کے درمیان نہایت اہم بحث تھی اور آج بھی ہے کیونکہ اس کا تعلق براہ راست انسان کی زندگی سے ہے، انسان کے مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے یہ بحث وجود میں آئی ہے، صاحبان علم عرصہ دراز سے حقوق سے بحث کرتے چلے آئے ہیں اس موضوع پر انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں ہیں۔

حق، انبیاء خصوصاً اسلام کے نورانی وانسان ساز مکتب میں خاص توجہ کا مرکز رہا ہے چنانچہ مختلف عبارتوں اور تعبیروں سے اس کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

حق کی تعریف

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

یوں تو تعریف وتوصیف کے لئے حق کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن آپس میں اس پر عمل کرنے کا دائرہ بہت محدود ہے. دو آدمیوں میں ایک کا حق دوسرے پر اس وقت ہوتا ہے جب دوسرے کا حق اس پر ہوتا ہے اور دوسرے کا حق اس پر اس وقت ہوتا ہے جب اس کا حق دوسرے پر ہو، پھر اگر کوئی ایسا ہے کہ اس کا حق دوسروں پر ہو لیکن اس پر کسی دوسرے کا حق نہیں ہے تو یہ صرف خدا سے مخصوص ہے اس کی مخلوق کا یہ مرتبہ نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنے بندوں پر اقتدار رکھتا ہے اس نے جہاں بھی احکام جاری کئے ہیں عدل وانصاف کے ساتھ جاری کئے ہیں۔[۱]

انبیاء کے (خصوصاً اسلام کے) مکتب میں نظام حقوقی ایک قطعی اور مسلم حقیقت ہے، مسلمانوں کے درمیان یہ بات بخوبی واضح ہے کے اجتماعی وسماجی روابط اور اختلافات کو قرآن کے احکام اور اس کے بیان سے حل ہونا چاہیئے، قرآن نے بھی مسلمانوں اور اسلامی معاشروں کو یہ بات اچھی طرح سمجھادی ہے چنانچہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۷

جولوگ خدا کی نازل کی ہوئی آیتوں کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے ہیں وہی نافرمان وفاسق ہیں۔ [۱] اسی سورے کی دوسری آیتوں میں ایسا نہ کرنے والوں کو کافر قرار دیا ہے:

جولوگ خدا کی نازل کی ہوئی (کتاب) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ [۲]

جولوگ اس چیز کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے کہ جس کو خدا نے نازل کیا ہے تو وہی ظالم ہیں۔ [۳]

اے رسولؐ ان کے درمیان ان آیتوں کے ذریعہ حکم وفیصلہ کیجئے، جو خدا نے نازل کی ہیں اور ان کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے۔ [۴]

انبیاء (خصوصاً) اسلام کے مکتب میں حقوقی نظام کی بنیاد الٰہی وانسانی اصولوں پر استوار ہے اور اسکے پس پشت بلند وبالا اور پاکیزہ مقاصد ہیں اور زندگی کے تمام زاویوں اور معاشرے کے ہر ایک پہلو پر توجہ رکھتا ہے اور اس میں عدل قائم کرتا ہے۔

اسلام کا حقوقی نظام معاشرہ کو کرامت وشرافت کی بنیاد پر استوار کرتا ہے اور صحیح تصور کائنات کی اساس پر اسکی اصلاح کرتا ہے اور نسلی وقومی امتیازات کی نفی کر کے سارے مومنوں کو کالے، گورے، عربی وعجمی اور خاندانی تفریق مٹا کر، ایک معاشرہ سمجھتا ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے حاکیت خدا کی ہے یہاں تک جولوگ قانون سازی کے عہدہ پر فائز ہوتے ہیں انکی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خدا کے قوانین کو کشف کریں اور اجتماعی وسماجی دستورات اس کے مطابق قائم کریں اور خود بھی مکمل طور پر اس کی اطاعت کریں۔

اسلام کے قوانین فطرت سے ہم آہنگ ہیں وہ انسان کی خواہشوں اور تمایلات کو ضرورت کے مطابق نہ کم نہ زیادہ در خور اعتنا سمجھتا ہے اور اپنی و معاشرہ کی ضرورتوں کی تکمیل، خود مختاری، آزادی، اقتصادی وتہذیبی وثقافتی ترقی اور اسلامی معاشرہ کی قیادت کے ذریعہ ثابت ومتغیر قوانین کے دائرہ میں انسان کو اسکے مقصد تخلیق اور ہدایت کی طرف لے جاتا ہے۔

---

[۱] مائدہ [۲] مائدہ ۴۷ [۳] سورۂ مائدہ ۴۵ [۴] مائدہ ۴۹

حق

جو شخص حقوق کی اقسام سے بحث کرتا ہے، اسے ہر چیز سے پہلے حق کو پہچاننا چاہیئے۔ اس لئے پہلے ہم لغت میں حق کے معنی دیکھیں گے اور پھر اس کے اصطلاحی معنی اور اسکی اقسام بیان کریں گے اور مفہوم حق، ماہیت حق، حق و ملک کے فرق اور حق و حکم کے فرق کو بھی بیان کریں گے۔

حق کے لغوی معنی

لغت میں حق کے متعدد معنی بیان ہوئے لیکن ہم یہاں ان میں سے انہیں کی طرف اشارہ کریں گے جو اہم ہیں: راغب اصفہانی لکھتے ہیں: دراصل حق کے معنی مطابقت و موافقت رکھنا ہے۔ اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس مطابقت و ہم آہنگی کی حق کے اکثر معانی میں رعایت ہوئی ہے۔ منجملہ:

الف۔ حق، خدا اور پیدا کرنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے: اس نے ساری مخلوق کو حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے،، فذالکم الله ربکم الحق [1]

ب۔ حق مخلوق کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس لحاظ سے کہ مخلوق کو حکمت کے مطابق خلق کیا ہے، وما خلق الله ذالك الا بالحق [2]

ج۔ حق واقع کے مطابق اعتقاد رکھنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے،، فهدى الله الذين آمنوا لما اختلفوا فيه من الحق [3]

د۔ حق اس قول و فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو شائستہ اور نپا تلا ہو۔ لقد حق القول على اكثرهم [4]

بعض اہل علم اور صاحبان لغت نے لکھا ہے کہ جن معنی میں حق مستعمل ہوا ہے ان کی تحقیق سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اصل میں حق کے معنی ثبوت ہیں اور حق کے تمام معنی کی بازگشت ثبوت ہی کی طرف ہوتی ہے۔ [5]

۱۔ یونس ۳۲ ۲۔ یونس ۵ ۳۔ بقرہ ۲۱۳

۴۔ یٰس ۷ مفردات راغب مادہ،، حق ۵۔ منقول از معیار اللغہ والمدخل الاسلامی صفحہ ۲۱۹

بنابریں حق عبارت ہے ہر ثابت امر سے خواہ وہ واقعی ہو یا نسبی۔ اسی لئے ہم خدا کو حق کہتے ہیں کیونکہ وہ ثابت و حقیقی ہے اور قرآن کو اس اعتبار سے حق کہتے ہیں کہ اس کا خدا کی طرف سے ہونا ثابت ہے اور جو امر واقع و ثابت ہوتا ہے اس کو حق کہتے ہیں۔ اور عدل کو اس لیے حق کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز کے ثبوت و بقا کا ضامن ہے اور اسلام کو اس کی حقیقت و واقعیت اور اس کے ثبوت کے لحاظ سے حق کہتے ہیں۔

کسی شخص کی ملکیت اور اسکے مخصوص حصہ کو بھی حق کہتے ہیں یہ بھی اس کے ثبوت ہی کیلئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ قانون کے حکم اور معتبر قرارداد کی بنا پر معین و ثابت ہوا ہے، حق کے مختلف معنی کے مقابل میں باطل بھی آتا ہے اور اس کے اپنے معنی ہیں۔

مفہوم حق

لفظ حق، مصدر، اسم مصدر اور صفت کی صورت میں استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید میں مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے: وہ جانتے ہیں کہ خدا واضح حق ہے،، ۱ خدا کے فعل کے لیئے بھی حق کا لفظ استعمال ہوا ہے، خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے،، ۲ دین خدا کیلئے بھی حق کا لفظ استعمال ہوا ہے، خدا وہ ہے کہ جس نے اپنے رسول کو دین حق کے ساتھ بھیجا، ۳ وعدہ کے بارے میں بھی آیا ہے،، جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کا وعدہ حق ہے. وحی کیلئے بھی حق کا لفظ ہے،، کتاب سے ہم جس چیز کی وحی کی ہے وہ حق ہے ۴ قصص کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ بیشک یہ قرآن کے برحق قصے ہیں۔ ۵ اور حکم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کریں، ۶

مزید برآں قرآن مجید میں حق کا ایک مخصوص مفہوم ہے جو دو انسانوں کے درمیان کے رابطہ کو یا ایک انسان اور دوسری چیز کے رابطہ کو بیان کرتا ہے اس صورت میں کبھی مطلق طور پر استعمال ہوتا ہے، اپنے قرابتداروں کا حق دے دو، ۷ اور کبھی ل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، ان کے اموال میں مانگنے

---

۱ نور۲۵ ۲ انعام۷۳ ۳ فتح۲۸ ۴ فاطر۳۱

۵ آل عمران۶۲ ۶ ص۲۲ ۷ سورہ روم۳۸

والوں اور محروموں کا حصہ ہے، ۱ کبھی علیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، مقروض و مدیون کو لکھوالینا چاہئے ۲

امام زین العابدین علیہ السلام اور دیگر ائمہ علیہم السلام کے کلام میں حق کا استعمال حقوقی اصطلاح میں نہیں ہوا ہے بلکہ اخلاقی حقوق میں ہوا ہے، اگر چہ ان میں سے اکثر میں اجتماعی پہلو بھی ہے اور اس کتاب میں ہماری اصل بحث اسی سے ہے۔

حق کے اصطلاحی معنی

حق کے اصطلاحی معنی کے سلسلہ میں مغرب کے فلسفیوں اور اسلامی علماء کے درمیان اختلاف ہے: ہم یہاں ان میں سے بعض اختلافات کو بیان کرتے ہیں:

۱۔ فرانس کے معاشرہ شناش اور ماہر اقتصادیات لرمی نیہ،، نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے، حق بشر کے روابط کی ہم آہنگی اور ان کا توازن ہے،، یہ بات پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ لغوی اعتبار سے حق اس عدل کو کہتے ہیں جو موجودات کے درمیان یا ہر موجود کے اجزا میں ہم آہنگی و توازن پیدا کرتا ہے، بنابرایں، فرانسوی معاشرہ شناس نے حق کی جو تعریف کی ہے اگر چہ وہ عین عدل نہیں ہے لیکن اس سے بہت قریب ہے۔ ۳

۲۔ بعض نے حق کی تعریف اس طرح کی ہے ۔حق ایک فطری و طبیعی یا قرار دادو اعتباری واقعیت و حقیقت ہے کہ جو اپنے مالک کو اس کی نگہبانی کرنے کے لئے طاقت دیتی ہے، جیسے حقِ حیات، حقِ آزادی و مساوات، ازدواجی حق اور قصاص وغیرہ کا حق۔

۳۔ سید محمد آل بحر العلوم ۔تیرھویں صدی کے عظیم فقہاء میں سے ہیں کہتے ہیں،، حق کبھی ملک کے مقابل اور کبھی اس کے مرادف مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے اور دونوں معنوں میں ایک اعتباری و فرضی طاقت ہے کہ جس کے سبب سے ایک انسان کو کسی مال یا کسی شخص پر یا دونوں پر تسلط و غلبہ دیا جاتا ہے ، جیسے کرایہ پر لی گئی چیز کہ کرایہ پر دینے والے کو کرایہ پر لینے والے کے مخصوص مال پر تسلط ہوتا ہے۔ ۴

---

۱ ذاریات ۱۹ ۲ بقرہ ۲۸۲

۳ تطبیق در حقوق جزائی عمومی اسلام صفحہ ۴۲ ۴ بلغۃ الفقیہ ج ۱ ص ۱۳

۴۔ شیخ انصاریؒ فرماتے ہیں۔ حق، ایک قسم کا تسلط وقدرت ہے کہ جس کے سبب صاحب حق اپنے لئے کوئی فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ [۱]

۵۔ محمد کاظم اخوند خراسانی کہتے ہیں،، حق، خاص اعتبار اور ایک مخصوص اضافہ ہے جو حکم وضعی یا تکلیفی یا کسی دوسری چیز سے سمجھ میں آتا ہے جیسے ملک سے فائدہ اٹھانے اور اس میں تصرف کرنے کا حق ملکیت سے اخذ ہوتا ہے، اسی طرح حق مارہ (راہ گیر کا حق) کہ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس کے لیے اس باغ کا پھل کھانا مباح ہے کہ وہ جس کے پاس سے گزرتا ہے۔ [۲]

۶۔ آیت اللہ سید محسن الحکیم کہتے ہیں:

حق ملک ہی کی ایک قسم ہے اور ملک مالک اور مملوک کے درمیان ایک خاص قسم کا رابطہ ہے۔ [۳]

۷۔ سید محمد کاظم یزدی طباطبائی:

حق، کسی چیز پر ایک اعتبار اور فرضی تسلط ہے یا اس کا تعلق خارج کی کسی چیز سے ہوتا ہے، جیسے کسی زمین کو پتھروں سے گھیرنا یا خارج کے علاوہ دوسری چیز سے ہوتا ہے جیسے خیار فسخ کا حق. یا کسی پر ہوتا ہے مثلاً قصاص کا حق. بنابرایں حق، ملک سے کم رتبہ ہے بلکہ اسی کی ایک قسم ہے۔ [۴]

۸۔ دوسرے افراد نے حق کو ملک سے نچلے درجے پر رکھا ہے اور حق وملک دونوں کو تسلط کے دو مرتبہ میں قرار دیا ہے چنانچہ آیت اللہ ابوالقاسم الخوئی لکھتے ہیں ملکیت عام قدرت وتسلط سے عبارت ہے جبکہ حق خاص تسلط ہے۔ [۵]

۹۔ علامہ طباطبائی مرحوم فرماتے ہیں:

حق ایک قسم کا اختصاص ہے۔ یہ اختصاص اجمالی طور پر معاشرہ کے وجود میں آنے سے پہلے بھی تھا. اور معاشرہ کی تشکیل کے بعد مختلف اور گونا گوں صورتوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے، ان میں سے ایک حق ہے [۶] اب دیکھنا یہ ہے کہ حق اور ملک میں کیا فرق ہے۔

---

[۱] مکاسب اوائل کتاب بیع [۲] درآمدی حقوق اسلامی ج ۱ ص ۴۶ [۳] منقول از نہج الفقاہت ص ۶،۷

[۴] منقول از حاشیہ مکاسب ص ۵۵ [۵] منقول از ارشاد الطالب الی التعلیق علی مکاسب ج ۲ ص ۱۲

[۶] ایضاً منقول از المیزان ج ۲ ص ۵۴

حق اور ملک کا فرق

مفہوم حق پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ حق اور ملک کے درمیان جو فرق ہے اسکو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک اور مالکیت کے مفہوم کی بھی وضاحت کردی جائے تاکہ ان دونوں کا فرق روشن وواضح ہو جائے۔

۱۔ ملک ایک شرعی حکم ہے جس کا تعلق اصل چیز یا اس کی منفعت سے ہوتا ہے اور یہ مالک کو مالک ہونے کی حیثیت سے اس سے فائدہ حاصل کرنے یا ان کا عوض لینے کی طاقت وقدرت دیتا ہے [۱]

۲۔ ملکیت، کسی چیز کے اختصاص سے عبارت ہے کہ دوسروں کو اس سے منع کرے اور اس کے مالک کو اس میں تصرف کا موقع دے مگر یہ کہ کوئی شرعی مانع اس کو اس میں تصرف سے باز رکھے [۲]

۳۔ ملک ایک اعتباری رابطہ ہے کہ جس کی بنیاد پر مملوک، مالک سے مخصوص ہو جاتا ہے اور اس کے مقتضا سے مالک کو قانون کے دائرے میں یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے جس طرح چاہے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو اس میں تصرف کرنے سے باز رکھے لیکن اگر شرعی موانع ہوں جیسے حکم افلاس اس صورت میں وہ اس میں تصرف نہ کر سکے گا۔ [۳]

گذشتہ نظریات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض فقہا نے حق کو ملک سے نچلے درجہ میں رکھا ہے اور بعض نے اس کو کبھی ملک کے مقابلہ میں اور کبھی اس کے مرادف سمجھا ہے۔

حق اور ملک کے بارے میں جو وضاحت کی گئی ہے اس کو ملحوظ رکھنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حق، مصادیق کے لحاظ سے ملک سے اعم ہے لیکن اس کا مفہوم ملک کے مفہوم سے جدا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان دو بنیادی فرق ہیں:

۱۔ حق کو تصرفات کی تمام قسمیں بھی سمجھا جا سکتا ہے اور ایک یا چند تصرف بھی سمجھا جا سکتا ہے ملکیت کے برخلاف کہ اس کا مقتضا تصرفات عینی ہوتا ہے جیسے (کھانا، پہننا وغیرہ) اور تصرفات اعتباری جیسے بیچنا اور بخشنا وغیرہ کا جائز ہونا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مقامات پر یہ تصرفات قانون کے حکم سے محدود ہو جائیں یا وقتی طور پر ممنوع قرار دیئے جائیں جیسے بچہ اور اور مجور کا اپنے مال میں تصرف کرنا۔

---

[۱] درآمدی حقوق اسلامی ص ۵۴ [۲] تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۳۰۵ [۳] تاریخ الفقہ الاسلامی ص ۵۷

۲۔مفہوم مالکیت صرف ایک اضافہ کو مستلزم ہو اور وہ مالک ومملوک کے درمیان ایک اضافہ ونسبت ہے جب کہ مفہوم حق میں صاحب حق اور متعلق حق کے درمیان جو اضافہ ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک اضافہ اور ملحوظ رکھا جاتا ہے اور وہ عبارت ہے۔"من له الحق ،اور من عليه الحق "سے بنابر این یہ دو مفہوم مستقل ہیں اور ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی جگہ نہیں آسکتا۔

حق کی قسمیں

لغوی اور اصطلاحی معنیٰ ،مفہوم حق اور ملک سے اس کے فرق کی وضاحت وتحقیق کے بعد ہم حق کی تقسیم بیان کرتے ہیں:

۱۔حق طبعی اور حق وضعی

حق کی کچھ تقسیمات ہیں جن کو حقوق سے متعلق کتابوں میں درج کیا گیا ہے انھیں میں سے حق طبیعی اور حق وضعی بھی ہے بشر کے طبیعی حقوق کی بنیاد ایک ہی چیز پر ہے اور وہ ہے انسان کا ان چیزوں سے استفادہ کرنا جو خداوند عالم نے پیدا کی ہیں اور انسان کی بقا اور کمال کا تعلق ان سے استفادہ کرنے پر موقوف ہے .بعبارت دیگر حقوق طبیعی وہ حقوق ہیں جو فرضی واعتباری نہیں ہیں بلکہ وہ فطری طور پر دنیا میں پیدا ہوتے ہیں ،جیسے زندگی اور آزادی کا حق ہر ایک کو محض پیدائش سے حاصل ہو جاتا ہے اور انسان کے حقوق کی بنیاد انھیں طبیعی حقوق پر قائم ہے۔

وضعی حقوق فرضی یا اعتباری ہیں ان کو انسان نے خود کسی خاص مناسبت کی وجہ سے بنایا ہے.
آیت اللہ سید محمد کاظم یزدی نے حقوق کو اس طرح تقسیم کیا ہے (یہ تقسیم نقل وانتقال اور حق کو ساقط کرنے کے لحاظ سے ہے)

۱۔جو حقوق صاحب حق کے مرنے سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتے اور جن کا ساقط کرنا یا دوسرے کی طرف منتقل کرنا صحیح نہیں ہے۔وہ ہے باپ کا حق ،حاکم کی ولایت کا حق ،عورت سے خوش فعلی کا حق اور وصی ہونے کا حق۔

۲۔ جن حقوق کو ساقط کرنا جائز ہے لیکن دوسرے کی طرف منتقل کرنا صحیح نہیں ہے اور صاحب حق کی موت سے بھی وہ قہری طور پر دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتے ہیں وہ ہے: غیبت کا حق، گالی کا حق اور توہین کے ذریعہ اذیت و آزار پہنچانے کا حق یا زدوکوب کرنے کا حق جب کہ اس کو راضی کرنا اور صاحب حق سے معاف کرانا واجب ہو اور توبہ کافی نہ ہو۔

۳۔ جو حقوق حقدار کے مرنے کے بعد وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور ان کا ساقط کرنا بھی جائز ہے لیکن انھیں دوسرے کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں وہ ہے حق شفعہ۔

۴۔ جن حقوق کو ایک دوسرے کی طرف منتقل کرنا اور ساقط کرنا جائز ہے، وہ حق خیار اور حق قصاص ہے۔

۵۔ جن حقوق کو بغیر عوض کے منتقل اور ساقط کرنا جائز ہے وہ ہے قسم کا حق۔ اس نظریہ کی بنا پر جسکو فقہا کی ایک جماعت، ، جیسے قواعد میں علامہ نے اور لمعہ میں شہید اولؒ نے، ، نقل کیا ہے۔

۶۔ جن حقوق میں نقل و اسقاط مشکوک ہے مثلاً والدین اور اولاد کے نفقہ کا حق۔ [1]

۲۔ اللہ کا اور لوگوں کا حق

فقہا نے ایک کلی تقسیم میں حق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: حق اللہ اور حق الناس. امام خمینیؒ تحریر الوسیلہ میں تحریر فرماتے ہیں حقوق کی، اپنی کثرت کے باوجود، دو قسمیں ہیں، حق اللہ اور حق الناس، [2] اسی کتاب میں حقوق کی دوسری تقسیم کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ حق اللہ کی دو قسمیں ہیں. محض خدا کا حق، جیسے زنا کی حد اور لواط کی حد یا خدا اور بندوں کا مشترک حق جیسے تہمت کی حد اور چوری کی حد۔ [3]

لوگوں کا وہ حق ہے جس کو قانون بنانے والے نے کسی خاص فرد یا خاص افراد کیلئے بنایا ہوتا کہ وہ اس حق کی روشنی میں اپنے منافع حاصل کر سکے مثلاً حق الشفعہ حق الناس ہے اور اس کو استعمال کرنے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے یا وہ فائدہ جو غیر منقول مال میں شریک کو ملتا ہے کسی دوسرے سے اس کا ربط نہیں ہوتا ہے، حق قصاص بھی حق الناس ہے اس سے بھی مقتول کے وارث ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔

---

[1] تطبیق در حقوق ج ۱ ص ۴۶۔۴۷ [2] تحریر الوسیلہ ج ۲ ص ۴۴۶ [3] تحریر الوسیلہ ج ۲ ص ۴۴۹

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد، کہ حق الناس وہ حق ہے جو کسی فرد یا چند افراد سے مخصوص ہوتا ہے، ہم یہ کہتے ہیں: اسی کے مقابلہ میں خدا کا حق ہے اور اس سے مراد معاشرہ کا عام حق ہے. خصوصاً اللہ کے حق کو اس کے حقیقی معنی پر انھیں حمل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خدا کو حق لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ان کا اس کو کوئی نفع پہونچتا ہے پس قانون بنانے والوں نے پورے اسلامی معاشرے اور امت مسلمہ کے لئے جو قانون بنائے ہیں اصطلاح میں انھیں حق اللہ کہتے ہیں:

فقہا کو سبیل اللہ کے معنی میں اس بات کا اذعان ویقین ہے کہ اس کو حقیقی معنی پر حمل کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا اس سے وہ امور مراد ہیں جو سب کے فائدہ کے لئے ہیں، جن کا تعلق سارے معاشرے سے ہے اور ان کا فائدہ تمام لوگوں کیلئے ہے. شرح لمعہ کی کتاب الزکوۃ میں مرقوم ہے: وہ عام المنفعہ امور جو ہم کو اس کی خوشنودی، قربت اور اس کے ثواب تک پہونچاتے ہیں وہ فی سبیل اللہ ہیں، جیسے مسجد بنانا، ضرورت مندوں کی مدد کرنا، دو آدمی کے درمیان صلح کرانا، علمی مدارس تعمیر کرانا اور نظام دین کو ثابت وقائم رکھنا۔ [۱]

۳۔ حقِ اختصاص، اولویت اور مالکیت:

فقہانے حق کی ایک اور تقسیم کی ہے اور وہ یہ کہ حق، اختصاص اولویت اور مالکیت پر تقسیم ہوتا ہے وحق اختصاص کا تعلق عام طور پر اس جگہ سے ہوتا ہے کہ جہاں کسی چیز کی شرعی یا عرفی مالیت نہ ہو اور نتیجہ میں مالکیت اس سے سلب ہو چکی ہو، اختصاص اور حق اولویت میں یہی فرق ہے کیونکہ اختصاص میں مالیت نہیں ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں دوسرے سے صلح نہیں کی جاسکتی. لیکن حق اولویت میں صلح کی جاسکتی ہے، جیسا کہ اس سلسلہ میں شیخ انصاری فرماتے ہیں: فائدہ کے لئے نجس العین کی حفاظت کرنا جائز ہے، بظاہر ان چیزوں میں حق اختصاص ہے جو کہ حیازت یا سابقہ مالکیت سے پیدا ہوتا ہے مثلاً کسی کے حیوان کا مرجانا اور اس کے گوشت کا خراب وفاسد ہونا اس حق پر عوض کے بغیر مصالحت نہیں ہوسکتی، بلکہ عوض کے ساتھ بھی اس صورت میں مصالحت ہوسکتی ہے کہ وہ عوض اس حیوان یا گوشت کی قیمت شمار نہ ہو [۲]

---

[۱] شرح لمعہ کتاب زکوۃ [۲] مکاسب ا ص ۱۴

مرحوم نائینی فرماتے ہیں: ان چیزوں کا حق اختصاص کہ جو شرعی مالیت نہیں رکھتے ہیں، جیسے وہ شراب جو سرکہ بننے کے قابل ہے، انہیں حق کہا جاتا ہے۔ [۱]

جوش دیئے ہوئے انگور، جو کہ شراب میں تبدیل چکے ہیں، نجس ہیں اور اسلام میں شراب کی کوئی قیمت نہیں ہے لیکن چونکہ ان کو اتنا پکایا جا سکتا ہے کہ جس سے وہ سرکہ بن جائے اور قیمتی ہو جائے اگر چہ وہ مالیت نہیں رکھتے ہیں لیکن بعد کے عنوان کے لحاظ سے حق اختصاص محفوظ ہے۔

حق اولویت، اور حق اختصاص کے درمیان یہ فرق ہے کہ جس چیز سے حق اولویت کا تعلق ہوتا ہے وہ شرعی مالیت کی حامل ہوتی ہے چنانچہ اگر کوئی اسے تلف وضائع کرتا ہے تو وہ ضامن ہے اور اسے چاہئے کہ اس کا مثل یا اس کی قیمت مالک کو دے۔ مثلاً حق تحجیر میں حقدار کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اس میں تصرف نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی اس کی اجازت و رضا کے بغیر اس میں تصرف کرتا ہے اور اس پر کوئی کام کرتا ہے تو اس میں حق نہیں پیدا کر سکتا۔

حق مالکیت، مالکیت کی تعریف ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن یہاں اس میں کچھ اضافہ کرتے ہیں: ہر انسان اپنی ذہنی تصویر پر تسلط رکھتا ہے یعنی جب چاہتا ہے اس کو ایجاد کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس کو مٹا دیتا ہے۔ اس تسلط کو تکوینی تسلط کہتے ہیں، اور جب خارج والی چیزوں کے بارے میں انسان ایسا تسلط پیدا کر لیتا ہے تو وہ ان کا مالک بن جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مالکیت، خارج والی چیز پر شخصی تسلط، ایک اعتبار ہے کہ وہ خود اس میں تصرف کر سکتا ہے اور دوسروں کو تصرف کرنے سے روک سکتا ہے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مالکیت اعتباری، مالک و مملوک کے درمیان ایک اضافہ ونسبت ہے۔ [۲]

حقوق امام زین العابدینؑ کی نظر میں

شرح رسالۃ الحقوق کہ جو جو فرد، اجتماعی اور اخلاقی حقوق کے بارے میں ہے اور حضرت علی ابن الحسینؑ کا کلام ہے اب ہم اس کو شروع کرتے ہیں نیز بہت سے فردی حقوق کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

---

۱ منیۃ الطالب ج ۱ ص ۸ — ۲ کتاب البیع امام خمینیؒ ج ۱ ص ۱۱-۲۵

انسان اور ذمہ داری

انسان کے اندر ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو دوسرے موجودات کے اندر نہیں ہے زندگی میں انسان کے لئے بہت سخت ذمہ داری ہے جو اس کی عقل وادراک اور اجتماعی شعور سے وجود میں آتی ہے ،ذمہ داری ایک درخت ہے جس کی زمین معرفتیں ہیں اور اعتقاد اسکی جڑیں ہیں اور حوادث و بحران اس کی بہاریں ہیں .اگر اسکی زمین زرخیز ہے تو وہ ہر بہار میں پھل دے گی۔ اور اس پر کوئی آفت نہیں آئے گی۔ کیونکہ آفت کسی کمی کی وجہ سے آتی ہے۔

ذمہ داری کی بنیاد

خداوند عالم بلا وجہ نعمتیں نہیں دیتا ہے اور جو دیا ہے اس کو بلندی اور برتری کا معیار نہیں قرار دیتا ہے اور جو دیا گیا ہے اس کا کوئی نتیجہ ہوتا ہے یا اس کو واپس لوٹانا ہوتا ہے اس نتیجہ میں برتری ہے یہیں سے ذمہ داری پیدا ہوتی ہے کہ خداوند فرماتا ہے. یقیناً اس روز تم سے نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائیگا۔ ۱

پس سرمایہ کو حرکت میں رکھئے ورنہ ذخیرہ اندوزی اور احتکار ہو جائے گا. جو دیا گیا ہے اس کا کچھ صلہ اور نتیجہ ہونا چاہیے۔ سرمایہ کا کچھ نفع ہونا چاہیئے .اور وہ جس کا ہے اسے اسی کیلئے ہونا چاہیئے۔

ذمہ داری کو سمجھنے کا طریقہ

ذمہ داری کو سمجھنے کیلئے چند اصولوں کی ضرورت ہے۔ ا۔ ہوا وہوس سے آزادی، ۲۔ ذمہ داری کو پورا کرنے کی طاقت پیدا کرنا، ۳۔ اس کو سمجھنا اور پہچاننا قرآن کہتا ہے:

جس نے ہدایت پائی اس نے اپنے ہی فائدہ کیلئے ہدایت پائی ہے اور جو گمراہ ہوا ہے وہ بھی ، اپنے نقصان کیلئے گمراہ ہوا ہے اور کوئی شخص کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہم اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے جب تک کہ اس کے پاس پیغمبر نہیں بھیج دیتے۔ ۲

انسان کی ذمہ داری خود اسی سے شروع ہوتی ہے۔ اس پر دو قسم کی ذمہ داری ہے: فردی و

---

۱ تکاثر: ۸ ۲ اسراء: ۱۵

اجتماعی، فردی ذمہ داری کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ہر نفس اپنے کئے کا رہین وگروی ہے۔ [۱] پھر فرماتا ہے: مرد وزن میں سے جو بھی نیک کام انجام دیتا ہے اور وہ مومن ہے تو ہم اسے پاک وپاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور اسے اس کے عمل سے بہتر جزا عطا کریں گے۔ [۲] اور انسان کی اجتماعی ذمہ داریوں کے بارے میں فرماتا ہے:

لوگوں کے اعمال کے سبب خشکی اور دریا میں فساد ظاہر ہو (پھیل) گیا ہے تاکہ ہم ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائیں شاید یہ پلٹ کر آجائیں۔ [۳]

ذمہ داری ذوق اور انتخاب کی بنیاد پر ہوتی ہے

ہر شخص اپنے ذوق، لیاقت اور طاقت وامکان کے مطابق ذمہ داری قبول کرتا ہے ایک کاشتکار اور مرغی فارم والا ہے دوسرا یا لوہار یا درزی ہے، حکماء کا قول ہے کہ انسان، مدنی الطبع ہے یہ اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے اور اجتماعی زندگی کی طرف انسان کے راغب ہونے کی اسی طریقہ سے تفسیر ہو سکتی ہے۔ جب زندگی کی بنیاد تعاون پر استوار ہے تو پھر یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ معاشرہ کے افراد کی ایک دوسرے کے بارے میں کیا ذمہ داری ہے اور دوسری طرف چونکہ انسان کے اندر خودخواہی کا جذبہ ہوتا ہے اور مشہور قول "الحق لمن غلب" لہذا وہ دوسروں کے حقوق کو غصب کر لیتا ہے اور یہیں سے اجتماعی قتل وغارت گری پیدا ہوتی ہے اور یہیں سے معاشرہ کے لئے قانون کی احتیاج پیدا ہوتی ہے اور یہ کہ حصار کی صورت میں کچھ نظام اور مقررات معاشرہ میں وجود پذیر ہوں تاکہ ہر ایک اپنے مفاد ومنافع کی حفاظت کرے۔

یہ تو تھی انسان کی ذمہ داری۔ انسان کچھ حقوق کا حامل ہے اسے ان کی رعایت کرنا چاہئے اور اسے جو کچھ عطا کیا گیا ہے اس کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا بالکل اس طرح جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: آنکھ، کان اور دل، سب سے سوال کیا جائے گا۔ [۴]

یہ چیزیں واضح ہو گئیں تو ضروری ہے اپنی ذمہ داری کی حدوں کو پہچانیں اور یہ سمجھیں کہ کن

---

[۱] مدثر: ۳۸ [۲] نحل: ۹۷ [۳] روم: ۴۱ [۴] اسراء: ۳۶)

حقوق کے بارے میں وہ ذمہ دار ہیں!

رسالۃ الحقوق اور امامؑ سوانح عمری

حقوق کے بارے میں قضا و جزاء کے مختلف پہلوؤں سے مکاتب حقوق میں بحث ہوئی ہے نمایاں اور قدر آور شخصیتوں نے فردی و اجتماعی حقوق کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فردی و اجتماعی اور اخلاقی حقوق کے موضوع پر امام زین العابدینؑ کے رسالۃ الحقوق سے جامع کتاب موجود نہیں ہے۔

شیعوں کے چوتھے امام حضرت زین العابدین علیہ السلام نے ۳۷ھ یا ۳۸ھ میں ولادت اور ۹۴ھ یا ۹۵ھ میں شہادت پائی اور جنت البقیع میں اپنے چچا کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مرحوم کلینی نے آپ کی ولادت ۳۸ھ اور شہادت ۹۵ھ اور آپ کی عمر مبارک ۵۷ سال تحریر کی ہے۔ [۱] [مشہور مورخ] یعقوبی نے آپ کی شہادت ۹۹ھ اور عمر مبارک ۵۸ سال لکھی ہے۔ [۲] شیخ مفید نے آپ کی ولادت ۳۸ھ، شہادت ۹۵ھ اور عمر مبارک ۵۷ سال تحریر کی ہے۔ [۳]

آپ کی سوانح عمری کیلئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے چنانچہ مورخین اور سیرت نگاروں نے آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں تحریر کی ہیں آپ امامت، ولایت وعصمت اور صداقت کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ بہت عظیم انسان تھے۔ ایسی عبادت کی کہ زین العابدین نام پایا یعنی عبادت کرنے والوں کی زینت اور سجدے ایسے کئے کہ سید الساجدین لقب پایا یعنی سجدہ کرنے والوں کے سردار، خوف و خشیت خدا میں اتنا گریہ کیا کہ تاج البکائین لقب پایا اور خدا سے اس طرح مناجات کی کہ لوگوں کو خدا سے دعا مانگنے اور اس سے ہم کلام ہونے کا دستور العمل "صحیفہ سجادیہ" یادگار چھوڑا۔

آپ سے زیادہ صبر کرنے اور مشقتیں برداشت کرنے والا کون ہوگا کہ سانحۂ کربلا کے خونبار واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور ظلم و ستم کے خلاف شام کی جامع مسجد میں خطبہ دیکر اپنا تعارف کرایا اور اپنے بزرگوں کی عظمت کو واضح اور بنی امیہ کی سرکشی و بیدادگری کو طشت از بام کیا۔

---

۱ اصول کافی ج ۲ ص ۳۶۸ ۲ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۰۳ ۳ ارشاد ج ۲ ص ۱۳۸

معنویت کے بلند مقام پر فائز تھے اور دلوں میں اتنا اثر ونفوذ تھا کہ جب آپؑ خانۂ کعبہ کے طواف کے لیے پہنچے تو مجمع بے اختیار چھنٹ گیا اور راستہ صاف کر دیا تا کہ آپؑ حجر اسود کو بوسہ دیں اور ہشام بن عبدالملک جو کہ ازدحام کی وجہ سے طواف نہیں کر سکا تھا اور حجر اسود کو بوسہ نہیں دے سکا تھا وہ ایک گوشہ میں کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا اور لوگوں کی نظروں میں امام زین العابدینؑ کے احترام اور ان کے دل میں آپ کی عقیدت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے معلوم کیا: یہ کون ہے؟ جس کی اتنی عظمت ہے؟ فرزدق اپنے جوشیلے اشعار کے ذریعہ امام کا تعارف کراتا ہے اور ہشام سے کہتا ہے۔ کیا تم انھیں نہیں پہچانتے یا تجاہل کر رہے ہو؟ یہ وہ ہیں کہ جن کے نقش قدم کو سرزمین بطحا پہچانتی ہے، انھیں خانۂ خدا، سرزمین حرم اور دوسری زمینیں پہچانتی ہیں۔

هذا الذی تعرف البطحا وطاته والبیت یعرفه والحل والحرم

فرزدق نے اپنے اس طویل قصیدہ میں آپ کی عظمت کو بیان کیا ہے لیکن ہم اس مختصر کتاب میں پورا قصیدہ نقل کرنے سے قاصر ہیں۔ ہشام بن عبدالملک نے حسد کی بنا پر فرزدق کا وظیفہ بند کر دیا تو امام زین العابدینؑ نے فرزدق کو تاحیات وظیفہ دیا۔

آپؑ نے نبوت کے گھرانہ میں آنکھ کھولی کہ جس گھر کو خدا نے رفعت و بلندی کی اجازت دی ہے آپؑ وحی کے فرزند اور امام کے پروردہ اور خود امام ہیں۔ آپ مکمل انسان شناس ہیں، آدمی کی روح کے تمام زاویوں اور فردی واجتماعی اور ثقافتی وسیاسی حقوق سے باخبر ہیں۔ ''رسالۃ الحقوق'' جو کہ پچاس حقوق پر مشتمل ہے، کو احادیث کی بہت سی کتابوں سے جمع کیا گیا ہے اور صدیوں سے علماء ودانشور اس کی شرح لکھتے رہے ہیں ان شروح میں سے بعض کا ہم اس مقدمہ میں ذکر کریں گے۔

رسالۃ الحقوق کے تراجم وشروح

رسالۃ الحقوق عرصہ دراز سے علوم اسلامی کے دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور انھوں نے اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں، عظیم محقق یونیورسٹی کے پروفیسر جناب ڈاکٹر سید جعفر شہیدی نے اپنی کتاب زندگانی علی ابن الحسینؑ کے ص ۱۷۰۔۱۷۱ پر ان تراجم وشروح کا ذکر کیا ہے جو اسطرح ہیں:

۱۔ رسالۃ الحقوق، مولف سید سبط الحسن لکھنوی، حاشیہ کے ساتھ۔

۲۔ رسالۃ الحقوق، مولف عبدالہادی مختار، مولف کے مقدمہ کے ساتھ ''کتاب الشہر'' کے سلسلہ کا ایک جز ہے اور کاظمین میں سید صادق صدر کے مقدمہ کے ساتھ چھپا ہے۔

۳۔ رسالۃ الحقوق، یہ فاضل نبیل و ماہر حقوق جناب توفیق الفلکی، مقیم نجف اشرف، کی تالیف ہے۔

۴۔ اس رسالہ کے فقرے، سخنان امام سجاد،، نامی رسالہ میں ڈاکٹر صاحب الزمانی کے توسط سے ۱۳۲۶ھ میں سے شائع ہوئے ہیں۔

۵۔ فاضل محترم جناب حاج شیخ محمد باقر کمرہ ای، نے رسالۃ الحقوق کا خصال کے متن سے پورا ترجمہ کیا ہے۔

۶۔ رسالۂ حقوق از مرحوم ناصری۔

۷۔ رسالہ حقوق از علی گل زادہ غفوری۔

۸۔ ترجمہ رسالۂ حقوق از آیۃ اللہ جنتی، اس کا ترجمہ تحف العقول کے متن سے کیا ہے اور انتشارات علمیہ اسلامی نے ۱۳۵۴ھ میں شائع کیا ہے۔

۹۔ ترجمہ رسالۂ حقوق از فاضل محترم جناب حاج سید احمد فہری زنجانی۔ یہ ترجمہ خصال کے متن سے کیا ہے۔

۱۰۔ رسالۂ حقوق مختصر مقدمہ کے ساتھ انتشارات دارالتوحید، تہران سے ۱۴۰۳ھ میں شائع ہوا ہے۔ دانشمند محترم جناب سپہری نے اپنی کتاب، ترجمہ وشرح رسالۃ الحقوق کے مقدمہ میں ڈاکٹر جعفر شہیدی کی مذکورہ فہرست نقل کرنے کے بعد دیگر تراجم وشروح کے مزید نام نقل کئے ہیں جو اسطرح ہیں:

۱۔ ترجمہ کوتاہ وسادہ جزوۂ کوچک امام چہارم موسسہ درراہ حق: قم۔

۲۔ ترجمہ رسالۂ حقوق تالیف جناب ابراہیم میانجی، یہ رسالہ، کتاب،، سخنان برگزیدہ،، کے ضمن میں ص ۱۹۱ تا ص ۲۲۲ پر کتاب خانہ مرتضوی تہران سے ۱۳۹۴ھ ق میں شائع ہوا تھا۔

۳۔ اس رسالہ کا ترجمہ وشرح ''مبانی مناسبات انسانی در مدیریت اسلامی'' کے نام سے

۱۳۶۵ھ میں دوبارہ انتشارات امیر کبیر سے شائع ہوا تھا.اس کے مولف سید محمود سیا ہپوش (حسینی) ہیں۔

۴۔کتاب ''صراط المومنین'' در ترجمۂ رسالۂ حقوقیہ حضرت زین العابدینؑ تالیف جناب قوام اسلامی جابسی ص۲۳۲ پر مشتمل ہے.

۵۔رسالۃ الحقوق للامام علی بن الحسین زین العابدین،عربی میں انتشارات اسماعیلیان نے قم میں دوجلدوں میں چھاپا ہے، یہ سید علی قبانچی کی تالیف اس پر حجۃ الاسلام سید محمد جواد تبریزی نے مقدمہ لکھا ہے.اس کتاب میں علمی ودینی مواد بہت زیادہ ہے مگر افسوس کہ مولف نے روایات اور تاریخی مطالب کے ماٰخذ ومدرک تحریر نہیں کئے ہیں خود سپہری صاحب نے بھی اس رسالہ کا ترجمہ وشرح کی ہے جو ۱۹۵/صفحات پر مشتمل ہے اور انتشارات دار العلم نے قم میں ۱۳۷۰ھ میں شائع کیا ہے.آپ کی اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے رسالہ الحقوق کی سند کی بھی چھان پھٹک کی ہے اس رسالہ کی یہ خصوصیت دیگر شروح میں نہیں پائی جاتی ہے.ہم یہاں انھیں کی سند کی تحقیق کو نذر قارئین کر رہے ہیں:

تحقیق سند رسالۃ الحقوق

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ یہ رسالہ عرصۂ دراز سے علماء اور اسلامی دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور بہت سے بزرگوں نے اس کو اپنی معتبر کتابوں سے نقل کیا ہے ہم اس کو جن قدیم ترین منابع سے اس کو نقل کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔تحف العقول،،اثر: مرحوم ابن شعبہ حرانی متوفی ۳۸۱ھ،، یہ رسالہ تحف العقول کے ص/۱۸۴تاص/۱۹۵پر مرقوم ہے۔

۲۔من لا یحضرہ الفقیہ ،،اثر: رئیس المحدثین مرحوم شیخ صدوق متوفی ۳۸۲ھ ق ج/۲ ص/۶۱۸سے ۶۲۶ مرقوم ہے.

۳۔مکارم الاخلاق،،اثر:مرحوم شیخ طبرسی متوفی ۵۴۸ھ ق،، یہ رسالہ اس کتاب کے ص/۴۱۹ سے ۴۲۴ پر مرقوم ہے اس رسالہ کے دوسرے منابع جو علماء نے بیان کئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

شیخ صدوق کی کتاب ''الخصال'' ص/۵۶۴،انھیں کی امالی ص/۳۶۸،علامہ مجلسی مرحوم کتاب

بحار الانوار ج ۷۴ ص ۲ مرحوم خوئی کی شرح نہج البلاغہ ج ۱۴ ص ۳۴۲، سید محسن امین مرحوم کی اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۶۳۸، محدث نوری مرحوم کی مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۷۴ علامہ مامقانی مرحوم کی مرأۃ الکمال ج ۳ ص ۵۹۹، تحف العقول کے مولف نے اس رسالہ کو بغیر سند کے نقل کیا ہے لیکن مرحوم شیخ صدوق نے من لا یحضرہ الفقیہ میں اور (خصال) میں بھی اس کی سند بیان کی ہے۔ رجال سند کی تحقیق جو کہ دشوار و مفید کام ہے جو علمائے رجال کی مخلصانہ زحمتوں اور محنتوں سے انجام پذیر ہوا ہے اور جس سے ائمہ کی صحیح معرفت ہوتی ہے اور جھوٹے راویوں کی قلعی کھلتی ہے۔ اسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جو کہ جناب سپہری صاحب کی تحقیق کا نتیجہ ہے موصوف نے سند کی تحقیق کا معیار کتاب (من لا یحضرہ الفقیہ) کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ مرحوم شیخ صدوق کو اس کتاب کے منقولات پر پورا اعتماد تھا۔ موصوف سند کی تحقیق کے سلسلہ میں لکھتے [۱] ہیں: مرحوم صدوق نے پہلے اس رسالہ کو مرسل طریقہ سے نقل کیا تھا اور لکھا تھا۔ [۲]

اسماعیل ابن فضل نے ثابت بن دینار سے اور انہوں نے سید العابدین علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے۔ پھر کتاب کے اختتام پر جہاں انہوں نے اپنے مشائخ کا ذکر کیا ہے اس طرح تحریر فرمایا ہے [۳] اس کتاب میں جو کچھ میں نے امام زین العابدینؑ کے رسالۃ الحقوق میں اسماعیل ابن فضل سے نقل کیا ہے اسی کی روایت میں نے علی ابن احمد ابن موسیٰ سے کی ہے وہ فرماتے ہیں: ہم سے محمد بن جعفر کوفی اسدی نے روایت کی اور کہا: ہم سے محمد بن اسماعیل برمکی نے روایت کی اور کہا: ہم سے عبداللہ ابن احمد نے بیان کیا اور کہا: ہم سے اسماعیل بن فضل نے بیان کیا اور انھوں نے ثابت ابن دینار ثمالی سے اور انھوں نے سید العابدین علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام سے روایت کی ہے:

میں نے مذکورہ سند سے آگاہ ہونے کیلئے رجال شیعہ کے قدیم ترین منابع، جو کہ اصل اربعہ رجالیہ [۴] کے نام سے مشہور ہے، اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا ہے لیکن علی ابن احمد بن موسیٰ کا ذکر رجال کی کتابوں میں نہیں ہے اس لئے اس سند کو مجہول قرار دیا گیا ہے۔ [۵] محمد بن جعفر اسدی کوفی) کی

---

[۱] ترجمہ شرح رسالۃ الحقوق ص ۳۱ تا ۳۷ [۲] من لا یحضرہ الفقیہ ۳ ص ۶۱۸ [۳] من لا یحضرہ الفقیہ ج ۴ ص ۵۱۲

[۴] اصول ا۔ رجال نجاشی [۵] رجال شیخ طوسی

رجال کی کتابوں میں توثیق کی گئی ہے۔ [۱]

محمد بن اسماعیل برکی،، بھی موثق ہیں اور ممدوح ہیں اگر چہ ابن الغضائری نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن موثق قرار دینے والوں نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ جس میں ان کی توثیق ہوئی ہے۔ [۲]

عبداللہ بن احمد نام کے کئی آدمی ہیں، رجال وحدیث کے ماہر ومحقق جناب علی اکبر غفاری نے یہ احتمال دیا ہے کہ ہوسکتا ہے عبداللہ بن احمد رازی مراد ہوں۔ [۳] عبداللہ بن احمد رازی بھی قابل اعتماد ووثوق نہیں تھے۔ خواہ اس سند میں عبداللہ بن احمد رازی مراد ہوں یا یہ نام چند آدمیوں کے درمیان مشترک ہو۔ کہ ممکن ہے ان میں سے بعض ضعیف اور بعض ثقہ ہوں۔ عمل میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ جب تک حدیث کے سلسلۂ روات میں سب ثقہ نہیں ہوتے اس وقت تک اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ [۴]

سلسلۂ سند میں جو آخری فرد ہے اس کی بھی تحقیق ہونی چاہیئے اور وہ،، ابوحمزہ ثمالی یا ثابت بن ابی صفیہ،، ہے یہ پاک اور آزاد منش آدمی تھے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان کی دیانت داری ہی ہے کہ اس تاریک اور پر آشوب دور میں ان کے تین بیٹوں نے زید بن علی کے پرچم انقلاب کے سایہ میں شہادت پائی تھی ان کے بارے میں نجاشی تحریر کرتے ہیں:

ان کے بیٹے نوح ومنصور اور حمزہ تینوں نے زید کے ساتھ شہادت پائی خود انھوں نے جناب امیر المومنینؑ امام حسینؑ اور امام زین العابدینؑ کو درک کیا تھا، وہ ان مقدس ہستیوں کی حدیث نقل کرنے میں قابل اعتماد اور معتبر صحابی تھے اور آپ کے بہترین مددگار تھے۔ حضرت سید الشہداءؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے ان کے متعلق فرمایا: ابوحمزہ اپنے زمانہ میں ایسے ہی تھے جیسے اپنے زمانے میں سلمان تھے۔ [۵]

---

۱ فہرست شیخ طوسی ۲ رجال کشی یا اختیار معرفۃ الرجال ہیں

۳ حاشیہ من لایحضرہ الفقیہ ج ۴ ص ۵۱۲ مزید تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو رجال نجاشی ص ۳۴۸ فہرست شیخ طوسی ص ۱۴۴ و ۱۴۵ معجم الرجال الحدیث ج ۱ ص ۱۰۴ ۴ معجم الرجال ج ۱ ص ۲۲۱، رجال طوسی ص ۱۰۴ و ۱۰۵

۵ مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو: معجم الرجال الحدیث ج ۳ ص ۳۸۳

تحقیق سند کا نتیجہ:

رجال حدیث کی تحقیق اور ان کی چھان پھٹک کے سلسلہ میں جناب سبحانی اس طرح لکھتے ہیں:

اس حدیث کے صحیح ہونے، اور یہ کہ ہر امام کی زبان سے صادر ہوئی ہے پر چند دلیلوں کے ذریعہ اعتماد کیا جا سکتا ہے اور وہ دلیلیں یہ ہیں:

۱۔ مرحوم قہپائی مجمع الرجال (ج ۷ ص ۲۱۹) میں لکھتے ہیں: مرحوم شیخ صدوق کے اجازۂ شیوخ میں وہ لوگ ہیں کہ کتب رجال میں نہ ان کی مدح ملتی ہے نہ مذمت: لیکن شیخ صدوقؒ ان کا نام لکھنے کے بعد رضی اللہ اور رحمۃ اللہ لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صدوقؒ ان کے ایمان وصداقت اور ان کی وثاقت پر اعتماد رکھتے تھے ورنہ وہ ان کے ناقابل اعتماد ہونے اور فاسد العقیدہ ہونے کی تصریح کرتے چہ جائیکہ انکے لئے خدا کی رضا و رحمت کی دعا کرتے۔

۲۔ من لا یحضرہ الفقیہ کے مقدمہ میں شیخ صدوقؒ رقم طراز ہیں:

اس کتاب کی تالیف سے میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں دوسرے راویوں اور مصنفین کی مانند جو روایت بھی مل جائے اسی کو کتاب کی زینت بنادو بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب میں ایسی روایات جمع کروں جن کے ذریعہ میں فتویٰ دوں اور یہ فیصلہ سنا سکوں کہ یہ صحیح ہیں میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ یہ میرے اور میرے پروردگار کے درمیان حجت ہے۔

۳۔ اس بات کو پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ بہت سے بزرگوں نے اپنی معتبر کتابوں میں اس رسالہ کو نقل کیا ہے اور یہ عرصۂ دراز سے علماء کی توجہ کا مرکز رہا ہے، علماء کا اس کو قبول کرنا اور مرحوم صدوقؒ کے نقل کرنے پر ان کا اعتماد کرنا اس رسالہ کو قبول کرنے کی دلیل ہے۔

۴۔ آیت اللہ العظمیٰ بروجردی مرحوم۔ جو کہ رجال میں مہارت رکھتے تھے۔ ان راویوں کے بارے میں، کہ جن سے صدوقؒ مرحوم نے اس رسالہ کو نقل کیا ہے، اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں:

لیکن وہ رسالۃ الحقوق جس کی حضرت زین العابدین علی بن الحسین سلام اللہ علیہ سے روایت کی گئی ہے۔ اس کے راویوں میں سے اسمٰعیل بن فضل ہاشمی نوفلی ہیں جو نوفل بن حارث بن عبد المطلب کی

اولاد سے ہیں یہ بصرہ کے محدثین میں سے تھے اور موثق ہیں، ثابت بن دینار ابو حمزہ ثمالی ہیں یہ بھی موثق ہیں۔ اور حسین بن صدوق کی سند یہ ہے جعفر بن محمد بن قولویہ سے اور انہوں نے حسین بن محمد عامری سے، جو کہ کلینی کے شیوخ میں سے ہیں، اور انہوں نے اپنے چچا عبداللہ بن عامر سے اور عبداللہ بن عامر نے محمد بن ابی عمیر سے اور محمد بن ابی عمیر نے عبدالرحمن بن محمد سے اور انھوں نے فضل بن اسمٰعیل بن فضل سے اور انھوں نے اپنے والد اسمٰعیل بن فضل سے روایت کی ہے اور سند موثوق بہ ہے۔ [1]

سپہری صاحب آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

مذکورہ دلیلوں اور قرائن کے علاوہ، علماء اسلام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ اخلاق و معارف اور مستحبات سے متعلق احادیث کو قبول کرنے میں سند کے مسئلہ میں تسامح سے کام لیتے ہیں یہ اصل، تسامح ادلۂ سنن میں،، مشہور ہے ایسی حدیثوں کو قبول کرنے کے لئے ان کے مضمون کو بلند ہونا چاہئے، اصول و عقائد اور مذہبی و عقلی مسلمات کے منافی نہیں ہونا چاہئے اور رسالۃ الحقوق میں یہ خصوصیات موجود ہیں۔ [2]

مولف کہتا ہے: ہم نے رسالۃ الحقوق کی اس شرح میں دو اعتبار سے، تحف العقول کا متن رکھا ہے:

۱۔ تحف العقول، ان کتابوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے جن میں رسالۃ الحقوق نقل ہوا ہے اگر چہ تحف العقول کے مولف نے اس کی سند نقل نہیں کی ہے کیونکہ تمام کتابوں میں انہوں نے حذف سند کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

۲۔ مولف نے ان کتابوں کی بہ نسبت کہ جن میں یہ رسالہ نقل ہوا ہے تمام کتابوں سے زیادہ مفصل اور جامع عبارتیں نقل کی ہیں۔

زیادہ تر حقوق کے ذیل میں ہم نے ان عبارتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو مکارم الاخلاق میں بعبارت دیگر نقل ہوئے ہیں اور، حج کے حق کو جو کہ تحف العقول کے متن میں بیان نہیں ہوا ہے، ہم نے مکارم الاخلاق سے ہی نقل کیا ہے اور اس شرح میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ جن پچاس حقوق کو امام زین العابدینؑ نے خلاصہ کے طور پر بیان فرمایا ہے آیات و روایات کے ذریعہ ان کی اتنی وضاحت کر دی

---

[1] راہ ورسم زندگی از نظر امام سجادؑ کے ص ۲۸ پر آیت اللہ بروجردی کی تحریر ہے تالیف جناب علی غفوری [2] تالیف جناب علی غفوری

جائے کہ جس سے کتاب کا حجم زیادہ نہ ہو جن حقوق میں کوئی لغوی شکل تھی تو اس کو ہم نے لغت ہی کے اعتبار سے حل کیا ہے، اس شرح کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ رسالۃ الحقوق میں زیادہ تر اخلاقی پہلو ہیں لیکن ہم نے ممکن حد تک اس کے فقہی حقوق کو بھی بیان کر دیا ہے تا کہ قاری حقوق کے سلسلہ میں دین اسلام کی جامعیت کو اچھی طرح سمجھ لے۔

امید ہے کہ امام سجادؑ حقیر کی طرف توجہ فرمائیں گے، اپنی عنایات میں مجھے بھی شامل فرمائیں گے اور میری خطاؤں کو معاف فرمائیں گے اور خداوند عالم سے میرے لئے دعا فرمائیں گے کہ وہ مجھے اہل بیت معصومؑ کے دین و مکتب کے خدمتگاروں میں قرار دے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

"رسالته عليه السلام المعروفته برسالة الحقوق"

اعلم۔ رحمك الله۔ انّ لله عليك حقوقا محيطة لك في كل حركة تحركتها، او سكنة سكنتها، او منزلة نزلتها، او جارحة قلبتها وآلة تصرفت بها: بعضها اكبر من بعض۔

واكبر حقوق الله عليك مااوجبه لنفسه۔ تبارك وتعالىٰ۔ من حقه الذي هو اصل الحقوق ومنه تفرع، ثم اوجبه عليك لنفسك من قرنك الى قدمك على اختلاف جوارحك، فجعل لبصرك عليك حقا، ولسمعك عليك حقا، وللسانك عليك حقا، وليديك عليك حقا، ولرِجلك عليك حقا، ولبطنك عليك حقا ولفرجك عليك حقا، فهذه الجوارح السبع التي بها تكون الافعال۔

ثم جعل عزوجل لافعالك عليك حقوقا، فجعل لصلاتك عليك حقا، ولصومك عليك حقا، ولصدقتك عليك حقا، ولهديك عليك حقاولافعالك عليك حقا۔

ثم تخرج الحقوق منك الى غيرك من ذوى الحقوق الواجبة عليك، واوجبها عليك حقوق ائمتك، ثم حقوق رعيتك، ثم حقوق رحمك، فهذه حقوق يتشعب منها حقوق۔

فحقوق أئمتك ثلاثه، اوجبها عليك حق سائسك بالسلطان، ثم سائسك بالعلم، ثم حق سائسك بالملك وكل سائس امام۔

وحقوق رعيتك ثلاثة، اوجبها عليك حق رعيتك بالسلطان، ثم حق رعيتك بالعلم فان الجاهل رعية العالم، وحق رعيتك بالملك من الازواج وماملكت من الايمان۔

وحقوق رحمك كثيرة، متصلة بقدر اتصال الرحم فی القرابة، فاوجبها عليك حق امك، ثم حق ابيك، ثم حق ولدك، ثم حق اخيك، ثم الاقرب فالأقرب والاول فالاول۔

ثم حق مولاك المنعم عليك، ثم حق مولاك الجاری نعمته عليك، ثم حق ذی المعروف لديك، ثم حق موذنك بالصلاة، ثم حق امامك فی صلاتك، ثم حق جليسك، ثم حق جارك، ثم حق صاحبك، ثم حق شريك، ثم حق مالك، ثم حق غريمك الذی تطالبه، ثم حق غريمك الذی يطالبك، ثم حق خليطك، ثم حق خصمك المدعی عليك، ثم حق مستنصحك، ثم حق الناصح لك، ثم حق من هو اكبر منك، ثم حق من هو اصغر منك، ثم حق سائلك، ثم حق من سالته، ثم حق من جری لك علی يده مساءةٌ بقول او فعل اومسرة بذلك؛ بقول او فعل: عن تعمد منه او غير تعمد منه، ثم حق اهل ملتك عامة، ثم حق اهل الذمة۔ ثم الحقوق الجارية بقدر علل الاحوال وتصرف الاسباب، فطوبی لمن اعانه الله علی قضاء مااوجب عليه مّن حقوقه ووفقه وسدده۔

جان لو کہ تمہارے اوپر بزرگ و برتر خدا کے کچھ حقوق ہیں خواہ انہیں تم حرکت و جنبش میں انجام دو یا سکون و آرام میں، اس منزل میں جس میں تم اترے ہو، یا اس عضو کے ساتھ جس کو تم نے بدلا ہے یا ان اقدار کے ساتھ جس کو بروئے کار لائے ہو، ان حقوق میں سے بعض، بعض حقوق سے بڑے ہیں۔

تمہارے اوپر خدا کے بڑے حقوق وہ ہیں جو اس نے اپنے لئے تمہارے اوپر واجب کئے ہیں۔ اس کے بعد بدن کے اعضاء کو مدنظر رکھتے ہوئے سر سے پیر تک کے لئے کچھ حقوق واجب کئے

ہیں، کچھ حقوق تمہارے اوپر تمہاری آنکھ کے ہیں، اور تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہارے کان کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہاری زبان کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہارے ہاتھ کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہارے پیر کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہارے شکم کے ہیں، تمہارے اوپر کچھ حقوق تمہاری شرمگاہ کے ہیں، یہ سات اعضاء ہیں کہ جن سے اعمال انجام پذیر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد خداوند عالم نے تمہارے اوپر تمہارے اعمال وافعال کے حقوق رکھے ہیں چنانچہ تمہاری نماز، روزے اور تمہاری زکوٰۃ کا تمہارے اوپر حق ہے اور دیکھو تمہارے کاموں کے بھی تمہارے اوپر کچھ حقوق ہیں۔

اب تم اپنے جسم وجان سے باہر نکلو اور جن کے حقوق تمہارے اوپر ہیں ان کی طرف جاؤ، ان حقوق میں سے واجب ترین حق تمہارے ائمہ کا ہے اسکے بعد تمہاری رعیت کا ہے اور پھر تمہارے رشتہ داروں کا حق ہے۔ اور انھیں حقوق سے دوسرے حقوق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

تمہارے اوپر تمہارے ائمہ کے تین حق ہیں، پھر ان میں سے تمہارے اوپر واجب ترین حق اس شخص کا ہے جو تمہارے اوپر سیاسی غلبہ و برتری رکھتا ہے اور جس کے ہاتھ میں تمہارے امور کی باگ ڈور ہوتی ہے اور اسکے بعد اس شخص کا حق ہے کہ جس کے اختیار میں تمہارا علمی نظم ونسق ہوتا ہے، پھر اس شخص کا حق ہے کہ جس کے اختیار میں ملکی نظام ہے اور ہر نظم ونسق امام کے اختیار میں ہے۔

تمہارے اوپر تمہارے ماتحتوں کے بھی تین حقوق ہیں، ان میں سے واجب ترین حق اس کا ہے جو تمہارے زیر تسلط ہے پھر ان لوگوں کا حق ہے جو تمہارے علم کے زیر تسلط ہیں بیشک جاہل عالم کی رعیت ہے۔ پھر ان کا حق ہے جو ملک کے لحاظ سے تمہارے زیر تسلط ہیں جیسے عورتوں، غلاموں اور کنیزوں کا حق۔

عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق تمہارے اوپر بہت زیادہ ہیں جو ایک دوسرے سے اتنے ہی متصل ہیں جتنا رحم میں قربت ہے تمہارے ان کے درمیان، تمہارے اوپر تمہاری ماں کا واجب ترین حق ہے، پھر تمہارے باپ کا حق ہے اسکے بعد اولاد کا حق ہے۔ پھر تمہارے بھائی کا حق ہے جو جتنا قریب ہے اس کا اتنا ہی حق ہے۔ جو اول ہے وہی اول ہے۔

اسکے بعد تمہارے آزاد کرنے والے اور تمہارے ولی نعمت کا حق ہے پھر اس مولا کا حق ہے جس کی نعمتیں ابھی تک جاری ہیں اس کے بعد ان لوگوں کا حق ہے جنھوں نے تمہارے ساتھ نیک سلوک کیا ہے۔ پھر اس موذن کا حق ہے جو تمہیں آواز اذان سے نماز کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کے بعد پیش نماز کا حق ہے، پھر تمہارے ہم نشین کا حق ہے اسکے بعد تمہارے ہمسایہ کا حق ہے اس کے بعد تمہارے ہمسفر و ہمراہ کا حق ہے، پھر تمہارے شریک کا حق ہے اسکے بعد تمہارے مال کا حق ہے، پھر تمہارے مقروض کا حق ہے. پھر تمہارے رفیق کا حق ہے اسکے بعد تمہارے دشمن کا حق ہے جس نے تمہارے خلاف دعویٰ کیا ہے اسکے بعد اس شخص کا حق ہے جو تمہیں مشورہ دیتا ہے اور پھر اس شخص کا حق ہے جو تم سے وعظ و نصیحت کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔

اسکے بعد اس کا حق ہے جو تم سے بڑا ہے، پھر اس کا حق ہے جو تم سے چھوٹا ہے، پھر تم سے سوال کرنے والے کا حق ہے، اس کے بعد اس شخص کا حق ہے جس سے تم سوال کرتے ہو، پھر اس کا حق ہے جس پر تمہاری طرف سے زیادتی و بدسلوکی ہوئی ہے خواہ قول سے ہوئی ہو یا فعل سے یا اس کا مذاق اڑانے سے یا تمہارے قول و فعل کا اس نے مذاق اڑایا ہو. جان بوجھ کر ایسا کیا ہو یا غفلت کی وجہ سے. پھر تمہارے اوپر تمہارے ہم مذہب لوگوں کا حق ہے۔ اس کے بعد تمہارے اوپر اس کافر ذمی کا حق ہے، جو اسلام کی پناہ میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ پھر وہ حقوق ہیں جو زندگی کے اسباب بدلنے سے وجود پذیر ہوتے ہیں، بس خوش نصیب ہے وہ شخص جسکی خدا نے ان حقوق کی ادائیگی میں مدد کی جو اس پر واجب کئے تھے اور اس سلسلہ میں اس کو توفیق دی اور اسے ثابت قدم رکھا۔

یہاں تک حضرت علی ابن الحسین علیہما السلام نے ان تمام حقوق کے بارے میں ایک مقدمہ براءت و استہلال کے عنوان سے بیان کیا ہے کہ جن کو بعد میں تفصیل سے بیان فرمائیں گے. اور اولین حق خدا کا حق قرار دیا ہے. خداوند عالم سے دعا ہے کہ ان پر اسطرح عمل ہو کہ جیسی اس کی رضا ہے۔

خدا کا حق

اَمّا حقُّ اللّٰہِ الاَکبَرُ فَاِنّکَ تَعبُدَہُ لا تُشرِکَ بِہ شَیاً فَاِذَافعَلتَ ذَالِکَ بِاخلَاصٍ جَعَلَ لَکَ عَلیٰ نَفسِہٖ اَنْ یَکْفِیَکَ اَمرَ الدُّنیا وَالآخِرَۃِ وَ یَحفَظَ لَکَ مَا تُحِبُّ مِنْھَا۔

خدا کا حق جو کہ تمام حقوق سے بڑا ہے وہ یہ ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو جب تم خلوص کے ساتھ اس کی عبادت کرو گے تو خدا نے بھی اپنے اوپر یہ لازم کر لیا ہے کہ وہ دنیوی اور اخروی چیزوں میں تمہاری کفایت کرے گا اور تمہارے لئے تمہاری محبوب و پسندیدہ چیزوں کو محفوظ رکھے گا۔

بعثت انبیاء کا مقصد

انبیاء کی اہم ترین ذمہ داری یہ تھی کہ وہ لوگوں کو عبادت کی طرف بلائیں اور ہر قسم کے شرک سے جنگ کریں۔ارشاد ہے: ہم نے ہر امّت میں رسول بھیجا تا کہ وہ امت کو خدا کی عبادت کرنے کا حکم دے اور اسے طاغوت و سرکش سے بچتے رہنے کی تلقین کرے ان میں سے بعض کی تو خدا نے ہدایت کر دی ہے اور بعض پر گمراہی و ضلالت مسلط ہو گئی ہے، زمین پر چلو، پھر و اور دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔[1]

اس آیت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی ذمہ داری یہ تھی کہ لوگوں کو خدا کی عبادت کی طرف دعوت دیں، ہر قسم کے شرک سے جنگ کریں اور ان دونوں کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور اپنے فریضہ کو بہترین طریقہ سے انجام دیں، لوگوں کو بتوں، چاند سورج اور گائے وغیرہ کی پرستش سے روک کر خدا کی عبادت کی طرف بلائیں۔

خدا کی عبادت فطری ہے

خدا کی عبادت کرنا اور اس کی بارگاہ میں خضوع کرنا انسان کی فطرت کا جز ہے۔فطرت کے

[1] نحل:۳۶

ایک معنی سرشت بھی ہیں جس کوانسان کے وجود وطبیعت کا جز کہا جاتا ہے اور سارے انسانوں میں وضاحت کے ساتھ نمایاں ہے اس سلسلہ میں رسولؐ فرماتے ہیں: ہر بچہ فطری طور پر خدا پرست پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ جو اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ [۱]

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ ہر انسان فطری اور ذاتی طور پر خدا پرستی کی طرف مائل ہوتا ہے اس میلان کوانہوں نے میل عالی کا نام دیا ہے وہ کہتے ہیں: جس طرح انسان حقیقت جوئی کی طرف مائل ہے چنانچہ علم وحکمت اور فلسفہ کے حصول کا شوق سرچشمہ بھی یہی ہے، یعنی انسان فطری طور پر حقیقت کو پہچاننے کی طرف مائل ہے اور حقیقت شناسی کا میلان اس کے اندر بچپنے سے شروع ہوتا ہے اور عمر کے آخر تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہ حقیقت جوئی ہی کا جذبہ ہے جو اسے والدین سے عجیب وغریب قسم کے سوالات کرنے پر ابھارتا ہے وہ تمام چیزوں کی خلقت اور ان کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل کو جاننا چاہتا ہے، جس طرح وہ اخلاقی فضائل کی طرف میلان رکھتا ہے اسی طرح وہ نیکی، احسان کرنے اور صدقہ دینے میں بھی لذت محسوس کرتا ہے، حسن وخوبصورتی کی طرف بھی میلان رکھتا ہے خواہ وہ معنوی ومادی اور اخلاقی ہو، اس رجحان وتمایل کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل وبرہان کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح انسان کے اندر کمال مطلق، علم مطلق، جمال مطلق اور کمالات کے سرچشمہ کی طرف میلان ورجحان ہوتا ہے اور یہی چیز اسے خدا تک پہونچا دیتی ہے، اس سلسلے میں دلیل وبرہان کی ضرورت نہیں ہے۔ فطری طور پر انسان کے خدا کی طرف مائل ہونے کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

تم اپنی توجہ دین حنیف پر مرکوز کرلو کہ یہی خدا پرستی کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے یہی سیدھا سچا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔ [۲]

اس آیت میں جو لفظ دین استعمال ہوا ہے اس کو درج ذیل دو معنی میں سے کسی ایک معنی میں استعمال کیا جاسکتا ہے:

۱۔ دین کے بنیادی واصلی احکام آدمی کی سرشت کے مطابق وہم آہنگ ہیں۔

---

[۱] منشور جاوید ج ۲ ص ۵۸ [۲] روم: ۳۰

۲۔ خدا کی طرف میلان اور اس کے لئے سراپا تسلیم ہونے ہی کو اسلام کہتے ہیں، جو اس صفت سے متصف ہو جائے اس کو مسلمان کہتے ہیں۔ بنابرایں یہ کہا جا سکتا ہے: دین کے فطری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان کی سرشت و فطرت میں خدا پرستی اور اس کے احکام کو تسلیم کرنے کا میلان پیدا کر دیا گیا ہے. حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ نہج البلاغہ کے خطبہ اول میں اس فطرت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں.

پھر خدا نے ان کے درمیان رسول بھیجے اور پے در پے انبیاء آئے تا کہ وہ ان سے فطرت کے عہد و معاہدہ کو پورا کرائیں۔[۱] دوسری جگہ فرماتے ہیں: کلمۂ توحید و اخلاص ہی انسان کی فطرت ہے [۲]

مصائب میں خدا سے پناہ مانگنا فطری بات ہے

جو چیز فطری ہے اس کے اثبات کے لئے اگر چہ دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن بعض لوگ جاہ و منصب کے نشہ میں مست ہو کر اپنے معبود کو بھول جاتے ہیں. اور ان کے ذہن پر نسیان و فراموشی کے پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ پھر کسی حادثہ کے واقع ہونے سے یک بیک غفلت و فراموشی کی تاریکی سے باہر نکل آتے ہیں اور اپنے معبود کی طرف متوجہ ہو جاتے خدا کی طرف دست دعا بلند کرتے ہیں انکے اس فعل سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ یہ خدا کی طرف تمایل ان کی فطرت ہے۔ جس پر غفلت کی گرد پڑ گئی تھی چنانچہ جیسے ہی غفلت کی گرد برطرف ہوئی وہ خدا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

منقول ہے کہ ایک شخص امام صادقؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور بڑے ہی تعجب خیز انداز میں معرفت خدا کے بارے میں گفتگو کرنے لگا اور عرض کی: میں نے بڑے سے بڑے عالم سے بحث کی ہے لیکن کوئی بھی مجھے تحیر سے نجات نہیں دلا سکا امام صادقؑ نے راہ فطرت ہی کے ذریعہ اسے اس کے تحیر سے نجات دلائی اور اس سے فرمایا: کیا تم نے کبھی کشتی سے سفر کیا ہے؟ دریا کا سفر کیا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپؑ نے فرمایا: کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کشتی ٹوٹ گئی ہو اور تم نے کسی ٹوٹے ہوئے تختہ کا سہارا لیا ہو اور موجوں میں پھنس گئے ہو؟ اس نے کہا ہاں: ایسا ہوا ہے آپ نے فرمایا:

---

۱ نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۱ / ۲ ایضاً خطبہ ۱۱۰ /

تمہیں وہاں نہ خشکی نظر آتی تھی اور نہ کوئی نجات دلانے والا دکھائی دیتا تھا! کیا اس وقت تم نے دل سے کسی ایسی طاقت کی طرف راغب ہوئے تھے جو تمہیں نجات دلائے؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: وہی خدا ہے، آپ کی اس گفتگو سے اسے تحیر سے نجات مل گئی [۱]

انسان کا خدا کی طرف مائل ہونا فطری بات ہے اور سارے انبیاء اسی فطرت کو نکھارنے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔

امام زین العابدینؑ نے جس چیز کو سب سے بڑا حق قرار دیا ہے: وہ ہے خدا کی عبادت کرنا اور شرک سے بچنا؛ بحث کے آغاز میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی طور پر عبادت کے لغوی بیان کردیئے جائیں۔ اس کے بعد یہ بیان کیا جائیگا کہ اسلام نے کن چیزوں کو عبادت قرار دیا ہے، شرک کیا ہے اور اس کے کتنے درجے ہیں۔

عبادت کے لغوی معنی

مشہور لغت شناس راغب اصفہانی عبودیت اور عبد کے معنی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں: ''عبودیت'' کے معنی ہیں خود کو ذلیل وحقیر سمجھنا۔ لیکن عبادت اس سے زیادہ بلیغ ہے۔ اور چونکہ عبادت خود کو نہایت ذلیل وحقیر سمجھنا ہے لہذا اس عبادت کا مستحق وہی ہوسکتا جو سارے صفات کمالیہ وجمالیہ کا حامل اور ساری نعمتوں کا مالک ہو اور وہ خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے، اسی لئے یہ عبادت اس سے مخصوص ہوگئی ہے پھر لکھتے ہیں ''عبادت کی دو قسمیں ہیں ا۔ عبادت بالتسخیر جیسا کہ سجود میں ذکر ہوا ہے یعنی کوئی موجود خود کو خدا کے قابو اور اس کی تسخیر میں سمجھے اور اپنے وجود کو اس کی مخلوق تصور کرے۔ دوسری قسم، عبادت اختیاری ہے جو کہ صاحبان نطق وفہم کے لئے ہے آیات میں جس عبادت کا ذکر ہوا ہے وہ بھی اختیاری عبادت ہے جس کو انسان اپنے اختیار وارادہ کے ساتھ بجالاتا ہے۔ [۲]

واضح رہے کہ عبادت و اطاعت کے درمیان فرق ہے عبادت خدا سے مخصوص ہے جبکہ اطاعت کا اطلاق خدا کے غیر پر بھی ہوتا ہے مثلاً والدین یا شوہر کی اطاعت۔

---

۱ الشافی: ج ۱ ص ۴۰ ۲ مفردات راغب مادۂ عبد

قرآن میں عبد کے معنی

عبد: قرآن میں دو معنی میں استعمال ہوا ہے: ایک غلام و مملوک۔ جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

" کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ الحر بالحر و العبد بالعبد و الانثیٰ بالانثی [۱]

قتل کے سلسلہ میں تم پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ آزاد کے عوض آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے قصاص میں عورت (قتل کی جائے گی)

خدا نے اس مملوک غلام کی مثال دی ہے جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔ [۲]

نیز فرماتا ہے: آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز نہیں ہے مگر یہ کہ وہ رحمان (خدا) کی بندگی میں اسکی طرف آئے گی۔ [۳]

اقرب الموارد میں مرقوم ہے: عبد انسان ہی کو کہا جاتا ہے خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ عبد کے دوسرے معنی خدا کے عبادت گذار اور اس کے مطیع کے ہیں۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

اے ان لوگوں کی اولاد کہ جن کو ہم نے نوح کے ساتھ ان کی کشتی میں سوار کیا یہ جان لو کہ وہ شکر گذار (عبد) بندے تھے [۴]

پاک ہے وہ خدا کہ جس نے اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصی کی سیر کرائی [۵]

اور ہمارے بندے ایوب کا بھی ذکر کیجئے کہ جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا۔ [۶]

ان آیتوں میں "عبد" شائستہ اور خدا کے مطیع انسان کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور حضرت نوح وایوب اور رسولؐ، خدا کے شائستہ ترین بندے ہیں۔

خدا کی عبادت دو طرح کی جاتی ہے ایک حلال و حرام سے متعلق اس کے احکام کی اطاعت کر کے یہ ایک قسم کی طاعت و فرمانبرداری ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے:

میری عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔ [۷]

---

[۱] بقرہ: ۱۷۸ [۲] نحل: ۷۵ [۳] مریم: ۹۳ [۴] اسریٰ: ۳ [۵] اسریٰ: ۱ [۶] ص: ۴۱ [۷] طہ: ۱۴

میں نے جناتوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔ ۱؎

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو ایک ہی مطمح نظر سے خدا کی عبادت کرتے ہیں (شک و تردد کی حالت میں عبادت کرتے ہیں) اگر اسے مال یا کوئی خیر ملتی ہے تو اسے اطمینان ہوتا ہے اور اگر کسی امتحان و آزمائش سے گذرتا ہے تو روگردانی کرتا ہے اور دنیا و آخرت میں خسارہ اٹھاتا ہے اور یہ کھلا نقصان ہے۔ ۲؎

قوی احتمال یہ ہے کہ آخری دو آیتوں میں لفظ عبد مطیع و فرمانبردار کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عبادت کے ایک معنی اس تذلل کے ہیں جس کے ساتھ تقدس ہوتا ہے یعنی بندہ خدا کے حضور میں بے پناہ خشوع و خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اسے ہر نقص و عیب سے پاک سمجھتا ہے اور اسے تمام کمالات کا مالک جانتا ہے چنانچہ جب اسلام میں عبادتِ خدا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسلام انسان کو خدا کے علاوہ ہر موجود کی عبودیت و بندگی سے روکتا ہے خصوصاً مالداروں، بادشاہوں اور سرکشوں کی بندگی سے منع کرتا ہے اسلام کہتا ہے نفع و ضرر خدا کے ہاتھ میں ہے اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر نہیں ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

اے رسول کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے نفع و ضرر کا مالک نہیں ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے ۳؎

تم لوگ، خدا کے غیر کی عبادت کرتے ہو وہ تمہارے رزق کے مالک نہیں ہیں تم اپنا رزق خدا سے طلب کرو۔ ۴؎

اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو کہ جس نے تم کو اور تم سے پہلے والوں کو پیدا کیا ہے تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ ۵؎

عبادت اسلام کی نظر میں

اسلام میں کس چیز کو عبادت کہا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں کسی مخصوص چیز کو

۱؎ ذاریات: ۵۶ ۲؎ حج: ۱۱ ۳؎ مائدہ: ۷۵ ۴؎ عنکبوت: ۱۷ ۵؎ بقرہ: ۲۱

عبادت نہیں کہا جاتا بلکہ عبادت ایسا تناور درخت ہے کہ جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔مختلف قسم کے اعمال کو عبادت کہا گیا ہےان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

ا۔شکر عبادت ہے

قرآن کی بہت سی آیتوں میں شکر کو عبادت کہا گیا ہے لیکن پہلے یہ بیان کر دیا جائے کہ شکر کی تعریف کیا ہےاس کے بعد ان آیات کو بیان کیا جائے گا جن میں شکر کو عبادت کہا گیا ہے،علماء کہتے ہیں: شکر ایک فعل ہے کہ جس سے نعمت دینے والے کی تعظیم وتکریم آشکار ہوتی ہے یہ خواہ زبان سے ہو یا دلی محبت سے۔[1]

کسی نعمت کو اس موقع محل پر صرف کرنا بھی شکر ہے۔اگر انسان ہر نعمت کو اس کے موقع محل پر خرچ کرے تو اس نے اس کا شکر ادا کر دیا مثلاً آنکھ نعمت ہےاور اس کا شکر یہ ہے کہ اس سے خدا کی نشانیوں کو دیکھا جائے۔قرآن کہتا ہے:اے رسول آپ کہہ دیجئے: دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیسی نشانیاں ہیں۔[2]

حضرت علیؑ نہج البلاغہ کے خطبۂ متقین میں فرماتے ہیں:متقین اور پرہیزگاروں نے خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اپنے کانوں کو مفید علم (کو سننے) کے لئے وقف کر دیا ہے۔[3]

دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں: ہر نعمت کا شکر، ورع و پاکدامنی اور خدا کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب ہے۔[4]

انسان کو جو نعمتیں عطا کی گئی ہیں انھیں گناہوں میں استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

- ### راہنمائی اور تربیت میں شکر کا اثر

آج کے دانشور وسائنسداں شکر وسپاس تربیت وراہنمائی کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں

---

۱ مفردات راغب ۲ یونس:۱۰۱ ۳ خطبۂ متقین:۱۹۳ ۴ سفینۃ البحار ج۱ ص۷۰۱

ذمہ دار اور زحمت کش و محنتی افراد کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے کیونکہ اگر ذمہ دار افراد کی زحمتوں کی قدر نہیں کی جائے گی تو ان کا حوصلہ پست ہو جائے گا اور پھر وہ ذمہ داری اور دلچسپی کے ساتھ کوئی کام انجام نہیں دیں گے۔

اس سلسلہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

اے مالک: نیک و بد کو تمہاری نظر میں یکساں نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اگر ایسا کرو گے تو نیک منش افراد نیکی سے بے رغبت ہو جائیں گے اور گناہگاروں کی گناہ کرنے میں جرأت بڑھ جائے گی۔ ۱؎

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی مانند قرار دیدیں؟ تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسا فیصلہ کر رہے ہو۔ ۲؎

یہ استفہام انکاری ہے یعنی ہم کبھی ایسا نہیں کریں گے۔

شکر، علمائے اخلاق کی نظر میں

علمائے اخلاق کہتے ہیں:

شکر کے تین اجزا ہیں:

۱۔ نعمت اور نعمت دینے والے کی معرفت

۲۔ انفعال نفسانی یعنی نیکی کرنے والے کے سامنے جھکا جاتا ہے اور نعمت ملنے پر خوشی ہوتی ہے۔

۳۔ نعمت دینے والے کے مقصد کو پورا کرنا۔

نعمت کی معرفت کے سلسلہ میں جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

جس شخص کو خدا نے کوئی نعمت عطا کی اور اس نے اس کو تہہ دل سے پہچان لیا تو اس نے اس کا شکر ادا کر دیا۔ ۳؎

دوسری جگہ فرماتے ہیں: شکر کا آخری زینہ یہ ہے کہ نعمت پانے والا یہ سمجھ لے کہ یہ نعمت خدا کی

۱؎ نہج البلاغہ مکتوب ۵۳ ۲؎ قلم: ۳۵۔۳۶ ۳؎ اصول کافی ج ۲ ص ۹۶ حدیث ۱۵

طرف سے ہے۔ [۱]

نعمت اور چاپلوسی کے بارے میں حضرت علی فرماتے ہیں: کسی شخص کی لیاقت و شائستگی سے زیادہ تعریف کرنا چاپلوسی ہے اور شائستگی کی تعریف نہ کرنا عجز یا حسد ہے۔ [۲]

خدا نے اپنی نعمتوں کے شکر کو عبادت قرار دیا ہے۔

اگر تم خدا کی عبادت کرنا چاہتے ہو تو اس کا شکر ادا کرو۔ [۳]

بلکہ خدا کی عبادت کرو اور اس کے شکر گذار بندوں میں ہو جاؤ۔ [۴]

مذکورہ دونوں آیتوں میں خدا یہ فرماتا ہے کہ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا عبادت ہے، اور خدا کو ماننے والے عظیم لوگ ایسا ہی کرتے ہیں چنانچہ فرماتا ہے:

جب تم سواری پر سوار ہو تو اپنے پروردگار کی نعمتوں کو یاد کرو اور یہ کہو۔ پاک ہے وہ خدا کہ جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کر دیا حالانکہ ہم اس پر قادر نہ تھے۔ [۵]

حضرت سلیمان خدا سے شکر ادا کرنے کی توفیق طلب کرتے ہیں:

اے اللہ جو نعمتیں تو نے مجھے اور میرے والد کو دی ہیں مجھے ان کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ [۶]

۲۔ رزق فراہم کرنا بھی عبادت ہے

جن چیزوں کو اسلام میں عبادت قرار دیا گیا ہے ان میں سے حلال کمائی بھی ہے اور اس نیت سے روزی تلاش کرنا بھی عبادت ہے کہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

جب تم نماز (جمعہ) سے فارغ ہو جاؤ تو روئے زمین پر پھیل جاؤ اور خدا کے فضل سے روزی تلاش کرو اور خدا کا ذکر زیادہ کرو ہو سکتا ہے اس طرح تم کامیاب ہو جاؤ۔ [۷]

۱۔ سفینۃ البحار ج ۱ ص ۱۰۷ ۲۔ نہج البلاغہ کلمہ حکمت ۳۲۹ ۳۔ بقرہ: ۱۷۲ ۴۔ زمر: ۶۶

۵۔ زخرف: ۱۳ ۶۔ نمل: ۱۹ ۷۔ سورہ جمعہ ۱۰

''فضل خدا طلب کرو'' یہ قرآن مجید میں زیادہ تر روزی طلب کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مفہوم اس سے وسیع ہے اور کمائی و کوشش بھی اسی کا مصداق ہے چنانچہ بعض لوگوں نے اس جمعہ کے بارے میں لکھا ہے:

نماز جمعہ کے بعد روزی تلاش کرنے میں برکت ہے: روایت میں بیان ہوا ہے کہ رسولؐ نمازِ جمعہ کے بعد بازار تشریف لے جاتے تھے۔ [۱]

درج ذیل روایات بھی رزق حاصل کرنے کو عبادت قرار دیتی ہیں:

امام محمد باقرؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: عبادت کے ستر جز ہیں ان میں سب سے افضل حلال رزق حاصل کرنا ہے۔ [۲]

اسی سلسلہ میں ابوحمزہ نے امام محمد باقرؑ سے روایت نقل کی ہے:

جو شخص لوگوں سے بے نیاز ہونے اور ان کی نظر میں معزز ہونے کے لئے دنیا طلب کرتا ہے اور اس طلب دنیا کو وہ اپنے اہل وعیال کے لئے وسعت و فراخی کی کوشش اور ہمسایوں کے لئے مدد سمجھتا ہے تو روز قیامت وہ خدا سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند درخشاں ہوگا۔ [۳]

محنت کرتے ہوئے مرجانا

جناب محمد بن یعقوب کلینی نے ایک روایت میں علی بن ابراہیم سے اور انہوں نے اپنے والد سے نقل کیا ہے اور دوسری سند سے محمد بن اسمٰعیل سے انہوں نے فضل بن شاذان سے اور انہوں نے ابن ابی عمیر سے اور انہوں نے عبداللہ بن حجاج سے انہوں نے امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: محمد بن منکدر کہتا تھا: میں یہ نہیں سوچتا تھا کہ علی بن الحسین نے محمد بن علی کو صحیح جانشین مقرر کیا ہے۔ ایک روز میں نے یہ طے کیا کہ میں اس سلسلہ میں انہیں نصیحت کرونگا لیکن انہوں نے ہی مجھے نصیحت کردی، محمد بن منکدر کے دوستوں نے معلوم کیا! انہوں نے تمہیں کیا نصیحت کی ہے؟ اس نے کہا: میں گرمی

---

[۱] تفسیر نمونہ ج ۲۴ ص ۱۲۸ [۲] وسائل الشیعہ ج ۱۲ ص ۱۱ [۳] وسائل الشیعہ ج ۱۲ ص ۱۱ ح ۵

کے موسم میں دو پہر کے وقت مدینہ کی گلی کوچوں سے گذرتا ہوا مدینہ سے باہر نکل گیا، یہاں تک کہ میری ملاقات محمد باقرؑ سے ہوگئی فربہ بدن تھے دو غلاموں کے ساتھ کام میں مشغول تھے، میں نے سوچا کوئی قریش کا بزرگ کام کر رہا ہے، یہ ایسی گرمی میں دنیا کی حرص میں نکلا ہے، ابھی میں اسے نصیحت کرتا ہوں۔

میں نزدیک گیا، سلام کیا، آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا، میں نے عرض کیا: ایسی گرمی میں قریش کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ دنیا طلبی میں مشغول ہے؟! اگر آپ کو اس حال میں موت آجائے تو کیا ہوگا؟!

آپ نے جواب دیا: اگر ملک الموت اس وقت میری روح قبض کرنے کے لئے آئے گا تو مجھے خدا کی اطاعت میں پائے گا میں اپنے اہل وعیال کے اخراجات پورا کرنے اور لوگوں سے بے نیاز ہونے کے لئے کام کر رہا ہوں، ہاں اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ گناہ و معصیت کی حالت میں موت نہ آئے، میں نے عرض کی: اے فرزند رسولؐ آپ نے سچ فرمایا میں آپ کو نصیحت کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نے مجھی کو نصیحت فرمادی۔ [۱]

اس حدیث میں امام محمد باقرؑ نے زندگی کو چلانے کے لئے جدوجہد کرنے کو خدا کی عبادت قرار دیا ہے۔ ایک روایت میں موسیٰ بن بکیر کہتے ہیں: حضرت ابوالحسن موسیٰ بن جعفرؑ نے فرمایا: جو شخص اپنے اور اپنی اولاد کے لئے حلال طریقہ سے روزی فراہم کرتا ہے اس کی مثال اس مجاہد کی سی ہے جو راہ خدا میں جہاد کرتا ہے۔ [۲]

کوشش و کام کے ذریعہ خدا سے رزق طلب کرو

محمد بن علی بن الحسین نے اپنی سند سے فضیل بن یسار سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: فرزند رسولؐ میں نے اب کوشش و کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ایسا نہ کرو بلکہ دوکان کھولو اور کاروبار شروع کرو اور خدا سے اپنی روزی و رزق طلب کرو۔ [۳]

۱۔ وسائل ج ۱۲ ص ۹ باب ۴ حدیث ۱ ۲۔ ایضاً ح ۴ ۳۔ ایضاً ص ۸ حدیث ۱۱

محنت کرنے والے عابدوں کا درجہ

روح بن عبدالرحیم نے امام صادق سے نقل کیا ہے کہ آپ نے اس آیت ''رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله'' [۱] ایسے مرد ہیں کہ انہیں تجارت اور خرید وفروخت یادِ خدا سے باز نہیں رکھ سکتی'' کے ذیل میں فرمایا: یہ لوگ کاروبار کرنے والے تھے لیکن نماز کے وقت کاروبار بند کر دیتے تھے اور نماز کیلئے (مسجد) چلے جاتے تھے یہ لوگ ان عبادت گزاروں سے بہتر ہیں جو بیکار رہتے ہیں۔ [۲] ایسی روایات بہت زیادہ ہیں جو کام اور کوشش سے متعلق ہیں لیکن یہاں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ واضح رہے کوئی بھی کام عبادت کے منافی نہیں ہے بلکہ اگر کام روزی ورزق سے متعلق ہو اور زندگی کے اخراجات چلانے کی غرض سے انجام دیا جارہا ہو تو وہ بجائے خود بہت بڑی عبادت ہے بلکہ بغیر کام کے عبادت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے پہلے انسان کی اقتصادی حالت صحیح ہونی چاہیئے تاکہ وہ خلوص کے ساتھ عبادت کر سکے۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں: جس کے پاس زمین اور پانی ہے یعنی سینچائی کے اسباب ہیں اور وہ پھر اقتصادی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو خدا ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔ [۳]

رسولؐ کے سامنے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا گیا جو زہد و تقویٰ میں شہرت یافتہ تھا اور ہر وقت نماز، روزہ میں مشغول رہتا تھا۔ اصحاب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ ہم نے اس سے بڑا عبادت گذار نہیں دیکھا۔ رسولؐ نے فرمایا: اس کا کام کیا ہے؟ عرض کیا: کوئی کام نہیں کرتا۔ رسولؐ نے فرمایا: اس کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں۔ عرض کیا: اس کے اخراجات کو ہم پورا کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: تم ان سے بڑے عابد ہو۔ [۴]

۳۔ دعا بھی عبادت کا مصداق ہے

دعا کے معنی پکارنے اور بلانے کے ہیں اور عبادت کے لوازم میں سے ہے کیونکہ دعا ہی خدا سے بندے کے رابطہ کا وسیلہ ہے اور چونکہ انسان کے راستے میں بے شمار حوادث ہیں اور وہ تمام مشکلوں کو حل کرنے پر قادر نہیں ہے لہذا اسے ایک سہارے کی ضرورت ہے اور وہ سہارا خدا ہے پھر دعا خدا کے

---

[۱] نور: ۳۷ [۲] وسائل الشیعہ ج ۱۲ حدیث ۱۴ [۳] وسائل الشیعہ ج ۱۲ ص ۲۴: حدیث ۱۳ [۴] کار و حقوق کارگر ص ۱۱۹

تقرب کا وسیلہ ہے۔ خدا فرماتا ہے:

تمہارا پروردگار کہتا ہے تم مجھ سے دعا کرو میں قبول کرونگا جو لوگ میری عبادت سے روگردانی کرتے ہیں۔ وہ ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہونگے۔ [1]

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دعا مانگنا خدا کو پسند ہے وہ چاہتا ہے کہ اس سے دعا کی جائے اس نے دعا قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن وعدہ مشروط ہے مطلق نہیں ہے وہی دعا قبول ہوتی ہے جس میں ضروری شرائط پائے جاتے ہیں۔

دعا ایک قسم کی عبادت ہے کیونکہ آیت میں اس کے لئے عبادت ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو ان سے کہدیں کہ میں ان کے قریب ہی ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں ہوسکتا ہے وہ راہ راست پر آجائیں۔ [2]

اس آیت میں خداوند عالم نے سات مرتبہ اپنی طرف اور سات مرتبہ بندوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان سے اپنے قرب وارتباط کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ دعا ایک قسم کا خضوع اور بندگی ہے اور جس طرح عبادتوں میں تربیتی اثر ہے ایسا ہی اثر دعا میں بھی ہے۔ اس آیت کی شان نزول کے بارے میں منقول ہے کہ ایک عرب رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور سوال کیا: کیا ہمارا خدا نزدیک ہے تا کہ ہم اس سے مناجات کریں یا دور ہے کہ اسے پکاریں؟ رسولؐ نے سکوت اختیار کیا جبرئیل نازل ہوئے اور مذکورہ آیت لائے۔

دعا روحانی بیماریوں کا علاج ہے

مشکلوں میں مبتلا انسان کو آرام کہاں میسر آتا ہے اس کے لئے الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کو وہ درد دل کے ساتھ حل کر کے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے دعا ایک ایسا راستہ ہے کہ جس کے ضمن میں وہ اپنا درد نہاں بیان کر کے شفا مانگ سکتا ہے۔

---

[1] مومن: ۶۰ [2] بقرہ: ۱۸۶

شدائد میں خدا کی طرف متوجہ ہونے کا وسیلہ

انسان کی طبیعت کی افتاد یہ ہے کہ وہ خوش حالی کی زندگی اور نعمتوں کی بہتات کے وقت خدا کو بھول جاتا ہے لیکن جب خود کو پریشانیوں میں گھرا ہوا دیکھتا ہے تو اسے خدا یاد آجاتا ہے اور وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے: خدا فرماتا ہے:

جب ہم انسان پر نعمت نازل کرتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور ہم سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے مگر جب اسے کوئی برائی چھو لیتی ہے تو اس سے نجات پانے کے لئے لمبی چوڑی دعا کرنے لگتا ہے۔[1]

دعا روایات کے آئینہ میں

ایک حدیث میں رسولؐ سے منقول ہے "دعا عبادت ہے"[2] دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ کے ایک صحابی نے آپؑ سے سوال کیا: مولا دو آدمی ایک ساتھ مسجد میں آئے ایک نے زیادہ نماز پڑھی اور دوسرے نے زیادہ دعا کی ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ فرمایا: دونوں بہترین ہیں، اس نے عرض کیا: کون افضل ہے؟ امام نے فرمایا: جس نے زیادہ دعا کی ہے کیونکہ یہ بہت بڑی عبادت ہے۔[3]

۴۔ بعض نظریں عبادت ہیں

جو نگاہ انسان کی معرفت کا باعث ہوتی ہے یا جس سے عبرت حاصل ہوتی ہے وہ اسلام کے نقطۂ نظر سے عبادت ہے حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

محبت و عقیدت سے عالم، عادل حاکم اور والدین کے چہرہ کے طرف دیکھنا عبادت ہے اسی طرح اس بھائی کے چہرہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے جس سے خدا کے لئے محبت کی ہے۔[4] واضح رہے کہ جب خدا کی رضا کے تحت دیکھا جائے گا تو وہ دیکھنا بھی عبادت ہوگا اور خدا اس عبادت کا ثواب عطا کریگا۔

۱۔ فصلت: ۵۱ ۲۔ مجمع البیان ج ۸ ص ۵۲۸ ۳۔ مجمع البیان ج ۸ ص ۵۲۹ ۴۔ مجموعہ ورام ج ۲ ص ۱۷۵

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: خدا کا حق یہ ہے کہ تم اس کی عبادت کرو یہ ساری عبادتوں کو شامل ہے اور خدا کے حق کی ادائیگی میں اس کا بڑا اثر ہے۔

ہر حال میں عبادت

دین ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم ہر حال میں خدا کی عبادت کریں اور ہمیشہ خود کو خدا کے سامنے حاضر سمجھیں غم و مسرت ناداری و مالداری اور صحت و تندرستی میں مختصر یہ کہ بدلتے ہوئے حالات کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے چاہئے خدا کے بعض بندے صرف ایک لحاظ سے عبادت کرتے ہیں خدا نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے فرماتا ہے:

بعض لوگ صرف زبان سے خدا کی عبادت کرتے ہیں (ان کے دل میں محکم طریقہ سے ایمان راسخ نہیں ہوا ہے) جب دنیا ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور نفع مل جاتا ہے تو انہیں اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور اگر آزمانے کے لحاظ سے کبھی ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ بدل جاتے ہیں اور کفر اختیار کر لیتے ہیں اس طرح وہ دنیا کو گنوا دیتے ہیں اور آخرت میں بھی نقصان اٹھائیں گے یہی آشکار و واضح نقصان ہے۔[۱]

آیت میں ''حرف علی'' استعمال ہوا ہے ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ان کے ایمان کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں ہے، ان کے دل میں نور ایمان کی تابش نہ ہونے کے برابر ہے اور ممکن ہے یہ سمجھایا گیا ہو کہ وہ ایمان و اسلام کے مرکز سے دور اس کے کنارے پر ہیں، ثبات قدم نہیں رکھتے ہیں معمولی جھٹکا لگتے ہی وہ اس سے جدا ہو جائیں گے۔

اس آیت کے ذیل میں زرارہ نے امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے: جو لوگ شرک کو چھوڑ کر خدا کی عبادت کرتے ہیں اور رسول کی معرفت نہیں رکھتے ہیں تو وہ شک و تردد کی حالت میں عبادت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اگر خدا ہمارے مال و اولاد میں اضافہ کر دے تو ہم سمجھیں کہ وہ اللہ کا رسولؐ ہے ورنہ ہم انھیں رسول نہیں مانیں گے۔ ارشاد ہے ان کی عبادت ایک طرف (زبانی) ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔[۲]

---

۱ حج: ۱۱ ۲ تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۴۷۲

عبادت میں نشاط وفرحت

محمد بن یحییٰ نے احمد بن محمد بن عیسیٰ سے انہوں نے دو واسطوں سے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: ہر عبادت کے لئے ایک فرحت و رغبت ہوتی ہے پھر سستی آجاتی ہے پس جو شخص اپنی عبادت کو میری پیروی میں نشاط کے ساتھ بجالاتا ہے وہ ہدایت یافتہ ہے اور جو شخص میری سنت کی مخالفت کرتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کا عمل خسارہ ہی خسارہ ہے۔ جان لو کہ میری روش و طریقہ یہ ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں، سوتا ہوں روزہ رکھتا ہوں اور افطار کرتا ہوں، ہنستا ہوں اور روتا ہوں جو میری سنت سے روگردانی کرتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے پھر فرمایا: نصیحت و وعظ کے لئے موت ہی کافی ہے اور یقین کے لئے بے نیازی اور مشغول رہنے کیلئے عبادت کافی ہے۔ [۱]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: ہر شخص کا کوئی میلان ہوتا ہے اور ہر رغبت سے کبھی دل اچاٹ ہو جاتا ہے خوش نصیب ہے وہ شخص جو بے رغبتی میں بھی خیر کی طرف ہو۔ [۲]

حفص بن بختری امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: سستی و بے رغبتی کی حالت میں عبادت نہ کرو۔ [۳]

عبادت میں اعتدال

جس طرح مذکورہ روایات میں ہمیں یہ تاکید کی گئی ہے کہ فرحت ونشاط کے ساتھ عبادت کریں، شوق وعشق کے ساتھ عبادت کریں تا کہ اس کا کچھ فائدہ حاصل ہو اور عبادت میں سستی و بے رغبتی سے پرہیز کریں کیونکہ سست انسان نے خدا سے مناجات کے میلان اور رغبت ونشاط کو گنوادیا ہے چنانچہ اسکی مثال ایسی ہی ہے جیسے بغیر روح کا بدن۔ عبادت میں افراط وتفریط سے بچتے ہوئے۔ عبادت میں میانہ روی اختیار کرو۔ رسولؐ نے تاکید فرمائی ہے کہ عبادت میں زیادہ نہ تھکو۔

عمرو بن جمیع نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: اے علی! یہ محکم و متین دین ہے لہذا اس میں نرمی کے ساتھ داخل ہونا چاہئے تھکان و خستگی کی حالت میں عبادت نہیں کرنا چاہئے

---

۱ اصول کافی ج ۲ ص ۸۵ ۲ ایضاً ص ۸۶ ۳ ایضاً

کیونکہ افراط کرنے والے کا کوئی سہارا باقی رہتا ہے اور نہ وہ کسی منزل پر پہنچتا ہے پس اس شخص کی طرح عبادت کرو جو بوڑھا ہے اور اس کے بعد مرنے کی امید رکھتا ہے۔ [1]

دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے:

فرمایا: میں بچپنے میں طواف کر رہا تھا کہ میرے والد میرے پاس سے گذرے اور مجھے دیکھا کہ میں عبادت میں سخت محنت کر رہا ہوں میرے رخساروں سے پسینہ بہہ رہا ہے، فرمایا: جعفر! بیٹے! بیشک جب خدا کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے جنت میں داخل کرتا ہے اور اس کی کم عبادت سے بھی خوش ہو جاتا ہے۔ [2]

مختصر یہ کہ جس طرح ہر کام میں میانہ روی اختیار کرنا چاہئے اسی طرح عبادت میں اعتدال سے کام لینا چاہئے۔ اسلام کے تصور کائنات میں اور خدا شناس فلاسفہ کے مسلک میں علت اول خداوند عالم ہے دوسرے علل اس جیسے نہیں ہیں بلکہ ان کا اثر بھی خدا ہی کی طرف سے ہے چنانچہ خدا پرست اور مادہ پرست آدمی کے تصور کائنات میں یہ فرق ہے۔ مادہ پرست مادہ ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور ہر چیز کو اپنے وجود میں آنے کے لحاظ سے مستقل سمجھتا ہے جبکہ موحد و خدا پرست علت و معلول کے نظام کا عقیدہ رکھتا ہے لیکن اس کو خدا سے متعلق جانتا ہے۔

مادی و طبیعی علل کے استقلال و عدم استقلال کا مسئلہ توحید و شرک کی سرحد ہے اس سرحد کو نظر میں رکھکر موحد کو باآسانی سمجھا جاسکتا ہے آیات قرآنی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات میں کوئی طاقت بھی خدا کی طاقت کے برابر نہیں ہے اور کسی بھی سبب کا اثر مسبب کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے:

کون ہے جو خشکی و تری کی تاریکیوں میں تمہاری ہدایت کرتا ہے اور کون ہے جو بشارت دینے والی ہواؤں کو اپنی رحمت سے آگے آگے بھیجتا ہے؟ کیا خدا کے علاوہ کوئی معبود ہے؟ خدا اس سے بلند ہے کہ جس کو تم اس کا شریک قرار دیتے ہو۔ [3]

ان کے مایوس ہو جانے کے بعد وہی ہے جو بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے۔ [4]

---

[1] اصول کافی: ج ۲ ص ۸۷ [2] ایضاً ج ۲ ص ۸۶ [3] نمل: ۶۳ [4] شوریٰ ۲۸

جو لوگ توحید اور یقین وخلوص سے وابستہ نہیں ہوئے ہیں ان کے حالات اس طرح بیان کرتا ہے:

جب لوگ بے بس ہو جاتے ہیں تو لولگا کر خدا کو پکارتے ہیں لیکن جب خدا انہیں اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو وہ اپنے پروردگار کا شریک قرار دیتے ہیں۔ ۱؎

جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو پورے خلوص کے ساتھ خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن جب ساحل پر پہنچ جاتے ہیں تو یکبارگی مشرک ہو جاتے ہیں۔ ۲؎

رسولؐ ان سے کہہ دیجئے کہ جو خدا تمہیں اس اور دوسری بلاؤں سے نجات دیتا ہے پھر بھی تم اس کا شریک قرار دیتے ہو۔ ۳؎

تثلیث از نظر قرآن

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ تم اسی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو۔ عبادت کے معنی اور اس کے مصداق کو ہم بیان کر چکے ہیں اب ہم اس کے بعد والے جملے ''کہ کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو'' کی وضاحت کرتے ہیں: جس طرح توحید کے مختلف مراتب و درجات ہیں اسی طرح شرک کے بھی مختلف اقسام و درجات ہیں: ذات میں توحید، صفات میں توحید، افعال میں توحید عبادت میں توحید اور اس کے دوسرے مراتب ہیں ایسے ہی ذات میں شرک، صفات میں شرک، افعال میں شرک، عبادت میں شرک اور اس کے دیگر اقسام۔

ذات میں شرک

قرآن کے نزول کے وقت مسیحی، عیسیٰ بن مریم کو معبود سمجھتے تھے قرآن نے انہیں کافر قرار دیا ہے:

جو لوگ عیسیٰ بن مریم کو خدا کہتے ہیں وہ کافر ہو گئے ہیں اے رسولؐ ان سے کہہ دیجئے کہ جب

۱؎ روم ۳۳ ۲؎ عنکبوت ۶۵ ۳؎ انعام: ۶۴

خدا چاہے گا مسیح بن مریم، ان کی ماں اور روئے زمین پر رہنے والوں کو نابود کر دے گا تو اسے اس سے کون روک سکتا ہے۔ [۱]

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا تین میں سے ایک ہے وہ کافر ہو گئے ہیں ایک خدا کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ [۲]

پہلی آیت میں واضح برہان کے ذریعہ فرماتا ہے: خدا عیسیٰ کو نابود کر سکتا ہے، صرف عیسیٰ ہی کو نہیں بلکہ تمام لوگوں کو ہلاک کر سکتا ہے اس میں شک نہیں ہے کہ مسیحی، حضرت عیسیٰ کو مریم کا فرزند مانتے ہیں اور کہتے ہیں: مسیح مریم کے پسر ہیں، اگر وہ مریم کے بیٹے ہیں تو دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی بشر ہیں اور ان کی موت وحیات خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس صورت میں وہ انہیں کیسے خدا مانتے ہیں جبکہ وہ اپنی موت وحیات کے مالک نہیں ہیں؟ اس آیت میں ان کے بشر ہونے پر زور دیا گیا ہے اور انہیں مریم کا بیٹا قرار دیا ہے۔

دوسری آیت میں ان کے کھانا کھانے کو اور اس بات کو بیان کیا ہے کہ ان کو کھانے کی احتیاج ہوتی تھی، ارشاد ہے: مسیح اور ان کی ماں کھاتی ہیں۔ [۳] یعنی مسیح اور ان کی والدہ دوسرے انبیاء سے مختلف نہیں ہیں۔ مسیح کا فرزند ہونا بھی ذات میں شرک کے مظاہر میں سے ایک ہے کہ ایک خدا کو تین خداؤں کی صورت میں دکھایا جاتا ہے قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ جس چیز کو انہوں نے معبود بنا رکھا ہے وہ مخلوق ہے۔

خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ بھی تمہارے ہی جیسے بندے ہیں [۴]

اے لوگو! جو کہ خدا کے غیر کو پکارتے ہیں وہ تمہاری مدد کرنے پر قادر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ گے تو وہ تمہاری بات نہیں سنیں گے تمہیں یہ محسوس ہوگا کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ دیکھتے نہیں ہیں۔ [۵]

قرآن اہل کتاب کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

اے رسول! اہل کتاب سے کہہ دیجئے کہ اس بات کو قبول کر لو جو ہمارے اور تمہارے درمیان

---

[۱] مائدہ: ۱۷ [۲] مائدہ: ۷۳ [۳] مائدہ ۷۵ [۴] اعراف ۱۹۴ [۵] اعراف ۱۹۷-۱۹۸

مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کے غیر کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں پھر اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں۔[۱]

مذکورہ آیت ہر قسم کے شرک کو شامل ہے یعنی کسی بھی قسم کا شرک نہ کیا جائے۔

عبادت میں شرک

اے رسول! ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں (لیکن میرا امتیاز یہ ہے کہ) مجھ پر مسلسل یہ وحی ہوتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے، پھر جو شخص خدا سے ملاقات کا امیدوار ہے اسے چاہئے کہ نیک و صالح عمل انجام دے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔[۲]

یہ آیت خدا کی عبادت میں شرک کرنے سے منع کرتی ہے اور اس بات کو بیان کرتی ہے کہ اپنی عبادت کو صرف خدا کے لئے قرار دو۔ مذکورہ آیت کے سلسلہ میں ابوالجارود نے امام محمد باقر سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: رسولؐ سے اس آیت کی تفسیر معلوم کی گئی تو آپ نے فرمایا: جو لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتا ہے وہ مشرک ہے اور جو لوگوں کو دکھانے کے لئے زکوات دیتا ہے وہ مشرک ہے اور جو لوگوں کو دکھانے کے لئے روزہ رکھتا ہے وہ مشرک ہے اور جو لوگوں کو دکھانے کے لئے حج کرتا ہے وہ مشرک ہے اور جو اس کام کو لوگوں کو دکھانے کے لئے انجام دیتا ہے کہ جس کا خدا نے اسے حکم دیا ہے، وہ مشرک ہے اور خداوند عالم ریا کاری قبول نہیں کرتا ہے۔[۳]

اسی آیت کے ذیل میں جراح مدائنی نے امام محمد باقر سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: انسان کوئی ثواب کا کام انجام دیتا ہے لیکن خدا کی رضا کو مدنظر نہیں رکھتا ہے بلکہ لوگوں کو دکھانے کے لئے انجام دیتا ہے تا کہ لوگ اس کے عمل کی تعریف کریں۔ یہ شخص خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے پھر فرمایا: جس شخص نے بھی کوئی نیک کام انجام دیا اور اسے مخفی رکھا خدا مرور زمانہ کے ساتھ اس کو ظاہر کر دے گا، اور جو بندہ اپنے برے کام کو مخفی رکھتا ہے خدا اسے شر کے عنوان سے ظاہر کر دے گا۔[۴]

---

۱ آل عمران ۶۴ ۲ کہف ۱۱۰ ۳ تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۳۱۴ ۴ ایضاً ج ۳ ص ۳۱۹

ایک حدیث میں زرارہ نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اگر بندہ کوئی کام خدا کی رضا اور آخرت طلب کرنے کے لئے انجام دیتا ہے اور خدا کے غیر کو بھی اس میں شریک قرار دیتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ [1]

قرآن میں مشرکوں کے اعمال کی عکاسی

قرآن مجید مشرکوں کے شرک آلود اعمال کی تصویر کشی اس طرح کرتا ہے:

حج کے مناسک کو انجام دیجئے اس حال میں کہ وہ خالص خدا کے لئے ہوں، اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیجئے دیکھو جو خدا کا شریک قرار دیتا ہے گویا وہ آسمان سے گر پڑتا ہے اور درمیان سے اسے پرندہ اچک لیتا ہے یا تیز ہوا اسے کہیں بہت دور پھینک دیتی ہے۔ [2]

اس آیت میں آسمان سے مراد توحید ہے اور شرک سقوط کا سبب ہے اس رفعت و بلندی سے جب انسان گرے گا تو وہ دو دردناک بلاؤں میں سے ایک میں لازمی طور پر مبتلا ہوگا یا وہ زمین پر آنے سے پہلے ہی پرندوں کا لقمہ بن جائے گا بعبارت دیگر وہ مرکز توحید سے جدا ہو کر بھری ہوئی ہوس میں پھنس جائیگا جو اس کی ہستی کو نابود کر دے گی اور اگر اس سے بچ جائیگا تو ہلاکت خیز طوفانوں میں گھر جائے گا جو اسے زمین پر پٹک دیں گے جس سے اس کے پرخچے اڑ جائیں گے اس طوفان سے مراد شیطان ہے جو اس کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک کی تشبیہ اس سے بہتر نہیں ملے گی۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے، جو کہ آج ثابت ہو چکی ہے، کہ سقوط کے وقت انسان کا کوئی وزن و بھرم نہیں رہتا ہے اور سقوط کے وقت انسان کے اندر جو اضطراب ہوتا ہے وہ اسی سبکی بے وقعتی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بیشک جو شخص ایمان سے شرک کی طرف بڑھتا ہے وہ مضبوط و استوار سہارے کو گنوا دیتا ہے اور ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتا ہے اس کے اوپر عجیب قسم کا اضطراب طاری ہو جاتا ہے۔ [3]

بنی امیہ شرک شناسی میں مانع

امام صادقؑ فرماتے ہیں: بنی امیہ نے ایمان شناسی کے لئے تو لوگوں کو آزاد چھوڑ رکھا تھا لیکن

---

[1] ایضاح ج۳ ص۳۱۷ — [2] حج: ۳۱ — [3] تفسیر نمونہ ج۱۴ ص۹۶

شرک کو پہچاننے کے لئے انہیں آزادی نہیں دی تھی تا کہ اگر انہیں شرک کی طرف بلایا جائے تو وہ یہ نہ سمجھ پائیں کہ انہیں شرک کی طرف ہنکایا گیا ہے۔ [۱]

اس حدیث کی شرح میں مرحوم فیض؛ شافی میں اس طرح رقم طراز ہیں:

بنی امیہ کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا تھا کہ لوگ بے چون وچرا ان کی اطاعت کریں اسی لئے انہوں نے ایمان وتوحید شناسی کے راستے کھلے چھوڑ رکھے تھے اور شرک کو پہچاننے کے راستے بند کر رکھے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر لوگ شرک کے مفہوم ومصداق کو نہیں سمجھیں گے تو آسانی سے شرک کو قبول کرلیں گے لیکن اگر اس کے معنی کو سمجھ لیں گے تو ہرگز بنی امیہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ [۲]

بنی امیہ ہی نہیں بلکہ تمام طاغوتی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ لوگ علوم ومعرفت کے میدان میں قدم نہ رکھیں کیونکہ جتنا علوم سے دور رہیں گے اتنے ہی بہتر طریقہ سے اطاعت کریں گے لہذا اسلامی تہذیب میں علم حاصل کرنے کو بہترین عبادات اور اہم ترین فریضہ قرار دیا گیا ہے اور جہالت ونادانی کے خلاف جنگ کہا گیا ہے۔

شرکِ خفی

شرکِ خفی کے بارے میں امام صادقؑ نے رسولؐ کی یہ حدیث بیان فرمائی ہے: مسعدہ بن صدقہ نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ سے رسولؐ کی اس حدیث "شرک اس چیونٹی سے بھی زیادہ خفی چلتا ہے جو تاریک رات میں کالے پتھر پر چلتی ہے" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مومنین مشرکوں کے خداؤں کو برا کہتے تھے نتیجہ میں مشرکین بھی مومنوں کے معبود کو برا کہتے تھے لہذا خدا نے مومنوں کو اس سے منع کیا تا مشرک ایسا نہ کریں کہ اس کے علاوہ نہ دانستہ طور پر مومنین شرک نہ کریں، سورۂ انعام میں ارشاد ہے [۳]: ان چیزوں کو برا نہ کہو کہ جن کو مشرکین پکارتے ہیں۔ [۴]

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خفی شرک کتنا خطرناک ہے اس سے خدا کی پناہ طلب کرنا چاہئے، امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: تمہارے اوپر خدا کا حق یہ ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس

---

۱ الشافی ج ۱ ص ۱۴۶ ۲ ایضاً ۳ سورۂ انعام ۱۰۸ ۴ بحار الانوار ج ۲۷ ص ۹۳

کا شریک قرار نہ دو اگر یہ عمل تم خلوص کے ساتھ انجام دو گے تو خدا نے بھی اپنے اوپر یہ فرض کیا ہے کہ وہ تمہارے دنیا و آخرت کے امور میں کفایت کرے گا اور تمہاری محبوب چیزوں کی حفاظت کرے گا۔ میں خداوند عالم سے اس حق کی توفیق کا طلب گار ہوں۔

نفس کا حق

"واماحق نفسك عليك فان تستوفيها فى طاعة الله فتودى الى لسانك حقه، والى سمعك حقه، والى بصرك حقه، والى يدك حقها، والى رجلك حقها، والى بطنك حقه، والى فرجك حقه وتستعين بالله على ذلك".

تمہارے نفس کا تم پر یہ حق ہے کہ اسے بھرپور طریقہ سے راہ خدا میں مشغول رکھو اگر تم نے ایسا کیا تو گویا تم نے اپنی زبان کا حق، اپنے کان کا حق، اپنی آنکھ، ہاتھ، پاؤں اور شکم وشرم گاہ کا حق ادا کردیا اور دیکھو ان کے حقوق کی ادائیگی میں خدا سے مدد طلب کرتے رہو۔

آپ کے اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے حقوق کو ادا کرنا گویا اپنے ان اعضاء وجوارح کے حقوق کو ادا کرنا ہے جو کہ خدا کی عطا ہیں لہٰذا اس سلسلہ میں خدا ہی سے مدد طلب کرنا چاہئے۔

نفس کے معنی

ابتداء میں اس بات کی طرف اشارہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نفس کے لغوی معنی کیا ہیں اور اس کا محل استعمال کیا ہے۔ مشہور لغت شناس راغب لکھتے ہیں: نفس کے معنی روح کے ہیں اس سلسلہ میں موصوف نے قرآن کی آیات کو بھی ثبوت میں پیش کیا ہے۔[۱]

مثلاً: اخرجوا انفسكم اليوم [۲] "فاعلموا ان الله يعلم ما فى انفسكم فاحذروه" [۳] تعلم ما فى نفسى ولا اعلم ما فى نفسك" [۴] ان آیتوں میں نفس روح کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن "يحذركم الله نفسه [۵] میں نفس سے مراد ذات ہے۔ راغب نے نفس کے دوسرے معنی بھی بیان کئے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں: درحقیقت نفس وہ ہوا ہے جس کو انسان منھ یا ناک کے ذریعہ بدن میں داخل کرتا ہے اور بدن سے کاربن گیس کو نکالتا ہے، اس میں بدن کے لئے غذا ہوتی ہے چنانچہ سانس کا سلسلہ منقطع ہوجانے سے موت واقع ہوجاتی ہے۔

---

۱ المفردات مادۂ نفس ۲ انعام ۹۳ ۳ بقرہ ۲۳۵ ۴ انعام ۹۳ ۵ آل عمران ۲۸

شیخ طبرسی مرحوم نے اس آیت ''ومایخدعون الاانفسہم ''[۱] کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ نفس کے تین معنی ہیں:

۱۔روح

۲۔تاکید مثلاً ''جائنی زید نفسہ''

۳۔ذات، اصل یہی معنی ہیں۔[۲]

قرآن میں نفس کے معنی

طبرسی نے تحریر کیا ہے کہ نفس روح کے معنی میں استعمال ہوا ہے مثلا اس آیت میں ارشاد ہے:

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی تمت فی منامھا فیمسک التی قضا علیھا الموت و یرسل الاخریٰ الیٰ اجل مسمیً [۳]

خداوند عالم روحوں کو موت کے وقت جب وہ کمال کو پہنچ جاتی ہیں لے لیتا ہے یا قبض کر لیتا ہے اور جس روح کا بدن ابھی نہیں مرا ہے اور اس کی موت کا وقت آگیا ہے تو اسے سوتے ہی میں روک لیتا ہے اور دیگر ارواح کو معین وقت تک کے لئے ان کے بدن میں بھیج دیتا ہے۔[۴]

۲۔نفس ذات کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً ارشاد ہے: واتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئا [۵] اس دن سے ڈرو! جس دن کوئی نفس کسی دوسرے نفس کا فدیہ نہیں دیا جائیگا۔

۳۔نفس قلب اور باطن کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔مثلاً: واذکر ربك تضرعا وخیفة [۶] اپنے پروردگار کو اپنے دل میں تضرع وزاری کے ساتھ یاد کرو واسرھا یوسف فی نفسہ [۷] اور یوسف اسے اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھے۔ و ربکم اعلم بما فی نفوسکم [۸] اور تمہارا پروردگار ان چیزوں کو اچھی طرح جانتا ہے جن کو تم چھپائے ہوئے ہو۔

---

[۱] بقرہ۹ [۲] مجمع البیان ج۱ ص۴۶ [۳] زمر:۴۲ [۴] زمر۴۲

[۵] بقرہ۴۸ [۶] اعراف۲۰۵ [۷] یوسف۷۷ [۸] اسرا۲۵

نفس کے اقسام کے بارے میں حکماء کا نظریہ

صدر المتألہین شیرازی نے شیخ الرئیس بوعلی سینا سے نقل کیا ہے کہ قوائے نفس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ نفس نباتی: یہ جسم طبیعی وآلی کا اولین کمال ہے اس میں فقط رشد ونمو پایا جاتا ہے۔

۲۔ نفس حیوانی: یہ جسم طبیعی وآلی کے لئے اولین کمال ہے کہ اس میں ارادہ کے ساتھ حس وحرکت پائی جاتی ہے۔

۳۔ نفس انسانی: یہ جسم طبیعی وآلی کا کمال ہے کہ اس میں تعقل اور کلیات کو سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور یہ مختلف رایوں کا استنباط کرتا ہے اسکے بعد موصوف ان تینوں قسموں کے خصوصیات بیان کرتے ہیں۔[1]

ابونصر فارابی۔ معلم ثانی۔ رسالہ فصوص الحکم کی بائیسویں فصل میں نفس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: نفس مطمئنہ کا کمال اپنے ادراک کے ذریعہ حق اول کا عرفان ہے پس اس کا عرفان حق اول ہے اس کی وضاحت الٰہی قمشہ ای نے اس طرح کی ہے: نفس ناطقہ کے بہت سے پہلو ہیں اگر وہ لذتوں اور حیوانی شہوتوں پر مرا جاتا ہے تو اسے نفس امارہ کہتے ہیں اور اگر شہوت کے غلبہ کی وجہ سے اس کی نظر میں بداعمال سنور جاتے ہیں تو اسے مزیّنہ کہتے ہیں۔ اور اگر حیوانی مقاصد کو انجام دینے کے لئے حیلے بہانے سے کام لیتا ہے تو اسے ''مسوّلہ'' کہتے ہیں۔ اگر وہ کسی برے کام کی انجام دہی کے بعد اصلی فطرت کی طرف رجوع کرتا ہے اور خود کو لعنت ملامت کرتا ہے تو اسے ''لوّامہ'' کہتے ہیں۔ اور اگر حیوانی لذتوں سے چھٹکارا پالیتا ہے اور اس کی شہوت وغضب کی قوت میں آرام وسکون پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عقلی لذتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے تو اسے نفس مطمئنہ کہتے ہیں اور اگر تسلیم ورضا کی منزل میں وہ خدا کی رضا کے لئے اپنی مرضی کو ختم کر دیتا ہے تو اسے نفس راضیہ ومرضیہ کہتے ہیں۔ موصوف نے ان باتوں کو قرآن سے اقتباس کیا ہے جس منزل پر اسے نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے وہاں اسے حق اول کی معرفت ہی میں لذت محسوس ہوتی ہے، پس نفس مطمئنہ (یعنی روح) اسے اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ آلودگیوں اور تن کی کدورتوں سے

---

[1] اسفار اربعہ ج ۸ ص ۵۳

پاک ہو جاتا ہے۔ ۱

اب ہم خدا کی مدد کے ساتھ نفس کے اِن مراتب کو قرآن کی روشنی میں بیان کریں گے اور ان آیتوں کو بھی بیان کریں گے جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔

نفس کے مراتب قرآن کی نظر میں

نفس کے بعض مراتب قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں ان کو ہم اختصار کے ساتھ سپرد قلم کرتے ہیں:

۱۔ نفس امّارہ

جو نفس لذتوں پر مرا جاتا ہے اسے نفس امّارہ کہتے ہیں یعنی وہ انسان کو ہمیشہ اس بات پر ابھارتا ہے کہ اس کی خواہش پوری کرے نفس کا یہ مرحلہ کہ جس کو قرآن کی زبان میں نفس امارہ کہا گیا ہے انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور خدا کے عظیم بندوں نے اس سے خدا کی پناہ طلب کی ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف کی زبانی اس طرح بیان ہوا ہے: میں اپنے نفس کو بری نہیں قرار دیتا کیونکہ وہ ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے مگر یہ کہ میرا پروردگار مجھے گناہوں سے بچے رہنے کی توفیق دیتا رہے۔ ۲

دوسری آیت میں ارشاد ہے جو اپنے پروردگار کے مقام و مرتبہ سے ڈرا اور اس نے ہوا وہوس سے اپنے نفس کو روک کر رکھا تو بہشت اسکی منزل ہے۔ ۳ نفس کے اس مرتبہ کے سلسلہ میں حضرت امیر المومنین فرماتے ہیں:

نفس کی طبیعت میں ہی سرکشی اور بے ادبی ہے بندہ پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اسے با ادب ومؤدّب بنائے۔ نفس تو میدان مخالفت میں چوکڑیاں بھرتا پھرتا ہے بندہ کو چاہئے کہ وہ اسکی خواہشوں کو پورا نہ کرے بلکہ اسے قابو میں رکھے اگر اسے آزاد چھوڑ دے گا تو وہ اسکی تباہی میں ایسا شریک ہوگا، جو نفس کی

---

۱ حکمت الٰہی عام وخاص ص ۳۱۔۳۲ ۲ یوسف: ۵۳ ۳ نازعات ۴۰۔۴۱

خواہشوں کو پورا کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے گویا وہ اپنے قتل میں اپنے نفس کے ساتھ شریک ہوا۔ ۱

امام صادقؑ فرماتے ہیں: نفس کو چھوڑنے سے پہلے اسے ضرر رسانی سے روک دو اور اسکی زبان کو لگام چڑھا دو اور اسے ناجائز خواہشوں کی زنجیر سے آزاد کرنے کے لئے اسی طرح کوشش کرو جس طرح تم اپنا روزگار تلاش کرنے میں کوشش کرتے ہو کیونکہ نفس تمہارے عمل کا مرہون ہے۔ ۲

نفس سے جہاد

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: مرد کا اپنے نفس سے جہاد کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ ۳

رسولؐ فرماتے ہیں: وہ آدمی شجاع اور طاقتور نہیں ہے جو لوگوں پر غالب آجاتا ہے بلکہ طاقتور اور مضبوط آدمی وہ ہے جو اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے۔ ۴

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: اپنے نفس کی مخالفت کرو تا کہ تم سیدھی سچی زندگی بسر کر سکو اور صاحبان علم کے ساتھ گھل مل جاؤ کہ اس طرح تم بھی عالم بن جاؤ گے اور جہالت سے نجات پا جاؤ گے۔ ۵

دوسری جگہ فرماتے ہیں: جو اپنے نفس پر غلبہ پا لیتا ہے وہ مکمل طور پر طاقت حاصل کر لیتا ہے۔ ۶

پہلوان سے بھی زیادہ طاقتور

رسولؐ ایک جماعت کے پاس سے گزرے ان میں سے ایک آدمی بہت وزنی اور بھاری پتھر اٹھائے ہوئے تھا اس کے بارے میں لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ وہ بہت وزنی پتھروں کا اٹھانے والا ہے اس کی وزن برداری سے لوگ حیرت زدہ تھے۔ رسولؐ ان کے قریب تشریف لے گئے اور معلوم کیا: کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے بتایا: اے اللہ کے رسولؐ! ایک شخص پتھر اٹھاتا ہے اسے سب سے بھاری اور وزنی پتھر

---

۱ مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۷۰ ۲ ایضاً ج ۲ ص ۱۰ ۳ شرح غرر و درر جمال خوانساری ج ۲ ص ۳۸۹

۴ مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۷۰ ۵ شرح غرر و درر ج ۳ ص ۲۶۲ ۶ نیز ج ۵ ص ۲۵۴

اٹھانے والا کہتے ہیں، آپ نے فرمایا: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس سے زیادہ طاقتور آدمی کی خبر دوں؟ وہ شخص ہے کہ جس کو دوسرا برا کہتا ہے اور وہ برداشت کرتا ہے، اپنے اوپر قابو رکھتا ہے اپنے اور اپنے ساتھی کے شیطان پر غالب آجاتا ہے۔[1]

۲۔ نفس لوامہ

ابھی تک جو آیات و روایات بیان ہوئی ہیں ان کا تعلق نفس امارہ سے تھا کہ جو ہمیشہ انسان کو برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ نفس امارہ کے مقابلہ میں نفس لوامہ ہے یعنی جو ملامت کرتا ہے۔ انسان سے اگر کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو یہ نفس اس کو سرزنش کرتا ہے قران مجید نے اسی نفس کی قسم کھائی ہے۔ ارشاد ہے:

لا اقسم بیوم القیٰمة و لا اقسم بالنفس اللوامة [2]

روز قیامت کی قسم اور نفس لوامہ کی قسم۔

علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں امام علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ نفس لوامہ سے مراد، آدم کا نفس ہے جس نے عصیان و نافرمانی کی اور ملامت کا نشانہ بنا۔ [3]

جو انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنے باطن سے ملامت و سرزنش کی آواز سنتا ہے۔ یہ آواز اس کو تکلیف دیتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے ملامت کرنے والی طاقت کا نام "وجدان اخلاقی" رکھا ہے جبکہ قرآن نے اسے نفس لوامہ کہا ہے، لفظ نفس کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ ملامت کرنے والی طاقت روح بشر ہے جو انسان کے وجود کا جز ہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ یہ روحانی طاقت شروع سے ہی آدم کے وجود میں تھی۔

مایوس بیمار اور اس کا علاج

حضرت امام زین العابدینؑ طواف میں مشغول تھے اچانک آپ کی نگاہ ان لوگوں پر پڑی جو مسجد کے گوشہ میں جمع تھے۔ آپ نے دریافت کیا: کیا بات ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ محمد بن شہاب زہری

---

[1] مجموعہ ورام ج ۲ ص ۱۰ [2] قیامت: ۱و۲ [3] تفسیر نور الثقلین ج ۵ ص ۴۶۱

نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں گویا پاگل ہو گئے ہیں؛ خاموش رہتے ہیں، کچھ بولتے ہی نہیں ہیں۔ ان کے خاندان والے ان کو اس لئے مکہ لائے ہیں کہ ہوسکتا ہے لوگوں کے اژدھام کو دیکھکر یہ بولنے لگیں طواف مکمل کرنے کے بعد امام زین العابدینؑ محمد بن شہاب زہری کے پاس گئے۔ اس نے امام زین العابدینؑ کو پہچان لیا۔ آپ نے دریافت کیا: تمہیں کیا ہوتا ہے؟ اس نے کہا: میں ایک شہر کا حاکم تھا۔ مجھ سے ایک بے گناہ کا خون ہو گیا۔ اس بے گناہ کے خون نے مجھے یہ دن دکھایا ہے۔ ایک بے گناہ کے خون نے ایک حاکم کا یہ حال کر دیا ہے اور اس کے ضمیر کی پھٹکار نے نفسیاتی مرض میں مبتلا کر دیا ہے وہ اس گناہ پر اتنا پشیمان ہے کہ بولنے کی جرأت بھی نہیں کر پا رہا ہے بلکہ پاگلوں جیسا بن گیا ہے، امام زین العابدینؑ نے اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ اپنے گناہ کی بخشش سے مایوس ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تمہارا رحمت خدا سے مایوس ہو جانا اس گناہ سے زیادہ خطرناک ہے جو تم نے بے گناہ کا خون بہا کر کیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: مقتول کے وارثوں کو اس کی دیت دیدو۔ اس نے کہا: انہوں نے دیت لینے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: دیکھتے رہو جب وہ نماز کے لئے گھر سے باہر جائیں تو دیوار کے اوپر سے ان کے گھر میں تھیلیاں ڈال دینا اس طرح[1] امام نے اس کا علاج کر دیا۔ یہ تھا نفس لوامہ کا اثر۔

۳۔ نفس مسولہ

ایک لحاظ سے نفس کو مسولہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ انسان کی نظر میں غلط اور برے کام کو اچھا بنا دیتا ہے اور ان کے انجام دینے کی طرف راغب کرتا ہے، قرآن مجید میں اس کے دو نمونے بیان ہوتے ہیں:

یوسف اور ان کے بھائی

جب یوسف کے بھائیوں نے انھیں باپ سے جدا کر کے کنویں میں ڈال دیا تو نفس نے انہیں فریب دیا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے "یوسف کے پیراہن کو جھوٹے خون میں رنگ کر اپنے والد

---

[1] مجموعہ ورام ج ۲ ص ۴

کے پاس لائے۔ باپ نے کہا: تمہارے نفس کی خواہش نے یہ چیز تمہارے لئے سنوار دی ہے جو تم کہتے ہو میں اس پر بہترین طریقہ سے صبر کرونگا اور خدا ہی سے مدد طلب کرونگا۔ [1]

اس آیت میں تسویل سے "سوّلت" آیا ہے جس کے معنی تزئین اور سنوارنے کے ہیں علماء نے کہیں اس کے معنی ترغیب اور کہیں وسوسہ بیان کئے ہیں کہ سب کا مفہوم ایک ہی ہے اور یہ کہ جب بھری ہوئی خواہشیں انسان کی روح اور خیال پر غالب آجاتی ہیں تو وہ انسان کی نظر میں کسی کے قتل اور کسی کے جلاوطن کرنے کو سنوار دیتی ہیں کہ وہ اس فعل کو مقدس اور اس کی انجام دہی کو لازمی وضروری سمجھنے لگتا ہے اور یہ نفسیات کے مسائل کی طرف ایک دریچہ ہے کیونکہ جب انسان کسی چیز کو شدت کے ساتھ چاہتا ہے خصوصاً جب یہ خواہش اخلاقی پستیوں کے ساتھ ہوتی ہے تو یہ چیز انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اور انسان کی نظر میں حقائق کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب نفس کے بغیر صحیح فیصلہ اور حقائق کا صحیح ادراک نہیں ہو پاتا ہے۔ اس داستان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نفس مسولہ کی کارستانی کے سبب یوسف کے بھائیوں نے کتنی بڑی خیانت کی تھی اور جھوٹے خون سے یوسف کا پیراہن رنگ کر اپنے جھوٹ کو ثابت کیا تھا، اسی داستان میں یہ بھی ہے کہ جب یہ لوگ مصر سے واپس لوٹے اور بھائی کی چوری کی خبر یعقوب کو دی تو یعقوب نے فرمایا:

کہا: تمہارے نفس نے اس کو تمہاری نظر میں سنوار دیا ہے میں بہترین صبر سے کام لوں گا امید ہے کہ خدا ان سب کو میری طرف پلٹائے گا۔ بیشک وہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ [2]

سامری:

قرآن کہتا: موسیٰ توریت کی تختیوں کو لینے کوہ طور پر گئے اور لوگوں سے فرمایا: یہ سلسلہ تیس دن تک جاری رہے گا لیکن اس میں خدا نے دس روز کا اضافہ کر دیا۔ اب چالیس دن کی مدت ہوگئی، انہیں دس دن کے عرصے میں سامری نے بنی اسرائیل کو بہکا دیا اور انہیں بچھڑے کی پرستش پر اکسایا۔ حضرت موسیٰ واپس آئے تو یہ افسوس ناک صورت حال دیکھی۔ پہلے تو آپ نے اپنے بھائی ہارون کو سرزنش کی لیکن

---

[1] یوسف: ۱۸ [2] ایضاً: ۸۳

جب یہ معلوم ہوا کہ اس میں ہارون کا کوئی قصور نہیں ہے تو سامری سے مخاطب ہوئے:

فرمایا: اے سامری کیا یہ غلط کام تم نے انجام دیا ہے؟ اس نے کہا: جو چیز میں نے دیکھی وہ انہوں نے نہیں دیکھی۔ میں نے رسول (یعنی خدا کے بھیجے ہوئے نمائندہ) کے قدم کی خاک اٹھائی اور اس کو میں نے (اس کے اندر) ڈال دیا یہی میرے نفس نے میری نظر میں سجا دیا تھا۔[1]

سامری ایک خود پسند اور منحرف آدمی تھا۔ اس نے ہوشیاری، جرأت مندی اور ماہرانہ چال چلی اور بنی اسرائیل کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ایک بڑا فتنہ کھڑا کر دیا اور موسیٰ کی کوششوں کا کوئی پاس ولحاظ نہ رکھا اور موقعہ ملتے ہی لوگوں کو بچھڑا پرستی کی دعوت دیدی۔

اس آیت میں سامری نے اپنے منفور عمل کی، کہ جس سے اس نے بنی اسرائیل کو گمراہ کیا تھا، اپنے نفس مسولہ کی طرف نسبت دی ہے اور کہا ہے: اس طرح میرے نفس نے اس چیز کو میری نظر میں سجا دیا ''قبضت قبضة من اثر الرسول ''اثر کے معنی''قدم کے نیچے کی مٹی کے ہیں''اور''نبذ''کے معنی بچھڑے کے اندر (اس مٹی کو) ڈالنے کے ہیں یا اثر سے مراد حضرت موسیٰ کی بعض تعلیمات اور نبذ سے مراد انہیں نظر انداز کرنا ہے دونوں کا مفہوم یہ ہے کہ سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے سلسلہ میں اپنے نفس سے دھوکا کھایا اور نتیجہ میں اتنی بڑی خیانت کی۔

حسن بصری امت کا سامری

احتجاج طبرسی میں منقول ہے کہ جب حضرت علیؑ بصرہ کو فتح کر چکے تو اہل بصرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں حسن بصری بھی تھا اس کے ہاتھ میں قلم کاغذ بھی تھا اور حضرت علیؑ کی ہر بات کو لکھ لیتا تھا۔ حضرت علیؑ نے اس کو سب کے درمیان بلند آواز سے مخاطب کیا اور فرمایا: یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اس نے عرض کی: آپ کی باتوں کو لکھ رہا ہوں تا کہ آئندہ کام آئیں۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: دیکھو! ہر قوم میں ایک سامری ہوتا ہے اور اس قوم کا سامری حسن بصری ہے ہاں اس کے اور موسیٰ کے زمانہ والے سامری کے درمیان یہ فرق ہے کہ وہ اپنے پاس آنے والے سے

---

[1] طہ: ۹۶

کہتا تھا میرے پاس نہ آؤ لیکن یہ کہتا ہے کہ جنگ نہ کرو یہاں تک گمراہ و منحرف لوگوں سے بھی جنگ نہ کرو حسن بصری نے لوگوں کو جنگ جمل میں حضرت علیؑ کا ساتھ دینے سے منع کیا تھا۔ ۱

۴۔ نفس مطمئنہ

نفس کا ایک رخ اطمینان بھی ہے اور یہ نفس کا بلند ترین رخ ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف پلٹ آ جبکہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے راضی ہے اور میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ ۲

کتنی اچھی بات ہے کہ خداوند عالم براہ راست ان نفوس کو بلا رہا ہے جو ایمان کی روشنی میں اطمینان کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں، یہ ایسی دعوت ہے کہ جس میں طرفین کی رضا ہے، عاشق کی رضا بھی ہے اور محبوب و معبود حقیقی کی رضا بھی، پھر اس کے سر پر عبودیت کا با افتخار تاج رکھنا اور اسے بندگی کے خلعت سے سرفراز کرنا، خاص بندوں میں شامل کرنا اور پھر اسے جنت میں آنے کی دعوت دینا کتنی اہم بات ہے۔

اطمینان و سکون انقلاب کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ نفس کو اس وقت سکون ملتا ہے جب وہ یقین اور معرفت و شہود کی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔ کاشفی کہتے ہیں: اے وہ نفس کہ جس کو میرے ذکر سے آرام ملا ہے جس نے میری نعمت کا شکر ادا کیا ہے اور بلا پر صبر کیا ہے۔ پس جس کرامت کا خدا نے وعدہ کیا ہے اکی طرف پلٹ آ جبکہ تو ان نعمتوں سے راضی ہے جو میں تجھے دی ہیں۔ ۳

موت کے وقت نفس مطمئنہ کی حالت

نفس مطمئنہ کا بہترین جلوہ مرتے وقت اور اس عالم مادہ سے جدائی کے وقت نظر آتا ہے وہ اس دنیا کو اطمینان و سکون کے ساتھ چھوڑتا ہے اور عالم ابدیت سے متصل ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت کو سدیر صیرفی نے امام جعفر صادق سے اس طرح نقل کیا ہے: سدیر کہتے ہیں:

میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: فرزند رسولؐ! میں قربان! کیا مومن روح قبض

۱۔ تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۳۹۲ ۲۔ فجر ۲۷ تا ۳۰ ۳۔ روح البیان ج ۱۰ ص ۴۴۲

ہونے کو اچھا نہیں سمجھتا ہے؟ فرمایا: نہیں خدا کی قسم جب ملک روح قبض کرنے کے لئے آتا ہے تو وہ جزع و فزع کرتا ہے ملک الموت اس سے کہتا ہے: اے خدا کے محبوب تم مطمئن رہو، اس خدا کی قسم کہ جس نے رسولؐ کو مبعوث کیا ہے، میں تم پر باپ سے زیادہ مہربان ہوں اپنی آنکھ کھولو اور دیکھو۔

پھر فرماتے ہیں کہ رسولؐ علیؑ فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ اور باقی ائمہ اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اے نفس مطمئنہ محمدؐ اور ان کی آل کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ کہ تو علیؑ کی ولایت سے راضی اور اپنے پروردگار کے ثواب سے خوش ہے، میرے بندے محمدؐ اور ان کی آل کی زمرہ میں شامل ہوجا اور میری جنت میں آجا، اس کی روح کے نزدیک اس آواز سے بہتر اور اس کے منادی تک پہنچنے سے بہتر اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔[1]

خواہش نفس سے جنگ

منزل کمال پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پہلے مرحلہ میں اپنے نفس کو پہچانے اور اس کی ہر خواہش کو پورا نہ کرے اس مفہوم کو "مجاشع" نے انسان کامل پیغمبر اسلام سے نقل کیا ہے صاحب کتاب غوالی اللئالی لکھتے ہیں: مجاشع نام کا ایک شخص رسول کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور درج ذیل سوال کئے اور ان کا جواب پایا:

اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ حق کو پہچاننے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: معرفت نفس، اس نے کہا: حق کی موافقت کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: نفس کی مخالفت، اس نے کہا: حق کی رضا حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: نفس کو ناراض کرنا۔ اس نے کہا حق تک رسائی کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: اپنے نفس کی خواہشوں سے منھ موڑنا، اس نے کہا حق کی اطاعت کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: نفس کی خواہشوں کے مقابلہ میں سرکشی کرنا، اس نے کہا حق کی راہ یاد کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: نفس کو فراموش کرنا۔ اس نے کہا: حق سے نزدیک ہونے کا کون سا راستہ ہے؟ فرمایا: نفس سے دوری اختیار کرنا، اس نے کہا حق سے انس کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: اپنے نفس سے ڈرنا، اس نے کہا: ان سب تک پہنچنے کا کیا

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۵ ص ۵۷۷

طریقہ ہے؟ فرمایا: حق سے اس کے خلاف مدد طلب کرنا۔ [1]

اس دلچسپ حدیث میں آدمی کے بلند منزل پر پہنچنے اور نفس کی مخالفت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس میں چند چیزیں قابل غور ہیں: حق و نفس کی معرفت، حق کی موافقت اور نفس کی مخالفت، حق کو خوشنود کرنا اور نفس کو ناراض کرنا، حق سے متصل ہونا اور نفس کی پروانہ کرنا، حق کی پیروی کرنا اور نفس کی نافرمانی کرنا، حق کو یاد رکھنا اور نفس کو بھلا دینا، حق سے نزدیک ہونا اور نفس سے دور ہونا، اگر اس حدیث پر عمل کر لیا جائے تو واقعاً انسان حقیقی عرفان کی منزل تک پہنچ جائے۔

فقہی لحاظ سے نفس کا حق

اس بحث کے آخر میں نفس کے فقہی حق کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں نفس، انسان کی حیات کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے حیات و زندگی بڑی قیمتی چیز ہے کوئی چیز بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، انسان کی جان کے بارے میں قرآن اس طرح فرماتا ہے:

اگر کسی نے انسان کو ناحق یا اس کے زمین میں فساد پھیلائے بغیر قتل کر دیا گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو زندہ رکھنے کا سبب بنا گویا اس نے سارے انسانوں کو زندگی دی۔ [2]

بے گناہ مومن کے قاتل کو قرآن مجید بد عاقبت قرار دیتا ہے اور اس جرم کو ہر جرم سے سنگین سمجھتا ہے:

جو جان بوجھکر کسی مومن کو قتل کرتا ہے اس کی سزا ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے اور اس پر خدا کا غضب ولعنت ہے اور اس نے اس کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ [3]

قرآن کہتا ہے: جو مظلوم مارا جائے ہم نے اس کے ولی وسرپرست کے لئے قصاص کی سلطنت رکھی ہے۔ لیکن اسے قتل کرنے میں حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ [4] حکم قصاص قرآن مجید کا اصلی منشور ہے، اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ [5]

---

[1] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۷۰ [2] مائدہ: ۳۲ [3] نساء: ۹۳ [4] اسراء: ۳۳ [5] بقرہ: ۱۷۹

قتل کی تین قسمیں ہیں: قتل عمد، قتل شبہہ اور قتل خطا، قتل عمد میں مقتول کے سرپرست کو اختیار حاصل ہے کہ وہ قصاص میں قاتل کو قتل کرے یا اس سے دیت وخوں بہا لے یا اسے معاف کر دے لیکن قتل شبہہ عمد اور قتل خطا میں دیت لے گا۔ قتل شبہہ عمد یہ ہے کہ انسان کسی کو کسی وجہ سے مارے اور اس پٹائی سے وہ مرجائے، ظاہر ہے اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا اور نہ ہی اس نے تلوار و گولی چلائی تھی۔[1]

قرآن کے زاویہ نگاہ سے قصاص میں معاشرہ کی حیات ہے اور قصاص کو حرام قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ ظالموں کو چھوٹ دیدے گئی۔ لیکن قرآن قصاص میں قتل کرنے کے سلسلہ میں زیادتی کرنے سے بھی منع کرتا ہے۔

ایک آزاد انسان کی دیت (قیمت) درج ذیل چیزوں میں سے ایک ہے:

ا۔ ایسے سو اونٹ ہیں جو چھٹے سال میں داخل ہو گئے ہوں۔

۲۔ دو سو گائے۔

۳۔ ہزار گوسفند

۴۔ دو سو حلے (یمنی کپڑا)

۵۔ ہزار مثقال شرعی سونا ہر مثقال ۱۸ نخود کا ہوتا ہے۔

۶۔ دس ہزار درہم۔

---

[1] مختصر النافع کتاب الدیات ص ۲۹۴

اعضائے بدن کے حقوق

زبان کا حق

"واما حق اللسان فاكرامه عن الخنى وتعويده على الخير، وحمله على الادب واجمامه الا لموضع الحاجه والمنفعه للدين والدنيا، واعفاؤه عن الفضول الشنعة القليلة الفائدة التى لايومن ضررها مع قلة عائدتها، ويعد شاهد العقل الدليل عليه، وتزين العاقل بعقله حسن سيرته فى لسانه: ولاقوة الا باللّٰه العلى العظيم۔

زبان کا حق یہ ہے کہ اسے گالی گلوچ سے محفوظ رکھو اور اسے نیک و شائستہ بات کہنے کا عادی بناؤ اسے با ادب بناؤ اسے ضرورت اور دین و دنیا کے فائدہ کے علاوہ بند ہی رکھو اور زیادہ چلنے، بے فائدہ بولنے سے روکو کہ تم اس کے نقصان سے محفوظ نہیں ہو اور اس کا فائدہ کم ہے، زبان عقل کا گواہ اور اس کی دلیل سمجھی جاتی ہے اور عقلمند کا عقل کے زیور سے آراستہ ہونا اس کی خوش بیانی ہے، مدد تو بس خدائے بزرگ و برتر ہی کی طرف سے ہے۔

امام زین العابدینؑ نے نفس کے حق کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ اسے پورے طریقہ سے خدا کی طاعت میں لگا دو اور اپنے ساتوں اعضاء کا بھی خیال رکھو، آپ ساتوں اعضاء کے حقوق کو تفصیل سے بیان فرماتے ہیں آغاز، زبان سے کرتے ہیں اور اس کی حفاظت کا طریقہ بتاتے ہیں:

زبان عظیم ترین نعمت

بیشک خدا نے اس دنیا میں عظیم نعمتوں سے ایک بڑی نعمت جو انسان سے مخصوص کی ہے وہ زبان ہے، سورۂ رحمان میں اس کی عظمت کی تصریح ہوئی ہے، خلق الانسان، علمه البیان" انسان کو پیدا کیا اور اس کو بولنا سکھایا، بیان کے معنی کسی چیز سے پردہ ہٹانے کے ہیں۔ زبان انسان کے باطن کی

خبر دیتی ہے، اس کے دل کی ترجمان ہے وہ سارے پردوں کو ہٹا کر اس کے دل کے حالات کو ظاہر کر دیتی ہے، اگر زبان نہ ہوتی تو انسان دوسرے حیوانات کی مانند صامت ہوتا نہ اپنی بات سمجھا سکتا اور نہ دوسرے کی بات سمجھ پاتا۔

زبانوں کا اختلاف خدا کی نشانی ہے

قرآن مجید میں خدا کا ارشاد ہے، خدا کی نشانیوں میں سے، آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا، اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے بیشک اس میں انسانوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ [۱]

زبان تعارف کا ذریعہ

کسی کو پہچاننے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں ان میں سے ایک زبان بھی ہے، ہر انسان اپنی زبان کے ذریعہ اپنا تعارف کراتا ہے۔ زبان ہی ہے جو انسان کے باطن کے اچھا یا برا ہونے کی خبر دیتی ہے، ہر آدمی کی زبان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ نیک ہے یا بد، امام محمد تقیؑ فرماتے ہیں، انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ [۲] زبان ہی ہے کہ پردہ ہٹا کر حقیقت کو عیاں کر دیتی ہے۔

زبان کی ماہیت

زبان کے سلسلہ میں حضرت علیؑ نے ایک چھوٹا سا جملہ فرمایا اور اس کی حقیقت کو واضح کر دیا:
زبان کا وزن و جرم کم ہے لیکن اس کا گناہ بہت سنگین ہے۔

خدا نے جو اعضاء و جوارح عطا کئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا کام جدا اور ہر ایک کی خصوصیت ہے مثلاً آنکھ رنگوں اور شکلوں کو دیکھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتی اسی طرح کان آوازوں کو سنتے ہیں اور بس ہاتھ چیزوں کو چھوتے ہیں اور ان کی کیفیت کا پتہ لگاتے ہیں لیکن زبان کے بہت سے کام ہیں زبان خیر و شر اور کامیابی و ناکامی کا سبب بھی ہے نیک بات جہاں کامیابی کا باعث ہوتی ہے اور غلط

۱۔ روم ۲۲ ۲۔ منتہی الآمال ج ۲ ص ۳۵۸

بات کہتی ہے تو ناکامی کا سبب ہوتی ہے انسان کو گمراہ کرنے کے لئے یہی شیطان کا آلۂ کار بن سکتی ہے۔

معاشرہ کی بہبود اور تباہی میں زبان کا کردار

معاشرہ کو سنوارنے اور برباد کرنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نہایت ہی مؤثر طریقہ موزوں بات کہنا ہے ایک زبردست اور قادر الکلام خطیب معاشرہ کی اصلاح کر سکتا ہے اور اسے انسانی اقدار اور اخلاقی فضائل کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے برخلاف اسے راہ راست سے ہٹا کر غلط راستہ پر لگا سکتا ہے۔

ایک ماہر خطیب پچھڑے ہوئے اور ست معاشرہ کو ترقی کی راہ پر لگا سکتا ہے اور اسکی زندگی کی ڈگر کو بدل سکتا ہے اس کے برخلاف وہ معاشرہ کی امنگوں اور حوصلوں کو سرد کر سکتا ہے اور حق پسند معاشرہ کو باطل پرستی کی طرف موڑ سکتا ہے اور باطل پرست معاشرہ کو راہ حق پر لگا سکتا ہے۔ مثلاً:

جب اسلامی شہروں میں حضرت علیؑ کی شہادت کی خبر پہنچی تو شام والوں نے بھی یہ سنا کہ علیؑ نے محراب عبادت میں شہادت پائی ہے تو اہل شام کی اس کثیر تعداد نے جو حضرت علیؑ کے خلاف معاویہ کے زرخرید خطیبوں کی تقریر سنتی تھی یہ سوال کیا: کیا علی نماز پڑھتے تھے؟

سب سے بڑا عبادت گزار کہ جس نے نماز قائم کرنے کے لئے جنگ کی، جس کے پاؤں سے حالت نماز میں تیر کھینچ لیا گیا اور اسے مطلق خبر نہ ہوئی شام والوں کی نظر میں وہی غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے نماز مخالف قرار پاتا ہے اور اہل شام اس کے مسجد میں جانے پر تعجب کرتے ہیں، یہ ہے زبان کا اثر کہ وہ حق کو باطل کی صورت میں پیش کرتی ہے۔

بسر بن ارطاۃ اور بنی ہمدان

معاویہ نے بسر بن ارطاۃ کو بنی ہمدان کا حاکم بنا کر بھیجا تو اس نے ظلم نے کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، کسی میں بولنے کی جرأت نہیں تھی ہر بات دل میں گھٹ کر رہ جاتی تھی، اسی نازک اور خطرناک زمانہ میں سودہ نام کی ایک عورت دین اور لوگوں کا دفاع کرنے شام گئی، معاویہ کے کارندوں نے

معاویہ کو خبر دی کہ سودہ نام کی ایک عورت آپ سے ملنے کے لئے آئی ہے، معاویہ کو بہت تعجب ہوا اور کہنے لگا جس کو تلاش کر کے میں تھک گیا وہ خود اپنے پیروں سے میرے دربار میں آ گئی، حاضر ہونے کی اجازت دی، سودہ دربار میں داخل ہوئی اور تندو کرخت لہجہ میں معاویہ کو سلام کیا۔

معاویہ نے کہا: دیکھا! تم نے مجبور ہو کر میری خلافت کو سلام کیا! سودہ نے کہا: معاویہ گھمنڈ نہ کرو ہر ایک کا ایک دور ہوتا ہے جو ختم ہو جاتا ہے۔ یہ منصب کب تک رہے گا ایک روز ختم ہو جائے گا، معاویہ نے کہا: سودہ تمہیں جنگ کا زمانہ یاد ہے کہ جب تم علی کے لشکر میں رزمیہ شعر پڑھ رہی تھی؟ بتاؤ اس سے تمہارا کیا مقصد تھا؟ میری ہلاکت و نابودی ہی تھا؟ وہ اشعار اب پڑھو!

سودہ نے کہا: تمہارے ظلم و ستم نے میرے ذہن سے ہر چیز کو محو کر دیا ہے، اس وقت میں تمہارے پاس بسر بن ارطاۃ کی شکایت لائی ہوں، اس نے ہمارے اوپر ظلم کیا ہے لوگوں کے اموال کو زبردستی چھین لیا ہے، انہیں قتل کیا ہے، معاویہ نے کہا: یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟! میں تمہیں اسی کے پاس بھیجتا ہوں تا کہ جو وہ چاہے تمہارے حق میں فیصلہ کرے۔ سودہ نے یہ شعر پڑھا:

صلی الاله علی جسم تضمنه قبر فاصبح فیه العدل مدفوناً

درود ہو اس جسم پر کہ جو قبر میں ہے اس کے دفن ہو جانے سے عدل بھی دفن ہو گیا۔

معاویہ نے کہا: اس سے تمہاری مراد کون ہے؟ سودہ نے کہا: میرے آقا علیؑ، اے معاویہ! جس طرح آج میں تمہارے پاس شکایت لے کر آئی ہوں ایک دن علیؑ کے پاس ایک شکایت لے کر گئی تھی علیؑ نماز پڑھنے کے لئے جا رہے تھے، جب آپ نے مجھے دیکھا تو دریافت کیا۔ کس کام سے آئی ہو؟ میں نے عرض کیا: آپ کے مقرر کردہ حاکم کی شکایت لائی ہوں، اے معاویہ! یہ سن کر علیؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، دست مبارک سے اپنی داڑھی پکڑی اور کہا: اے خدا تو گواہ ہے کہ میں نے اسے لوگوں پر ظلم کرنے کے لئے نہیں بھیجا ہے اسی وقت اس کی معزولی کا پروانہ لکھکر میرے سپرد کیا۔ لیکن تم شکایت سننے کے بجائے مجھے دھمکی دیتے ہو، تمہارے اور علیؑ کے درمیان یہی فرق ہے۔ معاویہ نے مجبور ہو کر بسر بن ارطاۃ کو قتل و غارت گری سے باز آنے کے لئے لکھا۔ یقیناً زبان صحیح طریقہ سے چلتی ہے تو بہت تیز کاٹتی ہے۔ یہ زبان ہی تھی جس نے معاویہ جیسے سنگدل کو اپنا موقف بدلنے پر مجبور کر دیا۔ معاویہ نے اس وقت

یہ بھی کہا تھا کہ علیؑ نے تمہیں مغرور کر دیا ہے، تمہاری قوم کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا ہے:

فلو کنت بوابا علیٰ باب جنة　　لقلت لهمدان ادخلوها بسلام

بلیغ بات کا اثر

حضرت علی بن ابی طالب اور معاویہ کے درمیان جب خط و کتابت ہوئی تھی تو اس وقت ایک خط آپ نے طرماح کے ہاتھ بھیجا تھا، طرماح، قادر الکلام، برجستہ بولنے والا اور فصیح آدمی تھا خط لے کر وہ معاویہ کی طرف روانہ ہوئے شام پہنچتے ہی انہوں نے معاویہ اور اس کے وزیر عمرو عاص سے ملاقات کی اور اپنی فصاحت و بلاغت سے اسے بھی انگشت بدنداں کر دیا معاویہ نے سوچا کہ اس برجستہ بولنے والے کو خرید لوں اور پھر اس سے فائدہ اٹھاؤں لہذا معاویہ نے کہا: اے دیہاتی! اگر میں تمہیں کوئی چیز دوں تو قبول کرو گے؟ طرماح نے کہا: کیوں نہیں! اگر جان بھی دو گے تو اسے بھی لے لونگا مال کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، معاویہ نے حکم دیا کہ ان کو دس ہزار درہم دیئے جائیں، دے گئے، معاویہ نے کہا اگر کم ہیں تو اور دیدوں؟ طرماح نے کہا: اضافہ کرنے کا حکم دو! تم اپنی جیب سے تھوڑی ہی دے رہے ہو۔ معاویہ نے دس ہزار درہم مزید دینے کا حکم دیا۔ طرماح نے کہا: دس ہزار اور دو تا کہ تیس ہزار ہو جائیں۔ درہم آنے میں دیر ہوئی تو طرماح نے کہا: کیا مجھ سے مذاق کر رہے ہو؟ یا تمہاری بات کو اہمیت نہیں دی جاتی، معاویہ نے جلد لانے کا حکم دیا، درہم طرماح کے سپرد کیئے گئے، عمرو عاص نے کہا: امیر المومنین کی بخشش کو تم نے کیسا پایا؟ طرماح نے کہا یہ مسلمانوں کا مال ہے، خدا کے خزانہ سے اس کے بندے کو مل گیا، معاویہ سے کیا مطلب؟! طرماح کی گفتگو سے معاویہ کے ناک میں دم تھا، اس نے اپنے کاتب کو بلا کر کہا: علی کے خط کا جواب لکھدو طرماح نے کہا: معاویہ تم علیؑ کو جنگ سے ڈراتے ہو؟! یہ تو ایسا ہی ہے جیسے شہباز کو ہوا سے اور شیر کو جنگل سے ڈرایا جائے۔ خدا کی قسم علیؑ کے پاس ایک شہباز ایسا ہے کہ تمہارے سارے چوزوں کو چن کر کھا جائیگا۔ معاویہ نے کہا: ہاں۔ وہ مالک اشتر ہے۔ طرماح کے جانے کے بعد معاویہ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا: اگر میں تم سے کسی کو اپنی حکومت و ملکیت کا دسواں حصہ بھی دیدوں تو بھی وہ اتنی خدمت نہیں کر سکے گا جتنی یہ دیہاتی علیؑ کی خدمت کر کے چلا گیا، عمرو عاص نے معاویہ سے کہا: اے معاویہ! علیؑ کو

رسول سے جو نسبت ہے اگر وہی نسبت رسولؐ سے تمہیں ہوتی تو ہم اس سے زیادہ تمہاری خدمت کرتے معاویہ نے کہا: خدا تمہیں غارت کرے تمہاری یہ بات تو میرے لیے اس دیہاتی سے بھی زیادہ گراں ہے۔[1]

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ اپنی زبان کو نیکی و خوبی کے زیور سے آراستہ کر دو تا کہ وہ حق کی خدمت کر کے ایسی عظمت پیدا کر سکے اور معاویہ ایسے دشمن کو عاجز کر سکے۔

فلسفۂ سکوت

بعض روایات میں خاموش رہنے کی اتنی زیادہ تاکید کی گئی ہے کہ جس سے سکوت کو بولنے پر ترجیح دی جاسکتی ہے تو سکوت کا فلسفہ کیا ہے اور خاموشی کہاں اختیار کرنا چاہئے؟!

ہم بیان کر چکے ہیں کہ زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے انسان کے ضمیر کو روشن کرنے والی اور اسکی شخصیت کو نمایاں کرنے والی سمجھی جاتی ہے۔ اسی کے ذریعہ فائدہ ونقصان بھی ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ زبان کے بارے میں فرماتے ہیں: زبان ایک درندہ ہے اگر آزاد ہوگا تو زخمی کردے گا۔[2] دوسری جگہ فرماتے ہیں: تمہیں اس بات پر تعجب ہونا چاہئے کہ انسان چربی سے دیکھتا ہے، گوشت کے ٹکڑے سے بولتا ہے اور ہڈی سے سنتا ہے اور سوراخ سے سونگھتا ہے۔[3]

زبان جنت یا جہنم میں پہنچانے کا سبب

سہل بن ساعدی رسولؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص مجھ سے اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے میں اس سے بہشت کا وعدہ کرتا ہوں۔[4]

رسولؐ سے دریافت کیا گیا: کس چیز کے سبب زیادہ لوگ جنت میں جائیں گے؟ فرمایا: تقویٰ اور حسن خلق کے ذریعہ عرض کیا گیا کہ زیادہ تر لوگ کس چیز کے ذریعہ جہنم میں جائیں گے؟! فرمایا: فرج

---

[1] مجلہ مکتب اسلامی سال چہارم شمارہ ۱۲ ص ۴۶
[2] نہج البلاغہ فیض الاسلام، حکمت: ۵۷
[3] ایضاً: حکمت ۷
[4] محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۱۹۲

وزبان کے ذریعہ [۱]

معاذ بن جبل نے رسولؐ سے دریافت کیا: کیا ہمارے بولنے کا ہم سے حساب لیا جائے گا؟ اور اس پر عقاب ہوگا؟ فرمایا: تمہاری ماں، تمہارے غم میں بیٹھے کیا زبان کی چنی ہوئی چیز کے علاوہ لوگ جہنم میں جائیں گے؟! [۲]

رسولؐ کی ان تینوں حدیثوں میں انسان کی کامیابی کو بے جانہ بولنے اور زبان کو گناہوں سے باز رکھنے میں قرار دیا گیا ہے زبان کی حفاظت انسان کو جنت میں پہنچانے کا اہم سبب ہے۔

انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: بندے کا ایمان اس وقت استوار ہوتا ہے، جب اس کا دل استوار ہو جاتا ہے۔ اور دل استوار و صحیح نہیں ہوتا ہے مگر زبان کے استوار ہونے سے اور وہ شخص جنت میں نہیں جاسکتا جو اپنے ہمسایہ کو ستاتا ہے۔ [۳]

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایمان کا توازن و تعادل، دل کے تعادل سے اور دل کا تعادل زبان کے توازن سے مربوط ہے یعنی جس شخص کی زبان ہی میں تعادل نہ ہو اس کی کسی چیز میں تعادل نہیں ہوگا۔

خاموشی آسان ترین عبادت

صفوان بن سلیم نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمہیں آسان ترین اور بدن کے لئے ہلکی عبادت بتاؤں؟

ایک خاموشی اور دوسرے حُسن خلق۔ [۴]

براء بن عازب کہتے ہیں: ایک عرب رسول کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: مجھے ایسا عمل اور کام سکھا دیجئے کہ جس سے میں جنت میں چلا جاؤں۔ فرمایا: بھوکے کو کھانا کھلاؤ، پیاسے کو سیراب کرو، نیک باتوں کا حکم دو، بری باتوں سے روکو اور اگر ان چیزوں کو انجام نہ دے سکو تو اپنی زبان کو نیک بات کہنے کے علاوہ بند رکھو۔ [۵]

۱۔ ایضاً ص ۱۹۳ ۲۔ محجۃ البیضا ج ۵ ص ۱۹۳ ۳۔ ایضاً ۴۔ ایضاً ص ۱۹۴ ۵۔ ایضاً ص ۱۹۸

رسولؐ نے فرمایا: مومن کی زبان اس کے دل کے پیچھے ہے۔ بات کہنے سے پہلے وہ اسے دل میں سوچتا ہے اگر دل اس کے اظہار کی اجازت دیتا ہے تو مومن بولتا ہے اور اگر اجازت نہیں دیتا؛ تو وہ خاموش رہتا ہے، منافق مومن کے برخلاف ہے۔ [1]

منقول ہے کہ کچھ لوگ معاویہ کے محل میں محو گفتگو تھے احنف بن قیس ایک کنارے پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے، لوگوں نے ان سے کہا: اے ابو بحر تم کیوں خاموش بیٹھے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: اگر جھوٹ بولوں تو خدا کا ڈر ہے اور اگر سچ بولوں تو تمہارا ڈر ہے لہذا خاموش رہنا بہتر ہے۔ [2]

ان روایات سے خاموش رہنے کی فضیلت آشکار ہو گئی۔ خاموشی کے وقت انسان گناہ کے خطرناک عواقب و انجام سے محفوظ رہتا ہے۔

عقل مند انسان اپنی بات کو پہلے عقل و وجدان کی کسوٹی پر کستا ہے اگر اس پر پوری نہیں اترتی تو خاموش رہتا ہے۔ جو روایات خاموش رہنے کا شوق دلاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بے محل بات کے انجام سے محفوظ رہے۔ ورنہ بولنا انسان اور سماج کی ترقی کا باعث ہے۔

زبان کا المیہ

علم اخلاق کے ماہر کہتے ہیں: دنیا میں ہر چیز کے لئے ایک آفت ہے، زبان کے لئے بھی کچھ آفتیں ہیں، بعض نے تو زبان کے لئے بیس آفتیں لکھی ہیں ہم یہاں اختصار کے ساتھ انھیں سپرد قلم کرتے ہیں:

ا۔ بے فائدہ بات کہنا

اس چیز کے بارے میں بولنا بھی زبان کی آفت ہے کہ جس سے کوئی فائدہ نہ ہو بلکہ وقت ضائع ہوتا ہو اس سلسلہ میں رسولؐ کا ارشاد ہے: انسان کا بہترین اسلام یہ ہے کہ وہ فضول بات کہنے سے پرہیز کرتا ہے۔ [3]

---

[1] ایضاً ص ۲۰۰ [2] محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۱۹۸ [3] ایضاً ص ۲۰۰

۲۔ضرورت سے زیادہ بولنا

رسولؐ نے فرمایا: خوش نصیب ہے وہ شخص جو زیادہ بولنے سے پرہیز کرتا ہے اور زیادہ مال ناداروں کو دیدیتا ہے۔ [۱]

۳۔باطل میں ڈوب جانا

رسولؐ فرماتے ہیں: جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لئے کوئی بات کہتا ہے وہ اپنی منزل و مرتبہ سے ایسے ہی گر پڑتا ہے جس طرح کوئی ثریا سے گر پڑے بلکہ اس سے بھی اوپر سے۔ [۲]

نیز فرماتے ہیں: قیامت کے روز سب سے بڑے خطا کار وہ لوگ ہونگے جو باطل میں گھل مل گئے تھے اس کے بعد قرآن مجید کے اس قول کی طرف اشارہ فرمایا: جب ان سے جہنم میں جانے کا سبب معلوم کیا جائے گا تو وہ کہیں گے ہم لہو ولعب اور باطل کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ [۳] سلمان سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: قیامت کے روز ان گناہگاروں کی تعداد زیادہ ہوگی جنہوں نے خدا کی معصیت میں زیادہ باتیں کہی ہونگی۔ [۴]

۴۔بحث و نزاع

جھگڑنا بھی زبان کی آفتوں میں سے ایک ہے جھگڑنے اور بحث کرنے سے شارع نے منع فرمایا ہے اور جھگڑنے والوں کی مذمت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے:

اپنے بھائی سے بحث اور بیجا مذاق اور وعدہ خلافی نہ کرو، دوسری جگہ فرماتے ہیں: جو خود کو حق پر سمجھتے ہوئے بحث اور جھگڑا کرنا چھوڑ دیتا ہے اس کے لئے بہشت کے بلند ترین طبقہ میں گھر بنایا جاتا ہے اور جو شخص جھگڑا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ باطل ہے اس کے لئے جنت کے نچلے طبقہ میں گھر بنایا جاتا ہے۔

---

[۱] محجۃ البیضاء ج۵ ص ۲۰۴ [۲] ایضاً ص ۲۰۷ [۳] ایضاً [۴] ایضاً

۵۔ خصومت

خصومت بھی زبان کی آفتوں میں سے ایک ہے شارع نے اس سے روکا ہے۔ کسی کی بات میں اس کو شرمندہ کرنے کی غرض سے عیب نکالنے کو مراء کہتے ہیں اور خصومت، مال یا حق کو حاصل کرنے کے لئے لجاجت کرنے کو کہتے ہیں۔ ابو ہریرہ رسولؐ سے نقل کرتے ہیں:

جو شخص علم کے بغیر کسی سے خصومت کرتا ہے وہ مرتے دم تک خدا کے غضب کے نشانہ رہتا ہے۔[1]

دوسری جگہ ارشاد ہے: بہشت میں ایسے محل بنے ہوئے ہیں کہ جن کے اندر سے باہر کا اور باہر سے اندر کا نظر آتا ہے، خدا نے یہ محل ان لوگوں کے لئے بنائے ہیں جو بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور اچھی اچھی باتیں کہتے ہیں، بری بات اور لجاجت سے پرہیز کرتے ہیں۔[2]

اس حدیث کے ذریعہ رسولؐ ہر مسلمان کو یہ حکم دیتے ہیں کہ بات کہنے میں ادب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے اور رکیک و بیہودہ بات کہہ کر دوسروں کے سینوں میں دشمنی کی آگ نہ بھڑکائے بلکہ نپی تلی بات کے ذریعہ دوسروں کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کرے۔

۶۔ حد سے تجاوز کرنا

کلام کی حد سے تجاوز کرنے کے معنی یہ ہیں کہ بات کہنے میں اتنی تصنع کرے کہ متانت سے خارج ہو جائے۔ جناب فاطمہ زہراؑ اپنے پدر بزرگوار سے نقل فرماتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں، جو خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بہترین کھانا کھاتے ہیں، بیش قیمت لباس پہنتے ہیں اور تصنع و تکلف کے ساتھ بات کہتے ہیں۔[3]

رسول کی اس حدیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کو اپنی گفتگو میں ایسے سخت اور نامانوس الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہیے جن کو عام لوگ نہ سمجھ سکیں ہاں بلند مطالب کو سلیس و دلنشیں عبارت میں پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ دین کی نظر میں ممدوح ہے۔

۱۔ محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۰۷ ۲۔ ایضاً ص ۲۱۳ ۳۔ ایضاً ص ۲۱۴

۷۔ گالی دینا

گالی اور فحش شریعت اسلامیہ کے نقطۂ نظر سے مذموم ہے، اسے زبان کی آفات میں شمار کیا گیا ہے رسولؐ فرماتے ہیں: خبردار گالی نہ دینا کیونکہ خدا فحش کلامی اور گالی دینے کو پسند نہیں کرتا ہے۔ [۱]

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: جو گالی دینے کے مرض میں مبتلا ہے اس پر جنت حرام ہے وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ [۲]

ایک روایت میں عائشہ سے فرماتے ہیں: اے عائشہ اگر گالی انسان ہوتی یا مرد کی صورت میں آ گئی ہوتی تو وہ مرد بدترین ہوتا۔ [۳]

گالی بکنا بدترین عادت اور بد خلقی ہے اور جس شخص میں یہ نقص ہے اسے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے علما نے فحش کی تعریف اس طرح کی ہے: نازیبا اور بھونڈی بات کو واضح طور کہنا فحش ہے اور جو شخص گالی دیتا ہے یا مدمقابل کو رنجیدہ کرنا چاہتا ہے۔ کہ دوسروں کو آزار پہنچانا قطعاً حرام ہے۔ تو اس کا سبب یا بدکاروں اور پست فطرت لوگوں کی ہمنشینی ورفاقت ہے کہ جس سے شریعت نے اسی لئے منع کیا ہے کہ ان کی صحبت سے فحش کلامی اور گالی گلوچ کی عادت پڑتی ہے۔

ایک شخص حضرت رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: مجھے نصیحتیں فرمایئے! آپ نے فرمایا: تمہارے لئے ضروری ہے کہ خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور اگر کوئی شخص تمہیں اس چیز کے بارے میں سرزنش کرے جو تمہارے اندر ہو تو تم اسے اس چیز کا طعنہ نہ دو جس کا تمہیں علم ہے کہ اس کے اندر ہے نتیجہ میں اس کا گناہ اور وبال اس کے ذمہ ہوگا۔ اور تمہیں اجر وثواب ملے گا، اور خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے کسی پر سب وشتم نہ کرو، وہ شخص کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے کسی پر سب وشتم نہیں کیا۔ [۴]

رسولؐ کی اس وصیت میں جو نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ انسان دوسروں کی جن برائیوں کو جانتا ہے انہیں ان کے خلاف حربہ کے طور پر استعمال نہ کرے۔

عیاض بن حمار کہتے ہیں: میں نے رسولؐ کی خدمت میں عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے قوم وقبیلہ کا ایک شخص مجھے برا کہتا ہے حالانکہ وہ شخصیت کے لحاظ سے مجھ سے پست ہے۔ کیا میں اپنا دفاع

---

[۱] محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۱۵ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۲۱۶ [۴] ایضاً ص ۲۱۷

کرتے ہوئے اس پر سب وشتم کرسکتا ہوں؟ رسولؐ نے فرمایا: ایک دوسرے پر لعنت ملامت کرنے والے دو آدمی دو شیطان ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ [۱]

۸۔ لعن

زبان کی آفتوں میں سے ایک لعن ہے۔ جو شخص دوسرے پر لعنت کرتا ہے اور اس کو خدا اور اسکی رحمت سے دور کرتا ہے ایسے لوگوں کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہوا ہے، جن لوگوں پر خدا نے لعنت کی ہے اور ان کو اپنی رحمت سے مایوس کیا ہے ان میں سے شیطان بھی ہے خداوند عالم کا ارشاد ہے:

بیشک تا قیامت تیرے اوپر میری لعنت رہے گی اور تو ہمیشہ میری رحمت سے محروم رہے گا۔ [۲]

حقائق کو چھپانے والوں پر بھی لعنت کی گئی ہے:

بیشک جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو، کہ جن کو ہم نے کتاب (قرآن) میں لوگوں کے لئے بیان کر دیا ہے، چھپاتے ہیں خدا ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔ [۳]

مباہلہ کے واقعہ میں جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دی گئی ہے:

جب عیسیٰ کے بارے میں آپ کے پاس علم آچکا ہے تو جو آپ سے حجت اور جھگڑا کرے تو ان سے کہہ دیجئے کہ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں تم اپنے بیٹوں کو لاؤ، ہم اپنی عورتوں کو لائیں تم اپنی عورتوں کو لاؤ، ہم اپنے نفسوں کو لائیں تم اپنے نفسوں کو لاؤ پھر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں۔ [۴]

مباہلہ کے معنی لغت میں "رہا کرنے اور قید و بند سے آزاد کرنے کے ہیں اور اسی وجہ سے اس حیوان کو بھی باہل کہا جاتا ہے جس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کے تھنوں پر تھیلا نما کپڑا اس لئے نہیں باندھا جاتا کہ بچہ آزادی سے دودھ پی سکے۔

دعا میں ابتہال کے معنی تضرع کرنا اور کسی کام کو خدا کے سپرد کرنے کے ہیں اور اگر کہیں ہلاکت ولعن اور خدا سے دوری کے معنی میں استعمال ہوا ہے تو اس لئے کہ بندہ کو اس کے حال پر چھوڑنے کا یہی نتیجہ

---

[۱] ایضاً [۲] ایضاً ص ۸۷ [۳] بقرہ: ۱۵۹ [۴] آل عمران: ۶۱

ہوتا ہے۔اور مذکورہ آیت میں مفہوم کے لحاظ سے دو آدمیوں کے ایک دوسرے پر نفرین کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسطرح اگر چند افراد کسی مذہبی مسئلہ کے بارے میں گفتگو کریں اور اختلاف کے وقت خدا سے یہ دعا کریں کہ کو جھوٹوں کو ذلیل فرما، مباہلہ کہتے ہیں، آیۂ مباہلہ اہل بیت کی حقانیت اور ان کی عصمت وطہارت پر دلالت کرتی ہے۔

جو کفار اور یہودی کسی پیغمبر کے ظہور کرنے اور اس کی آمد کے منتظر تھے تو جب آنحضرت ان کے پاس آئے تو انہوں نے پہچاننے کے باوجود ان کا انکار کر دیا بس کافروں پر خدا کی لعنت ہے۔ [1]

بعض موقعوں پر رسولؐ اور علیؑ بن ابی طالب نے بھی بعض افراد پر لعنت کی ہے ان میں سے دو نمونے یہاں قلم بند کئے جاتے ہیں:

رسول نے ابوسفیان پر سات مرتبہ لعنت کی ہے۔ [2]

حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپ نے کہا: رسولؐ نے فرمایا: سات گروہ ایسے ہیں کہ جن پر خدا ورسولؐ نے لعنت کی ہے:

۱۔جنہوں نے خدا کی کتاب میں تحریف کی ہے ۲۔جنہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا ہے، ۳۔جنہوں نے پیغمبر کی سنت کو دوسری چیز سے بدل دیا ہے۔ ۴۔جو لوگ میری عترت کے بارے میں اس چیز کو حلال سمجھیں جس کو خدا نے حرام کیا ہے، ۵۔جو اپنی سلطنت و بادشاہت میں انھیں ذلیل کرے۔ ۶۔جو خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرے اور خدا کی عبادت پر تکبر کرے۔ [3]

مومن لعن نہیں کرتا

رسولؐ فرماتے ہیں: مومن دوسروں پر لعنت کرنے میں اپنا وقت صرف نہیں کرتا۔ [4] اسلام کے نقطۂ نظر سے حیوانات پر بھی لعنت کرنا منع ہے۔ لعنت کے بارے میں جو آیات وروایات وارد ہوئی ہیں ان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کے لیے، حیوانات نباتات اور جمادات سب پر لعنت کرنا حرام ہے لیکن کفار، منافقین اور علیؑ بن ابی طالب اور ان کی اولاد کا حق غصب کرنے والوں پر لعنت کرنے

[1] بقرہ: ۸۹ [2] سفینۃ البحار ج ۲ ص ۵۱۳ [3] ایضا ص ۵۱۲ [4] محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۱۹

کوسنگتی اوران پر نفرین کرنے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

۹۔ غنا اور شعر خوانی

زبان کی آفتوں میں سے ایک غنا اور شعر خوانی بھی ہے، شحام کی صحیحہ، ابن ابی عمیر کی مرسلہ اور ابو بصیر کی موثقہ میں، جو کافی میں نقل ہوئی ہیں، اور عبد الاعلیٰ کی روایت میں جو کہ معانی الاخبار میں نقل ہوئی ہے اور ہشام کی حسنہ میں، جو کہ تفسیر قمی سے منقول ہے ان تمام روایات میں قرآن کی آیت: واجتنبوا قول الزور [1] اور "والذین لا یشھدون الزور" [2] وارد لفظ زور سے مراد غنا ہے، اور اس آیت "ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل الله [3] لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اسلئے موسیقی کے آلات خریدتا ہے تا کہ لوگوں کو راہ خدا سے منحرف و گمراہ کرے۔ لیکن اشعار سے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک میں اشعار کی مدح اور دوسری میں ان کی مذمت ہے یقیناً شعر خوانی اور غنا سے مراد ان کے معنی ہیں کہ جن کو زبان کی آفتوں میں شمار کیا گیا ہے ورنہ آواز اور گنگنانے کا تعلق صرف زبان سے نہیں ہے۔

۱۰۔ بے جا مذاق و مزاح

حد سے زیادہ مذاق و مزاح کو شریعت میں مذموم سمجھا گیا ہے۔ ایک حدیث میں رسولؐ کا ارشاد ہے: اپنے بھائی سے مذاق نہ کرو اور نہ اس سے حد سے زیادہ مزاح کرو۔ [4]

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: میں بھی مزاح کرتا ہوں لیکن حد زیادہ نہیں اور حق بات کہتا ہوں۔ [5]

رسول کا مزاح

رسولؐ نہایت ہی دلچسپ مزاح فرماتے تھے۔ ایک روز ایک بوڑھی عورت آپ کی خدمت

---

[1] حج: ۳۰ [2] فرقان: ۷۲ [3] لقمان: ۶ [4] محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۳۱ [5] ایضاً ص ۲۳۲

میں شرفیاب ہوئی، رسولؐ نے فرمایا؛ بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی، (یہ سن کر) بوڑھی عورت رونے لگی، آپ نے فرمایا: اس روز تم بوڑھی نہیں رہو گی بلکہ جوان ہو جاؤ گی۔ خداوند عالم قران مجید میں فرماتا ہے: ہم انہیں باکرہ اور ایسی بنا دیں گے کہ جیسے انہیں کسی نے چھوا بھی نہ ہو۔ [۱]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: مذاق خندہ آور ہوتا ہے اس کے نتیجہ میں عقل زائل ہو جاتی ہے اور اس سے انسان کا وقار جاتا رہتا ہے۔ [۲]

۱۱۔ مذاق وٹھٹھول

علمائے علم اخلاق نے دوسروں سے مذاق وٹھٹھول کرنے کو بھی زبان کی آفتوں میں شمار کیا ہے۔ خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

اے ایمان لانے والو تم میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ سے مذاق نہ کرے ہو سکتا ہے کہ جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے وہ ان سے بہتر ہوں جو مذاق اڑا رہے ہیں، اور نہ عورتوں کو دوسری عورتوں کا مذاق اڑانا چاہئے ممکن ہے وہ عورتیں کہ جن کا مذاق اڑایا جارہا ہے ان عورتوں سے بہتر ہوں جو مذاق اڑا رہی ہیں اور ایک دوسرے پر لعن طعن نہ کیا کرو اور ایک دوسرے کے عیب کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارا کرو یہ بہت بری بات ہے کہ ایمان کے بعد کفر کا نام رکھیں اور جو اس پر توبہ نہ کرے وہی ظالم ہیں۔ [۳]

آیت میں پہلی چیز جو بیان ہوئی ہے وہ مسلمان کی شخصیت کا احترام ہے۔ مسلمانوں کو فردی اور اجتماعی روابط میں ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ ہاں مادہ پرست اور خداشناس لوگوں کا طرز فکر کلی طور پر مختلف ہے، مادہ پرست شخصیت اور اس کے احترام کو خوبصورت چہرہ اور متناسب الاعضاء بدن میں منحصر سمجھتا ہے لیکن ایک مسلمان کا محور فکر، انسانی کمالات اور اخلاقی پہلو ہوتے ہیں۔

آیت کا یہ جملہ ''عسیٰ ان یکونوا خیر آمنھم'' اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مذاق کا مخالف ہے چونکہ انسان ایک دوسرے کے باطن اور جذبات سے بے خبر ہے لہذا اسکی نظر میں وہ حقیقی

---

۱ واقعہ: ۳۴۔۳۵   ۲ نہج البلاغۃ فیض الاسلام حکمت ۴۴۲   ۳ حجرات: ۱۱

انسان کے چہرہ اور بدن کے لحاظ سے انسان ہے کیونکہ دونوں یکساں نظر آرہے ہیں ہیں اور ممکن ہے بدشکل انسان کا مذاق اڑایا جائے حالانکہ اگر اس کے انسانی ملکات و کمالات آشکار ہو جاتے تو کبھی اس کا مذاق نہ اڑایا جاتا شخصیت کا معیار کچھ پنہاں اور غیر مرئی امور ہیں لہذا ظاہری اسباب کی بنا پر تمسخر کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔

تمسخر کرنے کا نفسیاتی محرک

نفسیاتی نقطۂ نظر سے وہی لوگ تمسخر و مذاق کرتے ہیں کہ جو شخصیت کے اعتبار سے ناقص ہوتے ہیں وہ دوسروں کی توہین و تحقیر کر کے اپنے نقص کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ جن لوگوں کی شخصیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی وہ کسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔

دوسروں کی اہانت کرنے اور ان کے شرمندہ ہونے سے لذت اندوز ہونے والے افراد کی طبیعت میں ایک قسم کی درندگی ہوتی ہے، بس دونوں میں یہ فرق ہے کہ درندے انسان کے جسم پر حملہ کرتے ہیں اور یہ لوگوں کی عزت آبرو کو نشانہ بناتے ہیں۔

مسخروں کے بارے میں امام سجاد کا نظریہ

ایک دن ایک مسخرہ امام زین العابدین کے دوش سے ردا اچک لے گیا۔ امام نے اپنی زبان سے کچھ نہ فرمایا لیکن لوگوں نے اس کا تعاقب کیا اور اس سے ردا چھین لائیے۔ امام نے معلوم کیا: یہ حرکت کس نے کی تھی؟ عرض کیا: ایک مسخرہ تھا جو لوگوں کو ہنسانے کے لئے ایسا کرتا ہے۔ امام نے فرمایا: اس سے کہہ دینا: ان للّٰہ یوما یخسر فیہ المبطلون ''خدا کا ایک دن ہے اس دن وہ لوگ گھاٹا اٹھائیں گے جو دوسروں کا مذاق اڑانے میں عمر گنواتے ہیں۔[1]

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب ج ۴ ص ۱۵۸

ناقص الاعضاء لوگوں سے مذاق کرنا منع ہے

بعض لوگ کسی وجہ سے ناقص الاعضاء ہوتے ہیں اور ظاہری صحت وسلامتی سے محروم ہو جاتے ہیں ایسے افراد سے اگر کوئی مذاق کرتا ہے تو انہیں بہت دکھ ہوتا ہے، ایک تو اسلئے کہ دوسرے انسان ان کی توہین کر رہے ہیں دوسرے اس لئے کہ ان کے اندر ایک نقص پیدا ہو گیا ہے، حضرت علی بارگاہ خدا میں دعا فرماتے ہیں:

اللهم اجعل نفسي اول كريمة تنتزعها من كرائمي و اول وديعة ترجعها من ودائع نعمك عندي [1]

اے اللہ! جو عظیم نعمتیں تو نے مجھے عطا کی ہیں ان میں سے اولین نعمت جو تو مجھ سے سلب کرے وہ میرا نفس وجان ہو اور جو امانتیں تو نے میرے سپرد کی ہیں ان میں سے اولین امانت جو تو مجھ سے واپس لے وہ میری حیات وزندگی ہو۔

حضرت امام حسین دعائے عرفہ میں بارگاہ خدا میں عرض پرداز ہیں:

ومتعني بجوارحي وَاجْعل سمعي وبصري الوارثين وانصر ني على من ظلمني [2]

پروردگار مجھے میرے تمام اعضاء سے بہرہ مند فرما میرے کان اور آنکھ کو میرا وارث قرار دے یعنی مجھے آخر عمر تک اندھا اور ناقص الاعضاء ہونے سے محفوظ رکھ۔

جاحظ اور مسخرے پن کا نتیجہ

جاحظ تیسری صدی ہجری کا ایک بڑا عالم تھا اس کی بہت سی کتابیں اور علمی آثار آج بھی موجود ہیں وہ بہت ہی کریہہ المنظر اور بدشکل تھا حضرت علیؑ سے دشمنی کا اظہار کرتا تھا اور آپ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا تھا اسی لئے بنی عباس کے خلفاء اس کی حمایت کرتے تھے ایک روز اس نے اپنے شاگردوں سے کہا: پوری زندگی میں مجھے سب سے زیادہ ایک عورت نے شرمندہ کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ

[1] نہج البلاغہ فیض خطبہ ۲۰۶ [2] دعائے عرفہ امام حسینؑ

ایک دن میں نے ایک عورت کو دیکھا، اس نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں، میں نے منظور کر لیا وہ مجھے مجسمہ ساز کے پاس لے گئی اور اس سے کہا: اس شیطان کی مانند، یہ کہا اور چلی گئی میں حیرت زدہ رہ گیا، میں نے دوکاندار سے معلوم کیا معاملہ کیا ہے؟ اس نے بتایا: اس عورت نے مجھ سے شیطان کا مجسمہ بنانے کی فرمائش کی تھی، میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ میں نے شیطان کو نہیں دیکھا ہے، اس کا مجسمہ کیسے بناؤں؟ آج وہ تمہیں یہاں لائی اور بزعم خود اس نے تمہیں شیطان سمجھا ہے۔ [1]

۱۲۔ راز فاش کرنا

زبان کی ایک آفت دوسروں کے راز کو فاش کرنا بھی ہے، شریعت نے راز فاش کرنے کی مذمت کی ہے۔ رسولؐ فرماتے ہیں:

جب کوئی شخص کوئی بات کہتا ہے اور پھر رخ موڑ لیتا ہے تو وہ سننے والے کے پاس امانت ہوتی ہے۔ [2]

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: ایک دوسرے کی بات تمہارے پاس امانت ہے، حسنؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

خیانت یہ بھی ہے کہ تم اپنے بھائی کا راز فاش کرو۔ [3]

۱۳۔ جھوٹا وعدہ

زبان کی آفتوں میں سے وعدہ کر کے اسے وفا نہ کرنا بھی ہے۔ وعدہ وفا کرنا اللہ والوں کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ قرآن فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو! اپنے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرو۔ [4]

رسولؐ نے فرمایا: وعدہ، انسان کے دین کا جز ہے، خداوند عالم نے حضرت اسمٰعیل کے صادق الوعد، ہونے کی تعریف کی ہے چونکہ انہوں نے اپنا وعدہ وفا کیا تھا لہذا انہیں قرآن مجید میں اس نام سے

---

[1] تتمۃ المنتہی ص ۲۵۶ [2] محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۳۷ [3] ایضا [4] ایضا

موسوم کیا گیا ہے۔ ۱

۱۴۔ قول وقسم میں جھوٹ

جھوٹ بڑے گناہوں میں سے ایک ہے اور اس سے انسان کی عزت وآبرو کافور ہو جاتی ہے، قرآن مجید اور حدیث میں جھوٹی بات کہنے اور جھوٹی قسم کھانے کی مذمت کی گئی ہے اس سلسلہ میں بہت سی آیات وروایات موجود ہیں ہم ان میں سے بعض کو یہاں تحریر کرتے ہیں:

ابوسعید کہتے ہیں: میں نے رسولؐ سے سنا کہ خدا سے دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اے پروردگار! میرے دل کو نفاق سے اور میرے دامن کو زنا کی آلودگی سے اور میری زبان کو جھوٹ بولنے سے پاک وصاف رکھ۔ ۲

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: جھوٹ ایمان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ ۳

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: کوئی بھی بندہ ایمان کا مزہ نہیں چکھ سکتا یہاں تک کہ وہ جھوٹ سے پرہیز کرے خواہ جھوٹ سنجیدگی کے ساتھ ہو یا مذاق میں۔ ۴

ایک شخص نے رسولؐ کی خدمت میں عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! کیا مومن زنا کرتا ہے؟ فرمایا: کبھی، عرض کی مومن چوری کرتا ہے؟ فرمایا: کبھی کر لیتا ہے، عرض کی: کیا مومن جھوٹ بولتا ہے؟ فرمایا: ہرگز، خداوند عالم فرماتا ہے: جھوٹ کا بہتان تو وہی لوگ باندھتے ہیں جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ ۵

حضرت امام حسن عسکریؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: تمام گناہوں کو ایک گھر میں ذخیرہ کر دیا گیا ہے اور اس گھر کی کنجی جھوٹ ہے۔ ۶ یعنی اگر کسی نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا تو وہ تمام گناہوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

---

۱ مریم: ۵۴ ۲ محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۴۱ ۳ اصول کافی ج ۲ ص ۳۳۹
۴ ایضاً ص ۳۴۰ ۵ سفینۃ البحار ج ۲ ص ۴۷۳ ۶ مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۱۰۰

جھوٹ کا سرچشمہ

رسولؐ نے فرمایا: جھوٹ بولنے والا اس نقص وکمی کے باعث جھوٹ بولتا ہے جس کو وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔[۱] بنابرایں جھوٹ کا سرچشمہ نفس کی پستی وکمی ہے۔

جھوٹ کا مدمقابل صداقت وسچ ہے جس کا تعلق نفس پر اعتماد سے ہے۔ ایک روز حجاج نے ایک طولانی تقریر کی مجمع کے درمیان سے ایک شخص نے باآواز بلند کہا: نماز کا وقت ہوگیا؛ تقریر کا دامن سمیٹئے نہ وقت تمہارے لئے ٹھہرے گا اور نہ خدا تمہارے عذر کو قبول کرے گا، اس بات پر حجاج کو بہت غصہ آیا اور اس کو قید خانہ میں ڈالنے کا حکم دیدیا اس کے عزیز واقارب حجاج کے پاس گئے اور درخواست کی کہ وہ پاگل ہے۔ حجاج نے کہا: اگر وہ اپنے پاگل ہونے کا خود اعتراف کرلے تو ٹھیک ہے وہ لوگ قید خانہ میں اس شخص کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ تم اپنے پاگل ہونے کا اعتراف کرلو اس طرح تم رہا ہو جاؤ گے، اس نے کہا: خدا نے مجھے صحیح سالم اور عاقل پیدا کیا ہے، میں دیوانہ نہیں ہوں، اپنے پاگل ہونے کا جھوٹا اعتراف کیوں کروں؟ انہوں نے حجاج کو خبر دی کہ وہ یہ کہتا ہے۔ چنانچہ حجاج نے اس کے سچ کے احترام میں اس کو آزاد کر دیا۔[۲]

۱۵۔ غیبت

زبان کی پندرہویں آفت غیبت ہے، غیبت کی بحث شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی تعریف بیان کردی جائے: شہید ثانی نے کتاب الریبہ "میں غیبت کی یہ تعریف کی ہے" کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی طرف ایسی بات کی نسبت دینا جس کو وہ پسند نہ کرتا ہو اور عرف میں اس بات کو عیب سمجھا جاتا ہو اور کہنے والے کا مقصد بھی اس میں عیب ونقص ثابت کرنا ہو۔[۳]

لوگوں نے جناب ابوذر سے غیبت کے معنی معلوم کئے تو انہوں نے جواب دیا اپنے مسلمان بھائی کی عدم موجودگی میں ایسی بات کہنا کہ اگر وہ سنے تو اسے تکلیف ہو۔[۴]

شریعت اسلام میں غیبت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ شیخ انصاریؒ نے مکاسب میں کچھ دلیلوں کی

---

[۱] ایضا [۲] گفتار فلسفی ج۲ ص۴۵ منقول از ثمرات الاوراق ص۲۳۳ [۳] مکاسب ص۴۱ [۴] ایضا

بناپراسے حرام قرار دیا ہے اور اس کے حرام ہونے میں درج ذیل آیتوں سے تمسک کیا ہے:

اور تم میں سے بعض، بعض کی غیبت نہ کریں کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے یقیناً یہ بات تمہیں پسند نہیں ہے۔ [۱]

غیبت اس لئے بھی منفور عمل ہے کہ غیبت کرنے اور سننے والے دونوں ہی ایک مجبور و بے دفاع انسان پر حملہ کرتے ہیں۔ ایک تو ایسے مردہ کا گوشت کھاتا ہے کہ جس میں کوئی حس و حرکت نہیں ہے اور دوسرا اس شخص کو اپنے حملہ کا نشانہ بناتا ہے جو وہاں موجود نہیں ہے کہ اپنا دفاع کرے۔ اس تشبیہ و مثال میں قرآن نے چار چیزیں بیان کی ہیں:

۱۔ مسلمان اور ہم مذہب، سگے بھائی کی مانند ہیں۔ ۲۔ اس کی عزت و آبرو اسکے گوشت کی مانند ہے۔ ۳۔ اس کی غیبت کرنا اور اس کی عزت پر حملہ آور ہونا اس کا گوشت کھانے کے مثل ہے۔ ۴۔ اور چونکہ وہ اس جگہ موجود نہیں ہے اور اس حملہ سے باخبر نہیں ہے لہذا اپنا دفاع نہیں کرسکتا گویا کہ وہ اس مردہ کی مانند ہے کہ جس کو چیر اپھاڑا جارہا ہو اور وہ اف بھی نہ کر رہا ہو شاید حضرت علیؑ نے اسی وجہ سے غیبت کرنے والے کو عاجز قرار دیا ہے: غیبت عاجز و کمزور کا حربہ ہے۔ [۲]

دوسری آیت کہ جس سے غیبت کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے یہ ہے:

جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں کے درمیان کسی برائی کو پھیلائیں ان کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے درحقیقت خداوند عالم جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ [۳]

چونکہ انسان اجتماعی زندگی گذارنے کا خوگر ہے لہذا وہ جس معاشرہ میں زندگی بسر کرتا ہے وہ معاشرہ اس کے گھر کی مانند ہے اسے چاہئے کہ اس معاشرہ کی حفاظت اسی طرح کرے جس طرح وہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے اور اس میں گندگی و فساد پیدا نہ ہونے دے۔ اسی بناپر اسلام نے ہر اس چیز سے شدید طور سے جنگ کی ہے کہ جو معاشرہ کی فضا کو آلودہ اور گندہ کرتی ہے، اسلام نے غیبت کی بھی شدید طور پر مذمت کی ہے کہ اس میں پوشیدہ عیوب ظاہر ہوتے ہیں اور اسلام کو یہ بات پسند نہیں ہے، مسلمان بھائی کے عیوب کو چھپانے کا حکم اسی طرح بامفہوم ہوسکتا ہے۔ تیسری آیت کہ جس سے شیخ انصاری نے

---

۱ حجرات: ۱۲ ۲ شرح غرر الحکم و درر الکلم ج ۱ ص ۲۶۸ ۳ نور: ۱۹

غیبت کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے یہ ہے:

خدا ان لوگوں کو دوست نہیں رکھتا ہے جو اپنی باتوں کے ذریعہ برائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ [۱]

اس بات پر توجہ رکھنا چاہئے کہ ''سوء'' سے مراد ہر قسم کی برائی اور بدی ہے اور قول میں جہر سے مراد ہر قسم کا لفظی اظہار ہے۔ یہ اظہار خواہ شکایت کی صورت میں ہو یا حکایت و بیان کی شکل میں یا لعنت و تذلیل کے پیرایہ میں یا غیبت کے انداز میں اسی لئے مذکورہ آیت سے غیبت کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے۔

چوتھی آیت، کہ جس سے استدلال کیا گیا ہے، یہ ہے:

وائے ہو ہر عیب جو اور مسخرہ کرنے والے پر۔ [۲]

بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ رسولؐ کی عدم موجودگی میں آپ کی غیبت کیا کرتا تھا او آپ کو دیکھکر مذاق اڑاتا تھا۔

ھمزہ اور لمزہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اگر چہ مبالغہ کے مشہور اوزان پر نہیں ہیں، پہلے کا مادہ ھمز ہے جس کے معنیٰ توڑنا ہے اور چونکہ عیب جو اور غیبت کرنے والے دوسروں کی شخصیت کو پاش پاش کرتے ہیں اسلئے ان پر بھی ھمزہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ لمزہ ''لمز'' سے مشتق ہے اور رمز کے وزن پر ہے جس کے معنیٰ عیب جوئی اور غیبت کرنا ہیں۔

حدیث کی رو سے غیبت کا حرام ہونا

غیبت کے حرام ہونے کے سلسلہ میں عامہ و خاصہ کے طریق سے بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں اور ان میں اس گناہ کے برے اور غلط آثار مختلف مثالوں میں بیان ہوئے ہیں، ان میں سے چند نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

رسولؐ فرماتے ہیں: ہر مسلمان کا خون و مال اور اس کی (ہتک) عزت دوسرے مسلمان پر حرام

---

[۱] نساء : ۱۴۸ [۲] ھمزہ : ۱

ہے! اور فیض کاشانی نے کتاب "محجۃ البیضاء" میں غیبت کو عزت و شرف کا مصداق قرار دیا ہے۔ جابر اور ابو سعید دونوں نے رسولؐ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: خبردار غیبت نہ کرنا کیونکہ غیبت زنا سے زیادہ سخت ہے کیونکہ کبھی آدمی زنا کا مرتکب ہوتا ہے اور پشیمان ہو کر خدا سے توبہ کرتا ہے اور خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، لیکن غیبت کرنے والا اس وقت تک نہیں بخشا جائیگا جب تک کہ وہ خود معاف نہ کردے کہ جس کی غیبت کی تھی۔ ۲

شب معراج

انس کہتے ہیں: رسولؐ نے فرمایا: شب معراج میرا گزر ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو ناخنوں سے اپنا چہرہ نوچ رہے تھے، میں نے جبریل سے معلوم کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ لوگوں کی غیبت کر کے ان کی عزت و آبرو کو برباد کیا کرتے تھے۔ ۳

غیبت اور اس کا رد عمل

اس دنیا کے ثابت و مستقل قوانین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان جو کام بھی انجام دیتا ہے اس کا رد عمل ضرور ہوتا ہے اس سلسلہ میں درج ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

پہاڑ کے سامنے کھڑے ہو کر آواز لگانا صدا کی بازگشت کا سبب ہوتا ہے۔ توپ کا گولہ جتنی تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف جاتا ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ نیچے آتا ہے۔ کھٹائی کا نام سن کر منھ میں پانی آجاتا ہے، یہی عمل اور رد عمل ہے؛ مثنوی کہتے ہیں:

این جهان کوه است و فعل ماندا سوی ما آید صداها راندا

براء کہتے ہیں: رسولؐ نے ہمارے درمیان خطبہ دیا یہ خطبہ کچھ ایسا تھا کہ طلقاء نے، جن سے چشم پوشی کر لی گئی تھی، گھروں میں سنا تھا۔ فرمایا: اے وہ لوگو! جو زبان سے ایمان لائے ہو نہ دل سے! مسلمانوں کی غیبت نہ کیا کرو اور ان کی کمزوریوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو کیونکہ اگر کوئی ایسا کرے گا تو خدا اس

محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۵۱ ۲ ایضاً ۳ محجۃ البیضاء ج ۵ ص ۲۵۱

کے راز اور کمزوریوں کو آشکار کردے گا۔ اور خدا ایسا کرنے والے کے راز کو فاش کردے گا۔[۱]

یہی ردعمل ہے اس سلسلہ میں عامہ وخاصہ کے طریق سے روایات نقل ہوئی ہیں مذکورہ حدیثیں عامہ کی نقل کی ہوئی تھیں اب خاصہ کی نقل کردہ حدیثیں ملاحظہ فرمائیں:

شیخ صدوق نے اپنی سند سے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو شخص اپنے بھائی کی غیبت کرنے اور اس کے عیوب یا خفیہ باتوں کو آشکار کرنے کے لئے جاتا ہے اس کا پہلا قدم جہنم کی طرف اٹھتا ہے اور خداوند عالم اس کے عیوب کو لوگوں کی نظر میں آشکار کر دیتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی غیبت کرتا ہے اس کا روزہ اور وضو باطل ہو جاتا ہے اور اگر وہ اس حال میں مرجائے تو خدا کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھتے ہوئے مرے گا۔[۲]

واضح رہے کہ روزہ اور نماز کا یہ بطلان فقہی بطلان نہیں ہے، غیبت کو فقہا نے مبطلات روزہ اور وضو میں شمار نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہاں ان کے باطل ہونے سے مراد یہ ہے کہ روزہ اور وضو کے آثار ختم ہو جائیں گے۔

امام صادقؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: غیبت انسان کے ایمان کو برباد کرنے میں، کینسر کے جراثیم کے بدن میں دوڑنے سے بھی زیادہ تیز ہے۔[۳] بنابرایں یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیبت دین کا سرطان ہے۔

مفضل نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: جو شخص کسی مومن کے نقصان کے لئے بات کہتا ہے اور اس نے اس کا مقصد اس مومن کو ذلیل کرنا اور اس کو اس طرح نقصان پہنچانا ہو کہ لوگوں کے درمیان اس کی عزت ختم ہو جائے تو خداوند عالم اسے اپنی ولایت سے نکال کر شیطان کی ولایت کی طرف ڈھکیل دیتا ہے اور شیطان بھی اس کو قبول نہیں کرتا ہے۔[۴]

غیبت صرف زبان ہی سے نہیں ہوتی

ہر وہ چیز جو دوسرے کے نقص وعیب کو ظاہر کرے اور اس چیز کو سمجھائے کہ جس کو وہ ناپسند کرتا

---

۱ ایضا ص۲۵۲ ۲ محجۃ البیضاء ج۵ ص۲۵۴ ۳ ایضا ۴ ایضا ص۲۲۵

ہوتو وہ بھی غیبت ہے، خواہ زبان کے ذریعہ ہو، کھلم کھلا ہو یا اشارہ، کنایہ اور رمز وایما کے ذریعہ یا طعنے دینے اور لکھنے کے وسیلہ سے، زبان سے غیبت کرنا اس لحاظ سے حرام ہے کہ غیبت کنندہ اپنے بھائی کے عیب کو دوسرے سے بیان کرتا ہے، بنا برایں کسی بھی ذریعہ سے عیب سمجھانا غیبت ہے اور حرام ہے، لنگڑا کر چلنا یا کسی کی نقل کرنا حرام ہے بلکہ اس سے بھی بدتر کیونکہ یہ عیب کو زیادہ واضح کرتا ہے، ایک عورت عائشہ کے پاس آئی جب وہ چلی گئی تو عائشہ نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ پستہ قد ہے رسولؐ نے فرمایا: تم نے اسکی غیبت کی ہے۔ [۱]

سننے والا بھی غیبت میں شریک ہے:

رسولؐ نے فرمایا: غیبت سننے والا بھی غیبت کرنے والوں کا شریک ہے۔ [۲] بنا برایں سننے والا بھی گناہ سے نہیں بچ سکتا مگر یہ کہ زبان سے اس کو غلط قرار دے یا کسی طریقہ سے اسکی بات کو قطع کردے یا وہاں سے اٹھکر چلا جائے اگر ان میں سے کوئی بھی کام نہ کر سکے تو اس کو دل سے غلط سمجھے، لیکن اگر زبان سے یہ کہے: میاں! چپ ہو جاؤ، اور باطنی طور پر اس سے خوش ہو تو یہ نفاق ہے رسولؐ نے فرمایا:

جس شخص کے سامنے کوئی شخص کسی مومن کو ذلیل کرے اور وہ اس کی مدد کر سکتا ہو لیکن مدد نہ کرے تو خدا روز قیامت اسے ساری مخلوق کے سامنے ذلیل ورسوا کرے گا۔ [۳]

نیز فرمایا:

جو شخص اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی عزت وآبرو کا دفاع کرے تو خدا پر یہ حق ہے کہ قیامت کے دن اسکی عزت وآبرو کو بچائے۔ [۴]

آپ ہی کا ارشاد ہے:

جو اپنے بھائی کی عدم موجودگی میں اس کی عزت کی حفاظت کرتا ہے تو خدا پر یہ حق ہے کہ اسے جہنم سے نجات عطا کرے۔ [۵]

---

[۱] علم اخلاق اسلامی (ترجمہ معراج السعادات ج۲ ص۲۹۳ تا ۲۹۶ [۲] علم اخلاق اسلامی (ترجمہ السعادات) ج۲

[۳] ایضا [۴] ایضا [۵] ایضا

غیبت کے محرکات

جن چیزوں کو علما نے غیبت کے محرکات میں شمار کیا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ غضب، کینہ یا حسد، اس صورت میں غیبت، علم اخلاق کی اصطلاح میں قوۂ غضبیہ کے رذائل میں سے ہے۔

۲۔ تمسخر اور استہزاء، کسی شخص کا ہنسی مذاق اڑانا یا لوگوں کو ہنسانے کے لئے کسی کی نقل کرنا اس کا تعلق اس کی قوۂ شہویہ سے ہے۔

۱۔ فخر و مباہات، دوسرے کے عیوب بیان کر کے بڑا بننا مثلاً یہ کہے: وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا اور اس سے اس کا مقصد اپنی برتری ثابت کرنا ہو تو یہ بھی قوۂ غضبیہ کے رذائل میں شمار ہوتا ہے۔

کسی شخص کی طرف کسی غلط کام کی نسبت دینا، اس کو بیان کرنے سے اس کا مقصد خود کو پاک و بے عیب ثابت کرنا ہو اس کام کے لئے بھی دوسرے کو کسی کام میں اس لئے اپنا شریک قرار دیتا ہے تاکہ اس کام میں وہ خود کو معذور ثابت کرے۔

۵۔ اپنے دوستوں کی ہمنوائی کرنا، مسلمانوں کے عیوب بیان کرنے کے سلسلہ میں اس لئے اپنے دوستوں کی ہمنوائی کرتا ہے تاکہ وہ اس سے نفرت نہ کریں، اس قسم کی غیبت کا محرک نفس کی کمزوری ہے۔

۶۔ کسی بڑی شخصیت کے سامنے کسی شخص کے عیوب کو اس لئے بیان کرنا کہ اسکی نظر میں اسکی کوئی وقعت و حیثیت نہ رہے اس کی بنیاد بھی خوف اور ضعف نفس ہی ہے۔

۷۔ مہربانی و ہمدردی: مثلاً کسی شخص کو کسی پریشانی میں مبتلا دیکھ کر یہ کہے اس غریب نے اس غلط کام سے مجھے بھی دکھ پہنچایا، میں بھی اس کے غم میں اس کا شریک ہوں لیکن اس کا یہ نام لینا اور اس کے عیب کو ظاہر کرنا بھی غیبت میں شمار ہوتا ہے۔

۸۔ کسی کے غلط کام پر تعجب کا اظہار کرنا مثلاً یہ کہے: تعجب ہے فلاں شخص ایسے غلط کام کا مرتکب ہوا ہے گویا یہ تعجب کرنے والا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پیرایہ میں اس آدمی سے ناراضگی کو ظاہر کرنا چاہتا ہے یہ شخص نہ جانتے ہوئے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔

علمائے علم اخلاق نے انسان کے اندر غیبت کے یہ آٹھ محرکات بیان فرمائے ہیں۔

غیبت کے علاج کا طریقہ

اس خانمانسوز اور مہلک مرض کا علاج یہ ہے کہ پہلے مرحلہ میں اس کی خرابیوں اور اس کی جزاء میں ملنے والی اخروی سزاؤں کو یاد کرے، دوسرے مرحلہ میں اس کے دینوی نقصانات اور برائیوں کو یاد کرے لیکن ان سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ اپنے وجود سے غیبت کے محرکات کا صفایا کردے۔

اگر کسی سے کوئی غلط کام سرزد ہو جاتا ہے اور وہ اس کام کی نسبت دوسرے کی طرف دیتا ہے تو اس کے علاج کا طریقہ یہ ہے، اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خدا کے غضب کا نشانہ بننا مخلوق کی دشمنی سے کہیں زیادہ سخت ہے اور اسے یہ جان لینا چاہئے کہ یہ بہت بڑی نادانی ہے۔

اپنے لئے جواز پیدا کرنے کے لئے اس طرح کسی کی غیبت کرنا کہ اس نے بھی یہ غلط کام کیا ہے لہذا میں نے بھی کیا ہے مثلاً یہ کہے: چونکہ فلاں شخص نے حرام کھایا ہے لہذا میں نے بھی حرام کھالیا ہے۔ جو شخص خدا کی مخالفت کرتا ہے اس کی پیروی نہیں کرنا چاہئے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ جو شخص اپنے برے فعل کا دوسرے کے برے فعل سے موازنہ کرتا ہے اس کے عذر و بہانہ کا سرچشمہ اس کے نفس کی خباثت ہے۔

اور جہاں غیبت کا محرک دوستوں اور ساتھیوں کی موافقت ہو تو اس کا علاج یہ ہے اسے یہ بات یاد رکھنا چاہئے۔ اگر وہ مخلوق کی خوشنودی کو خدا کی خوشنودی پر مقدم کرتا ہے تو خدا کے غضب میں مبتلا ہوگا۔ اور مومن ہرگز ایسا کام نہیں کرتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس شخص کے نزدیک خدا پست مخلوق سے کم اہمیت رکھتا ہے؟!

لیکن جہاں غیبت کا محرک دوسرے کی بات کے اثر کو زائل کرنا ہو وہاں اس کا علاج یہ ہے: اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کسی چیز کے گمان واحتمال کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ وہ چیز واقع ہوگئی ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص اس کی برائی نہ کرے یا اس کے خلاف گواہی نہ دے۔ بنابرایں وہم کی وجہ سے تلافی کرنا انسان کے ایمان کے منافی ہے۔

اگر غیبت کا محرک کسی کی ہمدردی اور اس سے محبت ہو یا خدا کے غضب کی بنا پر غیبت ہو اگر چہ یہ چیز اچھی ہے لیکن اگر اس میں غیبت کا عنصر ہوگا تو اس کا اجر وثواب ختم ہو جائے گا۔ ایسی غیبت کا علاج یہ ہے کہ اگر وہ غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس ہمدردی اور تعجب کا محرک ایمان اور دین کی حمایت ہی ہے تو صحیح ہے اور اگر اس میں غیبت کا عنصر ہو تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دین کی حمایت نہیں ہے۔

غیبت اور آزادیٔ بیان

زبان کی آفتوں، خصوصاً غیبت، کی وضاحت کرنے کے بعد ہم اس بحث کو شروع کرتے ہیں کہ اسلام میں آزادیٔ بیان ہے یا نہیں؟ اگر بیان کی آزادی ہے تو کس حد تک؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام کے حقوقی نظام میں بیان کی آزادی کو محترم شمار کیا گیا ہے۔ اس بات کا ثبوت وہ آیات وروایات ہیں جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

پس ان بندوں کو بشارت دیدیجئے جو بات سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی صاحبان عقل وخرد ہیں۔ [1]

واضح ہے کہ بہترین بات کی پیروی اسی جگہ کی جاسکتی ہے جہاں بیان کی آزادی ہو اور اچھی بری باتوں کا موازنہ کر کے اچھی بات کی پیروی کی جاسکے، حضرت علیؑ بن ابی طالب سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: یہ دیکھو کہ کیا کہا: یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا۔ [2]

آپ کا قول ہے: علم وحکمت کو حاصل کرو خواہ وہ گمراہوں سے حاصل ہو حکمت لے لو خواہ مشرکوں سے ملے۔ [3]

مخالف افکار سے معصومینؑ کس طرح مقابلہ کرتے تھے

دین کے رہبروں کی سیرت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مخالفوں کے عقائد کا صحیح طریقہ سے مقابلا کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ مثلاً جن لوگوں " جیسے سعد بن ابی وقاص اور ابو موسیٰ اشعری

---

[1] زمر: ۱۷۔۱۸ [2] درآمدی برحقوق اسلامی ص ۱۷۱ [3] ایضاً

وغیرہ'' نے حضرت علیؑ کی، آغاز خلافت میں، بیعت نہیں کی تھی، آپ نے ان پر دباؤ بھی نہیں ڈالا اور جن لوگوں، جیسے طلحہ وزبیر، نے بیعت توڑ دی تھی اور آپ کے خلاف جنگ بھڑکائی تھی، ان سے بھی آپ نے ممکنہ حد تک جنگ سے پہلو تہی کی۔

کتاب وسائل الشیعہ میں مرقوم ہے: حضرت علیؑ نے ان لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی کافر و مشرک قرار نہیں دیا جنہوں نے آپ سے جنگ کی تھی بلکہ آپ یہی فرماتے تھے: وہ ہمارے بھائی ہیں انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔[1]

اسی طرح امام صادق کی ابن ابی العوجاء جیسے لوگوں سے نپی تلی رسم وراہ تھی، لہذا بیان کی آزادی پر کوئی قدغن نہیں ہے ہاں اسلام میں فتنہ وفساد ممنوع ہے خواہ کسی بھی طریقہ سے ہو۔

فقہی نقطۂ نظر سے زبان کی قیمت

زبان کے حق کی بحث اپنی اہمیت کی بنا پر طولانی ہوگئی ہے، اس کے خاتمہ پر ہم فقہی نقطۂ نظر سے زبان کی قیمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شارع نے انسان کی صحیح زبان کی مکمل دیت معین کی ہے جو بجائے خود زبان کی اہمیت و قیمت کی دلیل ہے۔ محقق حلّی اپنی کتاب ''مختصر النافع'' میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

صحیح زبان کی دیت کامل دیت ہے اگر اس کا کچھ حصہ کٹ جائے تو حروف معجم کے لحاظ سے دیکھا جائے گا جو کہ ۲۸ ہیں اور گونگے کی زبان کی دیت ایک تہائی ہے۔

آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید ابو القاسم الخوئی ''تکملۃ المنھاج'' میں اس طرح رقم طراز ہیں:

جہاں زبان کا فائدہ ختم ہو جائے وہاں صحیح زبان کے کٹے ہوئے حصہ کی مقدار کی مساحت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا معیار وہ حروف ہیں جو زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ بنا برایں اگر مساحت کے لحاظ سے زبان کا ایک چوتھائی حصہ کٹا ہو لیکن زبان سے نصف حروف ادا ہوتے ہوں تو اس صورت میں نصف دیت دی جائے گی اور اگر مساحت کے اعتبار سے آدھی زبان قطع ہو جائے مگر حروف کے لحاظ

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۶۲

سے ایک چوتھائی کو نقصان پہنچا ہو تو اس صورت میں ایک چوتھائی دیت دی جائے گی۔ [۱]

حقیقت یہ ہے زبان کی مساحت مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی دیت میں صحیح طریقہ سے حروف کی ادائیگی کو معیار سمجھا گیا ہے۔

---

[۱] مبانی تکملۃ المنہاج ج ۲ ص ۲۹۰

کان کا حق

واما حق السمع فتنزیهه عن ان تجعله طریقا الیٰ قلبك الا لفوهه کریمة تحدث فی قلبك خیرا او تکسب کریما فانه باب الکلام الی القلب یؤدی الیه ضروب المعانی علیٰ ما فیها من خیر او شر ولا قوة الا بالله۔ [۱]

کان کا حق یہ ہے کہ تم اسے اپنے دل کا راستہ بنانے سے پاک رکھو ہاں اسے اس بہترین بات کے لئے دل کا راستہ بناؤ جو تمہارے دل میں پیدا ہو جو تمہیں بہترین اخلاق سے آراستہ کرے کیونکہ کان دل کا راستہ ہے اور وہ بہترین معانی کو درک کرتا ہے کان دل تک خیر یا شر کو پہنچاتا ہے اور طاقت وقوت صرف خدا کی ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: اے رسول کہہ دیجئے خدا وہی ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں کان، آنکھ اور دل عطا کئے لیکن تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ [۲]

انسان کے تکامل میں قوت سامعہ کا اثر

جب انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو اس وقت وہ اس دنیا کے مخلوقات وموجودات سے نا آشنا ہوتا ہے، رفتہ رفتہ ان سے آشنا ہوتا ہے اور ان کی معرفت پیدا کرتا ہے۔ ان کی شناخت کا ایک طریقہ انسان کی قوت سامعہ اور اس کا کان بھی ہے۔ وہ کان کے ذریعہ باتوں کو سنتا ہے اور ذہن وحافظہ میں ثبت کرتا ہے سننا مقصد تک پہنچنے کا مقدمہ ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ بن ابی طالب نے اس شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ جس نے نیکی کی طرف راہنمائی طلب کی تھی۔

اے سوال کرنے والے پہلے تم سنو، پھر اسے سمجھو پھر یقین پیدا کرو اس کے بعد اس پر عمل کرو۔ [۳]

---

[۱] مکارم الاخلاق میں اس طرح ہے: وحق السمع تنزیهه عن سماع الغیبة وسماع مالایحل سماعته، یعنی کان کا حق یہ ہے کہ اس کو غیبت اور اس چیز کے سننے سے پاک رکھو کہ جس کا سننا جائز نہیں ہے۔

[۲] ملک: ۲۳ [۳] اصول کافی ج ۲ ص ۲۵۲

اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سمجھنے، یقین کرنے اور عمل کرنے کی ابتداء کان سے ہوتی ہے۔ لہذا سامعہ کو حس اجتماعی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کو قوہ باصرہ سے افضل قرار دیا جاسکتا ہے۔

سننے کا نظام

آواز کیا ہے؟

آواز اجسام کے ارتعاش سے پیدا ہوتی ہے، انسان کی آواز بھی اس کے حلق کے تاروں کے ارتعاش ہی کا نتیجہ ہے۔ تجربہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ خلا (وہ فضا جہاں ہوا نہ ہو) میں آواز منتشر نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اس سے یہ خیال بھی نہیں پیدا ہونا چاہئے کہ منتقل کرنے کا ذریعہ صرف ہوا ہے بلکہ گیس سے زیادہ تیز رفتار سیال چیز اور سیال چیزوں سے زیادہ تیز رفتار جامد چیزیں بھی آواز کو منتقل کرتی ہیں۔

سننے کے مختلف حصے سننے کی مشینری تین جداگانہ حصوں سے مل کر بنی ہے:

۱۔ظاہری کان ۲۔درمیانی کان ۳۔اندرونی کان

ظاہری کان

یہ حصہ دو عضو سے مل کر بنا ہے کان کی گوٹ جس کو کان کا خیمہ بھی کہتے ہیں اور دوسرا کان کا مجریٰ ہے۔ لالہ گوش یہ ایک ابھری ہوئی نرم ہڈی ہے جس میں باریک باریک مخصوص سوراخ ہیں یہ باعث زینت ہونے کے علاوہ صوتی امواج کو بھی جمع کرتی ہے اور آواز کی سمت کو معین کرتی ہے، نیز آواز کی شدت کو گھٹاتی ہے۔

کان کا مجریٰ یہ تین سینٹی میٹر لمبا ایک سوراخ ہے اور اس کے داخلی حصہ کے بالکل آخر میں ایک پردہ ہے جس کو صماخ (یعنی سوراخ) کہتے ہیں، یہی ظاہری کان کو درمیانی کان سے جدا کرتا ہے اس سوراخ کی دیوار پر مخصوص قسم کی کھال چڑھی ہوئی ہے اس میں بھی بہت سے سوراخ ہوتے جن سے

زہریلا اور لس دار مادہ ٹپکتا ہے اس مادہ سے میکروب مر جاتے ہیں یہی مادہ کیڑے مکوڑوں اور گرد وغبار سے بھی کان کو محفوظ رکھتا ہے۔

درمیانی کان

پردۂ صماخ کے پیچھے ایک فضا ہے جس کو صماخ پٹی کہتے ہیں اور دو دریچوں کے ذریعہ اندرونی کان سے مربوط ہوتا ہے۔ اس پٹی میں چھوٹی چھوٹی اور نازک ہڈیاں رکھی گئی ہیں کہ جن کے اسماء سے ان کے کام کی نوعیت بھی معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ ہتھوڑا نما ہڈی، اس کا دستہ پردہ صماخ پر لٹکا ہوا ہے۔

۲۔ آئرن نما ہڈی، ہتھوڑا نما ہڈی اسی پر لگتی ہے۔

۳۔ رکاب نما ہڈی بیضی دریچے پر لگی ہوئی ہے، اور بیضی دریچہ وہ کھڑکی جو اندرونی کان تک پہنچتی ہے۔

۴۔ لنز نما ہڈی یہ آئرن نما اور رکاب نما ہڈی کے درمیان رابطہ ہے۔

اندرونی کان

یہ حصہ قوت سامعہ کا اہم ترین اور نازک وحساس ترین حصہ ہے جو ایک مضبوط ہڈی کے پیچھے واقع ہے تا کہ ہر پہنچنے وا[illegible] سے محفوظ رہے، اسکی [illegible]رت بہت پیچیدہ ہے، اسکے آلات واوزار بہت ہی باریک ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ان کے تین مختلف حصے ہیں:

۱۔ دہلیزی حصہ اس میں دو گڑھے ہیں۔ ۲۔ نصف دائرہ کا مجریٰ یہ تین نصف دائرہ ہڈیوں سے مل کر بنا ہے اور مجریٰ حلزونی، یعنی اسپرنگ نما ۵/۲ نلی ہے، یہ تینوں اعضاء کان کی اس اندرونی فضا میں تیرتے ہیں جو ایک سیال مادہ سے پر ہے جبکہ ان تینوں کے اندر بھی ایک مخصوص مادہ ہے، ان تینوں سے اعصاب کے تار جڑے ہوئے ہیں اور یہ تینوں جداگانہ آواز کو پہنچانے پر مامور ہیں۔ [1]

---

[1] شناخت بدن انسان، برنامہ علوم تندرستی سال اول حسعای ویژہ ص ۳۱ تا ۴۷

ہم کیسے سنتے ہیں؟

جو ہوا صوتی لہروں کی حامل ہوتی ہے وہ کان میں داخل ہوتی ہے جس کے ٹکرانے سے کان کے پردہ میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ ہتھوڑا نما، آئرن نما اور رکاب نما ہڈیاں اس ارتعاش کو کان کے پردے سے اٹھا کر بیضی دریچے پر پھینکتی ہیں جو کہ اندرونی کان کے مدخل میں واقع ہے۔ یہ دریچہ اس ارتعاش کو لیتا ہے اور اس سیال مادہ میں پہنچا دیتا ہے جو اندرونی کان کی فضا کے درمیان ہے سننے والے خلئے اس سیال مادہ کے اندر منتشر ہیں وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس تاثر کو دماغ میں منتقل کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں صوت وصورت کا احساس ہوتا ہے۔

قوت سامعہ

قوت سامعہ کا تعلق مختلف قسم کے عوامل سے ہے، آواز کی موقعیت، اس کی جسمانی کیفیت، غذائیت، ضمیری انفعالات اور سب سے زیادہ آشکار افراد کا سن ہے طول عمر سے قوت سامعہ کا براہ راست اور اٹوٹ رابطہ ہے جتنا سن بڑھتا ہے اسی لحاظ سے بہرہ پن بڑھتا ہے۔

ایک کامل و بے عیب کان میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ اس کا پردہ ظریف و مبہم آواز کو ہوا میں موجود ملکول سے ٹکرانے کے سبب مرتعش ہو جاتا ہے اور سننے والے خلیئے دماغ کو متاثر کرتے ہیں اگر چہ ظاہری کان آواز کو دریافت کرتے اور آواز کی سمت کا سراغ لگاتے ہیں لیکن آواز کو کنٹرول بھی کرتے ہیں اگر ان دونوں حصوں میں ہم آہنگی وتناسب نہ ہوتا تو کوئی آواز سنائی نہ دیتی۔ [1]

قرآن میں کان کو آنکھ و دل پر کیوں مقدم کیا ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ جن میں آنکھ، کان اور دل کا ذکر ہے اور ان میں سے اکثر آیات میں کان کو آنکھ اور قلب پر مقدم کیا گیا ہے کیا اس کی علت کو سمجھا جا سکتا ہے؟ پہلے ہم ان میں سے چند آیات کو بیان کرتے ہیں:

---

[1] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر ج ۱۵ ص ۱۰۰

قل من یرزقکم من السماء والارض امن یملك السمع والابصار۔[۱]

ان السمع والبصر والفؤاد کل اولٰئك کان عنه مسئولا۔ [۲]

(اے رسول) ان سے یہ معلوم کیجئے کہ زمین وآسمان سے تمہیں کون رزق دیتا ہے۔

اور سماعت وبصارت کا مالک کون ہے؟

بیشک سماعت وبصارت اور دل ان میں سے ہر ایک کے بارے میں سوال کیا جائیگا۔

اسی طرح سورۂ نحل کی ۷۸ ویں، سورۂ مومنون کی ۷۸ ویں، سورۂ بقرہ کی ساتویں اور سورۂ فصلت کی بیسویں آیت میں نیز دوسری بہت سی آیات میں کان کو مقدم کیا گیا ہے۔

جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ: دانشوروں نے علمی اعتبار سے کان کی بہت سی برتریاں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ سماعت کی حد فاصل کم از کم ہزار گنا زیادہ ہے جبکہ بصارت میں یہ فاصلہ بہت کم ہے (کان ایک منٹ میں ۱۶ سے ۱۶۰۰۰) بار حرکت کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ آنکھ مخصوص تعداد ہی کے رنگوں میں تمیز کر سکتی ہے۔ اس کی حدود مشخص ومعین اور بہت کم ہیں مثلاً آنکھ بنفشہ سے کم اور سرخ رنگ سے آگے نہیں دیکھ سکتی، لیکن کان اپنی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ قوت سماعت کے ساتھ ہر قسم کی آواز سنتے ہیں یعنی صوتی لہروں اور موجوں کو گرفت میں لینے والا عضو جو کہ کان کے اندر واقع ہے ۱۵۰۰ قسم کی آوازوں کو مختلف اعضاء کی مدد سے ۳۳۵ قسم کی آوازوں کو مختلف شدتوں کے ساتھ سنتا ہے یعنی ۳۳۳۰۰ آوازوں کو محسوس کرتا ہے۔ آنکھ ان تین لاکھ رنگوں کو مشخص کرنے کے لئے کہ جن کو انسان نے حاصل کیا ہے آلات واوزار سے مدد لے گی، جبکہ کان بیمار ہونے سے پہلے سنی جانے والی چیزوں میں کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح آنکھوں کو بہت شدید روشنی سے نقصان پہنچتا ہے جیسے سورج گہن کے وقت دیکھنے یا مسلسل ٹیلی ویژن وکمپیوٹر اور فیلم دیکھنے سے آنکھ متاثر ہوتی ہے جبکہ اضافی آواز کان کو ضرر نہیں پہنچاتی ہے، مختصر یہ کہ آنکھ کے دیکھنے کا میدان بہت محدود ہے وہ سامنے یا دائیں بائیں ہی دیکھتی ہے حالانکہ کان شش جہات کی آواز سنتے ہیں، ایسی ہی برتری کے لحاظ سے دانشوروں نے کان کو اس کی ساخت اور فیزیکلی اعمال کے اعتبار سے آنکھ پر مقدم کیا ہے لیکن کان کو

---

[۱] یونس: ۳۱ [۲] اسرأ: ۳۶

آنکھ پر مقدم کرنے کی علت قرآن مجید میں اس لئے موضوع بحث قرار پائی ہے کہ تزکیۂ نفس میں کان کا اہم کردار ہے۔ یعنی قلب و نفس کو سنوارنے میں کان کا حصہ آنکھ سے زیادہ ہے۔[۱]

قرآن میں کان ''سمع'' کی جمع کیوں نہیں آئی ہے؟

شیخ طوسیؒ نے اپنی کتاب ''تفسیر تبیان'' میں ایک مشہور ادیب سے اس طرح نقل کیا ہے کہ ''سمع'' کے مفرد آنے کی علت ممکن ہے دو چیزوں میں سے ایک ہو۔

اول تو یہ کہ کبھی ''سمع'' اسم جمع کے عنوان سے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ اسم جمع میں جمع کے معنی پوشیدہ ہوتے ہیں اس لیے اس کی جمع بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

دوسرے ہو سکتا ہے کہ آیت میں وارد لفظ ''سمع'' مصدری معنی کا حامل ہو اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ مصدر کم اور زیادہ دونوں پر دلالت کرتا ہے لہٰذا جمع بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرے اس فرق کے علاوہ بھی اس کی علمی توجیہ کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ غیر معمولی مسموعات (سنی جانے والی چیزیں) کی بہ نسبت ادراکات و مشاہدات میں زیادہ تنوع ہے اسی لئے، قلوب و ابصار جمع کی صورت میں بیان ہوئے ہیں لیکن ''سمع'' مفرد کی صورت میں بیان ہوا ہے۔[۲]

کان کی فقہی قیمت

یہ تو آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے کہ امام زین العابدینؑ کے نظریہ کے مطابق، انسان کے اوپر کان کے دو حق ہیں جو کہ بیان ہو چکے ہیں، کان کی فقہی قیمت بھی ہے جس کو شارع نے بیان کر دیا ہے، محقق حلی فرماتے ہیں:

انسان کے دونوں کانوں کے لئے مکمل دیت مقرر کی گئی ہے اور ایک کان کے لئے نصف دیت رکھی گئی ہے۔ اس کی لو کو کاٹنے کی دیت ایک تہائی ہے اور لو میں سوراخ کرنے کی دیت بھی ایک تہائی ہے۔[۳]

۱۔ اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر ج ۱۵ ص ۱۰۱ تا ۱۰۶ ۲۔ تفسیر نمونہ ج ۱ ص ۵۶ ۳۔ مختصر النافع ص ۳۰۰

تقریباً یہی مفہوم "مبانی تکملۃ المنہاج" کی عبارت کا ہے۔

دونوں کانوں کی دیت مکمل ہے اور ایک کان کی دیت نصف ہے اور کان کے بعض حصہ کی دیت، اسی کے لحاظ سے ہے اور لو کی دیت ایک تہائی ہے۔[1]

موصوف اپنے فارسی رسالۂ عملیہ میں لکھتے ہیں: دونوں کان کاٹنے کی دیت پوری ہے اسی طرح ایسا کام کرنا کہ جس سے اس کے دونوں کان بہرے ہو جائیں، اگر اس کے ایک کان کو کاٹ لے یا اسے بہرہ کر دے تو قتل کی نصف دیت دینا ہوگی۔ اور اگر اس کے کان کی لو کاٹ لے تو احوط یہ ہے کہ اس سے صلح کرے۔

---

[1] مبانی تکملۃ المنہاج ج ۲ ص: ۲۸۰

آنکھ کا حق

"واما حق بصرك فغضه عما لا يحل و ترك ابتذاله الا لمواضع عبرة تستقبل بها بصرا او تستفيد بها علما فان البصر باب الاعتبار"[1]

لیکن آنکھ کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ اس کو اس چیز سے بند کرلو جو تمہارے لئے حلال وروا نہیں ہے آنکھ سے وہی دیکھو جس سے عبرت ہو اور جس سے تم بینا ہو جاؤ جہاں سے تم کوئی علم حاصل کرسکو کیونکہ آنکھ عبرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

بصر (بروزن فرس ہے) کے دو معنی ہیں قوت بینائی اور آنکھ، [2] مفردات میں راغب فرماتے ہیں: بصر قوت بینائی کو بھی کہا جاتا ہے اور آنکھ کو بھی [3] بصر یعنی بینا ہو گیا، بصر اور ابصر، یعنی دیکھا، درک اور مشاہدہ کیا۔[4]

''بصر'' آنکھ کو بھی کہا جاتا ہے اور قوت باصرہ کو بھی کہا جاتا ہے مثلاً اس آیہ شریفہ میں ''وما امر الساعة الا كلمح البصر۔ [5] بصر کی جمع ابصار ہے مثلاً: وجعل لكم السمع والابصار والافئدة [6]

بصیرت کے معنی دل کی بینائی کے ہیں اور یہ معرفت و درک کے مرادف ہے۔ اقرب الموارد میں نقل ہوا ہے کہ بصر کے معنی علم ہیں اور طبرسی نے آیت ''ادعوا الى الله على بصيرة ومن اتبعنى '' [7] میں بصیرت سے دل کی معرفت و بینائی ہی مراد لی ہے اور بصیرت کے معنی عقل و زیرکی بیان کئے ہیں۔

---

[1] مکارم الاخلاق کی عبارت یہ ہے: ''حق البصر ان تغمضه عما لا يحل لك تعبر بالنظر'' اور آنکھ کا حق یہ ہے کہ اسے اس چیز سے بند رکھو جو تمہارے لئے روا نہیں ہے اور اس کے ذریعہ مختلف حوادث سے عبرت حاصل کرو۔

[2] قاموس القرآن ج۱ ص۱۹۵ [3] مفردات راغب ص۴۹ [4] فرہنگ بزرگ جامع مادہ بصر

[5] نحل: ۷۷ [6] نحل: ۷۸ [7] یوسف: ۱۰۸

قوت بینائی چند علوم کا محور

آنکھ احساس وادراک کا ذریعہ ہے اور علم نفسیات کی توجہ کا مرکز واقع ہوتی ہے اور چونکہ نور کے قوانین سے مربوط ہے اسلئے اس سے علم فزکس میں بھی بحث ہوتی ہے اور چونکہ دیکھنے کی پر اسرار کیفیت نے فلاسفہ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا ہے او. یہ بدن کی ایک قوت ہے اور ایک مخصوص فریضہ کی حامل ہے اسلئے علم تشریح اور فزیالوجی میں اس کی باریکیوں اور جزئیات سے بحث ہوتی ہے لہذا اگر ہم آنکھ کو چند علوم کا محور کہیں تو یہ مبالغہ نہیں ہے اور اسی قوت سے ہم رنگوں، شکلوں اور اجسام کے فاصلوں کو دیکھتے ہیں۔

آنکھ سے صحیح طریقہ سے استفادہ کرنا

خداوند عالم نے آنکھ کی عظمت کو سورہ بلد میں انسان کے گوش گزار کیا ہے فرماتا ہے: الم نجعل له عينين "[۱] کیا ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں نہیں قرار دی ہیں آنکھ بدن سے باہر کی دنیا سے رابطہ کا اہم ترین وسیلہ ہے اس کی حیرت انگیزیاں اتنی زیادہ ہیں کہ جو حقیقت میں انسان کو اس کے خالق کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہیں ۔ مگر افسوس کہ بعض انسان آنکھ سے صحیح فائدہ حاصل نہیں کرتے ہیں ۔ سورۂ اعراف میں انسانوں کے ایک گروہ کے بارے میں بیان ہوا ہے: ولهم اعين لا يبصرون بها [۲] اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں ہیں اور اس نعمت سے صحیح طور پر استفادہ نہیں کرتے ہیں۔

سورہ بلد کی آیت کے ذیل میں رسولؐ کی ایک حدیث ہے کہ خداوند عالم انسانوں سے فرماتا ہے:

آدم کے بیٹو! اگر تمہاری زبان تمہیں اس چیز کی طرف ابھارے جس کو میں نے تم پر حرام کیا ہے تو میں نے اسے بند کرنے کے لئے دو لبوں سے تمہاری مدد کی ہے تو اسے بند کرلو اور اگر تمہاری آنکھ تمہیں حرام کی طرف لے جائے تو میں نے تمہارے اختیار میں دو پلکیں دی ہیں ان سے اسے بند کرلو۔ [۳]

---

[۱] بلد : ۸ [۲] اعراف : ۱۷۹ [۳] نور الثقلین ج ۵ ص ۵۸۱

آنکھوں کو خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بند کیا جانا چاہئے سورۂ کہف میں کافروں کے بارے میں ارشاد ہے:

الذین کانت اعینهم فی غطاءٍ عن ذکری وکانوا لا یستطیعون سمعاً [1]

وہ لوگ جن کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ سن نہیں سکتے تھے۔

اس آیت میں خدا یہ فرماتا ہے کہ کافر اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے چشم پوشی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے برخلاف وہ ان چیزوں سے آنکھیں موند لیتے تھے جن سے انسان کو خدا یاد آتا ہے۔ اور قوت سامعہ رکھنے کے باوجود انہوں نے کان نہیں دھرے، حقیقت یہ ہے کہ کافروں نے حق جوئی اور حقائق کو درک کرنے والی قوت کو ناکارہ کر دیا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ آنکھوں کے بارے میں فرماتا ہے: انہوں نے میری یاد سے دور رہنے کے لئے اپنی آنکھیں موند لی ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ غفلت کے پردوں میں تھے اس لئے انہوں نے خدا کے آثار کو نہیں دیکھا اور چونکہ حقیقت کو نہیں دیکھا اس لئے گمراہ ہوئے۔

یاد خدا ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو آنکھوں سے دیکھا جا سکے جو دکھائی دیتا ہے وہ اس کے آثار ہیں اور آثار ہی اس کے ذکر و یاد کا سبب ہوتے ہیں۔

انسان اپنی خلقت کو دیکھے

آنکھوں سے صحیح معنی میں دیکھ… ور ان سے درست طریقہ سے استفادہ کرنا وہی ہے جس کو قرآن نے سورۂ طارق میں بیان کیا ہے اور انسان کو دیکھنے کی دعوت دی ہے فر… تا ہے:

فلینظر الانسان مم خلق خلق من ماء دافق یخرج من بین الصلب والترائب [2]

انسان کو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے اس پانی سے جو پشت اور سینہ کے بیچ سے نکلتا ہے۔

---

[1] کہف ۱۰۱ [2] طارق: ۵ تا ۷

اس طرح قرآن نے تمام انسانوں کو مخاطب قرار دیا اور انہیں ان کی پہلی خلقت کی طرف پلٹا دیا ہے۔ اور استفہام کے ذریعہ ان سے سوال کیا تمہاری خلقت کیا تھی؟ اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی اس سوال کا جواب دیدیا ہے تم اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کئے گئے ہو جس کو مرد کا نطفہ کہتے ہیں جو منی میں تیرتا ہے اور نکلتے وقت اچھل کر نکلتا ہے۔ اس کے بعد صلب وترائب کے موضوع کو چھیڑتا ہے کہ جس کے بارے میں مفسرین نے متعدد احتمال دیئے ہیں لیکن یہاں ان کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے یہاں ہمارا مقصد یہی ہے کہ: جہاں قرآن دیکھنے کی دعوت دیتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے:

اپنے کھانے کی چیزوں کو دیکھو

دوسری چیز جس کی طرف دیکھنے کی قرآن نے دعوت ہے وہ انسان کی خوراک اور اس کا کھانا ہے سورہ عبس میں ارشاد ہے: فلینظر الانسان الی طعامه انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے کھانے و خوراک کو دیکھے خارج کی چیزوں میں سے کھانا ہر چیز سے زیادہ انسان سے نزدیک ہے کہ معمولی سی تبدیلی کے بعد اس کے وجود کا جز بن جاتا ہے اگر اسے کھانا نہ ملے تو وہ بہت جلد ہلاک ہو جائے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام موجودات میں سے اسی کا سہارا لیا ہے خاص طور سے نباتات اور درختوں سے فراہم ہونے والی غذا کا سہارا لیا ہے۔

اس دیکھنے کے کیا معنی ہیں؟ اس کے بارے میں مفسرین کے نظریات مختلف ہیں بعض نے کہا ہے یہی ظاہری نگاہ مراد ہے یعنی انسان کو دسترخوان پر اپنے کھانے کو دیکھنا چاہئے کہ حلال طریقہ سے فراہم ہوا ہے یا حرام طریقہ سے، نفع بخش ہے یا ضرر رساں، بعض روایات میں علمی غذا وخوراک کے معنی میں نقل ہوا ہے۔ امام محمد باقر فرماتے ہیں: علمه الذی یا خذه عمن یاخذه [1] انسان کو اپنے علم کو دیکھنا چاہئے کہ اسے کس سے اور کس طریقہ سے حاصل کیا ہے؛ یا کھانے کی چیزوں کے بارے میں غور و فکر سے جو بھی مراد ہو قرآن نے اس کے بارے میں انسان کو غور کرنے کی دعوت دی ہے۔

قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر انسان کو نظر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ مثلاً فانظروا

---

[1] تفسیر صافی ج ۲ ص ۷۸۹

کیف کان عاقبة المکذبین [۱] حق کو جھٹلانے والوں کا انجام دیکھو کیا ہوا۔ دوسری آیت میں ارشاد ہے: سیروا فی الارض فانظروا کیف بدء الخلق [۲]

زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا نے خلقت کا آغاز کیسے کیا ہے۔

نامحرم عورتوں کو دیکھنا منع ہے

قل للمومنین یغضوا من ابصارهم و یحفظوا فروجهم ذالك ازکی لهم ان الله خبیر بما یصنعون و قل للمومنات یغضضن من ابصارهن ویحفظن فروجهن [۳]

یغضوا، غض بروزن "خر" سے مشتق ہے جس کے معنی کم کرنا اور گھٹانا ہیں اور بہت سی جگہوں پر آواز دھیمی کرنے اور نگاہ جھکانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی بنا پر آیت کہتی ہے: اپنی نگاہ کو جھکاؤ، نظر کو نیچا رکھو یہ ایک لطیف مفہوم ہے کہ نامحرم عورتوں کے روبرو ہونا پڑے تو اپنی نگاہ کو جھکالو کیونکہ اگر آنکھیں بند کریں گے تو راستہ کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ لیکن اگر اس کے بدن وصورت پر نگاہ پڑے تو تم اپنی نگاہ کو جھکالو اور جس چیز کو دیکھنے سے منع کیا ہے اس سے نظر ہٹالو۔

جس طرح خداوند عالم نے قرآن مجید میں مرد وعورت دونوں کو نامحرم کو دیکھنے سے منع کیا ہے اسی طرح بہت سی روایات میں بھی نامحرم کو دیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہے بعض مقامات پر تو اس کے نقصان دہ اثر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کتاب "وسائل الشیعہ" میں ایک باب اس عنوان "باب تحریم النظر الی النساء الاجانب وشعورهن" کا ہے اس باب کی اولین حدیث یہ ہے:

محمد بن یعقوب عن محمد بن یحییٰ، عن احمد بن محمد، عن ابن فضال، عن علی بن عقبه، عن ابیه، عن ابی عبدالله علیه السلام قال: سمعته یقول: النظرة سهم من سهام ابلیس مسموم و کم من نظرة اورثت حسرة طویلة [۴]

محمد بن یعقوب نے محمد بن یحییٰ سے انہوں نے محمد بن فضال سے انہوں نے علی بن عقبہ سے

---

[۱] نحل: ۳۶ [۲] عنکبوت: ۲۰ [۳] نور: ۳۰-۳۱ [۴] وسائل الشیعہ ج ۱۴ کتاب النکاح ص ۱۳۸-۱۳۹

انہوں نے اپنے والد سے انہوں نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: نگاہ شیطان کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے اور اکثر ایک ہی نگاہ طویل حسرت کا باعث ہوتی ہے۔

اس حدیث میں نگاہ کو تیر سے تشبیہ دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تیر نشانہ پر لگتا ہے تو اسے شگافتہ کر دیتا ہے، غلط نگاہ بھی عصمت و عفت کے پردہ کو چیر دیتی ہے، پھر فرماتے ہیں: غلط نگاہ طویل حسرت کا باعث ہوتی ہے بہت سے لوگ حرام نظر ہی کی وجہ سے ایسے شدید نقصان سے دوچار ہوئے ہیں کہ جس کی تلافی آخر عمر تک نہیں ہو سکی، اور ندامت و پشیمانی کی زندگی گزارتے رہے لیکن کوئی نتیجہ حاصل نہ ہو سکا۔

چھٹی روایت میں منقول ہے:

وباسناده عن ابن ابی عمیر، عن الکاهلی، قال ابو عبدالله النظرة بعد النظرة تزرع فی القلب الشهوة و کفی بها لصاحبها فتنة۔ [1]

روایت کی اسناد ابن ابی عمیر سے ہے انہوں نے کاہلی سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: امام صادقؑ نے فرمایا: ایک بار دیکھنے کے بعد دیکھنا دل میں شہوت کا بیج بوتا ہے اور یہی بیج جو نگاہ سے بویا جاتا ہے اپنے حامل کو فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اس باب کی نویں روایت میں منقول ہے: **قال الصادق علیه السلام: من نظر الیی امرأة فرفع بصره الی السماء اوغض بصره لم یرتد الیه بصره حتی یزوجه الله من الحور العین۔** [2]

جس شخص کی نظر کسی نامحرم پر پڑی اور اس نے فوراً ہی آسمان کی طرف دیکھا، یا اس نے اس عورت سے نگاہ ہٹالی، آنکھیں بند کر لیں، اس نے نگاہ نہیں ہٹائی مگر یہ کہ خدا نے جنت میں حور العین کو اس کی زوجیت میں دیدیا۔

شرع میں بعض موقعوں پر نامحرم پر نظر ڈالنے کو جائز قرار دیا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

---

۱ وسائل الشیعہ ج ۱۴ کتاب النکاح ص ۱۳۸-۱۳۹ ۲ وسائل الشیعہ کتاب النکاح ج ۱۴

استثنائی موقعوں پر دیکھنا جائز

قرآن مجید کی بعض آیتوں اور رسالۃ الحقوق میں امام سجاد کے بیان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خدا نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے انہیں دیکھنا جائز نہیں ہے محرمات سے آنکھوں کو بند رکھنا چاہئے۔لیکن بعض جگہوں پر شارع نے نامحرم کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔اس عورت کو دیکھنا جائز ہے جس سے انسان شادی کرنا چاہتا ہے، کتاب وسائل الشیعہ میں ایک باب اس عنوان کا ہے۔

باب انہ یجوز للرجل النظر الیٰ وجہ امرأۃ یرید تزویجھا و یدیھا و شعرھا و محاسنھا:

اس باب میں پہلی روایت محمد بن یعقوب سے انہوں علی بن ابراہیم سے انہوں نے اپنے والد ابن ابی عمیر سے انہوں نے ایوب بن خزار سے انہوں نے محمد بن مسلم سے نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا:

میں نے ابوجعفر سے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا کہ وہ ایک عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

کیا وہ اسے دیکھ سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، کیوں نہیں کہ وہ اسے گراں ترین قیمت میں خرید رہا ہے۔[۱]

اس روایت میں صرف جواز نظر کے بارے میں سوال کیا گیا ہے لیکن یہ حدیث مصداق کو بیان نہیں کرتی ہے کہ دیکھنا کہاں جائز ہے ہاں دوسری روایتیں ایسے مصادیق بیان کرتی ہیں،اسی روایت کی مانند دوسرے باب کی روایت ہے۔

و عنہ عن ابیہ، عن ابن ابی عمیر، عن هشام بن سالم و حماد بن عثمان و حفص بن البختری کلھم عن ابی عبداللہ قال: لا باس بان ینظر الیٰ وجھھا و معاصمھا اذا اراد ان یتزوجھا۔[۲]

علی بن ابراہیم سے انہوں نے اپنے والد ابن ابی عمیر سے انہوں نے ہشام بن سالم اور حماد بن عیسیٰ سے اور حفص بن بختری سے اور سب نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

---

[۱] وسائل الشیعہ ج۱۴ص۵۹ [۲] ایضا

اگر عورت سے شادی کرنے کا ارادہ ہو تو اس کے چہرہ اور کلائی یا گٹے کو دیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

تیسری روایت میں ابوعلی اشعری... نے حسن بن سری سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام صادق کی خدمت میں عرض کیا: ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور اسے غور سے دیکھتا ہے اس کی پشت اور چہروں کو دیکھتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کی پشت و چہرہ کو دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ۱

اسی باب کی دوسری روایات میں بھی عورت کے محاسن کو اس وقت دیکھنے کو جائز قرار دیا گیا ہے جب اس سے شادی کرنے کا ارادہ ہو اور لذت کی نگاہ سے نہ دیکھ رہا ہو۔

ڈاکٹر کا بیمار عورت کو دیکھنا

ڈاکٹر و طبیب کا اس عورت کو دیکھنا بھی مستثنیٰ ہے جس کا علاج کوئی دوسرا نہ کر سکے کتاب وسائل الشیعہ، کی کتاب النکاح کے آداب و مقدمات نکاح کے ایک سو تیسویں باب میں یہ بیان ہوا ہے: اس باب کی پہلی روایت میں اس مطلب کو اس طرح بیان کیا ہے۔

محمدبن یعقوب عن محمد بن یحییٰ عن أحمد بن محمد بن عیسیٰ عن علی بن الحکم، عن ابی حمزة الثمالی عن ابی جعفر علیه السلام. قال: سألته عن المرأة المسلمة یصیبها البلاء فی جسد ها اما کسر واما جرح فی مکان لا یصلح النظر الیه یکون الرجل ارفق بعلاجه من النساء یصلح له النظر الیها؟قال اذا اضطرت الیه فلیعالجها ان شائت. ۲

محمد بن یعقوب محمد بن یحییٰ سے انہوں نے احمد بن محمد بن عیسیٰ سے انہوں نے علی بن الحکم سے انہوں نے ابوحمزہ ثمالی سے انہوں نے ابوجعفر علیہ السلام سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے امام سے اس مسلمان عورت کے بارے میں دریافت کیا کہ جو مریض ہوگئی یا اس کے بدن کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی یا زخم لگ گیا اور اس کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اور علاج کرنے والا ڈاکٹر عورت سے زیادہ ماہر ہے کیا اس عورت کو

---

۱ وسائل الشیعہ ج۱۴ص۵۹ ۲ وسائل الشیعہ ج۱۴ص۱۷۲

ڈاکٹر کو دکھانا جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: مجبوری کے وقت دکھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ اگر عورت چاہتی ہے تو علاج کرا سکتی ہے۔

اہل ذمہ اور بادیہ نشینوں کی عورتوں کو دیکھنا

جن عورتوں کو دیکھنا جائز قرار دیا گیا ہے ان میں اہل ذمہ اور بادیہ نشینوں کی عورتیں بھی ہیں۔
اس سلسلہ میں وسائل الشیعہ کے ۱۱۲ ویں باب میں منقول ہے:

محمد بن یعقوب نے علی بن ابراہیم سے انہوں نے اپنے والد نوفلی سے انہوں نے مسکونی سے انہوں نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: اہل ذمہ کی عورتوں کی کوئی حرمت نہیں ہے ان کے بالوں اور ہاتھوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ [۱]

محمد بن یعقوب نے عباد بن صہیب نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: دیہاتیوں اور بادیہ نشینوں اور خانہ بدوشوں کی عورتوں کے سر اور بالوں کو دیکھنا جائز ہے کیونکہ اگر انہیں بے پردہ رہنے سے منع کیا جاتا ہے تو بھی وہ اپنے بالوں کو نہیں چھپاتی ہیں یہی حکم پاگل اور کم عقل عورت کا بھی ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ جان بوجھ کر اسے نہ دیکھے۔ [۲]

عبرت کے لئے دیکھنا

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: دیکھی جانے والی چیزوں کو عبرت کیلئے دیکھنا چاہئے کیونکہ آنکھیں ایسے دروازے ہیں جو عبرتوں کی طرف کھلتے ہیں انسان کی نگاہ کی قسموں میں سے ایک عبرت آمیز نگاہ بھی ہے کہ جس سے انسان نصیحت حاصل کرتا ہے یہی نگاہ انسان کے لئے نفع بخش ہے۔ ہارون نے موسیٰ بن جعفر کی خدمت میں خط لکھا: مجھے مختصر لفظوں میں وعظ و نصیحت کیجئے۔ امام نے اسے جواب لکھا:
ہر وہ چیز جس پر تمہاری نگاہ پڑتی ہے اس میں تمہارے لئے ایک نصیحت و عبرت ہے۔ [۳]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: عبرتیں کتنی زیادہ ہیں لیکن ان سے عبرت کم حاصل کی جاتی ہے۔ [۴]

---

۱ وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۱۴۹ ۲ ایضاً ص ۱۵۰ ۳ سفینۃ البحار ج ۲ ص ۱۴۶ ۴ ایضاً

کاخ جهان پر است ز ذکر گذشتگان   لکن کسی که گوش کند این نداکم است

دنیا گزرے ہوئے لوگوں کے ذکر سے بھری پڑی ہے لیکن اس ندا کو سننے والے بہت کم ہیں۔

حضرت علیؑ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: جو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ بینا ہو جاتا ہے اور جو بینا ہو جاتا ہے وہ سمجھ جاتا ہے اور جو سمجھ جاتا ہے وہ علم کے رتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔

ایک روایت میں نقل ہوا کہ جب حضرت علیؑ مدائن کے قریب سے گزرے اور وہاں کسریٰ کے محل وغیرہ کے آثار دیکھے کہ جو منہدم ہوا چاہتے ہیں تو آپ کے ایک صحابی نے ابن یعفر یمنی کا یہ شعر سنایا:

جرت الریاح علیٰ رسوم دیارهم   فکانهم کانوا علیٰ میعاد

ان کے مکانوں کے مٹے ہوئے نشانات پر ہوائیں خاک اڑا رہی ہیں گویا ان کی ایک میعاد تھی۔

حضرت علیؑ نے فرمایا: تم نے یہ آیات کیوں نہ پڑھیں:

وکم ترکوا من جنات و عیون و زروع و مقام و نعمة کانوا فیها فاکهین کذالك و اورثنلها قوما آخرین فما بکت علیهم السماء والارض وما کانوا منظرین[۱]

انہوں نے کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑے ہیں، کتنی ہی کھیتیاں اور بڑے بڑے محل وقصر اور ایسی نعمتیں چھوڑی ہیں جن سے وہ مالا مال تھے اور ان کا وارث ہم نے دوسری قوم کو بنادیا اور ان پر آسمان رویا نہ زمین اور نہ انہیں کوئی مہلت دی گئی۔

یہ آیتیں فرعون اور اس کی قوم کے بارے میں ہیں ان تمام ظلم وستم کے بعد حکومت اور وہ سر زمین ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور بنی اسرائیل اس کے مالک ہو گئے۔ وہ دریا میں غرق ہو گئے اور انہیں کوئی نہ بچا جاسکا، ہاں ایسی عبرت آموز نگاہ سے عقلمند سبق لیتے ہیں۔

امام علی نقیؑ اور متوکل

مسعودی لکھتا ہے کہ جب متوکل کے سپاہی امام علی نقیؑ کے گھر میں داخل ہوئے اور انہیں کوئی

---

[۱] دخان: ۲۵

چیز نہ ملی تو انہوں نے متوکل کو صورت حال بتائی، وہ اپنی بزم میں شراب چڑھائے ہوئے مست بیٹھا ہوا تھا، اس نے حکم دیا کہ امام کو ان کے گھر سے دربار میں لاؤ، امام آئے تو اس نے آپ کا احترام کیا، اور شراب کا جام آپ کی طرف بڑھایا، امام نے فرمایا: شراب میرے خون و گوشت میں داخل نہیں ہوئی ہے، مجھے اس سے معاف رکھا جائے، متوکل نے کہا: کوئی شعر سنائیے، امام نے فرمایا: مجھے اشعار سے زیادہ شغف نہیں ہے، متوکل نے اصرار کیا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے:

با توا علی قلل الاجبال تحرسهم	غلب الرجال فلم تنفع القلل
واستنزلوا بعد عز عن معاقلهم	واسكنوا حفرا يا بئسما نزلوا
ناداهم صارخ من بعد دفنهم	اين الاساور و التيجان والحلل
اين الوجوه التى كانت منعمة	من دونها تضرب الاستار والكلل
فافصح القبر عنهم حين سائلهم	تلك الوجوه عليها الدود تنتقل
قد طال ما اكلوا دهرا وقد شربوا	واصبحوا اليوم بعد الاكل قد اكلوا

وہ بلند و بالا اور عظیم الشان محلوں میں رہتے تھے اور پاسبانوں اور محافظوں کے ذریعہ ان کی حفاظت ہوتی تھی لیکن بلند محلوں اور پاسبانوں نے انھیں کوئی فائدہ نہیں دیا۔ وہ اپنے محلوں سے نیچے آگئے ہیں جن میں وہ عزت کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، اور اب انہوں نے قبر کے گڑھے میں سکونت اختیار کر لی ہے جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ ان کے دفن کے بعد ایک منادی نے آواز دی، تمہارا تاج اور ٹھاٹ باٹ کہاں گیا اور شاداب و تر و تازہ چہروں کو کیا ہو گیا۔ قبر کے گوشہ سے آواز آئی: ان کے چہرے حشرات کا گھر بن گئے ہیں ایک زمانہ تک انہوں نے کھایا پیا اب انہیں کھایا جا رہا ہے۔[1]

متو ان اشعار کو سن کر رونے لگا اور اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ ایک قول کے مطابق اس نے جام شراب کو زمین پر دے مارا یہ ہے عبرت آموز نگاہ! مگر افسوس کہ متوکل نے اس سے کوئی عبرت نہ لی۔

محدث قمی نے سفینۃ البحار میں امام صادقؑ سے "اروی سلم کا واقعہ نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

---

[1] منتہی الآمال ج ۲ ص ۳۰۰

حضرت داؤدگھر سے برآمد ہوئے زبور کی تلاوت کی، پرندے اور درندے بھی آپ کے ساتھ پڑھ رہے ہیں وہ اس پہاڑ کے پاس گزرے جہاں حضرت حزقیل عابد تھے، حضرت داؤد نے کہا: کیا حاضر خدمت ہونے کی اجازت ہے؟ کہا: نہیں، حضرت داؤد رونے لگے۔ خداوند عالم نے حضرت حزقیل کو ندادی کہ داؤد کو رنجیدہ نہ کرو، اسلئے حزقیلؑ نے داؤدؑ کو داخل ہونے کی اجازت دیدی، حضرت داؤد نے ان سے دریافت کیا: ابھی تک آپ نے کبھی گناہ کرنے کا ارادہ کیا ہے؟ فرمایا: نہیں، حضرت داؤد نے پھر سوال کیا: کیا آپ کو کبھی اپنے عمل پر گھمنڈ اور تکبر وغرور ہوا ہے؟ فرمایا: نہیں، کیا کبھی دنیا کی طرف مائل ہوئے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ حضرت داؤد نے کہا: اس حال میں آپ خود کو کس طرح دنیا سے الگ رکھتے ہیں؟ کہا: میں اس درّے میں چلا جاتا ہوں پھر وہ حضرت حزقیل کے ساتھ درے میں گئے وہاں ایک لوہے کا تخت دیکھا جس پر ایک کھوپڑی نصب تھی اس کے کنارے ایک تختی تھی اس پلا یہ لکھا تھا: یہ کھوپڑی اروی سلم کی ہے، جس نے ہزار سال حکومت کی، ہزار شہر بسائے، ہزار جوان عورتوں سے شادی کی آخر کار یہاں پہنچا کہ خاک اس کا بستر ہے اور کیڑے مکوڑے اس کے مونس ہیں، جو شخص مجھے دیکھے اسے دنیا کے فریب میں نہیں آنا چاہئے یہ ہے عبرت بیں نظر۔

آنکھ کی ساخت

آنکھ دو چیزوں سے مل کر بنی ہے ایک اس کے فرعی اجزا ہیں دوسرے آنکھ کی چربی ہے، فرعی اجزاء عبارت ہیں حدقہ، پلک، بھویں، ابرو اور آنکھ کو گردش دینے والے عضلات سے:

ا۔ حدقہ: متعدد ہڈیاں ایک دوسرے سے متصل ہو گئی ہیں جس سے مخروطی شکل کا جوف یا صندوقچہ سا بن گیا ہے تاکہ اس میں آنکھ کی لطیف و پراسرار چربی (ڈیلا) محفوظ رہے۔ ایسی نازک چیز کے لئے ایک مضبوط صندوق ضروری ہے مذکورہ ہڈیاں اوپر کی طرف پیشانی کی ہڈیوں سے اور نیچے کی طرف چہرہ کی ہڈیوں سے باہر کی طرف کن پٹی اور اندر کی طرف اس ہڈی سے متصل ہے جو ناک کی ہڈی سے ملی ہے۔

حدقہ آنکھ کی چربی اور ان تمام لطیف ونازک اعضاء کو محفوظ رکھنے کے لئے جو کہ ہڈیوں کے

اس صندوقچہ کے اندر ہیں، اس صندوقچہ کی داخلی اور اندرونی فضا چربی کے مادہ سے، جو کہ ایک حد تک سیال بھی ہے، پر ہے، حدقہ ایک جھلی یا پردے کے وسیلہ سے دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے، سامنے کا آنکھ ہی ہے اور اس کے پیچھے کے حصہ میں بینائی کے تار ہیں، کہ جن کا کام دماغ تک تصویریں بھیجنا ہے اور اسی میں حسی و حرکی تار واعصاب اور آنکھ کو گردش دینے والے مچھلی نما یا چوہے کی شکل کے گوشت کے ٹکڑے ہیں اور وہ رگیں ہیں جو حدقہ اور مچھلی نما عضلات تک خون پہنچاتی ہیں۔

۲۔ پلک: آنکھوں کے سامنے ظریف و مضبوط دو پردے لٹکا دیئے گئے ہیں جو سردی و گرمی اور گرد و غبار سے آنکھ کی حفاظت کرتے ہیں نیند اور خطرے کے وقت خود بخود بند ہو جاتے ہیں تا کہ کسی بھی ہونے والے حملہ اور وارد ہونے والے صدمہ سے آنکھ کی حفاظت کر سکیں اس کے علاوہ روشنی کو اعتدال میں لانے کی ذمہ داری بھی انہیں کی ہے۔

عام اوقات میں ایک منٹ میں بار ہا پلکیں بند ہوتی ہیں جس کے نتیجہ میں ایک مخصوص پانی کو جو کہ آنکھ کے بالائی حصہ میں واقع غدود سے ٹپکتا ہے آنکھ کے صفحہ پر بہا دیتی ہیں جس سے آنکھ دھل جاتی ہے اس طرح انہیں ہمیشہ تر و تازہ رکھتی ہیں اور آنکھ کی کارکردگی کو آسان بناتی ہیں۔

اشکوں کا بہنا دو لحاظ سے آنکھوں کے لئے ضروری اور مفید ہے ایک: تا کہ آنکھوں کی دھلائی ہو جائے اور ہوا کے ذریعہ آنکھ میں پڑنے والے گرد و غبار کو روکے کہ جس سے آنکھ کا اسکرین مکدر و دھندلا ہو جاتا ہے دوسرے: چونکہ یہ بہنے والا مادہ عفونت کی ضد کا حامل ہے اس لئے آنکھ کی چربی کی حفاظت کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۳۔ مژہ: پلکوں کے کناروں پر بالوں کی منظم جھالر لگا دی گئی ہے، جو آنکھوں میں گرد و غبار پڑنے میں مانع ہوتی ہے اور زیادہ روشنی کے وقت اس کا مقابلہ کر کے اس کو گھٹاتی ہے۔ پلکوں کے کناروں پر کچھ غدود ہوتے ہیں ان سے مخصوص چکنا مادہ ٹپکتا ہے جو کہ مژگاں کو چکنا اور ٹھیک ٹھاک رکھتا ہے تا کہ عام حالات میں وہ آنکھوں کے پانی کو رخسار پر نہ بہنے دیں اور آنکھوں کے مستقل طور پر کھلنے اور بند ہونے میں انسان کو تکلیف نہ ہونے دے، اس کے اطراف میں چھ عضلات ہیں تا مختلف سمتوں اوپر، نیچے دائیں، بائیں، اندر اور باہر کی طرف گردش کرنے میں اس کی مدد کریں۔

۵۔ابرو:ہر پلک کے اوپر بے شمار بالوں کی ایک منظم لکیر کھنچی ہوئی ہے جو خوبصورتی کی علامت ہونے کے علاوہ پسینہ کو آنکھ میں جانے سے روکتی ہے اور روشنی کو، خاص طور سے اوپر سے آنے والی روشنی کو اعتدال پر لانے میں خاص اثر رکھتی ہے۔

آنکھ کے ڈیلے کے طبقات

باہر سے اندر کی طرف آنکھ کے طبقات تین پردوں سے وجود میں آئے ہیں۔

ا۔صلبیہ: یہ ایک سفید اور مضبوط پردہ ہے جو پوری آنکھ کا احاطہ کئے ہوئے یہ بہت زیادہ باریک ہے اسکی ضخامت ایک ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہے اس کے باوجود نہایت مضبوط ہے لہذا اپنی ذمہ داری، کہ آنکھ کی حفاظت کرنا ہے، کو بخوبی انجام دیتا ہے۔جس طرح کیمرے میں ایک ڈبہ ہوتا ہے کہ جس کے اندر: رہ بیں اور حساس شیشہ ہوتا ہے اسی طرح ہماری آنکھ میں بھی ایک مضبوط جھلی ہوتی ہے کہ جس کے اندر بہت سے ظریف وحساس اعضاء ہیں اس جھلی میں سے جو چیز دکھائی دیتی ہے وہ آنکھ کی سفیدی ہے۔سامنے کے حصہ میں وہ قدرے ابھرا ہوا، نازک اور شفاف ہوتا ہے تاکہ نور اس سے آسانی کے ساتھ عبور کر سکے اور اسی حصہ کو جو کہ پردہ صلبیہ کا ۹/۱ ہے:اصطلاح میں قرنیہ کہتے ہیں۔صلبیہ کے پیچھے ایک سوراخ ہے جس سے بینائی کی قوت آنکھ کے اندر آتی ہے۔یہ نازک پردہ کہ جس کو تشریح کی اصطلاح میں، طبیہ اور طبی اصطلاح میں غلاف بینائی کہتے ہیں اتنا سخت ہوتا ہے کہ معمولی چاقو طاقت کے زور سے ہی اس کو چیر سکتا ہے چنانچہ آپریشن کے وقت ڈاکٹروں کو تیز چاقو کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۔مشیمیہ: یہ ایک نازک لطیف پردہ ہے جو صلبیہ کی داخلی سطح کو گھیرے ہوئے ہے اس کے اندر بہت سی رگیں ہیں۔اس حساس ترین جھلی کا فریضہ آنکھ کی غذا فراہم کرنا ہے اور چونکہ یہ پردہ ایک حد تک بچہ دانی سے مشابہ ہوتا ہے اس لئے اس کو مشیمیہ کہتے ہیں۔

اس پردہ یا جھلی کے سامنے کے حصہ کو"عنبیہ" کہتے ہیں یہ شکل کے لحاظ سے مسطح اور عمودی ہوتا ہے اور یہی شکل کی تغییر اس بات کا سبب بنی کہ سطح قرنیہ کے اس حصہ میں ایک فضا پیدا ہو گئی اور وہ فضا ایک شفاف وسیال مادہ سے پر ہے جس کو"زلالیہ" کہتے ہیں، رنگ کے لحاظ سے کالا ہے یہ آنکھ کے کالے حصہ کو

تشکیل دیتا ہے بعض لوگوں کی آنکھوں کا یہ حصہ آسمانی اور سبز ہوتا ہے۔

عنبیہ کے وسط میں ایک سوراخ ہوتا ہے جس کو پتلی کہتے ہیں اس کا قطر ۳ تا ۶ ملی میٹر ہوتا ہے۔نور کی لہروں کے مقابلہ میں اس کے دہانہ کی وسعت کم وزیادہ ہوتی رہتی ہے۔یعنی نور جتنا زیادہ ہوتا ہے یہ اتنا ہی تنگ ہو جاتا ہے اور جب نور کم ہوتا ہے تو اس کی وسعت بڑھ جاتی ہے تا کہ یہ آٹومیٹک سسٹم اس نور کو مرتب کر سکے جو آنکھ میں وارد ہوتا ہے درحقیقت یہ کیمرے کے ڈیافرام کی مانند ہوتا ہے ہاں دونوں میں یہ فرق ہے کہ آنکھ خودکار ہے اس کو گھٹانے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس سوراخ کو آنکھ کا تل یا پتلی کہتے ہیں۔جب دو آدمی ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہوتے ہیں تو ہر کی آنکھ کی سیاہی کے وسط میں دونوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔انسان کی آنکھ کی پتلی گول ہوتی ہے اور ہمیشہ کالی نظر آتی ہے کیونکہ اس کے پیچھے کالی فضا ہے جس کو تاریک خانۂ چشم کہتے ہیں۔لیکن دوسرے حیوانات میں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے۔

۳۔شبکیہ: شبکیہ ایک لطیف وحساس جھلی یا پردہ ہے جو مشیمیہ کے بیچ میں واقع ہے اور چونکہ یہ پنجرہ یا کھڑکی سے مشابہ ہے اس لئے اس کو یہ نام دیا گیا ہے۔شبکیہ ایک عصبی پردہ ہے یعنی قوت باصرہ ہی سے مربوط ہے اور باصرہ ہی کے وسیلہ سے وہ دماغ سے مربوط ہوتا ہے اور اس کے عقب میں دو مشخص نقطے ہوتے ہیں ا۔نقطۂ کور: یہ آنکھ کی قوت بینائی کے مدخل میں واقع ہے ۲۔اس نقطہ کا رنگ زرد ہوتا ہے اور یہ بیضوی شکل کا ہے اس کو لکہ زرد کہتے ہیں چیزوں کی تصویریں پہلے اسی پر منعکس ہوتی ہیں پھر دماغ میں منتقل ہوتی ہیں۔

آنکھ کے شفاف سمندر

آنکھ کے کچھ حصے ایسے ہیں جو نور کو اپنے اندر سے گزارتے ہیں اور نتیجہ میں شبکیہ؛ زرد رنگ کے ٹکڑے پر تصویر پھینکتا ہے۔اور یہ حصے درج ذیل ہیں:

ا۔زلالیہ: قرنیہ، اور عنبیہ کے درمیان ایک فضا ہے جس کی وسعت وچوڑائی تین سے چار ملی میٹر تک ہوتی ہے، یہ شفاف اور نتھرے سیال مادے سے لبریز ہے۔اسی لئے اس کو زلالیہ کہتے ہیں۔

روشنی اور نور کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ جب رقیق و پتلا محیط، گاڑھے اور غلیظ محیط میں داخل ہوتا ہے تو اس میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے اسی انقلاب کو انکسار نور (نور کا دھاکہ) کہتے ہیں، بنابرایں جو نور ہوا کے ہلکے پھلکے محیط میں موجود ہے جب وہ اس ماحول میں آتا ہے تو وہ تھوڑا گاڑھا ہو جاتا ہے زلالیہ ہو جاتا ہے، منقلب ہو جاتا ہے اور شبکیہ پر منعکس ہونے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔

۲۔جلیدیہ: اس عضو کو عدس چشم بھی کہتے ہیں یہ ٹھوس و جامد اور شفاف ہے معمولی ذرہ بین کی مانند ہے ضخامت مین تین چار ملی میٹر موٹا ہوتا ہے اور آنکھ کے دوسرے پردہ یعنی عنبیہ کی پشت پر ہوتا ہے اور اس کا مرکزی حصہ اس کے اطراف کے حصوں سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔اس کے اوپر ایک نرم پردہ ہے اس کے اطراف میں کچھ ایسے عضلات ہیں جو شکل کو بدلنے کا سبب ہوتے ہیں۔

نور کو توڑنے اور زرد پردہ پر اجسام کی صورتوں کی تطبیق میں اس عضو کا اہم اور قابل توجہ اثر ہوتا ہے کیونکہ ساری تصویروں کو معین نقطہ پر پڑنا چاہئے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ آنکھ کے لنز سے سارے اجسام کا فاصلہ برابر نہیں ہے، ان میں سے بعض نزدیک اور بعض دور ہیں اس وقت یہی آنکھ کا لنز مرئی اجسام کے اس فاصلہ کو اپنی ترچھی شعاعوں اور (Iris) عضلات کے انقباض کے وسیلہ سے کم کر لیتا ہے تاکہ تصویریں شبکیہ پر منطبق ہو جائیں، اور یہ کام، جس کو تطابق کہتے ہیں، نہایت ہی آسانی اور تیزی سے انجام پذیر ہوتا ہے۔

۳۔زجاجیہ: یہ ایک صاف و شفاف مادہ ہوتا ہے جو آنکھ کے اندرونی گڑھے کو پر رکھتا ہے اور آنکھ کے لنز کے عقب میں قرار پاتا ہے اور اس کے اطراف میں ایک صاف ستھری جھلی ہوتی ہے، اس عضو کا کام بھی نور کو توڑنا ہے اور لکہ زرد (Yellow spot) پر اجسام کی تصویروں کی مطابقت میں اس کا بڑا کردار ہوتا ہے۔

آنکھ اور کیمرہ کی شباہت

فزیکی نقطۂ نظر سے آنکھ اور کیمرہ میں بہت سی مشابہتیں ہیں، کیمرہ میں اس کے لنز کے ذریعہ تصویریں ریل پر پڑتی ہیں اور آنکھ میں بھی چیزوں کی تصویریں شبکیہ پر ٹھہرتی ہیں۔کیمرہ میں لنز کی طاقت

کو لنز کو آگے، پیچھے کر کے بدل سکتے ہیں اور تصویر کو واضح کر سکتے ہیں اسی طرح آنکھ میں بھی لنز کی طاقت کی تبدیلی کے ذریعہ شبکیہ پر پڑنے والی تصویر کو واضح کر سکتے ہیں کیمرے میں ڈیافرام اور آنکھ میں سیاہ گول پردہ نور کی شدت کو منظم کرنے میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ مختصر یہ کہ کیمرہ ہو یا آنکھ دونوں میں اشیاء کی تصویر معکوس ہوتی ہیں دماغ کا پردہ تصویر کو سیدھا کرتا ہے اور اشیاء کی تصویر کو صحیح دیکھتا ہے۔

آنکھ کی فیزیولوجی (Physiology)

دیکھنے کے لئے اشیاء کی تصویر شبکیہ پر پڑتی ہے اور یہی بینائی کے خلیوں کی تحریک کا باعث ہوتی ہے۔ ایک ایک عصبی موج بینائی کے ریشوں کے ذریعہ دماغ تک پہنچتی ہے جہاں اس کا ادراک ہوتا ہے اور آنکھ کی پتلی کے ذریعہ نور منظم ہوتا ہے۔ اور نتیجہ میں آنکھ کی پتلی سے اشیاء کے فاصلہ کو نور کی شدت کے لحاظ سے کم و زیادہ کرتا ہے۔ اور زیادہ نور میں یا پتلی سے نزدیک دکھائی دینے والی چیز کو تنگ اور کم نور میں دور دکھائی دینے والی چیز کو اس کے برعکس کرتا ہے۔

آنکھ کی خرابی

عام طور پر چیزوں کی تصویر شبکیہ پر پڑتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اشیاء کی تصویر صحیح طریقہ سے شبکیہ پر نہیں پڑتی بلکہ اس سے آگے یا اس سے پیچھے پڑتی ہے اگر اس سے آگے پڑتی ہے تو آنکھ نزدیک دیکھتی ہے اور اگر اس سے پیچھے پڑتی ہے تو آنکھ اسے دور دیکھتی ہے۔

آنکھ کا نزدیک دیکھنا، اس وقت آنکھ نزدیک دیکھتی ہے جس وقت قرنیہ اور لنز کے درمیان کا فاصلہ معمول سے زیادہ ہوتا ہے یا شبکیہ سے لنز کا فاصلہ زیادہ ہوتا ہے یا لنز کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ ان تمام صورتوں میں ہر چیز کی تصویر شبکیہ سے آگے پڑتی ہے۔

آنکھ کا دور دیکھنا، دور دیکھنا، نزدیک بینی کے برعکس ہے اس میں قرنیہ کا فاصلہ آنکھ کے لنز سے کم ہوتا ہے یا پھر آنکھ کے لنز کی طاقت میں ضعف ہوتا ہے، اس خلل میں چیزوں کی تصویر شبکیہ کی پشت پر

پڑتی ہے، سن رسیدہ لوگوں کو اکثر دور نظر آتا ہے اسی وجہ سے اس کو آنکھوں کا بڑھاپا کہا جاتا ہے، اس مرض میں آنکھ کا لنز رفتہ رفتہ اپنے ارجاع کی قابلیت کو گنوا دیتا ہے اور پھر وہ تصویر کو شبکیہ پر ٹھہرانے کے قابل نہیں رہتا، آنکھ کے بڑھاپے کے زمانہ میں اشیاء کو دیکھنے کے لئے کہ جب وہ ایک میٹر سے کم آنکھ سے نزدیک ہوں تو اس وقت مناسب پاور کے محدب شیشہ سے مدد لینا چاہئے۔ [1]

فقہی نقطۂ نظر سے آنکھ کی قیمت

تحریر الوسیلہ میں امام خمینی تحریر فرماتے ہیں:

دونوں آنکھوں کی دیت کامل دیت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کی دیت نصف ہے، چندھے، بھینگے رات میں بہتر دیکھنے والا یا رات میں کم دیکھنے والا یا آشوب چشم والا اس شخص کی مانند ہے کہ جس کی آنکھیں صحیح ہیں، اور اگر اس کی آنکھ کی سیاہی میں سفیدی ہو اور دیکھنے کی صلاحیت اس طرح باقی ہے کہ دیکھنے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے تو اس کی دیت پوری ہے۔ اور اگر بینائی کو نقصان پہنچا ہو تو اسی لحاظ سے دیت کے حساب سے کم ہو جائے گی لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ جب تشخیص کا امکان ہو اور اگر اس کا امکان نہ ہو تو اس صورت میں ارش ہے یعنی صحیح و معیوب کے درمیان فرق کے لحاظ سے دیت دی جائے گی۔ [2]

کتاب، مبانی تکملۃ المنھاج میں، آنکھ کی دیت کے بارے میں یہ تحریر ہے: **وفیھما الدیة کاملة** "دونوں آنکھوں میں ایک کامل انسان کی دیت ہے، پھر حاشیہ پر لکھتے ہیں: اس سلسلہ میں علما کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ شیخ اور ابن زہرہ نے تو غیر شیعہ کے اختلاف کی نفی کا بھی دعویٰ کیا ہے اور مسالک میں اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے اور سند کے عنوان سے جو روایات نقل کی ہیں ان میں سے ایک عبد اللہ بن سنان کی صحیحہ ہے، انہوں نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

انسان کے بدن میں جس چیز کا جوڑا ہے، جیسے کہ دو ہاتھ اور دو آنکھ، ان میں سے ہر ایک کے

---

[1] شناخت بدن انسان، حسمائی دیڑہ، گفتار اول بینائی ص ۵ تا ۲۲ [2] تحریر الوسیلہ ج ۲ ص ۵۷۲

لئے نصف دیت ہے۔ [1]

اس کے بعد اصل مسئلہ میں فرماتے ہیں:

ہر آنکھ کے لئے نصف دیت ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ آنکھ صحیح تھی یا نہیں، آیت اللہ گلپائیگانی سے لڑکی کی آنکھ خراب کرنے کی دیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا: عورت کی ایک آنکھ کی دیت، عورت کی پوری دیت کی نصف ہے۔ [2] یقیناً انسان کی دونوں آنکھوں کی قیمت خود انسان کی قیمت کے برابر ہے۔

---

[1] مبانی تکملۃ المنہاج ج۲ ص۲۷۲

[2] مجمع المسائل ج۳ ص۲۵۵

پیر کا حق

واما حق رجليك فان لا تمشي بهما الىٰ مالا يحل ولا تجعلهما مطيتك في الطريق المستخفة باهلها فيها فانها حاملتك وسالكة بك مسلك الدين والسبق لك ولا قوة الا بالله ۔ [1]

تمہارے پیروں کا حق یہ ہے کہ ان سے اس چیز کی طرف نہ جاؤ جو تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔ اور انہیں اس راستہ کے لئے اپنی سواری نہ بناؤ جو چلنے والے کی سبکی کا باعث ہوتا ہے کیونکہ وہ تمہیں اٹھاتے ہیں اور دین کی طرف لے جاتے ہیں اور تمہارے آگے بڑھنے کا سبب ہوتے ہیں اور خدا کے علاوہ کوئی قوت وطاقت نہیں ہے۔

لفظ رجل (''ر'' کے کسرے کے ساتھ) قرآن مجید میں بھی آیا ہے: "ارکض برِجلك" اپنے پیر سے چلو، اس کی جمع ارجل ہے، سورۂ اعراف کی ایک سو پچانویں (۱۹۵) آیت میں ارشاد ہے: الهم ارجل يمشون بها۔ اور راستہ چلنے میں دو قدموں کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اسے قرآن مجید میں ''خطوہ'' (خ کے ضمہ کے ساتھ) کہا گیا ہے اسی طرح (خ کے فتحہ کے ساتھ) خطوہ ایک مرتبہ قدم اٹھانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے پہلے کی جمع خُطوات اور دوسرے کی جمع خَطوات ہے۔ [2]

شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے مراد اس کا وسوسہ اور گدگدانا ہے، راستہ چلنے میں صحیح معنی میں اتباع کرنے کا مفہوم یہ ہے اپنے پیر کو اس شخص کے نقش قدم پر رکھنا کہ جس کا اتباع کر رہا ہے اور اسی کی مانند راستہ طے کرنا ہے یہ لفظ ''خطوات'' جمع کی صورت میں قرآن مجید میں پانچ جگہ استعمال ہوا ہے: سورہ بقرہ آیت ۱۶۸ و ۲۰۸ سورہ انعام آیت ۱۴۲ اور سورۂ نور کی آیت ۲۱ مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے سفر میں شیطانی کج دھج کا تابع نہ ہو جائے بلکہ اس صحیح راستہ پر گامزن ہو جو انبیاء کے ذریعہ پہنچوایا کیا گیا ہے۔ [3]

---

[1] مکارم الاخلاق میں اس طرح مرقوم ہے: فيهما تقف على الصراط فانظر ان لا تزل بك فتردىٰ في النار۔ تم انہیں دو پیروں کے ذریعہ صراط پر کھڑے ہوگے ہوشیار تمہیں پھسلا نہ دیں اور خدا کے قہر کی آگ میں نہ ڈال دیں۔

[2] مجمع البیان ج ۱ ص ۲۵۲ [3] قاموس قرآن ج ۲ ص ۲۶۴۔

راستہ چلنے کے معنی میں قرآن میں دوسرا لفظ ''مشی'' بیان ہوا ہے، راغب کہتے ہیں:

الانتقال من مکان الیٰ مکان بارادة '' قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

''کلما اضاء لهم مشوفيه '' جب انہیں روشنی ملتی ہے تو وہ چل کھڑے ہوتے ہیں۔

''مشی'' معنوی طور پر راستہ طے کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، سورۂ حدید کی ۲۸ویں آیت میں آیا ہے:

ویجعل لکم نورا تمشون به ہم نے تمہارے لئے ایک نور قرار دیا ہے جس میں تم چلتے پھرتے ہو، اس سے مراد زندگی میں نور ایمان ہے۔ [۱]

خدا کے خاص بندے کس طرح چلتے ہیں؟

خداوند عالم نے قرآن مجید کے سورۂ فرقان میں اللہ کے بندوں ''عباد الرحمٰن'' کے (بارہ) ۱۲ صفات و خصوصیات بیان کئے ہیں ان میں سے پہلی خصوصیت راستہ چلنا ہے:

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض هوناً [۲]

خدا کے خاص بندے وہ ہیں جو سکون و وقار اور خاکساری کے ساتھ راستہ چلتے ہیں۔

''ہون'' مصدر ہے جس کے معنی خاکساری اور تکبر نہ ہونے کے ہیں اور یہاں مصدر اسم فاعل کے معنی میں تاکید کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ ایسے ہیں بلکہ عین خاکسار و عدم تکبر ہیں۔ [۳] بیشک خدا کے خاص بندوں کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تکبر و غرور نام کو بھی نہیں ہوتا ہے؛ یہ خصوصیت ان کے تمام اعمال میں یہاں تک کہ راستہ چلنے میں بھی دیکھی جا سکتی ہے کیونکہ اخلاق اقدار اور ملکات انسان کے اعمال، گفتگو اور حرکات میں نمایاں ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں رسولؐ کے لئے خدا کا اہم دستور

خدا نے اپنے رسولؐ کو جو اہم دستورات دیئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے: ولا تمش

---

[۱] قاموس قرآن ج ۶ ص ۳۶۰ [۲] فرقان: ۶۳ [۳] تفسیر نمونہ ج ۱۵ حاشیہ ص ۱۴۷

فی الارض مرحا انك لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا [۱]

روئے زمین پر اکڑ کر نہ چلو کیونکہ نہ تم زمین کو شگافتہ کر سکتے ہو اور نہ طول قامت میں پہاڑ کی مانند ہو سکتے ہو۔

یہ آیت ان مغرور متکبر کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے جو راستہ چلنے میں پٹک پٹک کر زمین پر قدم رکھتے تھے اس سے ان کا مقصد لوگوں کو اپنی آمد و رفت سے آگاہ کرنا تھا، گردن اٹھا کر چلتے تھے تاکہ بزعم خود دوسروں سے ممتاز ہو جائیں ان لوگوں سے قرآن کہتا ہے: اگر تم زمین پر اپنا پیر پٹکتے ہو تو اس سے تم زمین کو ہرگز شگافتہ نہیں کر سکو گے کیا تم اس کرۂ زمین پر ایک چھوٹا سا ذرہ نہیں ہو! تم کتنی ہی گردن بلند کر لو پہاڑ کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے بلکہ اپنے قد کو ایک سینٹی میٹر بھی نہیں بڑھا سکتے۔

بعض لوگ ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں کہ وہ خود کو فراموش کر دیتے ہیں، اپنی حقیقت کو بھول جاتے ہیں اور خود کو بڑا سمجھنے لگتے ہیں، رسولؐ کی ایک شاندار حدیث ہے: ایک روز آپ ایک کوچہ سے گزر رہے تھے، ایک جگہ کچھ لوگ جمع تھے، آپ نے ان کے جمع ہونے کی وجہ دریافت فرمائی: عرض کیا گیا کہ ایک دیوانہ ہے جو مضحکہ خیز حرکت کر رہا ہے آپ نے ان لوگوں کو اپنے پاس طلب کیا اور فرمایا: کیا میں یہ بتاؤں کہ صحیح معنی میں دیوانہ کون ہے مجمع پر سناٹا تھا سب ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔ فرمایا:

جو غرور و تکبر کے ساتھ راستہ چلتا ہے اور مستقل ادھر ادھر دیکھتا ہے اپنے کندھوں سے اپنے پہلوؤں کو حرکت دیتا ہے (اپنے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتا ہے اپنے وجود سے آگے اس کی نگاہ نہیں جاتی ہے) جس سے لوگوں کو کسی نیکی کی امید نہیں ہوتی جس کے شر سے وہ محفوظ نہیں ہیں یہی صحیح معنوں میں دیوانہ ہے اور جس کو تم دیکھ رہے تھے یہ تو ایک بیمار ہے۔

راستہ چلنے میں خاکساری یہ نہیں ہے کہ سست چلے اور پھونک پھونک کر قدم رکھے بلکہ خاکساری یہ ہے کہ ایسے قدم اٹھائے جس سے سکون وقار اور سنجیدگی ظاہر ہوتی ہو۔

---

[۱] اسرا: ۳۷

رسول کے چلنے کا انداز

کتاب مکارم الاخلاق میں ایک بحث رسولؐ کے راستہ چلنے سے متعلق ہے جس کا عنوان ''فی مشیہ'' ہے روایات میں سے ایک روایت یہ بھی ہے:

حضرت علی بن ابی طالبؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: جب رسولؐ راستہ چلتے تھے تو عجلت کے ساتھ نہیں چلتے تھے لیکن اس طرح تیزی سے قدم اٹھاتے تھے جیسے اوپر سے نیچے اتر رہے ہوں، نہ میں نے آپ سے پہلے کسی کو اس طرح چلتے دیکھا اور نہ آپ کے بعد۔ [۱]

رسولؐ کے ایک صحابی کا بیان ہے: میں نے کسی کو رسولؐ سے تیز چلتے ہوئے نہیں دیکھا لگتا تھا گویا آپ کے قدم کے نیچے کی زمین سمٹ رہی ہے ہم مشکل سے آپ تک پہنچتے تھے، حالانکہ آپ کے لئے یہ کوئی مشکل نہ تھی۔ [۲]

ابن عباس کہتے ہیں: جب رسولؐ راستہ چلتے تھے تو نہ عاجز و ناتواں کی مانند چلتے تھے نہ کہ کاہل و سست کی طرح۔ [۳]

راستہ چلنے کے بارے میں لقمان کی نصیحت

سورۂ لقمان میں ان نصیحتوں کے ذیل میں جو کہ لقمان نے اپنے فرزند کو کی ہیں، یہ جملہ بھی ہے:

(ولا تمش فی الارض مرحا ان اللہ لا یحب کل مختال فخور)

بیٹا زمین پر اکڑ کر نہ چلو کیونکہ خدا کسی مغرور و متکبر کو پسند نہیں کرتا ہے۔ [۴]

مرح، فرح کے وزن پر ہے جس کے معنی نعمت کے سبب مغرور و مست ہونا ہیں اور مختال، خیال خیلاء سے مشتق ہے اس کے معنی اپنے خیال میں خود کو بڑا سمجھنا ہے، اور فخور، فخر سے مشتق ہے، یعنی دوسروں کے سامنے فخر کرنے والا مختال و فخور میں یہ فرق ہے کہ پہلا لفظ کبر آلود ذہنی تخیلات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرا کبر آمیز بیرونی اعمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۱۔ مکارم الاخلاق ص ۲۲ ۲۔ تفسیر نمونہ ج ۱۵ ص ۱۵۳ ۳۔ مکارم الاخلاق ص ۲۲ ۴۔ لقمان: ۱۸

بعد والی آیت میں اثباتی پہلو کو بیان کرتا ہے۔"واقصد فی مشیك" اپنا راستہ چلنے میں اعتدال کو ملحوظ رکھو، رسول کی حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

جو شخص غرور و تکبر کے ساتھ زمین پر چلتا ہے اس پر زمین اور زمین کے اندر والے اور روئے زمین پر بسنے والے لعنت کرتے ہیں۔ [1]

امالی میں ایک حدیث میں ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے جن سے رسولؐ نے روکا ہے: رسولؐ نے غرور و تکبر کے ساتھ راستہ چلنے سے منع کیا ہے اور فرمایا: اگر کوئی شخص کوئی لباس پہنے اور اس پر تکبر کرے تو خداوند عالم اس کو زمین کے اس گڑھے میں پہنچا دیتا ہے جو جہنم کے کنارے ہے اور ایسا شخص قارون کا ہمنشیں ہوگا۔ کیونکہ وہ پہلا شخص ہے جس نے تکبر و غرور کی بنیاد رکھی تو خدا نے اسے اس کے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا اور نابود کر دیا۔ [2]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: خدا نے انسان کے اعضاء و جوارح پر ایمان کو واجب کیا ہے اور ایمان کو ان کے درمیان تقسیم کیا ہے، پیروں پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ گناہ و معصیت کی طرف نہ جائیں اور خدا کی مرضی کے مطابق اٹھائیں۔ [3]

روز قیامت کے گواہ

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: آج ہم ان کے منہ پر مہر لگاتے ہیں آج ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پیر ہمارے سامنے ان کاموں کی گواہی دیں گے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں۔ [4]

سورۂ نور میں آیا ہے: جس دن ان کے خلاف ان کے کئے ہوئے اعمال کی گواہی ان کی زبان، ان کے ہاتھ اور ان کے پیر دیں گے۔

اعضاء کے بولنے اور گویا ہونے کی کیفیت کے سلسلہ میں مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں:

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۴ ص ۲۰۷ [2] ایضا [3] اصول کافی ج ۲ ص ۳۴ [4] یٰس: ۶۵

۱۔اس دن خدا ہر عضو کے اندر ادراک وشعور اور بولنے کی قدرت پیدا کردے گا اور وہ سچ بولیں گے، کیا یہ کوئی تعجب کا مقام ہے؟ جس نے زبان نامی گوشت کے ٹکڑے میں یا دماغ میں یہ طاقت پیدا کی ہے وہ تمام اعضا کے اندر بھی یہ طاقت پیدا کرسکتا ہے۔

۲۔ان کو ادراک وشعور نہیں ملے گا لیکن خدا نہیں بولنے پر اکسائے گا بلکہ وہ خدا کے حکم سے حقائق کو آشکار کریں گے اور زبان کی مانند ہو جائیں گے۔

۳۔ہر انسان کے بدن کے اعضاء ان اعمال کے آثار کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہونگے جو اس نے پوری زندگی میں انجام دیئے ہیں کیونکہ اس دنیا میں کوئی عمل بھی نابود نہیں ہوتا ہے اور ان کے آثار کا ظاہر ہونا گواہی کے مثل ہے یہ مفہوم روز بولا جاتا ہے ادبا کے کلام میں بھی اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلا کہتے ہیں: عینك تشهد بسهرك، تمہاری آنکھ تمہاری بیداری کی گواہ ہیں۔ایک فارسی شاعر کہتا ہے:

رنگ رخسارہ خبر می دہد از سر درون [1]

مومنوں کی حاجت روائی کے لئے جانا

امام زین العابدینؑ نے پاؤں کے حق کے بارے میں فرمایا ہے: اپنے پیر سے حرام جگہ نہ جاؤ اور جس راستہ میں تمہاری ہتک ہوتی ہو اس پر قدم نہ رکھو کیونکہ یہ انسان کی بے وقعتی کا سبب ہوتا ہے اگر ہم اپنی حیثیت و وقعت بنانا چاہتے ہیں تو خدا کے بندوں کی حاجت روائی کے لئے قدم اٹھائیں:

علی بن ابراہیم نے اپنے والد سے انہوں نے حماد سے انہوں نے ابراہیم بن عمر یمانی سے اور انہوں نے امام صادق سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

کوئی بندہ ایسا نہیں ہے کہ جو اپنے مومن بھائی کی حاجت روائی کے لئے قدم اٹھائے مگر یہ کہ خدا اس کے لئے ہر اٹھنے والے قدم کے عوض ایک نیکی وخوبی لکھتا ہے اور اس کے ہر قدم پر ایک گناہ کو مٹاتا ہے اور اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے۔مکارم الاخلاق کی عبارت کے مطابق امام زین العابدینؑ نے فرمایا: تم

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۱۸ ص ۴۳۱

اپنے دونوں پیروں سے پل صراط پر کھڑے ہو گے ہوشیار! تمہارے پیر نہ پھسلیں اور تمہیں جہنم میں نہ گرادیں۔[1]

لوگوں کا جہنم میں داخل ہونا

خداوند عالم سورۂ مریم کی آیت ۷۱و۷۲ میں اس طرح اس کی خبر دیتا ہے:

تم سب جہنم میں جاؤ گے یہ تمہارے پروردگار حتمی حکم ہے پھر ہم اس سے ان لوگوں کو نجات عطا کریں گے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے اور ظالموں کو جو کہ عاجز آچکے ہونگے، اسی میں چھوڑ دیں گے۔

مفسرین نے ان دو آیتوں کی مختلف تفسیریں کی ہیں کہ جہنم میں داخل ہونے سے مراد کیا ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ ورود کے معنی نزدیک ہونا ہیں یعنی اچھے برے سب لوگ جہنم سے نزدیک ہو کر اسے دیکھیں گے پھر نیک وشریف بچ جائیں گے برے لوگ جہنم میں چلے جائیں گے اس پر انہوں نے حضرت موسیٰ کے بارے میں نازل ہونے والی سورۂ قصص کی آیت سے استدلال کیا ہے، ارشاد ہے:

ولما ورد مدین ''جس وقت موسیٰ مدین کے پانی کے کنارے پہنچے۔

دوسری تفسیر کہ جس کو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے: ورود کے معنی نزدیک ہونا نہیں ہیں بلکہ یہ داخل ہونے کے معنی میں ہے، حقیقت میں سارے انسان جہنم میں داخل ہوں گے لیکن مومنین نجات پاجائیں گے اور مشرکین اس مماثلت کے مطابق جو کہ ان کو آگ سے ہے اسی میں رہ جائیں گے، جو قرینہ اس تفسیر کی تقویت کر رہا ہے وہ آیت کا آخری جملہ ہے: **ثم ننجی الذین اتقو و نذر الظالمین.** اس سے دوسرے معنی ہی سمجھ میں آتے ہیں پھر اس آیت کی تفسیر سے متعلق جو حدیثیں آئی ہیں وہ بھی دوسرے معنی ہی کی تاکید کر رہی ہیں۔

جابر بن عبداللہ انصاری سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ ایک شخص نے ان سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا، جابر نے دو انگلیوں سے دونوں کانوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا: میرے ان دونوں کانوں نے رسول سے سنا ہے اگر جھوٹ بولوں تو یہ بہرے ہو جائیں فرماتے تھے یہاں ورود کے معنی

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۱۹۷

دخول کے ہیں، کوئی نیکوکار اور بدکار ایسا نہیں ہے جو جہنم میں نہ جائے لیکن مومنوں کے لئے آگ ٹھنڈی ہو جائے گی اور وہ جلنے سے محفوظ رہیں گے بالکل اسی طرح جس طرح ابراہیم کے لئے ہوا تھا، یہاں تک کہ آگ یا جہنم (اس میں جابر کو شک ہے) سردی کی شدت سے فریاد کرے گا۔ پھر خداوند عالم مومنوں کو رہائی عطا کرے گا اور ظالموں کو رسوائی کے ساتھ اسی میں چھوڑ دیا جائے گا۔ [1]

دوسری حدیث رسولؐ کی ہے: روز قیامت مومن سے آگ کہے گی: اے مومن گزر جا کہ تمہارا نور میرے شعلوں کو خاموش کئے دے رہا ہے۔ [2]

یہی معنی ان روایات سے سمجھ میں آتے ہیں جو صراط کے بارے میں آئی ہیں کہ جہنم کے اوپر ایک راستہ ہوگا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا۔

رسول سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا: تمام لوگ آگ میں وارد ہونگے پھر اپنے اعمال کے مطابق اس سے باہر آئیں گے، بعض بجلی کی مانند کچھ تیز ہوا کی مثل، بعض گھوڑے کے دوڑنے کی مانند کچھ معمولی سوار کی طرح، بعض تیز چلنے والے کی مانند اور بعض معمولی راستہ چلنے والے کی طرح۔ [3]

پیروں کی ساخت

دھڑ کے نچلے حصہ میں رانوں سے اوپر کا حصہ، ران، پیر اور پنڈلیاں ہیں رانوں سے اوپر کا حصہ بدن کے نچلے حصہ کو اوپر کے حصہ سے جوڑتا ہے یہ، کمر بند ہڈی ریڑھ کی ہڈی کی انتہا اور کولہے ہڈی سے تشکیل پاتی ہے۔

کولھے کی ہڈیاں پیچھے کی طرف سے خاجی ہڈیوں سے اور سامنے کی طرف جوڑ سے متصل ہو کر ایک گڑھا سا بن گیا ہے اس کو مجموعہ پیڈو کہتے ہیں۔

لیکن کولھے کی ہڈی چوڑی اور اَن گھڑ قسم کی ہوتی ہے یہ تین ہڈیوں " Iliam, Isehiam, pubis " سے مل کر بنی ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۳۵۲ [2] ایضا ۳۵۴ [3] ایضا ۳۵۳

ران کی ہڈی

یہ ہڈی پوری ران کو تشکیل دیتی ہے، اس کا اوپر کا حصہ گول جو ایک بڑی، چپٹی ہڈی کے پیالہ نما گھرے خانہ میں فٹ ہے اور نیچے جا کر پنڈلی سے گھٹنے کے جوڑ پر مل جاتی ہے، واضح رہے کہ کھڑے ہونے کی صورت میں ران کی ہڈی، اندر کی طرف جھکی رہتی ہے اور چونکہ عورتوں کا پیڑو کچھ چوڑا ہوتا ہے اس لیے ان کی ران زیادہ جھکی رہتی ہے، ران کی ہڈی، بدن کی سب سے زیادہ لمبی ہڈی ہوتی ہے۔ اس میں ایک تنہ اور دو اطراف ہوتے ہیں، ران کی ہڈی تکونی ہے، اس کا بالائی حصہ، دو حصوں، سر و گردن، میں تقسیم ہوتا ہے۔ اس ہڈی کا سرا صاف اور کروی ہوتا ہے، ران کا بالائی حصہ اندر اور باہر کی طرف تمائل رکھتا ہے اس کا قطر تقریباً ۵ سینٹی میٹر ہوتا ہے ران کی ہڈی کا سرا ایک مضبوط ڈورے کے ذریعہ اشابولم "Acedbulum" کے گڑھے سے متصل ہوتا ہے، خون کی رگیں اسی ڈورے کے ذریعہ ران تک پہنچتی ہیں۔ اگر سن رسیدہ لوگوں کے اس ڈورے پر چوٹ لگ جائے تو ممکن ہے کہ ران کے سرے تک خون نہ پہنچنے کے سبب اس کا بالائی حصہ متاثر ہو کر نابود ہو جائے، ران کی گردن نما ہڈی باریک ہوتی ہے جو ران کے سر کو تنے سے ملاتی ہے۔

ران کا نچلا حصہ چوڑا ہوتا ہے جو کہ پنڈلی کی موٹی ہڈی سے متصل ہوتا ہے یہی گھٹنے کا جوڑا کہلاتا ہے۔ اس کے اوپر ایک چپنی ہوتی ہے۔ گھٹنے کے جوڑ کا پچھلا حصہ تھوڑا چوڑا ہوتا ہے جس میں رگیں اور اعصاب ہوتے ہیں۔

گھٹنے کی چپنی

گھٹنے کے جوڑ پر ایک چھوٹی سی چپنی رکھی ہوتی ہے، جو کہ تکونی ہے یہ ہڈی گھٹنے کو آگے کی طرف جھکنے سے روکتی ہے۔

پنڈلی ہڈیاں

پنڈلی میں دو لمبی لمبی ہدیاں ہوتی ہیں، ایک موٹی اور دوسرے باریک، موٹی ہڈی اندر اور

باریک باہر کی طرف واقع ہے یہ دونوں اپنے بالائی اور نچلے حصہ میں ایک دوسرے سے متصل ہیں ہاں بیچ میں دونوں جدا رہتی ہیں۔

پنڈلی کی موٹی ہڈی

یہ ایک لمبی ہڈی ہے اس کا اوپری حصہ موٹا ہوتا ہے اور اس میں دو ابھار ہوتے ہیں، اس کا بالائی حصہ ران کے نچلے حصہ سے جڑ جاتا ہے۔

پنڈلی کی باریک ہڈی

یہ ہڈی باریک اور لمبی ہوتی ہے اور پیر کے بیرونی حصہ میں واقع ہوتی ہے اس کا بالائی حصہ گھٹنے تک نہیں پہنچتا ہے ہاں موٹی ہڈی کے آخری حصہ سے جڑ جاتا ہے اور نیچے کی طرف نکیلی ہڈی ہے جو ٹخنے کی ہڈی کے اوپر نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

پیر کی ہڈیاں

پیر میں تین جوڑ ہیں: ۱۔ ٹخنے کی ہڈیاں ۲۔ پیر کے تلوے کی ہڈیاں ۳۔ انگلیوں کی ہڈیاں ٹخنہ سات چھوٹی چھوٹی مضبوط سات ناہموار ہڈیوں سے مل کر بنا ہے یہ ہڈیاں دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں، نیچے اور اوپر، نچلے حصہ میں دو پلیٹ نما ہڈیاں اور ایک ایڑی ہے اور اوپر کا حصہ ٹخنہ ہے۔

استخوان قاب

یہ چھوٹی ہڈیاں اوپر کی طرف پنڈلی ہڈیوں سے اور نیچے کی طرف ایڑی کی ہڈی سے اور سامنے کی طرف ٹخنہ کی ہڈی سے جدا ہوتی ہے۔

ایڑی کی ہڈی

یہ چھوٹی ہڈی صرف ایڑی ہی ہے اور پاؤں کے گٹّے کی ہڈی کے نیچے واقع ہے۔

تلوے کی ہڈی

اس میں پانچ لمبی ہڈیاں ہیں جو پیر کے پیچھے کی طرف سے گٹّے کی ہڈیوں سے اور سامنے کی طرف سے انگلیوں کے جوڑ سے جدا ہوتی ہیں۔ پیر کے تلوے کی ہر ہڈی میں بھی ایک تنہ اور دو اطراف ہوتے ہیں۔

تلوے کی کمان نما ہڈی

تلوے کی ہڈی سپاٹ اور مسطح نہیں ہے بلکہ اس میں ٹیڑھا پن ہے۔ یہ ٹیڑھا پن اور پیر کی عرضی دطولی سطح میں واقع ہے۔ کھڑے ہونے کی حالت میں یہ بوجھ سنبھالتی ہے، اس سے راستہ چلنے میں آسانی ہوتی ہے اگر خدانخواستہ یہ تختہ کے مثل سپاٹ ہوتا تو راستہ چلنا دشوار ہو جاتا۔

انگلیوں کے پور

یہ ہاتھ کی انگلیوں کے پور سے کچھ چھوٹے ہوتے ہیں۔ انگوٹھوں کے علاوہ پیر کی ہر انگلی میں تین تین پور ہیں، پیروں کی انگلیاں، ہاتھوں کی انگلیوں کی بہ نسبت اندر کی طرف سے باہر کی جانب گنی جاتی ہیں یعنی انگوٹھے کو اول کہتے ہیں۔

پیر کی فقہی قیمت

امام زین العابدینؑ نے پیر ایسی عظیم نعمت اور اس سے لئے جانے والے کام کے بارے میں وصیت فرمائی ہے لیکن انسان کے اس عضو کا، جو کہ راستہ چلنے کا عامل ہے، فقہی اعتبار سے کیا حق ہے؟

کتاب تکملۃ المنہاج میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

دونوں پیر کاٹنے کی دیت ایک انسان کی دیت ہے اور ایک پیر کی دیت نصف ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ پیر جوڑ سے کاٹا جائے یا پنڈلی سے یا ران سے۔

پیر کی ساری انگلیاں کاٹنے کی پوری دیت ہے، مختصر النافع میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

دونوں پیروں کی دیت پوری ہے اور ان میں سے ایک کی دیت نصف ہے اور دونوں پیروں کی حد پنڈلی کا جوڑ ہے اور پیر کی انگلیوں کا وہی حکم ہے جو ہاتھوں کی انگلیوں[1] کا ہے۔(جیسا آئندہ بیان ہوگا)

---

[1] مبانی تکملۃ المنہاج، ج ۲ ص ۳۱۴ مختصر النافع ص ۳۰۱

ہاتھ کا حق

واما حق یدك فان لاتبسطها الیٰ مالا یحل لك فتنال بما تسطها الیه من اللّٰه العقوبة فی الاجل ومن الناس بلسان اللائمه فی العاجل ولا تقبضها مما افترض اللّٰه علیها ولکن توقرها بقبضها عن کثیر مما لا یحل لها و تبسطها الی کثیر مما لیس علیها فاذا هی قد عقلت و شرنت فی العاجل وجب لها حسن الثواب فی الاجل۔

ہاتھ کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ اسے اس چیز کی طرف نہ بڑھاؤ جو تمہارے لئے حلال نہیں ہے (کیونکہ اگر ایسا کروگے تو) آخرت میں خدا کے عقاب میں مبتلا ہوگے اور دنیا میں لوگوں کی ملامت سے بھی محفوظ نہیں رہوگے اور اسے اس چیز سے بند نہ رکھو جو خدا نے تم پر واجب کی ہے اور اس کا احترام اس طرح کرو کہ ان سے ان بہت سے کاموں کو انجام نہ دو جو ان کے لئے حلال نہیں ہیں اور ان کو ان چیزوں کے لئے کھولو جن میں ان کا نقصان نہیں ہے پھر اگر اس دنیا میں ہاتھ حرام سے باز رہے یا عقل و شرافت سے کام لیا تو آخرت میں ان کے لئے ثواب ہے۔

"ید" کے معنی ہاتھ اور قرآن میں اس کی جمع "ایدی" بیان ہوئی ہے سورۂ فتح آیت ۲۰ میں ہے "کف ایدی الناس عنکم" لیکن استعارہ کے طور پر ہاتھ متعدد معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ [۱]

۱۔ قدرت، تسلط اور ملک جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۲۶ میں بیان ہوا ہے "بیدك الخیر انك علیٰ کل شیءٍ قدیر [۲] اختیار تیری ہی قدرت میں ہے تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

ید مغلولہ ہاتھ روکنے کے معنی میں ہے چنانچہ سورۂ مائدہ کی ۶۴ ویں آیت ہے وقالت الیهود ید الله مغلولة غلت ایدیهم و لعنوا بما قالوا بل یداه مبسوطتان "یہودی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، ان کے ہاتھ بندھ جائیں وہ اپنے قول کی بنا پر لعنت کے مستحق بن گئے بلکہ خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، جس طرح چاہتا ہے انفاق کرتا ہے۔

---

[۱] غفاری کی تصحیح کردہ میں مما تحمل لها ہے [۲] قاموس قرآن ج ۷ ص ۲۶۰۔۲۶۱

۲۔طاقت وقدرت: سورہ ص کی ۴۵ویں آیت: واذکر عبادنا ابراهیم واسحق و یعقوب واولی الایدی والابصار ، ہمارے بندے ابراہیم واسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو کہ صاحب اقتدار اور (طاعت خدا میں) بصیرت رکھنے والے تھے۔

ہاتھ فساد کی جڑ

باوجودیکہ دونوں ہاتھ خدا کی ان نعمتوں میں سے ہیں جو خدا نے انسان کو عطا کی ہیں اور ان کی دیت ایک انسان کی دیت کے برابر قرار دی ہے لیکن زیادہ تر گناہ کا سبب بھی ہوتے ہیں ان میں سے بعض کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے، ارشاد ہے:

ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون [۱]

خشک وتر میں ان کاموں کی وجہ سے فساد پھیل گیا ہے جو کہ لوگوں کے ہاتھوں نے کئے ہیں، خداوند عالم چاہتا ہے کہ انہیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے شاید یہ (حق کی طرف) لوٹ آئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے ہر غلط کام معاشرہ کی کیفیت پر اور اس کے ذریعہ معاشرہ کے افراد پر اثر انداز ہوتا ہے اور اجتماعی نظام میں فساد کا باعث ہوتا ہے اور اپنے عمل وردعمل کا اثر چھوڑ جاتا ہے، بہت سی غلطیاں اور بدبختیاں انسان کے ہاتھ سے انجام پاتی ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: **ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر** [۲]

جو مصیبت بھی تمہارے اوپر پڑتی ہے وہ ان اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے جو تمہارے ہاتھوں نے انجام دیئے ہیں اور بہت سے بخش دیئے جاتے ہیں۔اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ انسان پر جو مصائب پڑتے ہیں وہ ایک قسم کی خدائی جزا ہیں، خداوند عالم سورہ بقرہ میں ارشاد فرماتا ہے:

وانفقوا فی سبیل الله ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة واحسنوا ان الله

---

۱ سورۂ روم: ۴۱ ۲ شوریٰ: ۳۰

یحب المحسنین [1]

راہ خدا میں خرچ کرو اور (اور ایسا نہ کرکے) خود کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیک کام انجام دو کہ خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بہت سی ہلاکتیں خود انسان کے ہاتھوں سے وجود میں آتی ہیں لہذا خدا نے خبردار کیا اور ہلاکت میں پڑنے سے منع کیا ہے۔

کبھی انسان انہیں ہاتھوں کے ذریعہ کہ جن سے اپنے لئے گھر بنانا چاہئے اپنے ہی گھر کو ویران و برباد کر ڈالتا ہے۔ چنانچہ سورۂ حشر میں ارشاد ہے:

وقذف فی قلوبکم الرعب یخربون بیوتهم بایدیهم وایدی المومنین فاعتبروا یا اولی الابصار [2]

ان کے دلوں میں اس طرح خوف و وحشت ڈالدی ہے کہ انہوں نے خود اپنے اور مومنین کے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کر دیا اے بصارت و بصیرت رکھنے والو عبرت حاصل کرو۔

یہ آیت یہودیوں کے بارے نازل ہوئی ہے بعض لوگوں کا قول ہے کہ وہ اندر اندر قلعوں کی دیواروں کو اس لئے گرا رہے تھے تا کہ وہاں سے بھاگ نکلیں، اور ممکن ہے اس کے کنائی معنی مراد ہوں کہ انہوں نے اپنی جاہلیت اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی زندگی برباد کر ڈالی۔ بہر حال، خدا یہ فرماتا ہے کہ بعض انسان اپنے ہاتھوں اپنی سعادت کو گنوا دیتے ہیں۔

قتل، ہاتھ کا گناہ

آدم کے بیٹوں کی داستان میں ہولناک ترین موضوع قتل ہے۔ جب خدا نے ایک کی قربانی کو قبول فرمالیا اور دوسرے کی قربانی کو رد کر دیا، تو اس نے اپنے بھائی کو قتل کی دھمکی دی، بھائی نے جواب دیا: میں تمہیں قتل نہیں کرونگا۔

لئن بسطت الی یدك لتقتلنی ما انا بباسط یدی الیك لا قتلك انی اخاف

---

[1] بقرہ: ۱۹۵ [2] حشر: ۲

اللہ رب العلمین [1]

اگر تم مجھے قتل کرنے کے لئے دست درازی کرو گے تو میں تمہارے قتل کے لئے ہرگز ہاتھ نہیں اٹھاؤنگا، کیونکہ میں عالمین کے پروردگار خدا سے ڈرتا ہوں۔

اس آیت میں ہاتھ کا ذکر ہوا ہے، ایک بھائی دوسرے بھائی سے کہتا ہے: اگر تم اپنے ہاتھ کو گناہ سے آلودہ کرو گے تو میں ہرگز ایسے گناہ کا مرتکب نہیں ہونگا۔ قرآن میں جن مقامات پر ہاتھوں کی طرف گناہوں کی نسبت دی گئی ہے ان میں سے بعض کو ہم نے بیان کیا ہے اب ہم حدیثوں میں سے بعض حدیثیں پیش کرتے ہیں جن میں ہاتھوں کے فرائض کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اصول کافی میں ایک باب اس عنوان سے قائم ہوا ہے کہ انسان کے اعضاء و جوارح کے درمیان ایمان تقسیم ہوا ہے۔ امام صادق فرماتے ہیں:

خدا نے ہاتھوں پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ ان چیزوں کی طرف نہ بڑھیں جن کو خدا نے ان پر حرام کیا ہے اور ان امور کو انجام دیں جن کا خدا نے حکم دیا ہے جیسے صدقہ دینا، صلۂ رحم اور راہ خدا میں جہاد کرنے اور نماز کے لئے طہارت کرنا واجب کیا ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

اے ایمان لانے والو! جب تم نماز کے لئے اٹھو! تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولیا کرو اور اپنے سروں کا اور پیروں کا ٹخنوں تک مسح کرو۔ [2]

قرآن مجید میں متعدد جگہوں پر ہاتھوں کا مختلف الفاظ میں ذکر ہوا ہے اور اہم چیزوں کی ہاتھوں کی طرف نسبت دی گئی ہے ان میں سے بعض کو ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

ہاتھ سے بیعت

بیشک خدا مومنین سے اس وقت راضی ہوا جب انہوں نے (اے رسولؐ) درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے دلوں کی کیفیت معلوم ہوگئی لہذا ان کے دلوں میں سکون و آرام نازل کیا اور انہیں قریبی فتح نصیب کی۔

---

[1] مائدہ: ۲۸ [2] مائدہ: ۶

بیعت ''بیع'' سے مشتق ہے جس کے معنی خرید و فروخت کے وقت ہاتھ میں ہاتھ دینے کے ہیں، لیکن بعد میں بیعت کا اطلاق عہد و اطاعت کے لئے ہاتھ دینے کے معنی پر ہونے لگا اس بیعت کی کیفیت یہ تھی کہ جب کوئی شخص کسی سے وفاداری کا اعلان کرتا تھا اور اس کو صحیح سمجھتا تھا اور اس کی اطاعت کرتا تھا تو وہ اس کی بیعت کرتا تھا شاید ان معنی پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا تھا کہ طرفین خرید و فروخت کے معاملہ کی مانند ایک دوسرے سے پابند رہنے کا عہد کرتے تھے، بیعت کرنے والا اس بات کے لئے آمادہ ہوتا تھا کہ وہ بیعت لینے والے کی اطاعت میں مال و اولاد وغیرہ کی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے۔ بیعت لینے والا بھی اس کی حمایت اور اس کا دفاع کرنے کا عہد کرتا ہے۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

جب وہ کسی امیر کی بیعت کرتے تھے تو اس کے استحکام کے لئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے تھے بالکل ایسے ہی جیسے خریدار و فروخت کنندہ کرتے ہیں۔[1]

خداوند عالم سورۂ فتح میں اپنے رسولؐ سے فرماتا ہے: ان الذین یبایعونك انما یبایعونَ اللہ۔[2]

اے رسولؐ جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں در حقیقت وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں، مرد ہاتھ سے رسولؐ کی بیعت کرتے تھے لیکن عورتیں ایک پانی کے برتن میں ہاتھ ڈال کر بیعت کرتی تھیں۔

لوگ رسولؐ اور ائمہؑ کی بیعت اس لئے کرتے تھے تاکہ ان سے اپنی وفاداری کی تجدید کر کے اسے مستحکم کریں لہذا بیعت توڑنے کو بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ بن جعفر یعنی امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے تھے:

تین گناہ انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں: بیعت توڑنا، سنت کو ترک کرنا اور جماعت کو چھوڑنا۔[3]

ہاتھوں کے اہم کاموں میں سے ایک بیعت بھی ہے۔

ہاتھ سے جزیہ دینا

قرآن مجید میں جن مقامات پر ہاتھ کا ذکر ہوا ہے انہیں میں سے ایک ہاتھ سے جزیہ دینا بھی

۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۰۹ ۲۔ سورۂ فتح ۱۰

ہے سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ما حرم اللہ و رسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن یدوھم صاغرون [1]

(اے رسول) اہل کتاب میں سے جو لوگ خدا اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لائے ہیں اور نہ خدا اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ آئین حق کو قبول کرتے ہیں ان سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک کہ وہ چھوٹے بن کر ہاتھ سے جزیہ نہ دیدیں۔

"جزیہ" جزاء سے مشتق ہے، جزیہ اس مال کو کہتے ہیں جو ان غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کی پناہ میں رہتے ہیں۔ اور یہ جزیہ؛ جان و مال کی حفاظت کی جزاء میں اسلامی حکومت کو دیا جاتا ہے۔ [2]

صاغر" صغر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں حقیر و ذلیل بننے پر راضی ہونا اور مذکورہ آیت میں مراد اسلام و قرآن کے سامنے ذلیل و خوار ہو کر جزیہ ادا کرنا ہے۔

جزیہ ایک قسم کا اسلامی ٹیکس ہے جس کا تعلق افراد سے ہوتا ہے اموال و اراضی سے نہیں ،دوسرے لفظوں میں اسے سالانہ ٹیکس کہہ سکتے ہیں، بعض لوگوں کا گمان ہے کہ لفظ جزیہ عربی نہیں ہے بلکہ اس کی اصل پرانی فارسی کے لفظ "کریت" ہے یعنی وہ ٹیکس جو فوج کی تقویت کے لئے لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے برخلاف لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خالص عربی ہے، جزیہ کے سلسلہ میں اسلامی حکومتوں اور اہل کتاب کے درمیان معاہدے ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہاں بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے: اور یہ معاہدہ وہ ہے جو خالد بن ولید اور فرات کے اطراف میں بسنے والے عیسائیوں کے درمیان ہوا تھا۔ معاہدہ کا متن:

هذا کتاب من خالد بن ولید لصلوا با ابن نسطونا و قومہ انی عاھد تکم علی الجزیۃ والمنعۃ ، فلك الذمۃ والمنعۃ وما منعنا کم فلنا الجزیۃ والا فلا ، کتب

---

[1] توبہ: ۲۹ [2] مفردات (جزی)

سنة اثنی عشرة فی صفر[1]۔

یہ خط خالد بن ولید کی طرف سے عیسائیوں کے سردار صلوبا اور اس کی قوم کے نام ہے میں تم سے جزیہ اور دفاع پر یہ معاہدہ کرتا ہوں اور اس جزیہ کے عوض تم ہماری پناہ وحمایت میں رہو گے جب تک تم ہمیں جزیہ دیتے رہو گے تم ہماری حمایت میں رہو گے اور جب ہم تمہارا دفاع وحمایت چھوڑ دیں گے تو پھر کوئی جزیہ نہیں لیں گے۔ یہ معاہدہ ماہ صفر ۱۲ھ لکھا گیا۔

جزیہ ہاتھ سے دیا جائے یہ بھی جزیہ کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔

ہاتھ کی فزیکی ساخت

ہاتھ میں تین ہڈیاں ہیں، کلائی، ہتھیلی اور انگلیاں، یہ ہڈیاں مجموعی طور پر آٹھ ہیں جو کہ دو ردیفوں میں چار چار ہیں اوپر کے حصہ کا نچلا حصہ کلائی کے نزدیک ہے، ان میں سے تین ہڈیاں کلائی کی ہڈی کے ساتھ گٹے کے مفصل وجوڑ کو بناتی ہیں، نیچے کی ہڈیاں بھی ہاتھ کی ہتھیلی کے ساتھ مفصل بن جاتی ہیں۔

ہتھیلی کی ہڈیاں

ہاتھ کی ہتھیلی میں پانچ ہڈیاں ہوتی ہیں جن کو باہر کی طرف سے اندر کی طرف گنا جاتا ہے (پہلی اور دوسری) اوپر کی طرف ہاتھ کے گٹے کی نچلی ہڈیوں کے ساتھ اور نیچے کی طرف انگلیوں کے پہلے پور کے ساتھ گٹا بنتی ہیں۔

انگلیوں کے پور

انگوٹھے کے علاوہ ہاتھ کی تمام انگلیوں میں تین پور ہوتے ہیں اور ہر پور میں ایک ہڈی ہوتی ہے جس کو بند انگشت کہتے ہیں ہر انگلی کی ایک ہڈی ہتھیلی کی ہڈیوں سے جدا ہوتی ہے انگلیوں کے پور کے

[1] تفسیر نمونہ ج ۷ ص ۳۵۷ اور اس میں تفسیر المنار ج ۱۰ ص ۲۹۴

بالترتیب نام ہیں۔

ان ہڈیوں میں ایک تنہ اور دو اطراف ہیں، پہلے پور کی ہڈی کے اوپر کا حصہ ہتھیلی کی ہڈی سے اور ان کے نیچے کا آخری حصہ دوسرے پور کی ہڈی کے اوپر کا حصہ دوسرے پور کا مفصل یا جوڑ ہوتا ہے۔ پور کی ہڈیاں انگلی کے پہلے پور ہی کی مانند ہوتے ہیں۔ بس تیسرے پور کے نچلے حصہ کے آخر میں مفصل نہیں ہوتا ہے۔

ممکن ہے بیان شدہ ہڈیوں کے علاوہ ہتھیلی کے مفصل سے پہلے اور انگلیوں کے پور میں چھوٹی چھوٹی ہڈیاں ہوں جن کو استخوان کنجدی کہتے ہیں۔ [۱]

فقہ کی نظر میں ہاتھ کی قیمت

اسلامی فقہ میں انسان کے دونوں ہاتھوں کی قیمت پوری دیت مقرر کی گئی ہے اور ایک ہاتھ کی نصف دیت رکھی گئی ہے، مبانی تکملۃ المنھاج میں تحریر ہے:

دونوں ہاتھ کاٹنے کی پوری دیت ہے اور ایک ہاتھ کی نصف دیت ہے اس مسئلہ میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ میں دونوں (منقول ومحصل) قسم کا اجماع ہے، اس سے بھی بڑھکر یہ کہ اس مسئلہ اور اس کے حکم کے سلسلہ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ [۲]

اس حکم پر بہت سی حدیثیں دلالت کر رہی ہیں ان میں وہ حدیثیں بھی دلالت کر رہی ہیں جو کہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو چیزیں انسان کے بدن کے اندر دو، دو ہیں ان کی دیت پوری ہے مثلا ہشام بن سالم کی صحیحہ ہے:

ہشام بن سالم نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو چیزیں انسان کے اندر دو ہیں ان کی پوری اور ایک کی نصف دیت ہے۔ [۳]

امام خمینیؒ تحریر فرماتے ہیں:

۔ ہاتھ کاٹنے کی دیت پوری ہے اور ایک ہاتھ کی دیت نصف ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ

---

[۱] شناخت بدن انسان ص ۷۱-۷۲ [۲] مبانی تکملۃ المنھاج ۲ ص ۲۹۹ [۳] وسائل الشیعہ ج ۱۹ ص ۲۱۷

ہاتھ دایاں ہو یا بایاں اور جس شخص کا پیدائشی ہاتھ ایک ہو یا ایک ہاتھ کہیں کٹ گیا ہو تو اس کے ہاتھ کی دیت بھی نصف ہی ہے۔[۱]

دیت کے دوسرے مسئلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

جس ہاتھ کی اتنی قیمت ہے اس کی حد کہاں تک ہے؟ کہتے ہیں اس کی حد معصم یعنی کلائی اور ہتھیلی کے درمیان مفصل (گٹہ) ہے پس اگر ایک ہاتھ کو گٹے سے قطع کیا جائے تو اسکی نصف دیت ہے خواہ اس میں انگلیاں بھی ہوں اس فرض میں انگلیوں کے لئے الگ سے دیت نہیں ہے اگر ایک انگلی کاٹی جائے تو اسکی دیت پانچ سو دینار ہیں جو پوری دیت کا نصف ہے۔

ہاتھ کے امین ہونے کی قیمت ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کے دونوں ہاتھوں کی دیت وہی ہے جو ایک انسان کے قتل کی ہے اور ایک ہاتھ کی قیمت نصف ہے۔ یعنی پانچ سو مثقال سکہ طلا۔ ابو العلا معری ایک روز سید مرتضیٰؒ کی خدمت میں پہنچا اور چوری کی حد (انگلیاں کاٹے جانے) پر اعتراض کیا اس نے اپنے اعتراض کا اظہار اس شعر کے ضمن میں کیا:

یدبخمس مئین عسجد و دیت ما بالها قطعت فی ربع دینار

جس ہاتھ کی دیت پانچ سو مثقال سونا ہے کیا وجہ ہے اسے اس رقم کی چوتھائی چوری کرنے پر کاٹ دیتے ہیں؟

سید مرتضیٰؒ ایک شعر میں اس کا جواب دیتے ہیں:

عزالامانت اغلاها وارخصها ذل الخیانت فافهم حکمة الباری

یہ امانت کی عزت ہے جس نے ہاتھ کی قیمت بڑھائی ہے اور یہ خیانت کی ذلت ہے جس نے اسکی قیمت کو گھٹا دیا ہے۔

اے ابو العلاء یہ خدا کی حکمت ہے، تم مسئلہ کو صحیح طریقہ سے سمجھو خدا کے قانون پر اعتراض نہ

---

[۱] تحریر الوسیلہ ج ۲ ص ۵۷۸

کرو۔ دوسرے نسخہ میں یہ لکھا ہے کہ سید مرتضٰی نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا:

حراسة الدم اغلاها وارخصها حراسة المال فانظر حکمت الباری

یہ خون کی حفاظت اور مال کی نگہبانی ہے جس نے ہاتھ کی قیمت کو بڑھا دیا ہے لیکن مال پر تجاوز کرنے نے ہاتھ کی قیمت کو گھٹا دیا ہے پس تم خدا کی حکمت کے بارے میں غور کرو۔

مشہور ہے کہ سید مرتضٰی کی بزم میں موجود ایک شخص نے اس طرح جواب دیا:

هناك مظلومة غالت بقيمتها وههنا ظلمت هانت على البارى

جہاں ہاتھ مظلوم ہے یعنی لوگوں کے حقوق کی طرف نہیں بڑھتا ہے وہاں اسکی قیمت ہے جہاں وہ چوری کر کے ظلم کرتا ہے وہاں وہ خدا کی بارگاہ میں بے قیمت ہے۔

اس سلسلہ میں تیسرے شخص نے کہا:

لما كانت امينة كانت ثمينة فلما خانت هانت

جب تک ہاتھ امین تھا با قیمت تھا جب اس نے خیانت کی تو بے قیمت ہو گیا۔

ایک شاعر نے اسی مفہوم کو شعر میں بیان کیا ہے:

خيانتها اهانتها وكانت ثمينا عند ما كانت امينا

اس شعر کا مفہوم بھی یہ ہے کہ ہاتھ کی قیمت اس کے امین ہونے میں ہے اور اس کے خیانت کرنے سے اس کی کوئی قیمت نہیں رہتی ہے۔[1]

---

[1] روضات الجنات ج ۱ ص ۱۷۱

شکم کا حق

واما حق بطنك فان لا تجعله وعاء لقليل من الحرام ولا لكثير و ان تقتصد له في الحلال ولا تخرجه من حد التقويه الى حد التهوين و ذهاب المروة وضطبه اذا هم بالجوع والظماء فان الشبع المنتهي بصاحبه الى التخم مكسلة و مقطعه عن كل بر و كرم وان الريّ المنتهي بصاحبه الى الشكر مستخفة و مجهله و مذهبة للمروة۔

تمہارے شکم کا حق یہ ہے کہ اسے قلیل و کثیر حرام کا ظرف نہ بناؤ بلکہ حلال میں سے بھی اسے اس کے اندازہ کے مطابق دو اسے تقویت کی حد سے نکال کر پرخوری اور بے مروتی کی حد تک نہ پہنچاؤ اور جب وہ بھوک و پیاس میں مبتلا ہو تو اسے قابو میں رکھو کیونکہ شکم پری سستی و کسالت کا باعث ہوتی ہے اور ہر نیک و مستحسن کام کی انجام دہی سے باز رکھتی ہے اور جو مشروب اپنے پینے والے کو مست کر دے وہ اسکی سبکی، نادانی اور بے مروتی کا سبب ہوتا ہے۔

انسان غذا کا محتاج ہے

سارے انسان غذا (کھانے) کے محتاج ہیں: اگر انہیں کھانا وخوراک نہ ملے تو وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے، بعض لوگوں کا گمان ہے کہ خدا کے بھیجے انبیاء کو غذا کی ضرورت نہیں ہوتی تھی ۔قرآن ان کے اس خیال تردید کرتا ہے:

وما جعلناهم جسدا لا ياكلون الطعام وما كانوا خالدين [۱]

اور ہم نے انبیاء کو ایسا جسد نہیں بنایا جو کھانا نہ کھائے اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے نہیں تھے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ پیغمبر کا انکار کرنے والوں کے اعتراض کو اس طرح نقل کیا ہے:

وقالوا ما لهذا الرسول ياكل الطعام و يمشى فا الاسواق [۲]

---

[۱] انبیاء: ۸ [۲] فرقان: ۷

وہ کہتے ہیں: اس رسول کو کیا ہو گیا کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازار میں چلتا پھرتا ہے؟!

قرآن مجید میں انسان کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنے کھانے کے بارے میں غور کرے:

فلینظر الانسان الیٰ طعامه ان صببنا الماء صبا ثم شققنا الارض شقا [1]

انسان کو اپنے کھانے کو دیکھنا چاہئے ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے اور زمین کے اندر سے دانہ ہم نے اگایا ہے۔

خارجی چیزوں میں انسان سے سب سے زیادہ نزدیک اسکی خوراک ہی ہے کہ وہ تھوڑی سی تبدیلی کے بعد انسان کے بدن کا جز بن جاتی ہے، اگر اسے خوراک نہ ملے تو عنقریب فنا ہو جائیگا یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام موجودات میں سے غذائی مواد کا سہارا لیا ہے وہ بھی اس مواد سے جو انسان کو نباتات اور درختوں سے حاصل ہوتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ غذا ہے کیا؟ واضح ہے کہ دیکھنے سے ظاہری طور پر دیکھنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ انسان کو چاہئے کہ اس غذائی مواد کی ساخت و ترکیب اور اس کے حیات بخش اجزاء میں اور انسان کے بدن میں اس کے حیرت انگیز اثر کرنے کے بارے میں غور کرنا مراد ہے۔

بعض افراد نے یہ کہا ہے کہ ظاہری نگاہ ہی مراد ہے کہ اس سے دہن کے غدوں سے لعاب مترشح ہوتا ہے اور نتیجہ میں کھانے کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے، لیکن یہ تفسیر کچھ بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سے پہلی اور بعد والی آیتوں میں اس قسم کے مسائل نہیں بیان ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے: دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ دسترخوان پر بیٹھکر یہ غور کرے کہ یہ کھانا کس طریقہ سے فراہم ہوا ہے، شرعی طریقہ سے یا غیر شرعی طریقہ سے؟! یہ اخلاقی اور تشریعی پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔

ائمہ معصومینؑ سے جو روایات نقل ہو کر آئی ہیں ان کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غذا سے مراد جان اور علم کی غذا ہے یعنی ان کی غذا کے بارے میں غور کرے کہ علم کس طریقہ سے سیکھا ہے؟

درج ذیل آیت کے سلسلہ میں امام محمد باقرؑ نے فرمایا: انسان جس علم کو حاصل کرتا ہے اس کے بارے میں غور کرے کہ کس سے حاصل کر رہا ہے؟ [2] امام صادقؑ نے بھی یہی معنی بیان کئے ہیں۔ بعد

---

[1] عبس: ۲۴ تا ۲۶ [2] تفسیر نمونہ ج ۲۶ ص ۱۳۶

والی آیتوں کے سیاق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ غذا سے مراد، ظاہری اور جسم کی غذا ہے کیونکہ اس میں بارش برسنے دانہ کے شگافتہ ہونے اور غذا کے فراہم ہونے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں انسان کو اپنے جسم کی غذا کے بارے میں غور کرنا چاہئے اور یہ سوچنا چاہئے کہ اس غذا کا سرچشمہ حیات بخش بارش ہے وہاں اسے اپنی روحانی غذا کے بارے میں بھی غور کرنا چاہئے کہ وہ قلب رسولؐ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوتی ہے اور وہاں سے معصومینؑ کے سینوں میں محفوظ ہو جاتی ہے اور پھر جوش مار کر ابلنے والے چشموں کی مانند دلوں کے صفحات پر جاری ہوتی ہے اور ایمان وتقوے کا لذت بخش پھل دیتی ہے۔ [1]

غذائی مواد کو تم نے پیدا کیا ہے یا خدا نے؟

قرآن مجید میں کھانے، پینے کی چیزوں اور ان کی اہمیت کے بارے میں کچھ آیات نازل ہوئی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

افرایتم ماتحرثون ۔ انتم تزرعونه ام نحن الزارعون لو نشاء لجعلناه حطاما فظلتم تفکهون [2]

کیا تم نے اس چیز کے بارے میں غور کیا ہے جو تم بوتے ہو؟ کیا تم نے اس کو اگایا ہے یا اس کے اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھوسے کی مانند بنا دیں اور تم حیرت زدہ رہ جاؤ۔

پہلی آیت میں لفظ ''تحرثون'' جو کہ حرث سے مشتق اور درس کے وزن پر ہے کے معنی کھیتی بونے کے ہیں اور دوسری آیت میں لفظ ''تزرعونه'' جو کہ زراعت سے مشتق ہے'' کے معنی اگانے کے ہیں۔

واضح ہے کہ انسان کا کام بو دینا ہے اور اگانا صرف خدا کا کام ہے ایک حدیث میں رسولؐ سے منقول ہے:

تم میں سے کوئی یہ ہرگز نہ کہے کہ میں نے زراعت کی ہے بلکہ یہ کہے کہ میں نے کھیتی بوئی ہے کیونکہ زارع حقیقی خدا ہے [3]

---

[1] تفسیر برہان ج ۴ ص ۴۲۹ [2] واقعہ: ۶۵ [3] مجمع البیان ج ۹ ص ۲۲۳، روح البیان ج ۹ ص ۳۳۲

ان آیتوں میں انسان کی توجہ خدا کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ وہی ساری مخلوق کا خالق ہے اور وہی ان کے رزق کا پیدا کرنے والا ہے جب وہ رزق کو نہ اگائے یا یا اس کو تباہ کردے، تو اس کو حطام کہتے ہیں۔ حطام "حطم" سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں غالبا خشک چیز جیسے بھوسہ پر یا سوکھی نباتات کے تنے کو توڑنے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یہاں حطام سے مراد بھوسہ ہے۔

"تفکھون" فاکھہ سے مشتق ہے جس کے معنی پھل اور میوے کے ہیں پھر اس کا اطلاق لطیفہ گوئی اور ہنسی، مذاق پر ہونے لگا لیکن یہی کبھی کبھی تعجب وحیرت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مذکورہ آیت میں بھی انہیں معنی میں استعمال ہوا ہے۔

افرایتم الماء الذی تشربون ء انتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون لو نشاء جعلناہ اجاجا فلولا تشکرون [1]

جو پانی تم پیتے ہو کیا کبھی تم نے اس کے بارے میں غور کیا ہے؟ کیا اسے تم بادل سے نازل کرتے ہو یا اس کے نازل کرنے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس نتھرے پانی کو تلخ بنادیں تو پھر تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟

ان آیتوں میں خداوند عالم انسان کے ضمیر سے فیصلہ طلب کر رہا ہے یا ان کے ضمیر کو بیدار کر رہا ہے تا کہ وہ اپنے کھانے، پینے کی چیزوں کے بارے میں غور کر کے خدا کی عظمت کو سمجھیں۔

انسان کی روح پر غذا کا اثر

غذا کے اچھے، برے اثرات صرف بدن ہی پر مترتب نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کے اچھے برے اثرات روح بشر پر بھی مترتب ہوتے ہیں، اس بات کو ساری دنیا کے دانشور تسلیم کرتے ہیں، ترقی یافتہ دنیا کی لیبارٹری اور تجزیہ کرنے والی مشین ایک حد تک غذا کے طبیعی عناصر کا پتا لگا سکتی ہیں لیکن ان غذاؤں کے معنوی آثار کا سراغ نہیں لگا سکتیں یا بنیادی طور پر وہ ہمیشہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں یا کم از کم یہ چیز ان آثار کا آج تک سراغ لگانے میں ناکام رہی ہیں۔

---

[1] واقعہ: ۶۸ تا ۷۰

اس سلسلہ میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی کھانے، پینے کی چیز کو حلال نہیں کیا مگر اس فائدہ کے سبب حلال کیا ہے جو اس چیز میں موجود ہے اور خدا نے کسی چیز کو حرام نہیں کیا مگر اس ضرر کے باعث جو اس میں موجود ہے۔ [۱]

اولیاء اسلام کی حقیقت بیں نظر کھانے، پینے کی چیزوں کے جسمانی فوائد و نقصانات کو دیکھتی تھیں چنانچہ انہوں نے بعض موقعوں پر ان کے جسمانی اور معنوی نقصانات کی تصریح کی ہے۔

خون پینے سے سنگدلی پیدا ہوتی ہے

امام صادقؑ نے بدن کی خرابیاں، بیان کرنے کے بعد خون کے حرام ہونے کی علت بیان فرمائی ہے: خون پینا انسان کو بداخلاق بنا دیتا ہے، دل کو پتھر کر دیتا ہے، محبت و مہربانی کو اتنا کم کر دیتا ہے کہ خون پینے والا ایسا خونخوار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے اور باپ کو بھی قتل کر ڈالتا ہے۔ [۲]

شراب خوری کے اثرات

امام صادقؑ شراب کے حرام ہونے کی علت بیان فرماتے ہیں:

مستقل طور پر شراب پینے والا بت پرست کی مانند ہے، شراب خور رعشہ میں مبتلا ہوتا ہے، اس کی مروت ختم ہو جاتی ہے شراب نوشی اسے مجرموں کو قتل کرنے اور زنا پر مجبور کر دیتی ہے۔

مے نوشی اور خون پینے کے جو برے اثرات بدن پر مترتب ہوتے ہیں ان کا تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن لیباریٹری میں دل کی قساوت کا پتا نہیں لگایا جا سکتا۔

الکحل کے دماغ اور بدن کے دوسرے اعضاء پر اثرات

ا۔ الکحل و اسپرٹ کا اثر یہ ہے کہ وہ دماغ کے خلیوں کو بیکار کر دیتا ہے، اکثر دماغ کی رگ

---

۱ مستدرک الوسائل ج ۳ ص ۷۱ ۲ ایضا

پھٹنے یا دماغ میں خون جمنے کا باعث ہوتا ہے اور خون کے دوران کو روکتا ہے اور بلڈ پریشر کا سبب ہوتا ہے یہ بدن کے اعضاء کے مفلوج ہونے کا باعث ہوتا ہے۔

۲۔ الکحل، اسپرٹ، مختلف امراض کے پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے جیسے ہاتھوں، پیروں میں رعشہ پڑنا اور ہاتھ و پاؤں پر قابو نہ رہنا، ظاہری اور باطنی حواس میں کمزوری آنا اور نتیجہ میں بے خوابی میں مبتلا ہونا۔

۳۔ الکحل حس ذائقہ کو ضائع، دہن کے لعاب کو کم اور اس کے ترشح کے نظم کو درہم برہم کرتا ہے، معدہ میں خلل پیدا کرتا ہے اور اسکی کھٹائی کو کم کرتا ہے اور پیپسین کے انعقاد کے ساتھ اکثر قے ہونے کا باعث ہوتا ہے کہ جس میں خون کا لوتھڑا بھی ہوتا ہے، نیز معدے اور اس کے بعد نالی میں مختلف قسم کے امراض پیدا کرتا ہے اور معدے کو حد سے زیادہ چوڑا کر دیتا ہے، نظام ہاضمہ میں حدت پیدا کرتا ہے شدید طور پر دست آنے کا باعث ہوتا ہے۔

۴۔ کلیجی کو کمزور کرتا اور اس پر ورم لاتا ہے اور جگر کی خرابی کا آغاز پیٹ کی طرف درد ہونے کے احساس سے ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ گردوں، یہاں تک کہ آنکھوں میں پیلئے کا مرض پیدا ہو جائے۔

۵۔ الکحل چونکہ بدن کے سسٹم کے استعمال کے لئے نہیں ہے محض اس کے معدے میں وارد ہونے سے خون ہو جاتا ہے اور یہ خون کے اندر کے سفید گلبول کو مار ڈالتا ہے اور بلڈ پریشر کم ہونے کے سبب سکتہ پڑتا ہے۔

الکحل و اسپرٹ کے خطرناک عوارض میں سے سانس لینے کے نظام میں تنگئ تنفس ایک خانماں سوز بیماری کا پیدا ہونا بھی ہے کیونکہ جب الکحل خون کے ساتھ گردہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ گردے کے مخاط میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس پر ورم لاتا ہے۔ اس تحریک سے بدن کی کیلشیم برباد ہوتی ہے اور گردے کے کام کو مختل کرتی ہے جس سے سل کا مرض پیدا ہوتا ہے۔

الکحل جنون کا سبب

جن مشروبات میں الکحل و اسپرٹ ہوتی ہے وہ دیوانگی و جنون کا باعث ہیں اسپتالوں کی

رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاگل ہونے والوں میں زیادہ تر وہ افراد ہیں جنہوں نے ایک عمر تک شراب پی ہے۔ بلاہائے اجتماعی نامی کتاب میں ''تندرست'' نامی مجلہ سے نقل کیا گیا ہے: فرانس میں ڈاکٹروں کی تحقیقات کے مطابق دو لاکھ پاگل وہ ہیں جو الکحل کے مشروبات کی وجہ سے پاگل ہوئے ہیں اور برطانیہ میں دانشوروں کی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پاگلوں میں نوے فیصد پاگل وہ ہیں جو الکحل سے بنی ہوئی مشروبات پیتے تھے۔

الکحل کے اثرات نسلوں میں

مذکورہ کتاب میں صاحب کتاب تحریر کرتے ہیں: الکحل سے نطفہ کے خلیوں پر برا اثر پڑتا ہے، چنانچہ جرمن کے ایک ڈاکٹر نے یہ ثابت کیا ہے کہ الکحل کے اثرات تین نسلوں تک باقی رہتے ہیں بشرطیکہ تین نسلوں نے الکحل نہ پی ہو۔

انہیں خانمانسوز نقصانات کے پیش نظر اسلام نے الکحل پینے کی اجازت نہیں دی ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے۔ حضرت امام زین العابدینؑ نے فرمایا: اپنے شکم کو ان چیزوں سے محفوظ رکھو جن کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، رسول فرماتے ہیں: **ملعون من جلس علیٰ مائدة یشرب علیها الخمر**[1] وہ شخص خدا کی رحمت سے دور ہے جو اس دسترخوان پر بیٹھتا ہے جس پر شراب پی جاتی ہے۔

آیت اللہ دستغیب نے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب تنقیح سے نقل کیا ہے: امریکہ نے منشیات کے استعمال کے خلاف تبلیغ میں ہر قسم کے حربہ و اسلحہ، مثلاً مجلات، جرائد، تقاریر، قلم اور سیمینار کا سہارا لیا ہے اور آٹھ سو ملیون ڈالر سے زیادہ خرچ کئے ہیں اور اس مقصد کے تحت دسیوں ملیون صفحات کتابوں اور مجلوں میں صرف کئے ہیں جبکہ چودہ سال کے عرصہ میں اور منشیات کی ممانعت والے قانون کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں دو سو پچاس ملیون لیرہ سے زیادہ خرچ کئے ہین اور ۳۳۵ افراد کو قید کیا ہے اور تقریباً ۱۶ ملیون لیرہ منشیات کے جرمانے کی بابت وصول کیا ہے اور ۴۵ ملیون لیرہ کی مالیت کی املاک کو ضبط کیا ہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس کے برخلاف لوگوں کی منشیات سے اتنی شیفتگی بڑھ گئی ہے

---

[1] سفینۃ البحار ص ۴۲۷

کہ ۱۹۳۳ء میں یہ سارے قانون توڑ کر منشیات سے کلی طور پر پابندی ہٹادی۔ ۱

لیکن دینِ اسلام نے باوجود یکہ زمانۂ جاہلیت میں شراب پانی کی طرح پی جاتی تھی، مختصر مدت میں اس کو حرام قرار دیا اور اسلامی معاشرہ کو اس کے نقصان اور شر سے بچالیا الکحل کے جو اثرات بدن پر ہوتے ہیں وہ سائنس دانوں پر پوشیدہ نہیں رہے، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، لیکن مروت اور اخلاقی اقدار کو لیباریٹریوں میں نہیں دیکھا جاسکتا کہ الکحل کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔

بعض افراد اپنے کھانے، پینے کی چیزوں کی صفائی کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اگر غذا کے آلودہ ہونے کا معمولی احتمال ہوتا ہے تو وہ اس غذا کو کھانے سے پرہیز کرتے ہیں لیکن وہ اپنی روح کی صحت و سلامتی سے اتنے بے پروا ہیں کہ ہر گندی بات کو سنتے ہیں اس کے بارے میں حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

مجھے ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے کہ جو کھانا کھاتے وقت چراغ روشن کر لیتے ہیں تا کہ یہ دیکھ لیں کہ کیا کھا رہے ہیں لیکن وہ اپنی روح کی غذا کو اہمیت نہیں دیتے کہ اپنی عقل و خرد کے چراغ کو روشن کرتے اور اس طرح اپنے عقیدہ و اعمال میں نادانی و خطاء سے محفوظ رہتے۔ ۲

امام حسنؑ فرماتے ہیں:

مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو کہ اپنے کھانے کی چیزوں کے بارے میں تو سوچتا ہے لیکن روح کی غذا کے بارے میں غور نہیں کرتا وہ اپنے پیٹ کو تو اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے جو اس کے لئے مضر ہے مگر اپنے سینہ کو اس چیز سے محفوظ نہیں رکھتا جو اسے پست کرتی ہے۔ ۳

اسلام کے دستورات میں ایک طویل بحث کھانے، پینے اور صحیح غذا حاصل کرنے کے بارے میں لوگوں کی راہنمائی سے مربوط روایات ہیں، مفید و مضر گوشت اور اس کی مقدار اسی طرح چربی، مٹھائی سبزی وغیرہ کے بارے میں بھی روایات آئی ہیں، ایک روز سوید بن غفلہ دوپہر کے کھانے کے وقت حضرت علیؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے دیکھا کہ آپ دسترخوان پر تشریف فرما ہیں اور سوکھی روٹی تناول فرما رہے ہیں جس پر جو کا دانہ دانہ آشکار ہے راوی کہتا ہے۔ میں آپ کے خدمت گزاروں کے پاس گیا

---

۱ گناہان کبیرہ ج۱ ص ۲۵۳ ۲ سفینۃ البحار ج۲ ص ۸۴ ۳ سفینۃ البحار ج۲ ص ۸۴

اوران سے کہا: تم لوگ آقا کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ جو کا پسا ہوا آٹا کیوں نہیں لاتے؟ فضہ نے کہا: آقا کا حکم ایسا ہی ہے وہ لوٹ کر امام کی خدمت میں آئے اس کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا: یہ طریقہ میں نے رسولؐ سے سنا ہے۔[1]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: حضرت سلیمانؑ جو کا چوکر نہیں نکالتے تھے۔[2]

احمد بن ہارون حضرت علی بن موسیٰ رضاؑ کی خدمت میں پہنچے آپ نے کھانا لانے کا حکم دیا دستر خوان بچھایا گیا اس پر کھانا لگایا گیا لیکن دستر خوان پر تازہ سبزی نہیں تھی، آپ نے کھانا شروع نہیں کیا، خادم سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ میں اس دستر خوان پر کھانا نہیں کھاتا جس پر تازہ سبزی نہ ہو؟ جاؤ سبزی لاؤ خادم سبزی لایا تو آپ نے کھانا نوش فرمایا۔[3]

معدے کی صحت کا اہم دستور

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے:

کھاؤ پیو لیکن فضول خرچ نہ کرو بیشک خدا فضول خرچ کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔[4]

یہ بات اب ثابت ہوئی ہے کہ یہ بھی حفظان صحت کا ایک اہم دستور ہے، کیونکہ دانشور افراد اپنی تحقیق میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بہت سی بیماریوں کی جڑ اضافی غذائیں ہوتی ہیں کہ وہ انسان کے بدن میں جذب نہیں ہوتی ہیں ایسی ہی باقی رہتی ہیں اور دل کے لئے بھاری بوجھ ہوتی ہیں اور بہت سی بیماریوں اور عفونتوں کا سبب بنتی ہیں بنا برایں معدے کی صحت کے لئے اولین قدم یہ ہے کہ موٹے افراد اپنا اضافی وزن گھٹائیں اس اضافی وزن کا اصلی سبب پرخوری ہے اس کی تلافی کھانے میں میانہ روی سے کرنا چاہئے۔

ہارون رشید کے دربار میں عیسائی حکیم کا اظہار

عظیم مفسر شیخ طبرسی نے تفسیر مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ ہارون رشید کے دربار میں ایک

---

[1] کودک (گفتار فلسفی) ج ۱ ص ۲۴۹ [2] مستدرک الوسائل ج ۳ ص ۱۰۱ [3] کودک ج ۱ ص ۲۵۱ [4] اعراف: ۳۱

طبیب تھا طب میں اس کی مہارت مشہور تھی ایک دن اس نے مسلمان عالم سے کہا: مجھے تمہاری آسمانی کتاب میں طب کے بارے میں کوئی چیز نہیں ملی حالانکہ مفید علم، علم ادیان اور علم ابدان ہی ہے۔ مسلمان عالم نے جواب دیا: خداوند عالم نے طب کے سارے قوانین کو نصف آیت میں بیان کر دیا ہے۔ ''کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو'' اور رسولؐ نے طب کے بارے میں یہ فرمایا: معدہ تمام بیماریوں کی جڑ ہے اور احتیاط کرنا ہر مرض کی دوا ہے اور بدن کو تم نے جس چیز کا عادی بنا دیا ہے وہ اسے دیتے رہو۔

اس عیسائی طبیب نے کہا: تمہاری آسمانی کتاب اور تمہارے رسولؐ نے جالینوس کے طب کی کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے۔

حفظان صحت کے دوسرے دستورات

پرخوری اور کم خوری دونوں ہی مذموم ہیں حضرت علیؑ فرماتے ہیں: کم کھانا بدن کی بہت سی بیماریوں کو ختم کرتا ہے۔ [1] البتہ اتنا کم بھی نہ ہو بدن میں سستی و کمزوری آجائے امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: حضرت امیر المومنینؑ سے منقول ہے: زیادہ کھانا اور زیادہ سونا دونوں نفس کو تباہ کرتے ہیں ضرر و نقصان کو بدن کی طرف کھینچتے ہیں۔ [2]

حضرت موسیٰ بن جعفرؑ اس طرح فرماتے ہیں: پرہیز و احتیاط سب سے بڑی دوا ہے اور معدہ بیماریوں کا گھر ہے۔ [3]

شکم سیری سے پرہیز کرنا چاہئے

رسولؐ فرماتے ہیں: بھرے ہوئے پیٹ پر کھانا کھانا برص کے ظاہر ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ [4]

آپ ہی کا ارشاد ہے:

لاتميتو القلوب بكثرة الطعام والشراب فان القلوب تموت كالزروع اذا

---

[1] فہرست غرر الحکم ص ۱۳ [2] ایضاً ۱۴

[3] سفینۃ البحار ج ۱ ص ۴۴۵ [4] ایضاً ص ۲۵ و مکارم الاخلاق ص ۱۴۷

كثر عليه الماء [۱]

زیادہ کھانے اور زیادہ پینے سے دل کو مردہ نہ بناؤ کیونکہ دل اسی طرح مر جاتا ہے جس طرح زیادہ پانی سے کھیتی مر جاتی ہے۔

حرام کھانے سے اجتناب کرو

رسولؐ نے فرمایا: جو آدمی ایک لقمہ حرام کھاتا ہے چالیس شب تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی اور چالیس دن تک دعا مستجاب نہیں ہوتی ہے اور اس سے جو گوشت پیدا ہوتا ہے وہ آگ میں جلنے کے لائق ہے۔ [۲]

نیز فرمایا: جس وقت کسی شخص کے پیٹ میں لقمۂ حرام جاتا ہے تو اس پر زمین و آسمان کے فرشتے لعنت کرتے ہیں اور جب تک اس کے شکم میں لقمۂ حرام رہتا ہے خدا اسکی طرف نہیں دیکھتا ہے، جو حرام کا ایک لقمہ کھاتا ہے وہ خدا کے غضب میں مبتلا ہوگا پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو خدا بخش دیتا ہے ورنہ وہ جہنم کا مستحق ہے۔ [۳]

اس کے برخلاف حلال کھانے کے بارے میں فرماتے ہیں:

جو شخص چالیس دن تک حلال کھانا کھانے پر مداومت کرے خدا اس کے دل کو منور کر دیتا ہے۔ اور علم و حکمت کے چشمہ کو اس کے دل سے زبان پر جاری کر دیتا ہے۔ [۴]

صحت و سلامتی کا راز

رسولؐ فرماتے ہیں: جو شخص کھانا کھانے میں پاکیزگی و صفائی کا خیال رکھتا ہے اور اچھی طرح چبا کر کھاتا ہے اور اس وقت کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے جب کچھ بھوک باقی رہتی ہے اور جب پاخانہ لگتا ہے تو اسے نہیں روکتا ہے تو وہ مرض موت کے علاوہ کسی مرض میں مبتلا نہیں ہوگا۔ [۵]

---

[۱] مکارم الاخلاق ص ۱۵۰ [۲] سفینۃ البحار ج ۱ ص ۳۳ [۳] مکارم الاخلاق ص ۱۵۰

[۴] محجۃ البیضاء ج ۳ ص ۲۰۴ [۵] مکارم الاخلاق ص ۱۴۶

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: پیٹ کے حق میں ہمیں افراط وتفریط سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ خوراک کے سلسلہ میں ہمیں اعتدال واحتیاط سے کام لینا چاہئے، ہم یہاں پرخوری کے نقصانات اور شکم کے حق کی رعایت نہ کرنے کے مضر اثرات کو سپرد قلم کرتے ہیں۔

بھوک انسان کی خطرناک حالت ہے بھوکا انسان گویا دین وایمان کو بھول جاتا ہے۔ اور محبت و مہربانی کو فراموش کر دیتا ہے اور پیٹ بھرنے کے لئے وہ غضبناک درندے جیسا بن جاتا ہے۔ تیسری صدی ہجری میں بصرہ میں ایک عظیم انقلاب آیا۔ چند سال تک صاحب زنج نے بصرہ پر اپنے چند سالہ تسلط کے دوران کشت وکشتار کا بازار گرم رکھا۔ ہزاروں مرد وعورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جو باقی بچ گئے تھے وہ خوف کے مارے چھپے رہتے تھے اور رات میں غذا حاصل کرنے کے لئے خوف زدہ اور لرزتے کانپتے باہر نکلتے تھے کاروبار بالکل ٹھپ ہو گئے تھے، کھیتی باڑی اور گلہ بانی کا کام چوپٹ ہو گیا تھا پورے علاقہ پر قحط سالی اور بھوک مری طاری تھی ایک مدت تک لوگ کتے بلی کا گوشت کھاتے رہے، اس کے بعد اپنے مردوں کا گوشت کھانے لگے کبھی تو اپنے نیم جان آدمی ہی کو کھا جاتے تھے۔

تاریخ میں ہے کہ اس زمانہ میں ایک عورت دیکھی گئی جو ایک سر ہاتھ میں لے کر رو رہی تھی لوگوں نے اس سے رونے کا سبب معلوم کیا تو اس نے جواب دیا بھوکے لوگ میری کمزور وناتواں بہن کے پاس جمع ہو گئے کہ وہ مر جائے تو اس کا گوشت کھائیں ابھی وہ مری نہیں تھی کہ انہوں نے اسکی تکا بوٹی نوچ لی اور اس کا گوشت بانٹ لیا، لیکن انہوں نے میرے اوپر یہ ظلم کیا ہے کہ اس کا سارا گوشت انہوں نے آپس میں بانٹ لیا اور مجھے صرف اس کا سر دیا ہے گوشت میں سے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔ [۱]

بھوک کی وجہ سے بہن نے اس طرح مہر ومحبت کو فراموش کر دیا ہے کہ اسے اپنی بہن کے مرنے کی فکر نہیں ہے بلکہ وہ اس بات پر روتی ہے کہ اس کی بہن کا گوشت اسے کیوں نہیں دیا گیا۔

شکم کا فقہی حکم

فقہاء نے اس شخص کے بارے میں کہ جو کسی کے شکم پر اس طرح ضرب لگائے کہ وہ پیشاب

[۱] تتمۃ المنتھی ص ۲۸۰، مروج الذھب ج ۴ ص ۱۰۸

و پخانہ نہ روک سکے تو اسے ایک تہائی دیت دینا پڑے گی درج ذیل عبارت کو ہم تکملۃ المنھاج سے نقل کرتے ہیں:

من داس بطن انسان بحیث خرج منه البول او الغائط فعلیه ثلث الدیة او یداس بطنه حتی یحدث فی ثیابه [1]

جو شخص کسی آدمی کے شکم پر اس طرح ضرب لگائے کہ وہ اپنا پخانہ نہ روک سکے تو اسے ایک تہائی دیت ادا کرنا پڑے گی یا اس کے شکم پر اس طرح ضرب لگائے کہ جس سے اس کا لباس آلودہ ہو جائے۔

پھر فرماتے ہیں: یہی اکثر علماء کا نظریہ ہے اور سکونی کے واسطہ سے جو روایت وارد ہوئی ہے وہی اس پر دلالت کرتی ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں: جو شخص کسی کے شکم پر اس طرح ضرب لگائے کہ وہ اپنا لباس آلودہ کرلے۔ اس کا حکم حضرت علیؑ سے دریافت کیا تو حضرت علیؑ فرمایا: اس کے شکم کو فاسد کردے تو سے ایک ثلث دیت دینا ہوگی۔

---

[1] مبانی تکملۃ المنھاج ج ۲ ص ۳۷۱

شرم گاہ کا حق

واما حق فرجك فحفظه مما لا يحل لك والاستعانة عليه بغض البصر فانه من اعون الاعوان و كثرة ذكر الموت والتهدد لنفسك بالله والتخويف لها به وبالله العصمة والتاييد ولا حول ولا قوة الا به [1]

تمہارے اوپر تمہاری شرمگاہ کا حق یہ ہے کہ اسے اس چیز سے محفوظ رکھو جو تمہارے لئے حلال نہیں ہے اور اس سلسلہ میں تم آنکھ بند کرنے سے مدد حاصل کرو کہ یہ بہترین مددگار ہے دوسرے موت کو یاد کرنے اور اپنے نفس کو خوف خدا سے ڈرانے سے مدد حاصل کرو اور اس سلسلہ میں عصمت وتحفظ اور تائید خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اسکی طاقت وقوت کے علاوہ کوئی طاقت وقوت نہیں ہے۔

''فرج'' کہ جس کی جمع فروج ہے اس کے معنی ہیں دو چیزوں کے درمیان خلل ورخنہ، سوراخ، شگاف وغیرہ [2] فرج پیشاب اور پخانہ کے مقام کو کہتے ہیں، راغب لکھتے ہیں: فرج دونوں پیروں کے درمیان ہے اور کنایتاً اس کا اطلاق پیشاب، پخانہ کے مقام پر ہوتا ہے اور کثرت استعمال کی بنا پر اب انہیں معنی میں صریح کی مانند ہوگیا ہے۔ مجمع البیان میں سورۂ مومنون کی آیت ۵ کے ذیل میں لیث کے قول کے بارے میں لکھا ہے:

فرج ہر مرد وعورت کی شرمگاہ کا نام ہے اور اقرب الموارد میں اس طرح لکھا ہے:

الفرج من الانسان العورة ويطلق على القبل والدبر [3]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فرج کے معنی شگاف اور دو چیزوں کے درمیان کے فاصلہ کے ہیں اور ایسے موقعوں پر شرم گاہ کے معنی میں کنایتاً استعمال ہوتا ہے ہم نے اس کے کنائی معنی کو محفوظ رکھتے ہوئے فارسی میں اس کے معنی دامن رکھے ہیں۔

فرج کی حفاظت سے مراد، جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے اسے دوسروں کی نگاہوں سے

---

[1] مکارم الاخلاق میں اس طرح ہے: واما حق فرجك ان تحصنه من ان ينظر اليه یعنی تمہارے اوپر تمہاری شرم گاہ کا حق یہ ہے کہ اسے زنا سے محفوظ رکھو اور اس کو نامحرم کی نگاہ سے چھپاؤ۔

[2] فرہنگ بزرگ جامع نوین [3] قاموس قرآن ج ۵ ص ۱۵۷

چھپانا ہے، امام صادقؑ کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: قرآن مجید کی جس آیت میں بھی حفظ فروج، شرم گاہوں کی حفاظت کا ذکر ہے وہاں حفظ سے مراد اسے زنا سے محفوظ رکھنا ہے مگر اس آیت میں حفظ سے مراد اسے دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا ہے۔[1]

یہ حدیث سورۂ نور کی ۳۱ ویں آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہے۔ آیت یہ ہے "قل للمومنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن۔

جنسی میلان ورغبت

جنسی میلان انسان کی زندگی میں لذت و کامیابی کا سبب ہے یہ اپنی جاذبیت وکشش کی طاقت سے مرد وعورت کے اندر شدید ہیجان پیدا کرتا ہے چنانچہ وہ عشق ومحبت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے بیاہ شادی کا مسئلہ ہر زمانہ میں دینی وعلمی محفلوں میں موضوع بحث رہا ہے اور اس کے بارے میں افراطی وتفریطی اور درمیانی نظریات سامنے آئے ہیں۔

شدت پسند نظریہ

جو لوگ جنسی آزادی کے قائل ہیں ان میں متاخرین میں سے فرائڈ اور اس کے پیرو ہیں یہ لوگ جنسی میلان کے بارے میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ فرائڈ نے جنسی میلان کے ابھرنے پر اپنی تقریروں میں بہت زور دیا ہے اور جنسی مسئلہ، جو کہ اس کے نظریہ ومکتب کا بنیادی ستون ہے، کے معنی کی اس نے بہت وسیع تفسیر کی ہے اور نتیجہ میں اس نے انسان کے بہت سے فطریات اور اس کے مستقل میلانات کو جنسی میلان ہی سے مشتق جانا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس نے اس میلان کو انسانی تہذیب وتمدن کی بنیاد قرار دیا ہے۔

فرائڈ کے نقطۂ نظر سے جنسیت سے جو لذت طلبی ابھرتی ہے وہ بالغ افراد ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ لذت طلبی زندگی کے ہر دور میں انسان کے اندر موجود ہوتی ہے چنانچہ چھوٹے بچے اسی محرک

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۵۸۸

کی بنا پر ماں کا پستان چوستے ہیں اور اس سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ فرائڈ کے نقطہ نظر سے کچلے ہوئے میلانات وخواہشات ہی تحلیل روحی اور روحانی بیماریوں کے معالجہ کی بنیاد ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جب جنسی میلانات معاشرہ کی بندشوں کی یا دوسرے اسباب کی بنا پر کچل دیئے جاتے ہیں یا انہیں دبایا جاتا ہے تو وہ ضمیر کے اندر خلجان اور ایک قسم کا دباؤ پیدا کرتے ہیں اور انسان کو روحی بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

فرائڈ کے نقطۂ نگاہ سے جنسی بھی کجرویاں ہوتی ہیں اور روحانی توازن کا جو فقدان ہوتا ہے اس کا آغاز جنسی میلان ہی سے ہوتا ہے اور معالج وڈاکٹر کو ان کیفیتوں سے آگاہ ہونا چاہئے جو مریض پر گذشتہ ادوار میں طاری ہوئی ہیں۔ [۱]

فرائڈ کے مخالف ڈاکٹری نقطۂ نظر سے کہتے ہیں: فرائڈ نے شہوانی میلان کے خلل ہی کو روحی انحرافات کا سرچشمہ کیوں قرار دیا ہے اور اس کا علاج اسی سے کیوں شروع کیا ہے؟! فرائڈ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے روحی اور عصبی خرابیوں کا سبب اس جنسی میلان کی تبدیلیوں کو قرار دیا ہے جو غیر معمولی ہیں اور اس نے ہر شخص کے مادی، مالی اور سماجی ماحول کے عوامل کو نہیں دیکھا ہے جو کاری گر، بیکاری اور کام نہ ملنے کی وجہ سے بیوی بچوں کے اخراجات کی فکر میں نفسیاتی طور پر مریض ہو جاتا ہے تو اس کی روح کے مرض کا سرچشمہ جنسی میلان نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور اس عارضہ کو برطرف کرنے کے لئے کام، تگ ودو اور پیسہ کی ضرورت ہے اس کا علاج جنسی پیاس بجھانے سے نہیں ہوگا۔ [۲]

کلیسا اور جنسی روابط

پیروان کلیسا، کچھ دوسرے مذاہب اور بعض فلاسفر اور کچھ ماہرین اخلاق نے جنسی میلاپ وآمیزش کو ایک حیوانی حرکت جانا ہے اور اسے منفور و پلید قرار دیا ہے۔ یہ جنسی میلان کے بارے میں تفریط کے شکار ہیں، انہوں نے اس میلان کو کچل دیا ہے، "سن ژرم" جو کہ اولیاء کے سلسلہ کی آخری کڑی تھا وہ ہمیشہ زور دے کر یہ بات کہتا تھا: ہمیں چاہئے کہ بیاہ شادی کے درخت کو تجرد کی کلہاڑی سے کاٹ ڈالیں۔

۱۔ بزرگ سال وجوان (گفتار فلسفی) ج۱ ص۲۰۵ اس میں اندیشہ ھائی فروید ص۳۵، ۷۰ سے منقول ہے

۲۔ ایضاً: لیکن عبارت اس میں روانشناسی فروید ص۲۲ سے منقول ہے۔

کلیسا کے طریقہ کار کو ہم دیکھتے ہیں کہ "پولس" جو کہ کلیسا کے روحانی پیشواؤں اور اس کے اولیاء میں سے ایک تھا، اس نے زندگی بھر شادی نہیں کی اور کسی عورت کو اپنا شریک حیات نہیں بنایا بلکہ مردوں اور عورتوں کو یہ تشویق کرتا رہا کہ وہ شادی نہ کریں، پولس کے پہلے رسالہ میں قرنتیوں سے خطاب میں لکھا ہے: لیکن جس چیز کے بارے میں تم نے مجھے لکھا تھا تو مرد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو نہ چھوئے ہاں زنا سے بچنے کے لئے ہر مرد کو عورت رکھنا چاہئے اور ہر عورت کو شوہر دار ہونا چاہئے، شوہر کو بیوی اور بیوی کو شوہر کا حق ادا کرنا چاہئے... آگے چل کر لکھتے ہیں: میری یہ آرزو ہے کہ وہ مجھ جیسے ہوتے، مگر ہر شخص خدا کی خاص عطا کا حامل ہے ایک ایسا ہے تو دوسرا ایسا ہے۔ لہذا غیر شادی شدہ اور بیوہ عورتوں سے میری گزارش ہے کہ ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ میری طرح رہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکیں تو انہیں نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ نکاح کرنا جہنم میں جلنے سے بہتر ہے۔ [۱]

اسلام کا طریقہ، معتدل نظریہ

اسلام افراط و تفریط کے طریقوں کی مذمت کرتا ہے چنانچہ حضرت امیر المومنین جہالت و نادانی کو افراط و تفریط کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

لا یری الجاهل الا مفرطا او مفرّطاً۔

جاہل ہمیشہ افراط یا تفریط کرتے ہی دیکھا جاتا ہے۔

جنسی میلان کے سلسلہ میں میانہ روی ایک ایسا طریقہ ہے جو خدا کی رضا کے مطابق اور آفرینش کے طریقہ کے موافق ہے۔ اس طریقہ میں نہ جنسی و شہوانی خواہش کو بے لگام چھوڑا گیا ہے اور نہ اس کو یکسر کچلا گیا ہے، بلکہ یہ فطری میلان و خواہش صحیح اندازہ کے ساتھ قانون و اخلاق کا حامل ہے۔ اور فرد و سماج کی مصلحت کی حدود میں اس کو پورا کرنے کے اسباب فراہم ہوتے ہیں اور یہ خدا کے پیغمبروں کا طریقہ ہے کہ وہ ایک طرف تو حکم خدا سے لوگوں کو شادی و نکاح کرنے کی تشویق کرتے ہیں اور دوسری طرف جنسی کجرویوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور انسانی معاشرہ کو اس سے بچاتے ہیں۔

---

[۱] بزرگ سال و جوان (گفتار فلسفی) ج ۱ ص ۱۹۵

اسلام اور شادی

خداوند عالم سورۂ مومنون میں باایمان لوگوں کی ایک نمایاں صفت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

والـذین هم لفروجهم حافظون الا علیٰ ازواجهم او ما ملکت ایمانهم فانهم غیر ملومین فمن ابتغیٰ وراء ذالك فاولئك هم العادون ۱

اور جو لوگ اپنی شرم گاہوں کی (بے عفتی سے) حفاظت کرتے ہیں صرف اپنی بیویوں اور کنیزوں ہی سے جنسی لذت حاصل کرتے ہیں کیوں کہ ان سے لذت اندوز ہونے میں ملامت نہیں کی جا سکتی پس جو اس سے ہٹ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہی حد سے گزر جانے والا ہے۔

چونکہ شہوت انسان کی ایک منہ زور قوت ہے اسلئے اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ تم اپنی بیویوں اور ان کنیزوں ہی سے جنسی لذت حاصل کرو جو تمہارے اختیار میں ہیں۔ یہ تعبیر دائمی اور غیر دائمی دونوں بیویوں کو شامل ہے، ممکن ہے: غیر ملومین" سے اس غلط طرز فکر کی طرف اشارہ ہو کہ جس سے عیسائیت میں کجروی پیدا ہوئی ہے وہ ہر قسم کی جنسی آمیزش اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں یہاں تک کیتھولک کا پاپ اسی طرح تارک دنیا مرد و عورت تمام عمر تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر قسم کی شادی کو روحانیت کے خلاف سمجھتے ہیں، جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔

رسول نے اسلام کے دستورات میں جنسی آمیزش پر خاص توجہ فرمائی ہے اور اپنے پیرووں کو تجرد اور غیر شادی شدہ رہنے سے ڈرایا ہے۔

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله وسلم : من احب فطرتی فلیتسنن بسنتی ومن سنتی النکاح ۲

رسول نے فرمایا: جو شخص میری فطرت کو پسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ میری سنت کی پیروی کرے اور میری سنت میں سے نکاح بھی ہے۔

---

۱ مومنون: ۵ تا ۷ ۲ مکارم الاخلاق ص ۱۹۶

شادی گناہ سے حفاظت

رسولؐ فرماتے ہیں: اے جوانو! تم میں سے جس کے اندر شادی کی استطاعت ہے اسے چاہئے کہ شادی کرے کہ یہ خیانت آمیز نگاہوں اور شرم گاہ کو بے عفتی سے بچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اور جو شخص شادی نہ کر سکے اسے ہمیشہ روزہ رکھنا چاہئے کہ یہ شہوت کی منہ زوریوں کو روکنے میں اہم اثر رکھتا ہے۔ [۱]

شادی زندگی کی مضبوط بنیاد

اسلام نے اپنے پیروؤں کو خاندان سازی کی تشویق کی ہے اور اس کو خدا کے نزدیک بہترین بنیاد قرار دیا ہے رسول کا ارشاد ہے:

ما بنی فی الاسلام بناء احب الیٰ اللہ عز وجل واعز من التزویج [۲]

اسلام میں رکھی جانے والی بنیاد میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ بنیاد شادی کرنا ہے۔

اس لحاظ سے ایسی بنیاد بنانے میں عجلت ہونا چاہئے حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ ایک روز رسولؐ منبر پر تشریف لے گئے اور خدا کی حمد وثناء کے بعد فرمایا:

اے لوگو! لطیف وخبیر خدا کی طرف سے میرے پاس جبریل آئے اور کہا: باکرہ لڑکیاں درخت پر لگے ہوئے پھل کی مانند ہیں اگر پھل کو بروقت نہ چنا جائے تو اسے سورج کی دھوپ خراب کر دے گی اور ہوا چلنے سے وہ پراگندہ ہو جائیگا ایسے ہی وہ باکرہ لڑکیاں ہیں جو عورتوں کی مانند اپنے اندر تشنگی محسوس کرتی ہیں تو ان کی تشنگی کی کوئی دوا نہیں ہے سوائے شوہر کے اگر ان کی شادی نہ کی جائے تو وہ فساد سے محفوظ نہیں رہیں گی کیونکہ وہ بھی بشر ہیں اور بشر لغزش سے محفوظ ومعصوم نہیں ہے۔ [۳]

---

[۱] مکارم الاخلاق ص ۱۹۷
[۲] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۵۳۱
[۳] بزرگ سال وجوان، گفتار فلسفی ج ۱ ص ۱۹۲

شادی برائیوں سے بچاتی ہے

قرآن مجید نے شادی پر مرد و عورت کی عفت کے لحاظ سے توجہ دی ہے ارشاد ہے: ھن لباس لکم و انتم لباس لھن [۱] عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔ بیشک لباس برائیوں کا پردہ ہے اور شرم گاہ کو چھپاتا ہے، لباس بہت سے ناسازگار حالات اور امراض سے بچاتا ہے سردی و گرمی سے محفوظ رکھتا ہے، شادی بھی انسان کے اندر طہارت و پاکیزگی کو وجود بخشتا ہے رسولؐ فرماتے ہیں:

جو شخص خدا سے طاہر و مطہر حالت میں ملاقات کرنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنی عفت و پاک دامنی کو اپنی زوجہ کے ذریعہ محفوظ کرے۔ [۲]

شادی نہ کرنے کی رسولؐ نے مذمت فرمائی ہے

اسلام نے مسلمانوں کو گناہوں سے بچانے کے لئے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو شادی کرنے کی استطاعت رکھنے کے باوجود کسی وجہ سے شادی نہیں کرتے ہیں۔

عکاف نام کا ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، رسولؐ نے اس سے دریافت فرمایا: تم شادی شدہ ہو؟ عرض کی: اے اللہ کے رسول! نہیں۔ فرمایا: کیا تم بدن کی صحت اور مالی استطاعت نہیں رکھتے؟ عرض کی: رکھتا ہوں آنحضرت نے اسے شادی کرنے کا حکم اور شادی نہ کرنے سے ڈرایا۔

فرمایا: اے عکاف وائے ہو تجھ پر شادی کر لو کہ اس وقت خطا کاروں میں سے ہو شادی کر لو ورنہ گناہگاروں میں شامل ہو جاؤ گے۔ شادی کر لو ورنہ تم نصاریٰ میں شمار ہو گے شادی کر لو ورنہ تم شیطان کے بھائیوں میں شامل ہو گے۔ [۳]

ایک عورت نے قربۃ الی اللہ شادی نہ کرنے کا قصد کر لیا تھا۔ امام نے اس کو اس عمل سے روکا امام رضاؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک عورت نے امام باقرؑ سے دریافت کیا: میں متبتلہ ہوں، امام نے فرمایا تبتل سے تمہاری مراد کیا ہے؟: اس نے جواب دیا، میرا ارادہ ہے کہ ہرگز شادی نہ

---

[۱] بقرہ: ۱۸۷ [۲] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۵۳۰ [۳] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۵۳۰

کروں، فرمایا: کس لئے؟ اس نے کہا: فضیلت وکمال کے حصول کی خاطر۔ فرمایا: اس ارادہ کو چھوڑ دو اگر شادی نہ کرنے میں کوئی فضیلت ہوتی تو حضرت فاطمہ تم سے زیادہ اس فضیلت کو حاصل کرنے کی حقدار تھیں حالانکہ کوئی بھی فضیلت میں ان سے آگے نہیں ہے۔ [1]

ان دو حدیثوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اولیاء اسلام نے مرد و عورت کو مجرد اور غیر شادی شدہ رہنے سے روکا ہے اور انہیں مختلف طریقوں سے شادی کرنے کی تشویق کی ہے کہ پاک وپاکیزہ رہیں اور گناہوں سے اپنے دامن کو آلودہ نہ کریں۔

اسلام اور عورتوں سے کنارہ کشی

رسولؐ کے اصحاب میں سے چند آدمیوں نے اپنے نفس کے تزکیہ اور روح کی بلندی کے لئے عورتوں سے ملنا، روزہ افطار کرنا اور رات کو سونا اپنے اوپر حرام کرلیا۔ ان کے اس ارادہ کی اطلاع ام سلمہ کو بھی ہوگئی انہوں نے رسولؐ کو خبر کی:

فخرج الیٰ اصحابہ فقال : اترغبون عن النساء ؟ انی آتی النساء واکل النهار وانام بالليل فمن رغب عن سنتي فليس منّي [2]

رسولؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: کیا تم نے اپنی عورتوں سے کنارہ کشی کرلی ہے؟ میں تمہارا رسول ہوں اس کے باوجود میں عورتوں کے پاس جاتا ہوں، دن میں کھانا کھاتا ہوں اور رات کو سوتا ہوں پھر تم میں سے جو بھی میری سنت وروش سے اعراض کرے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ روایت ان لوگوں پر شدید تنقید کرتی ہے جو کہ عورتوں کو چھوڑ کر روحانی بلندی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے اس طریقہ کو غلط قرار دیتی ہے۔

زنا بڑا گناہ ہے

جو لوگ شادی کرکے گھر آباد کرنے سے پرہیز کرتے ہیں ممکن ہے وہ زنا کے مرتکب ہوجائیں

---

[1] بزرگ سال وجوان ج ۱ ص ۱۹۴ [2] وسائل الشیعہ ج ۱۴ ص ۸

اور اس طرح گونا گوں مشکلات سے دوچار ہوں لہذا قرآن مجید اس راستہ کو بدترین راستہ قرار دیتا ہے اور لوگوں کو اس کے قریب جانے سے منع کرتا ہے سورۂ اسراء میں ارشاد ہے:

ولا تقربوا الزنا انه کان فاحشة و ساء سبیلا۔ [1]

اور زنا کے قریب نہ جاؤ کہ یہ بدترین حرکت ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

اس مختصر جملہ میں تین نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

الف: قرآن یہ نہیں کہتا کہ زنا نہ کرو بلکہ یہ کہتا ہے کہ اس شرم آور فعل کے قریب نہ جاؤ یہ جملہ اس تاکید کے علاوہ کہ جو اس کے اندر موجود ہے اس بات کی طرف لطیف اشارہ کر رہا ہے کہ اکثر زنا کے کچھ مقدمات ہوتے ہیں جو انسان کو بتدریج زنا سے قریب کرتے ہیں، آنکھیں لڑانا بھی اس کے مقدمات میں سے ایک ہے جس کی طرف گزشتہ بیان میں اشارہ کیا جاچکا ہے، بے پردگی اور عریانی دوسرا مقدمہ ہے سیکس کی کتابیں اور بیلوفلم اور کلب وغیرہ بجائے خود اس کام کا ایک مقدمہ ہے اسی طرح نامحرم مرد وعورت کا تنہائی کی جگہ اکٹھا ہونا بھی زنا کے لئے وسوسہ انگیز عامل شمار ہوتا ہے۔

ب: جملۂ ''انه کان فاحشة'' کہ جس میں تین تاکیدیں ہیں (انّ، فعل ماضی اور لفظ فاحشہ کا استعمال) اس گناہ کے بھیانک ہونے کو آشکار کرتا ہے۔

ج: جملہ ''ساء سبیلا'' (زنا بدترین راستہ ہے) اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے اس راستہ سے معاشرہ میں دوسری برائیاں پھیلتی ہیں۔

زنا کے حرام ہونے کا فلسفہ

۱۔ خاندان کے نظام میں خرابی کا پیدا ہونا، اولاد اور ان کے باپوں کے رابطہ کا ختم ہونا کہ جس کا وجود صرف اجتماعی شناخت ہی کا سبب نہیں ہے بلکہ اولاد کی پوری حمایت کا بھی باعث ہے اور اس محبت کی بنیاد ہے جو پوری عمر میں اس حمایت کے جاری رہنے کا سبب ہوتی ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کا سراغ لگانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم لحہ بھر کے لئے اس طرح سوچیں کہ اگر پورے معاشرہ کو زنا کی

---

[1] اسراء: ۳۲

اجازت دیدی جائے، یا شادی کی رسم ختم کردی جائے‘ تو اس صورت میں جو بچے پیدا ہونگے ان کی پرورش کا بار کون اٹھائے گا، نہ پیدائش کے وقت کوئی ان کی حمایت کرے گا اور نہ لڑکپن کے زمانہ میں، اس سے قطع نظر ظلم وتشدد سے مقابلہ کرنے میں محبت کا اہم کردار ہوتا ہے، وہ اس محبت سے محروم ہو جائیں گے اور انسانی معاشرہ حیوانیت میں تبدیل ہو جائے گا۔

۲۔اس سے ہوا و ہوس کے بندوں کے درمیان مختلف قسم کے جھگڑے ہونگے بعض لوگوں نے جو کسی محلہ یا جاگیر وغیرہ کی داستانیں نقل کی ہیں ان سے بخوبی اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ جنسی کجرویوں کے ساتھ بدترین جرائم بھی وجود پذیر ہوتے ہیں۔

۳۔تجربہ اور علم نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ زنا سے مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اگر چہ اس کے برے آثار کو روکنے کے لئے بے پناہ بندوبست کئے گئے ہیں۔ پھر بھی ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد ملتی ہے جنہوں نے اس راستہ پر چل کر اپنی صحت کو گنوادیا ہے۔

۴۔یہ عمل اکثر بچوں کو ساقط کرانے، انہیں قتل کرنے، اور نسل کے قطع ہونے کا سبب ہوتا ہے، کیونکہ ایسی عورتیں ایسے بچوں کو اپنے پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، حقیقت میں وہ بچوں کو اپنی بداعمالی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں۔

۵۔اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ شادی کا مقصد صرف جنسی پیاس بجھانا ہی نہیں ہے بلکہ شادی کے اور بہت سے فوائد ہیں جیسے زندگی کی تشکیل میں اشتراک روحی انس، فکری سکون، بچوں کی تربیت اور زندگی کے تمام حالات میں تعاون کرنا۔ اگر مرد و عورت ایک دوسرے کے ساتھ زندگی نہ گزارے اور نکاح کو حرام سمجھا کیا جائے تو ان میں سے کوئی کام بھی انجام پذیر نہیں ہوسکے گا۔ [1]

رونگٹا کھڑا کردینے والی تعداد

برطانیہ کے دائرۃ المعارف کی ج ۲۳ ص ۴۵ میں لکھا ہے: متحدہ جمہوریاؤں کی جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے نوے فیصد لوگ مقاربت کی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۱۴ ص ۱۰۳۔۱۰۴.

اس تعداد میں جن بیماروں کا امریکہ کے سرکاری اسپتالوں میں علاج ہوتا ہے ان کی تعداد تین لاکھ ساٹھ ہزار سے زیادہ ہے، متحدہ جمہوریاؤں کے تمام اسپتالوں میں سے چھ سو پچاس اسپتال اس بیماری سے مخصوص کیے گئے ہیں جبکہ ان اسپتالوں میں علاج کرانے والوں سے ڈیڑھ گنا زیادہ لوگ وہ ہیں جو اپنے فیملی اور خصوصی ڈاکٹروں سے علاج کراتے ہیں۔

''قوانین جنسی'' کتاب کے ص ۳۰۴ پر لکھا ہے: امریکہ میں ہر سال تیس سے چالیس ہزار بچے مقاربت کی موروثی بیماری میں مر جاتے ہیں اور متحدہ جمہوریاؤں میں ان بیماریوں سے جو نقصانات ہوتے ہیں وہ سل کی بیماری کے علاوہ تمام بیماریوں سے زیادہ ہیں۔ اطلاعات نامی اخبار کے شمارہ ۱۰۴۱۴ میں لکھا ہے: ۱۹۷۵ء میں امریکہ میں ۲۰۱۷۰۰ بچے ناجائز پیدا ہوئے تھے اور گذشتہ بیس برسوں میں اس تعداد میں پانچ فیصد اضافہ ہے۔ اسی سال جو عورتیں شادی کے تکلفات کے بغیر حاملہ ہوئی تھیں ان کی تعداد ۲۴۰۰۰ ہزار تھی اور ان میں سے اکثر کی عمر ۱۷ سال سے کم تھی، اور پیرس میں ۴۳۵۱۵ بچوں میں سے ۴۱۴۵ بچے غیر قانونی ہیں اور سویڈن میں ہر سال ۱۷۰۰۰ ہزار بچے ناجائز پیدا ہوتے ہیں۔

کیھان نامی اخبار کے شمارہ ۵۳۵۶ میں لکھا ہے ڈاکٹر مولنٹر جو کہ لندن کے جنوبی علاقہ میں طبابت کر رہے ہیں ایک مقالہ میں لکھتے ہیں: لندن میں ہر سال جرائم کے سبب پیدا ہونے والے پچاس ہزار بچوں کو ساقط کرایا جاتا ہے۔ اور اگر بیس بچے پیدا ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک ناجائز ہوتا ہے۔ [1]

زنا کے دنیوی و اخروی آثار

یہاں تک ہم نے زنا کی حرمت کے فلسفہ اور اس کے بھیانک نتائج اور مغربی ممالک کی مختصر تعداد کی طرف اشارہ کیا ہے اب ہم ان روایات کو سپرد قلم کرتے ہیں جو دنیا و آخرت اور برزخ کے عذاب سے متعلق ہیں۔

حضرت علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ میں نے رسولؐ سے سنا ہے کہ فرماتے ہیں:

فی الزنا ست خصال : ثلاث فی الدنیا و ثلاث فی الاخرة فاما اللواتی

---

[1] گناہان کبیرہ ج ۱ ص ۱۹۴

فی الدنیا فیذھب بنور الوجہ و یقطع الرزق و یسرع الفناء واما اللواتی فی الاخرۃ فغضب الرب و سوء الحساب والدخول فی النار او الخلود فی النار۔ [۱]

زنا کے چھ برے آثار ہیں: ان میں سے تین دنیا میں ہیں اور تین آخرت میں ہیں۔ جو دنیا میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ زنا سے انسان کے چہرہ کا نور ختم ہو جاتا ہے، اس کی روزی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور اس کی تباہی وفنا میں تعجیل ہوتی ہے اور جو آخرت میں ہیں ان میں پروردگار کا غضب، حساب کی سختی اور آگ میں داخل ہونا یا ہمیشہ آگ میں رہنا ہے۔

زنا سے تباہی اور ناداری پیدا ہوتی ہے

رسولؐ فرماتے ہیں: زنا فقر وناداری کا باعث ہوتا ہے اور یہ شہروں کو ویران وتباہ کر دیتا ہے۔ [۲]

اسی طرح زنا مرگ ناگہاں کا سبب ہوتا ہے: امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: حضرت علیؑ کی کتاب میں لکھا ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جب میرے بعد زنا کی کثرت ہو جائے گی تو اچانک طور پر زیادہ اموات ہونگی اور ایسی بری موت سے لوگ دنیا سے جائیں گے۔

زناکار کا برزخ میں عذاب

محمد بن علی بن الحسین باسنادہ عن شعیب بن واقد عن الحسین بن زید، عن الصادق عن آبائی عن النبی فی حدیث المناھی، قال: الا ومن زنی بامرۃ مسلمۃ اویھودیۃ او نصرانیۃ او مجوسۃ، حرۃ او امۃ ثم لم یتب ومات مصرا علیہ فتح اللہ تعالیٰ لہ فی قبرہ ثلاثمائۃ باب یخرج منھا حیات و عقارب وثعبان من النار فھو یحترق الیٰ یوم القیامۃ فاذا بعث من قبرہ تاذیٰ الناس من نتن ریحہ فیعرف بذالک و بما کان یعمل فی دار الدنیا حتی یومر بہ الی النار۔ [۳]

---

۱ مجمع البیان ج۶ ص۴۱۴ ۲ وسائل الشیعہ، کتاب النکاح، ابواب نکاح محرم باب ۳ حدیث ۱۱ ج۱۴ ص۲۳۳

۳ ایضا ص۲۳۲

محمد بن علی بن الحسین نے اپنی اسناد کے ذریعہ شعیب بن واقد سے انہوں نے حسین بن زید سے انہوں نے اس حدیث میں جو مناہی سے متعلق ہے فرمایا: آگاہ ہو جاؤ جو شخص مسلمان یا یہودی یا نصرانی یا مجوسی عورت سے زنا کرے خواہ وہ آزاد ہو یا کنیز اور اس فعل سے توبہ نہ کرے اور اس پر اصرار کرتے ہوئے مرجائے تو خداوند عالم اسکی قبر میں تین سو دروازے کھولے گا کہ جن سے سانپ اور بچھو اور اژدھا نکلیں گے اور وہ قیامت تک جلتا رہے گا اور جب وہ قبر سے نکلے تو لوگوں کو اسکی بدبو سے اذیت ہوگی اور لوگ اسے اس کے بدعمل اور اسکی بدبو سے پہچانیں گے آخرکار اس کو جہنم میں ڈال دیئے جانے کا حکم دیا جائیگا یہ ہے برزخ میں زناکاروں کو دیا جانے والا عذاب اور روز قیامت انہیں جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔

موت کو یاد کرنے کے ذریعہ شرم گاہ کی حفاظت

امام زین العابدینؑ نے اس رسالہ میں شرم گاہ کی حفاظت کے طریقہ بیان فرمائے ہیں: فرماتے ہیں: نامحرم کو دیکھنے سے آنکھیں بند کرلو بلکہ ہر اس چیز کو دیکھنے سے آنکھیں بند کرلو جس کا دیکھنا حرام ہے، دوسرا طریقہ: شرم گاہ کی حفاظت میں موت کی یاد کا اثر؛ فرماتے ہیں: ''وکثرة ذکر الموت'' اور موت کو زیادہ یاد کرنا بھی شرم گاہ کی حفاظت کا باعث ہوتا ہے، قرآن مجید میں موت اور اسکی حقیقت سے متعلق کچھ آیات موجود ہیں یہاں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے: سورۂ ''ق'' میں ارشاد ہے:

وجائت سکرة الموت بالحق ذالك ما کنت منه تحیه [1]

اور سکرات موت کا وقت حق کے ساتھ آگیا کہ جس سے تم بھاگتے تھے۔

سکر، بروزن مکر، کے معنی پانی کے راستہ کو بند کرنے کے ہیں اور سکر بروزن فکر بند جگہ کو کہتے ہیں اور چونکہ نشہ کی حالت میں انسان اور اس کی عقل کے درمیان رسہ کشی ہوتی ہے اس کو سُکر بروزن شکر کہا گیا ہے سکرۂ موت، نشہ کی سی حالت ہے۔ موت کے آثار رونما ہوتے ہی انسان کا اضطراب بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات یہ انقلابی اور ہیجانی کیفیت اسکی عقل پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور اسکی علت یہ

[1] ق: ۱۹

ہے کہ موت ایک اہم انتقالی مرحلہ ہے کہ انسان اس دنیا سے تمام رشتوں کو توڑ دیتا ہے جس سے وہ مدت دراز سے مانوس تھا اور ایک نئی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اس مرحلہ میں اس پر ایک عظیم وحشت طاری ہوتی ہے اور اس پر نشہ کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

موت کیا ہے؟

امام زین العابدینؑ سے دریافت کیا گیا کہ موت کیا ہے؟ فرمایا:

للمومن كنزع ثياب وسخة قملة ، وفك قيود والاغلال الثقيلة والاستبدال بأ فخرِ الثّياب واطيبها واوطى المراكب وآنس المنازل، وللكافركخلع ثياب فاخرة والنقل عن منازل انيسة والاستبدال او ساخ الثياب واخشنها واوحش المنازل واعظم العذاب۔ [۱]

مومن کے لئے تو میلے اور جوؤں سے بھرے لباس کو اتارنے اور مضبوط زنجیروں اور بندشوں کو توڑنے اور فاخرہ لباس کو گندے لباس سے بدلنے اور مانوس منزل میں جانے کے مثل ہے۔ اور کافر کے واسطے فاخرہ لباس اتارنے اور وحشت ناک و نامانوس منزل میں منتقل ہونے کے مانند اور عظیم عذاب ہے۔

کربلا میں امام حسینؑ نے بھی حقیقت موت کے بارے میں بہترین تعبیر بیان کی ہے۔

موت امام حسینؑ کی نظر میں

صبرا بنی الكرام ، فما الموت الا قنطرة تعبر بكم عن البوس والضراء الى الجنان الواسعة والنعيم الدائمة فايكم يكره ان ينتقل من سجن الىٰ قصر وما هو لاعدائكم الا كمن ينتقل من قصر الىٰ سجن وعذاب "ان ابى حدثنى عن رسول ان الدنيا سجن المومن و جنة الكافر ، والموت جسر هولاء الى جنانهم و جسر

---

[۱] کفایۃ الموحدین ج ۳ ص ۲۰۳

ھٰؤلاء الیٰ جحیمھم۔ [1]

اے شریف وعظیم لوگوں کے بیٹو! صبر سے کام لو موت کی مثال تو ایک پل کی سی ہے جو تمہیں دنیا کے رنج ومحن سے نجات دلا کر وسیع وعریض اور دائمی نعمتوں والی بہشت میں پہنچا دے گی۔ اب تم میں سے ایسا کون ہے جو جیل سے چھوٹ کر قصر میں آرام کو پسند نہ کرے اور تمہارے دشمن کے لئے اس پل کی سی ہے جو انہیں عیش ونشاط کے محل سے جیل خانے میں پہنچا دے گی بیشک میرے والد نے مجھ سے رسولؐ کی حدیث بیان کی ہے کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے پس مومنوں کا پل ان کی جنت کی طرف اور ان کا پل جہنم کی طرف ہے۔

موت کی کیفیت امام صادقؑ کی نظر میں

امام صادقؑ سے عرض کیا گیا کہ ہمیں موت کی کیفیت بتائیے آپ نے فرمایا: مومن کے لئے ایک خوشبو کی سی ہے جس کو وہ سونگھتا ہے اور وجد میں آجاتا ہے اور نتیجہ میں اس کے سارے رنج ومحن دور ہو جاتے ہیں اور کافر کے لئے اژدھا کے ڈسنے اور بچھو کے ڈنک مارنے کی مانند ہے۔ [2]

حضرت علیؑ نے مرتے دم کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے: کہ جب مادی پردے ہٹ جاتے ہیں، فرشتے سامنے آتے ہیں۔

فرماتے ہیں:

جو کچھ تمہارے مرنے والے دیکھتے ہیں اگر اسے تم دیکھ لو تو تم وحشت میں پڑ جاؤ اور خوف زدہ ہو جاؤ تم نے حق کی باتیں سنیں اور اطاعت کی لیکن جو انہوں نے دیکھا ہے وہ تم سے پوشیدہ ہے اور عنقریب پردے ہٹ جائیں گے اور تم اسے دیکھ لو گے۔ [3]

موت کی حقیقت

اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ موت ایک عدمی امر اور فنا ہو جانا ہے۔ نہیں! یہ نظریہ اس چیز

---

[1] معانی الاخبار ج ۲ ص ۱۹۶ [2] کفایۃ الموحدین ج ۳ ص ۲۰۳ [3] نہج البلاغہ، فیض الاسلام خطبہ ۲۰

کے جو کہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے اور ان دلیلوں کے خلاف ہے جن کی طرف عقل راہنمائی کرتی ہے قرآن کی رو سے موت ایک وجودی شئے ہے ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف منتقل ہونا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں موت آنے کے لئے توفّی کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ واپس لینے اور فرشتوں کے ذریعہ روح کو بدن سے قبض کرنے کے ہیں۔

بعض اسلامی روایات میں وارد ہوا ہے کہ انسان کے لئے تین دن بہت زیادہ وحشتناک ہیں ا۔جس دن وہ پیدا ہوتا ہے اور اِس ان دیکھے جہان کو دیکھتا ہے۔دوسرے جس دن وہ مرتا ہے اور موت کے بعد کی دنیا دیکھتا ہے اور تیسرے جس دن عرصہ محشر میں وارد ہوگا اور ان احکام کو دیکھے گا جو اس دنیا میں نہیں تھے۔ [۱]

خداوند عالم نے ان تینوں دنوں کے لئے حضرت یحییٰ بن زکریا کے بارے میں فرمایا: سلام ہو ان پر جس دن ہو پیدا ہوئے سلام ہو ان پر جس دن وہ دنیا سے اٹھے سلام ہو ان پر جس دن ہو زندہ اٹھائے جائیں گے۔ [۲]

حضرت عیسیٰ کی زبانی نقل ہوا ہے: **والسلام علیّ یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیا۔** [۳]

سلام ہو مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا، سلام ہو مجھ پر جس دن میں دنیا سے انتقال کرونگا، سلام ہو مجھ پر جس دن میں زندہ اٹھایا جاؤنگا۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں: **ذکر الموت یمیت الشھوات** [۴]

موت کی یاد انسان کی شہوانی خواہشوں کو بھلا دیتی ہے۔

اذکروا ھادم اللذات فقیل : وماھو یا رسول اللہ ؟فقال الموت [۵]

لذتوں کو برباد کرنے والے کو یاد کرو عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! یہ کیا ہے؟ فرمایا: موت جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، امام زین العابدینؑ نے موت کی یاد کو شہوتوں کو ختم کرنے کا سبب قرار دیا ہے۔دوسرے یہ کہ انسان اپنے نفس کا خیال رکھے اور اسے عقاب خدا سے ڈرنے کا عادی

---

[۱] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۳۲۷۔ [۲] مریم: ۱۵ [۳] مریم ۳۳ [۴] مجموعہ ورام ص ۲۶۸ [۵] مجموعۂ ورام ص ۲۶۸

بتائے کہ یہ بھی شہوتوں کو بھلانے کا باعث ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ اہم اس بیان کے آخر میں فرماتے ہیں: عظیم و برتر خدا سے مدد طلب کرتا ہے اگر جوان خدا کو یاد کریں اور ہر حال میں اس کو حاضر و ناظر سمجھیں تو وہ انہیں نجات بخشے گا، جیسا کہ حضرت یوسف نے خدا سے عرض کی تھی: اگر تو مجھ سے عورتوں کے مکر و فریب کو دور نہیں کرے گا تو میں بھی انسانی طبیعت کی بنا پر ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔ [1]

انہوں نے خود کو خدا کے سپرد کیا تو خدا نے بھی انہیں نجات عطا کی۔

عورت کی حد فقہی نقطۂ نظر سے

شارع اسلام نے اس اجتماعی اور خانمانسوز وبا کے سد باب کے لئے کچھ ایسے حدود و قوانین بنائے ہیں کہ اگر وہ جاری کئے جائیں تو یقیناً اسلامی معاشرہ پاک و پاکیزہ ہو جائے اور ناموس کے لئے امن و امان کی فضا قائم ہو جائے، قرآن مجید کے سورۂ نور میں اس موضوع سے بحث ہوئی ہے چنانچہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں اس طرح لکھا ہے:

الزانية والزاني فجلدوا كلّ واحد منهما مأة جلدة ولا تاخذكم بهما رافة في دين الله ان كنتم تومنون بالله و باليوم الاخر و ليشهد عذابهما طائفة من المومنين۔ [2]

زنا کار عورت اور زنا کار مرد ہر ایک کو سو کوڑے مارو خبردار دین خدا کے سلسلہ میں کسی قسم کی محبت و مہربانی نہ کرنا اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کو سزا دیتے وقت مومنوں کی ایک جماعت کو موجود ہونا چاہئے۔

اس آیت میں تین حکم بیان ہوئے ہیں:

۱۔ زنا کار مرد عورت کو سزا دینے کا حکم (زنا سے مراد غیر مرد میاں بیوی کا شرعی جواز کے بغیر جنسی فعل انجام دینا)

۲۔ اس بات کی تاکید کہ اس حد کو جاری کرنے میں خواہ مخواہ کی محبت و مہربانی کا شکار نہ ہونا اور

---

[1] وما ابرئ نفسي ان النفس لامارة بالسوء الا ما رحم ربي: یوسف ۵۳ [2] نور: ۲

اس قسم کے جذبات کو کچلنے کے لئے خدا اور روزِ جزا پر ایمان کو پیش کیا ہے کہ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس قانون کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرے۔ اس سلسلہ میں رسولؐ کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے:

قیامت کے روز میدان محشر میں اس حاکم کو لایا جائیگا جنہوں نے خدا کی مقرر کردہ حد میں سے ایک تازیانہ کم کیا ہوگا تو اس سے کہا جائیگا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا: تیرے بندوں پر رحم کرنے کے لئے۔ ندا آئے گی کیا تم میرے بندوں پر مجھ سے زیادہ مہربان تھے؟ !حکم دیا جائیگا کہ اس کو جہنم میں پھینک دو۔ پھر اس حاکم کو لایا جائیگا جس نے ایک کوڑا زیادہ مارا تھا۔ اور اس سے کہا جائیگا تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا: تاکہ تیرے بندے تیری معصیت سے باز رہیں۔ خدا کا ارشاد ہوگا۔ کیا تم اس پر مجھ سے بڑے حاکم تھے؟ پھر حکم دیا جائیگا کہ اس کو جہنم میں پھینک دو۔ [1]

۳۔ سزا دیئے جانے کی جگہ پر مومنوں کی ایک جماعت کے پہنچنے کا حکم اس لیے نہیں ہے کہ گناہگار عبرت حاصل کریں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کی سزا سے دوسرے عبرت حاصل کریں، کیونکہ گناہ فرد سے معاشرہ میں سرایت کرتے ہیں اور یہاں چونکہ معاملہ عدالت میں پہنچ گیا ہے اور احکام جاری ہونے کا وقت آگیا ہے لہذا اس کی آبرو بچانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بلکہ اسے قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے عنوان سے پہچنوایا جائے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ قانون محترم ومقدس ہے۔

اس آیت میں زناکار مرد و عورت کی حد سو کوڑے بیان ہوئے ہیں اور یہ حکم عام ہے البتہ کچھ استثنائی موارد بھی ہیں کہ جن کو بعد میں بیان کیا جائیگا مجرم کے لئے اس حد کے ثابت ہونے کے لئے کچھ شرائط بیان ہوئے ہیں۔

پہلی شرط: بلوغ ہے یعنی مرد و عورت بالغ ہوں بنا برایں یہ حد ان لڑکے لڑکیوں پر جاری نہیں ہوگی جو بالغ نہیں ہوئے ہیں۔

دوسری شرط: اختیار ہے، آزادی واختیار سے زنا کیا ہو بنا برایں جس سے بالجبر زنا کیا جائے اس پر حد جاری نہیں ہوگی۔

تیسری شرط: عقل ہے یعنی زناکار خواہ مرد ہو یا عورت عاقل ہو اس بنا پر دیوانہ اور مجنون پر حد

---

[1] تفسیر فخر رازی ج ۲۳ ص ۱۴۸

جاری نہیں ہوگی۔[۱]

امام خمینی اضافہ فرماتے ہیں:

جو شخص زنا کا مرتکب ہوتا ہے اسے اس فعل کے حرام ہونے کا علم ہو خواہ اجتہاد کے ذریعہ علم ہو تقلید کے، پس اس شخص پر کوئی حد جاری نہیں ہوگی جو اس کے حرام ہونے کو نہیں جانتا ہے۔[۲]

مذکورہ حکم سے مستثنیٰ افراد زنائے محصن و محصنہ کے مرتکب مرد و عورت ہیں، محصن اس شخص کو کہتے ہیں جو شادی شدہ ہے اور بیوی اس کے پاس ہے۔ اور محصنہ اس عورت کو کہتے ہیں جو شادی شدہ ہے اور شوہر اس کے پاس ہے ان دونوں میں سے جو بھی زنا کا مرتکب ہوگا تو اس کی سزا موت ہے۔ دوسرا استثنا محرم سے زنا ہے اس کی سزا بھی موت ہے اسی طرح زنا بالجبر کی سزا بھی موت ہے۔

حکم جاری کرنے کے اصول و شرائط

۱۔ زنا کے ثابت ہونے اور حد جاری ہونے کے لازم ہونے کے لئے ضروری ہے کہ چار عادل مرد گواہ یا تین مرد اور دو عورتیں یا دو مرد اور چار عادل عورتیں اس کے دیکھنے کی گواہی دیں۔

۲۔ سارے گواہ یہ گواہی دیں کہ سب نے ایک ہی جگہ زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

۳۔ سارے گواہ یہ گواہی دیں کہ سب نے ایک ہی وقت میں زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

۴۔ سارے گواہ ایک ہی مجلس میں گواہی دیں۔

۵۔ اگر چار عادل افراد، چار آدمیوں کی زبانی نقل کریں تو کافی نہیں ہے۔

۶۔ اگر چار عادل گواہ زنا ہونے کی گواہی دیں لیکن اس عورت کو نہ پہچانیں تو ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

۷۔ اگر چار گواہوں میں سے تین آدمی بالاتحاد گواہی دیں اور چوتھا گواہی دینے سے پہلو تہی کرے یا وہ ان تینوں کی مخالفت کرے تو ان تینوں پر تہمت کی حد جاری ہوگی۔[۳]

---

[۱] مبانی تکملۃ المنھاج ص ۱۶۹ [۳] تحریر الوسیلہ ج ۲ ص ۴۵۶

[۲] مبانی تکملۃ المنھاج، تحریر الوسیلہ، شرح لمعہ باب زنا

عبادی افعال کے حقوق

حق نماز

فاما حقُّ الصّلاة فأن تعلم انها وفادة الی الله وانك قائم بها بین یدی الله فاذا علمت ذالك كنت خلیقا ان تقوم فیها مقام الذلیل الراغب الراهب الخائف الراجی المسكین المتضرع المعظّم من قام بین یدیه بالسكون والاطراق و خشوع الاطراف ولین الجناح وحسن المناجات له فی نفسه والطلب الیه فی فكاك رقبتك الّتی احاطت به خطیئتك استهلكتها ذنوبك ولا قوة الا بالله۔

لیکن نماز کا حق، تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ نماز تمہیں خدا کے حضور میں پہنچاتی ہے، اور نماز میں تم خدا کے سامنے کھڑے ہوتے ہو جب تم اس بات کی طرف متوجہ ہو جاؤ کہ تم خدا کے سامنے ہو تو تمہیں اس طرح کھڑا ہونا چاہئے جس طرح ذلیل، عاجز و خورو، مشتاق، حیراں، خوف زدہ، امیدوار محتاج زاری کرنے والا کھڑا ہوتا ہے اور جس کے سامنے تم کھڑے ہو اس کی عظمت سمجھتے ہوئے، ساکن، سر جھکائے اعضا کے خشوع کے اور فروتنی کے ساتھ اس کی عظمت کا لحاظ رکھو اور اپنے دل میں اس سے بہترین طریقہ مناجات و دعا کے ذریعہ اپنی گردن کو ان خطاؤں سے آزاد کرنے کی التماس کرو جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور ان گناہوں کی بخشش کی دعا کرو اور کوئی طاقت و قوت نہیں ہے سوائے خدا کے۔

نماز کا حق بیان کرنے میں امام زین العابدینؑ پہلے نماز کی اہمیت و عظمت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ نماز خدا کی بارگاہ میں باریاب ہونے کا ذریعہ ہے، نماز مادی دنیا کو چھوڑنے اور انسان کو مشغول کرنے والی چیزوں کو پس پشت ڈالنے اور پروردگار کی عظمت کی طرف متوجہ ہونے اور عالم ناسوت کی تاریکیوں سے نکل کر عالم نور میں پہنچنے کا وسیلہ ہے ایسے ہی سفر و ہجرت کو ان خصوصیات کے ساتھ ہونا چاہئے جو امام نے بیان فرمائے ہیں ان خصوصیات کو ہم نماز کی بحث کے ذیل میں بیان کریں گے۔

نماز عظیم عبادت

دین اسلام نے اپنے عبادی دستور العمل میں سب سے پہلے نماز کو رکھا ہے اور اس کی اہمیت کو اپنے ماننے والوں کے گوش گزار کر دیا ہے۔

شارع اسلام نے لڑکے اور لڑکی پر اس وقت سے نماز کو واجب کیا ہے جب وہ بالغ ہو جاتے ہیں اور اگر وہ کسی عذر کی بنا پر نماز نہ بجالا سکیں تو اس کی قضا بجالائیں رات دن میں مخصوص اوقات میں نماز کو واجب قرار دیا ہے چنانچہ نمازی کا ایک فریضہ اوقات نماز کو پہچاننا بھی ہے۔

اوقات نماز قرآن کی نظر میں

قرآن مجید کی بعض آیتوں میں اشارتاً اور بعض میں صریح طور پر اوقات نماز کو بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ ہود میں ارشاد ہے:

اقم الصلوٰة طرفی النهار و زلفا من الّليل ان الحسنات يذهبن السيّات ذالك ذكرى للذاكرين۔ [1]

اور آپ (رسولؐ) دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے پہلے حصہ میں نماز قائم کریں۔ بیشک نیکیاں، برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ خدا کو یاد کرنے والوں کے لئے ایک یاد دہانی ہے۔

بظاہر "طرفی النھار" صبح اور مغرب کی نماز کے وقت کو بیان کرتا ہے کہ دن کے دو طرف صبح اور شام ہی ہیں یہ زلف زلفہ کی جمع ہے جس کے معنی نزدیکی ہیں اور رات کے اس حصہ کو زلف کہتے ہیں جو دن سے نزدیک ہوتا ہے۔

یہ نماز عشاء کے وقت کی طرف اشارہ ہے اور اس آیت کی یہی تفسیر ائمہ اہل بیتؑ کی احادیث میں بیان ہوئی ہے کہ مذکورہ آیت تین وقت صبح مغرب اور عشاء کی نماز کو بیان کرتی ہے۔

سورہ اسراء میں ارشاد ہے:

اقم الصلوٰة لدلوك الشمس الىٰ غسق الليل و قرآن الفجر ان قرآن الفجر

---

[1] ہود: ۱۱۴

کان مشھودا۔ [۱]

زوال آفتاب سے رات کی تاریکی چھا جانے تک نماز قائم کرو (اول ظہر میں نماز ظہرین اور ابتدائے شب میں نماز مغربین قائم کرو) نماز صبح بھی بجالاؤ کہ نماز صبح کے گواہ رات دن کے فرشتے ہیں۔

قرآن فجر سے نماز صبح کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں پانچوں وقت کی نماز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور سورۂ بقرہ میں اس طرح ارشاد ہے:

حافظوا علی الصلواۃ والصلوٰۃ الوسطیٰ و قوموا للہ قانتین۔ [۲]

یہ آیت نماز ظہر و عصر سے متعلق ہے۔

امید بندھانے والی آیت

سورۂ ہود کی ۱۱۴ویں آیت کی تفسیر کے ذیل صاحب مجمع البیان نے اس آیت کے ذیل میں حضرت علیؑ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ! ایک روز آپ نے کچھ لوگوں سے دریافت فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ قرآن میں کونسی آیت زیادہ امید بخش ہے؟ بعض نے کہا: ان اللہ لا یغفر ان یشرك به و یغفر ما دون ذالك لمن یشاء۔ [۳]

آپ نے فرمایا: بہت خوب لیکن جو آیت میں معلوم کرنا چاہتا ہوں یہ وہ نہیں ہے۔

بعض نے کہا: آیۂ ومن یعمل سوء او یظلم نفسه ثم یستغفر الله یجد الله غفور رحیما۔ [۴]

آپ نے فرمایا: جو آیت میں معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہے۔

بعض نے کہا: آیۂ: قل یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله [۵]

آپ نے فرمایا: جو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں یہ وہ نہیں ہے لوگوں نے کہا: پھر وہ کونسی آیت ہے؟! آپ نے فرمایا: میں نے اپنے حبیب اللہ کے رسولؐ سے سنا ہے کہ فرماتے ہیں: امید بخش ترین

---

[۱] اسراء: ۷۸ [۲] بقرہ: ۲۳۸ [۳] نساء: ۴۸ [۴] نساء: ۱۱۰ [۵] ایضا

آیت یہ ہے: اقم الصلوٰۃ طرفی النھار و زلفا من اللیل [1]

حضرت موسیٰ کو آغاز وحی میں نماز کا حکم دیا جاتا ہے

حضرت علیؑ کا یہ قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ امید بخش ترین آیت قرآن، آیہ نماز ہے۔ اولوالعزم پیغمبر موسیٰ بن عمران کے حالات ملاحظہ فرمائیں: سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ خدا کا کلام سنتے ہیں:

وانا اخترتك فاستمع لما یوحی اننی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدنی واقم الصّلوٰۃ لذکری۔ [2]

میں نے تمہیں رسالت کے لئے منتخب کیا ہے اب جو تمہارے اوپر وحی ہوگی اسے سنو! میں اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر شرک سے خالص ہو کر میری ہی عبادت کرو اور میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

اس آیت میں پہلے توحید کو پیش کیا گیا ہے جو کہ انبیاء کی تبلیغ کی اہم ترین اصل ہے۔ پھر خدا کی عبادت کا ذکر ہے اور اس کے بعد نماز یعنی مخلوق کا خالق سے اہم ترین ربط اور اس پاک ذات کو فراموش نہ کرنے کے لئے موثر ترین طریقہ کا حکم دیا ہے۔ نماز کے گونا گوں فلسفہ میں، اس آیت اور موسیٰ کی دعوت کے آغاز میں خدا کے ذکر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ انسان کی زندگی میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کے باعث انسان غافل ہو گیا ہے اور خدا کو بھول گیا ہے لہٰذا دن رات مین متعدد بار نماز کے ذریعہ اس غفلت سے جنگ کی جاتی ہے۔ صبح کو انسان (اس نیند سے) بیدار ہوتا ہے جس نے اسے ہر چیز سے بیگانہ کر دیا تھا) اور اپنی زندگی کے پروگرام کو شروع کرنا چاہتا ہے، خدا نے ہر کام سے پہلے اس پر نماز واجب کی ہے تا کہ وہ نماز کے ساتھ اپنی زندگی کے امور کا آغاز کرے اور یاد خدا کے وسیلہ سے اپنے قلب و روح کو صفاء و جلا بخشے اور جب وہ اپنے روزمرہ کے کام میں منہمک ہو جاتا ہے اور زندگی کے امور اسے پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں تو دن کے نصف میں وہ ''حی علی الصلوٰۃ'' نماز کی طرف دوڑو کی آواز سن کر وہ نماز کے لئے جاتا

---

[1] مجمع البیان ج ۵ ص ۲۰۱ [2] طٰہٰ: ۱۳۔۱۴

ہے اور راز و نیاز کے لئے اپنے معبود کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنے دل پر پڑے ہوئے گرد وغبار کو صاف کرتا ہے۔ اسی طرح دن کے خاتمہ اور رات کے آغاز میں اور رات کا کچھ حصہ گزرنے کے بعد وہ پھر نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے اور اپنے دل میں خدا کی یاد کو زندہ کرتا ہے۔

اس آیت میں خدا نے حضرت موسیٰ سے یہ فرمایا ہے: نماز اس لئے پڑھنا ہے تاکہ تمہیں میرا ذکر یاد آجائے۔ اور سورۂ رعد میں خدا نے اپنے ذکر کو دلوں کے سکون واطمینان کا باعث قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے: الا بذکر الله تطمئن القلوب! جان لو کہ دل یاد خدا سے آرام پاتے ہیں۔

ہر حال میں یادِ خدا

سورۂ نساء میں جہاں مسافر اور نماز خوف کا بیان ہے وہاں یہ آیت ہر حال میں یاد خدا کو بیان کرتی ہے:

فاذا قضیتم الصلوٰة فاذکروا الله قیاما و قعودا و علیٰ جنوبکم فاذا اطماننتم فاقیموا الصلوٰة ان الصلوٰة کانت علی المومنین کتابا موقوتا [۱]

جب تم نماز پڑھ چکو تو کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے خدا کو یاد کرو پھر جب تم مطمئن ہو تو نماز قائم کرو یقیناً نماز مومنین پر وقت کے ساتھ واجب کی گئی ہے۔

کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے خدا کا ذکر کرنے سے ممکن ہے جنگ بند ہو جانے کے درمیان آرام کا وقت مراد ہو اور ممکن ہے سربازوں اور سپاہیوں کے مختلف حالات مراد ہوں کہ وہ کھڑے ہوتے ہیں کبھی بیٹھتے ہیں، کبھی پہلو کے بل لیٹتے ہیں اور کبھی ہتھیار استعمال کرتے ہیں در حقیقت یہ اسلام کا اہم دستور ہے تاکہ انسان کسی حال میں بھی خدا سے غافل نہ رہے۔ لیکن متعدد روایات میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں بیماروں کے نماز پڑھنے کی کیفیت بیان ہوئی ہے۔ اور روایات میں کتاب موقوت سے مراد ثابت و واجب ہے۔ [۲]

---

۱ نساء: ۱۰۳ ۲ تفسیر نمونہ ج ۴ ص ۱۰۴ و ۱۰۵۔

امام غزالی کا قول

روح نماز خشوع اور حضور قلب ہے، نماز سے مراد حق تعالیٰ سے دل کو سیدھا رکھنا ہے اور اس کی عظمت وہیبت کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: اقم الصلوٰة لذکری ''مجھے یاد کرنے کے لئے نماز قائم کرو رسول فرماتے ہیں: اس طرح نماز پڑھو جیسے تم کسی کو وداع کر رہے ہو، یعنی اس نماز کے ساتھ تم خود کو اور اپنی ہوا وہوس کو رخصت کرو بلکہ حق کے علاوہ ہر چیز کو رخصت کردو اور پورے انہماک کے ساتھ نماز پڑھو۔[۱]

یہاں تک ہم نے قرآن کی آیتوں سے نماز کی اہمیت اور اس کی بعض حکمتیں بیان کی ہیں۔

حقیقی نماز

مرحوم فیض ''الحقائق'' میں لکھتے ہیں: حقیقی نماز درج ذیل مطالب کو ملحوظ رکھنے سے وجود میں آتی ہے: حضور قلب ۲۔ اس کے معنی ومطالب کو سمجھنے ۳۔ تعظیم ۴۔ ہیبت ۵۔ رجاء ۶۔ حیا

حضور قلب

جو چیزیں حضور قلب کا سبب ہوتی اور جن کے ذریعہ سے انسان خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے ان میں سے ایک قصد وارادہ ہے، کیونکہ قلب ارادہ کے تابع ہوتا ہے جس چیز کے لئے انسان کا ارادہ جتنا زیادہ قوی ہوگا اسی تناسب سے دل اس کی طرف متوجہ ہوگا بنا برایں یہ کہا جا سکتا ہے: قلب ارادہ کے تابع ہے۔

انسان کے اندر اس عقیدہ کو پیدا ہونا چاہئے کہ دنیوی اور اخروی زندگی کے موازنہ میں اخروی زندگی کو ترجیح ہے کیونکہ وہ ابدی اور سرمدی ہے اس کے ساتھ مشکلات اور بے چینی نہیں ہے ان الدار الاخرة لهی الحیوان لو کانوا یعلمون [۲] بیشک آخرت ابدی زندگی کا گھر ہے اگر تم جانتے ہو، دوسری جگہ قرآن کا ارشاد ہے: والاخرة خیر و ابقیٰ [۳] آخرت بہتر اور جاویدانی ہے اس ابدی زندگی اور

۱۔ کیمیائے سعادت ج۱ ص۱۶۵۔۱۶۶ ۲۔ عنکبوت: ۶۴ ۳۔ اعلیٰ ۱۷

اور بہتر وبقا کو صرف نماز ہی کے وسیلہ سے حاصل کی جاسکتا ہے، نماز تقرب کا ذریعہ ہے۔ اگر اس جملہ کے ساتھ یہ عقیدہ قائم کرلیں کہ دنیا حقیر وپست ہے تو نماز میں حضور قلب ہو جائیگا۔

تفہیم

حضور قلب کے بعد اہم ترین موضوع ان الفاظ کے معنی کو سمجھنا ہے جن کو زبان سے ادا کر رہا ہے۔ اگر اس کی توجہ معانی پر مرکوز ہو گئی تو وہ دنیوی امور سے غافل ہو جائیگا پھر نماز کی حالت میں اسے خیالات کے جنجال سے نجات مل جائے گی۔ حالت نماز میں انسان کے ذہن پر مختلف قسم کے افکار کے ہجوم کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسکی مثال اس شخص کی سی ہے جو درخت کے سایہ میں موجود ہو اور وہ ایک درخت کے سایہ میں آزادانہ اور اکرام کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہو لیکن وہ پرندوں اور بلبلوں کی آوازوں میں کھو جائے پھر وہ لکڑی اٹھا کر انہیں اڑادے لیکن وہ پھر آجائیں تو حالت نماز میں نمازی کی یہی حالت ہوتی ہے۔

تعظیم

تعظیم ایک حالت ہے جو دل پر طاری ہوتی ہے، اس سے معرفت پیدا ہوتی ہے اور ایک معرفت خدا کے جلال وعظمت کی ہے جو کہ اصل ایمان ہے، اور دوسری معرفت اپنے نفس کے حقیر وپست ہونے اور اپنے کو خدا کے تابع فرمان سمجھنے کی ہے۔ ان دو حالتوں سے بندہ کے خشوع وانکسار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس حالت کے پیدا ہونے سے انسان خدا کی عظمت کو سمجھتا ہے۔

ہیبت

انسان کے نفس کے لئے دوسری حالت خوف وہیبت ہے یہ حالت خدا کی بے پناہ قدرت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ کہ عالم کے تمام ذرات میں خدا کی مشیت کارفرما ہے چنانچہ جتنا اس کی قدرت کا

علم زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کا خوف بڑھتا ہے، علامہ نراقی مرحوم نے خلوص کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:
اس امر میں خلوص، قصد قربت اور اس کے ریا کی آلودگی سے خالی ہونے کا بھی دخل ہے۔ [1]

رجاء

معرفت سے خداوند عالم کے لطف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس طرح کہ انسان خدا کے بے پناہ لطف و کرم کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسے خدا کے اس وعدہ کا یقین ہو جاتا ہے کہ نماز کے عوض جنت دے گا اور ان تمام چیزوں سے خدا لطف کی امید ہو جاتی ہے۔

حیاء

حیاء انسان کو اس وقت ہوتی ہے کہ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ وہ خدا کے حقوق کو پورا کرنے سے قاصر ہے اور اپنے وجود میں ایسے عیوب دیکھتا ہے کہ جو اسے مسلسل دنیوی امور اور اس کی زرق برق کی طرف متوجہ کرتے ہیں دوسری طرف جب اسے خدا کے جلال کا علم حاصل ہوتا ہے اور وہ اس بات کی طرف ملتفت ہوتا ہے کہ خدا اس کے باطن سے آگاہ ہے تو اس وقت انسان کے اندر ایسی حالت پیدا ہوتی ہے کہ جس سے حیاء پیدا ہوتی ہے۔ [2]

• یہاں تک ہم نے حقیقت نماز کو فیض کاشانی سے نقل کیا ہے۔ اب میرزا جواد ملکی تبریزی کا قول ملاحظہ فرمائیں: وہ عظمت و اہمیت نماز کے بارے میں شہید اول کی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

شہید اول نے واجبات نماز کو جو کہ ہزار مسئلے ہیں، ایک کتاب میں جمع کیا ہے اور اس کتاب کا نام الفیہ رکھا ہے اور مستحبات نماز کو دوسری کتاب میں جمع کیا ہے اور اس کا نام نفلیہ رکھا ہے۔

موصوف نے نماز کا ایک اہم فلسفہ بیان کیا ہے: ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ [3]

نماز انسان کو بداعمالیوں سے روکتی ہے تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] علم اخلاق اسلامی ج ۳ ص ۴۰۳ [2] الحقائق ص ۲۲۳ [3] عنکبوت: ۴۵

رہی یہ بات کہ نماز انسان کو بداعمالیوں اور بری باتوں سے باز رکھتی ہے تو یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کیونکہ قرآن نے نماز کی اس خاصیت کو صریح طور پر بیان کیا ہے پس نماز میں یہ خاصیت نہ ہو تو نماز ایک عمل ہے جو نفاق کے سبب وجود پذیر ہوا ہے کیونکہ اگر اس میں روح نماز کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ اتنی ہی مقدار میں انسان کو برائیوں سے روکتا۔ [1]

جیسا کہ اس عظیم عالم نے شہید اول کی کتب سے نقل کیا ہے، نماز کے علاوہ کسی عبادت میں اتنے مسائل نہیں ہیں چنانچہ فقہ وحدیث کی کتابوں میں نماز کا باب ہر باب سے زیادہ مفصل ہے ہم امام زین العابدینؑ کے نورانی کلمات کی شرح میں اس عمیق دریا کے چند قطروں کی طرف اشارہ کریں گے۔

نماز جن فردی، اجتماعی اور اخلاقی آثار کی حامل ہے، اختصار کے ساتھ ہم ان میں سے ہر ایک کا خلاصہ بیان کریں گے۔

نماز کے فردی آثار

نماز کے فردی آثار میں سے یہ ایک ہے کہ جو انسان رات دن میں پانچ مرتبہ خود کو خدا کے سامنے دیکھتا ہے اس کا حوصلہ وجذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور اس کا عزم وارادہ محکم ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ مشکلات کے مقابلہ میں پہاڑ کی مانند کھڑا رہتا ہے۔

فرد میں نماز کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ خود کو مادیات سے آزاد کرا لیتا ہے اور عالم ربوبیت کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا دل مادہ کی کدورتوں سے پاک ہو جاتا ہے اور اس کو آرام وسکون میسر آجاتا ہے منقول ہے کہ جب رسولؐ کسی حادثہ یا مشکل پیش آجانے کی وجہ سے محزون ہوتے تھے تو نماز کا سہارا لیتے تھے اور زیادہ نماز بجالاتے تھے چونکہ نماز گویا خدا سے ملاقات ہے اور جب آپ خدا سے ملاقات کرتے تھے تو آپ کا حزن وملال برطرف ہو جاتا تھا تو فرماتے تھے: اذا قام احدکم یصلی فانه یناجی ربه۔ [2] جب تم میں سے کوئی نماز پڑھتا ہے تو درحقیقت خدا سے مناجات کرتا ہے اور اس

---

[1] ترجمہ رسالۃ الحقوق، سپہری ص ۱۹۲ اس میں اسرار الصلوٰۃ ص ۱۷۶۔۱۷۷ سے منقول ہے۔

[2] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۱ ص ۲۹۲

کی پوری توجہ خدا پر ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس سے نہ دوری ہے اور نہ فاصلہ ہے وہ اس کی دعا کو سنتا ہے اس کے پکارنے کا جواب دیتا ہے۔

نماز کا دوسرا فردی اثر یہ ہے کہ وہ انسان کو اس غرور سے نجات دلاتی ہے جو زندگی کے سفر میں مال و منصب کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یہی انسانی کمال کا وہ نقطہ ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے قیام و رکوع اور سجود کے راز اور اس کے فلسفہ کے بارے میں امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

جو نماز مومن کے کمال کی معراج اور اہل تقویٰ کو خدا سے قریب کرنے والی ہے وہ ایسی چیزوں پر استوار ہے جو کہ ایک دوسرے کے لئے مقدمہ ہیں۔

۱۔ خود پسندی کو چھوڑنا بھی تقویٰ کی حقیقت اور اس کا باطن ہے دوسرے خدا خواہی اور حق طلبی ہے کہ یہ تقرب و معراج کی حقیقت ہے اسی لئے روایت میں وارد ہوا ہے "الصلوٰۃ قربان کل تقی" نماز ہر متقی اور پرہیزگار انسان کے لئے خدا سے قریب ہونے کا سبب ہے۔

یہ دونوں منزلیں، قیام و رکوع اور سجود سے بتدریج حاصل ہوتی ہیں۔ پس قیام کی حالت میں خود پسندی کو ترک کرنا ہے۔ مقام فاعلیت اور مقام رویت فاعلیت حق اور حق کی قیومیت مطلق کے مطابق ہے اور رکوع میں ترک خود پسندی حق کے اسماء و صفات ہیں۔

نماز کا ایک فردی اثر یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا اپنی اصلاح کرنے کے لیے تیار ہو اور اخلاقی فضائل میں بلندی کی انتہا تک پہنچ جائے اور دل کی سرزمین کو پستیوں سے صاف کرے۔ قرآن مجید سچے مومنوں کی، ان صفات کے ذریعہ، تعریف کرتا ہے کہ جن سے وہ نماز کے وسیلہ سے متصف ہوئے تھے چنانچہ سورۂ مومنون میں ارشاد ہے:

قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوٰتھم خاشعون۔[۱]

یقیناً ان مومنوں نے فلاح پائی کہ جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں

"افلح" فلح فلاح سے مشتق ہے اس کے اصل معنی شگافتہ کرنا اور کاٹنا ہے بعد میں اس کا اطلاق ہر قسم کی کامیابی اور مقصد کے حصول اور خوش بختی پر ہونے لگا حقیقت یہ ہے کہ کامیاب راستے سے

---

[۱] مومنون ۱۔۲

رکاوٹوں کو ہٹا دیتے ہیں اور اپنے آخری مقصد تک پہنچنے کے لئے راستہ بناتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ان معنی کے تشریح کرتے ہوئے راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں: فلاح کی دو قسمیں ہیں دنیوی و اخروی، دنیوی فلاح کا خلاصہ تین چیزوں میں ہوتا ہے: بقا غنا اور عزت اور اخروی فلاح چار چیزوں میں ہے: ایسی بقا جس کے لئے فنا نہ ہو ایسی بے نیازی جس کے ساتھ نیاز مندی نہ ہو، ایسی عزت جس کے بعد ذلت نہ ہو اور ایسا علم جس کے ساتھ نادانی و جہالت نہ ہو۔اس آیت میں مومنوں کا تعارف خشوع کے ذریعہ کرایا گیا ہے، خاشعون خشوع سے مشتق ہے اس کے معنی اس جسمانی اور روحانی خاکساری کے ہیں کہ جو کسی عظیم شخصیت کے سامنے یا کسی اہم حقیقت کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر بدن سے ظاہر ہوتا ہے۔آیت میں اسی چیز کی طرف اشارہ ہوا ہے، یعنی ان کی نماز کے الفاظ وحرکات بے جان نہیں ہیں بلکہ ان میں روح و معنویت ہے انہوں نے خدا کی طرف اس طرح توجہ کی ہے کہ وہ اس کے غیر سے جدا ہو گئے ہیں۔

خشوع پیدا ہونے کے اہم اسباب

۱۔ پہلا سبب کہ جس سے ایسی معرفت پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ دنیا اس کی نظر میں حقیر ہو جاتی ہے اور خدا عظیم ہو جاتا ہے حضرت علیؑ نے متقین کی علامتوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: **عظم الخالق فی انفسهم فصغر ما دونه فی اعينهم** [۱] جب خدا ان کی نظر میں عظیم و برتر ہو گیا تو خدا کے علاوہ دوسرے ان کی نظر میں حقیر ہو گئے۔

۲۔حالت نماز میں دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ کرے بلکہ پوری توجہ نماز اور اس کے معنی و مفہوم پر مرکوز کرے۔

۳۔نماز کے لئے خاص جگہ کا انتخاب کرے کہ اس میں دنیوی زرق و برق نہ ہو۔شاید یہی وجہ ہے کہ تصویر و مجسمہ کے مقابل، راستہ میں اور کھولے ہوئے دروازے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

۴۔گناہوں سے پرہیز کرنا خشوع کے پیدا ہونے کا اہم ترین عامل ہے۔

---

[۱] نہج البلاغہ، فیض خطبہ ۱۰۲

۵۔ نماز کے معنی، افعال واذکار اور اس کے فلسفہ کو جاننا۔

۶۔ اس کے مخصوص آداب و مستحبات کو بجالانا خواہ وہ اس کے مقدمات میں ہوں یا اصل نماز میں۔

۷۔ یہ کام بھی دیگر امور کی مانند مشق وتمرین چاہتا ہے۔ اس سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔[۱]

نماز کا اجتماعی اثر

نماز کے اجتماعی آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے دوسروں کی بہ نسبت افراد کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے وہ فطری طور پر اجتماعی زندگی گزارنے کا خوگر ہے۔

وہ تنہائی سے گھبراتا قید خانے کی کوٹھری میں انسان کا زندگی گزارنا اس کے لئے بدترین سزا ہے، انسان دو ذمہ داریوں کا حامل ہے :فردی و اجتماعی ،فردی ذمہ داری کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

"كل نفس بما كسبت رهينة" [۲] ہر انسان اس چیز میں پھنسا ہوا ہے جو وہ کرتا ہے۔

اور سورۂ نساء میں ارشاد ہے:"وما اصابك من سيئة فمن نفسك" [۳] تم تک جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری ہی طرف سے ہے اور ہر شخص اپنے قول وفعل کا جواب دہ ہے۔

اجتماعی مسئولیت، اس میں فرد سے نہیں بلکہ پورے معاشرہ سے بحث ہے، معاشرہ کے لئے ہر فرد کے کچھ فرائض ہیں جیسا کہ رسولؐ نے فرمایا: كلكم راع وكلكم مسئول "تم میں سے ہر اک نگہبان ہے اور ہر ایک جواب دہ ہے۔

خصوصیات نماز میں سے اجتماعی ذمہ داری کے احساس کو زندہ کرنا بھی ہے اسی لئے شارع نے فرادیٰ اور جماعت والی نماز میں فرق رکھا ہے، یہ دونوں ثواب کے لحاظ سے ہرگز برابر نہیں ہیں۔ اسلام نے نماز جماعت کے لئے بہت زیادہ تاکید کی ہے اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک

---

[۱] تفسیر نمونہ ج ۱۴ ص ۲۰۴-۲۰۵ [۲] مدثر: ۳۸ [۳] نساء: ۷۹

باز عبادی و سیاسی نماز جمعہ رکھی ہے کہ جس میں سارے مسلمان صف در صف ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوتے ہیں، اور امام جمعہ کے خطبہ سے سیاسی مسائل، معاشرہ کی موجودہ مشکلیں عنقریب پیش آنے والی مشکلوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ جب مسلمان نماز جمعہ میں کھڑے ہوتے ہیں تو اس وقت مسلمانوں کے شکوہ و جلال اور ان کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور یہ نماز اس بات کا باعث ہوتی ہے کہ کینہ توز دشمن مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے کی نہ سوچے، اس سے مسلمان ایک مستقل و خودمختار قوم بن جاتے ہیں اور ہمیشہ شوکت واقتدار کے حامل رہتے ہیں۔

نماز جماعت میں مستحب ہے کہ صفیں منظم ہوں دلچسپ بات یہ ہے کہ نماز جماعت میں کالے گورے، اور عرب و عجم صف میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوتے ہیں اور نماز کے بعد مصافحہ کرتے ہیں اس سے معاشرہ میں مساوات و برابری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور اس سے طبقاتی فکر، کہ جس سے آزاد منش اور شریف و نجیب آدمی کو اذیت ہوتی ہے، ختم ہوتی ہے اور کینہ توزی و عداوت کی جگہ خلوص و محبت آجاتی ہے، نماز جماعت میں شریک ہونے سے معاشرہ کے دوسرے لوگوں کے حالات بھی معلوم ہوجاتے ہیں اور اگر کوئی شخص کسی دن مسجد میں نہ آئے تو دوسرے نمازی اس کے نہ آنے کی وجہ معلوم کرتے ہیں۔ اگر اسے کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے تو اسے رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں مختصر یہ کہ نماز سارے مسلمانوں کو امت واحدہ (ایک امت) قرار دیتی ہے اور نتیجہ میں ایک مستقل معاشرہ وجود پذیر ہو جاتا ہے۔

نماز کے اخلاقی آثار

انسان اس وقت تک خدا کا تقرب حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ اپنے وجود سے رذائل کو بر طرف نہیں کرتا اور اپنے وجود سے ان برے صفات کو اکھاڑ کر نہیں پھینک دیتا جو جڑ پکڑ چکے ہیں اور دل کو فضائل کے پہنچنے کے لئے آمادہ نہیں کرتا قرآن کہتا ہے:

قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلی۔ [1]

---

[1] اعلیٰ ۱۴ تا ۱۵

یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنا تزکیہ کر لیا اور اپنے پروردگار کے نام کو یاد رکھا اور نماز پڑھی۔

نماز اخلاق کی طہارت و پاکیزگی کا ذریعہ ہے، مستقل نماز پڑھنے سے انسان نیکی کا عادی ہو جاتا ہے اور برائی سے باز رہتا ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے:

ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ [۱]

بیشک نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکتی ہے اور انسان کو فضیلت و سعادت سے قریب کرتی ہے چنانچہ درج ذیل آیتوں میں اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے:

ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسہ الشر جزوعا واذا مسہ الخیر منوعا الا المصلین الذین ھم علیٰ صلوٰتھم دائمون۔ [۲]

انسان کو حریص اور کمزور پیدا کیا گیا ہے، جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بے تاب ہو جاتا ہے اور جب مال مل جاتا ہے تو بخیل بن جاتا ہے، سوائے ان نمازیوں کے جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

بعض مفسرین اور صاحبان لغت نے ھلوع کے معنی حریص ولالچی اور بعض نے کمزور تحریر کئے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار سے یہاں انسان کے وجود میں تین اخلاقی منفی نکات کی طرف اشارہ ہوا ہے: حرص، جزع، فزع اور بخل و کنجوسی، اور دوسرے معنی کے لحاظ سے دو نکتے ہیں: جزع و فزع اور بخل، کیونکہ دوسری اور تیسری آیت "ھلوع" ہی کی ایک تفسیر ہے۔ [۳]

اس آیت میں انسان کے وجود کی حرص و طمع اور بے صبری و کمزوری سے اصلاح کے لئے نماز کا بنیادی کردار ہے۔ نمازی نماز کے زیر سایہ اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔ کہ نماز انسان کی زندگی کے آغاز و انجام کی تفسیر کرتی ہے۔ کہ وہ کہاں سے آیا ہے، کہاں آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔

جامع السعادات میں علامہ نراقی لکھتے ہیں: کہ ہمارے مولا امیر المومنینؑ سے پہلے سجدہ کے معنی دریافت کئے گئے تو آپ نے فرمایا: اس کے معنی یہ ہیں اے خدا تو نے ہم کو خاک سے پیدا کیا ہے، اور اس سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں: اور اسی سے ہمیں اٹھائے گا۔ اور دوسرا سجدہ اس بات کی طرف اشارہ ہے:

---

[۱] عنکبوت: ۴۵ [۲] معارج: ۱۹ تا ۲۳ [۳] تفسیر نمونہ ج ۲۵ ص ۲۸

اور پھر ہمیں اسی میں پہنچائے گا اور اس سے سر اٹھانے کے معنی یہ ہیں کہ پھر ہمیں دوبارہ اس سے اٹھائے گا۔[1]

جب انسان ایسے معنی پر توجہ کرے گا تو یقیناً اپنے نفس کی اصلاح کے لئے کوشش کرے گا۔

نماز اور کمال کی راہ میں رکاوٹ

شیخ محمود شبستری نے "گلشن راز" میں اس نماز کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس کی قبولیت کے موانع ورکاوٹ ختم ہو جاتے ہیں اور ان موانع کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

موانع تا نگردانی ز خود دور درون خانۂ دل نایدت نور

موانع چون در این عالم چهار طهارت کردن از وی هم چهار است

نخستین پاکی از احداث و انجاس دوم از معصیت و زشرك و وسواس

سیم پاکی از اخلاق نمیمه است که باوی آدمی همچون بهیمه است

چهارم پاکی سر است از غیر که اینجا منتهی میگردد ت سیر

آن کو کرد حاصل این طهارات شود بیشك سزاوار مناجات

تو تا خود را به کلی درنبازی نماز ت کی شود هر گز نمازی

چو ذات پاك گردد از همه شین نمازت گردد آنگه قرة العین[2]

جب تک تم ان چیزوں کو اپنے وجود سے دور نہیں کرو گے کہ جو نماز کی قبولیت میں رکاوٹ بنتی ہیں، اس وقت تک تمہارے دل میں نور نہیں آئے گا اس دنیا میں چار موانع ہیں طہارت بھی چار ہیں۔

پہلے تم حدث ونجاست سے طہارت کرو۔ پھر معصیت وشرک اور وسوسوں سے پاک ہو جاؤ تیسرے برے اخلاق سے پاک ہونا کہ بد اخلاق آدمی جانور کی مانند ہے۔ چوتھے باطن کی طہارت و پاکیزگی ہے اور یہی نقطہ کمال ہے پھر جو شخص ان چاروں طہارتوں کو بجالاتا ہے وہ بیشک خدا سے راز ونیاز کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جب تک تم خود کو پورے طریقہ سے فراموش نہیں کرو گے اس وقت تک

---

[1] علم اخلاق اسلامی ج ۳ ص ۴۴۲ [2] شرح گلشن راز ص ۴۴۲۔۴۴۳

تمہاری نماز، نماز نہیں ہوگی جب تمہاری ذات ہر برائی سے پاک ہو جائے گی اس وقت تمہاری نماز آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گی۔

یہاں تک ہم نے مختصر طور پر نماز کی اہمیت، اس کے فلسفہ اور اس کے فردی، اجتماعی اور اخلاقی آثار کو بیان کیا ہے۔ اب یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ امام زین العابدینؑ نے اپنے پیروؤں کو اپنے عمل سے نماز کا حق ادا کرنے کے معنی بتائے ہیں کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ کے زیادہ نماز پڑھنے پر آپ کے عزیز رونے لگتے تھے۔

علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں فاطمہ بنت الحسین سے نقل کیا ہے کہ وہ جابر بن عبداللہ کے پاس گئیں اور فرمایا: اے رسولؐ کے صحابی! آپ لوگوں پر ہمارے کچھ حقوق ہیں، ان میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ جب ہم میں سے کسی کے کثرت عبادت سے جاں بحق ہونے کا خوف ہو تو ان سے گزارش کریں کہ اپنا خیال رکھیں اے جابر! علی بن الحسین کی پیشانی پر کثرت سجود سے گھٹہ پڑ گیا ہے اور پیروں پر ورم آ گیا ہے، بدن لاغر ہو گیا ہے، ان سے کہئے کہ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

جابر آئے، حاضر خدمت ہونے کی اجازت طلب کی، اجازت ملی، داخل ہوئے دیکھا کہ آپ محراب عبادت میں تشریف فرما ہیں، امام اٹھے اور جابر کو اپنے برابر میں بٹھایا، مزاج پرسی کی، جابر نے عرض کی: میرے سید و سردار کیا خدا نے جنت آپ کے لئے اور جہنم آپ کے دشمنوں کے لئے نہیں بنایا ہے؟ پھر عبادت میں اتنی جانفشانی کیوں فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے رسولؐ کے صحابی! کیا آپ نہیں جانتے کہ خدا نے رسولؐ کی گذشتہ اور آئندہ کی تمام فروگزاشتوں کو معاف کر دیا تھا اس کے باوجود آپ نے عبادت میں جانفشانی نہیں چھوڑی تھی، اتنی عبادت کرتے تھے کہ آپ کے قدم مبارک ورم کر آئے تھے۔ اور جب آپ سے یہ بات کہی گئی کہ خدا نے آپ کی گذشتہ اور آئندہ کی فروگذاشتوں کو معاف کر دیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ جابر سمجھ گئے کہ میری بات کا آپ پر اثر نہیں ہوا ہے، عرض کی آپ اس خاندان سے ہیں کہ جس کے وسیلہ سے خدا بلاؤں کو دفع کرتا ہے اور آسمان و زمین کی حفاظت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں اپنے آباء و اجداد کی اسی طرح اقتدا کرتا رہوں گا یہاں تک کہ ان سے ملاقات کروں جابر کہتے ہیں: میں نے انبیاء کی اولاد میں کسی کو علی بن الحسینؑ کے مثل نہیں

دیکھا۔[۱]

"طاؤس فقیہ" کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ امام زین العابدینؑ نماز عشا کے بعد سے سحر کے وقت تک طواف وعبادت میں مشغول رہے اور جب یہ دیکھا کہ طواف کرنے والے کم ہو گئے ہیں اور جگہ خالی ہو گئی ہے، سر کو آسمان کی طرف بلند کیا اور عرض کیا پروردگارا! ستارے کم ہو گئے ہیں اور کچھ دیر میں غروب ہو جائیں گے، آنکھیں سو چکی ہیں لیکن تیری رحمت کے دروازے مانگنے والوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ پروردگار میں تیری چوکھٹ پر آیا ہوں تاکہ تو اپنی رحمت کو میرے شامل حال کر دے اور میری کوتاہیوں کو معاف کر دے اور روز قیامت مجھے میرے جد رسول کا چہرہ دکھادے، اس کے بعد آپ نے گریہ کیا اور عرض کی: قسم تیرے عزت وجلال کی! معصیت سے میں نے تیری مخالفت ونافرمانی کا ارادہ نہیں کیا تھا اور معصیت کرتے وقت میں تجھ سے اور تیرے سزا دینے سے بے خبر نہ تھا، لیکن میرا نفس مجھے فریب دینا چاہتا ہے اور تیری رحمت کا پردہ بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ پروردگار! کون ہے جو مجھے تیرے عذاب سے نجات دلائے؟ اے اللہ اگر مجھ سے تیرے نجات دینے کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو پھر میں کس سے تمسک کروں؟ افسوس کہ کل میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں اور جن کے نیک اعمال کا پلہ بھاری ہے ان سے کہا جائے تم جاؤ اور جن کے نیک اعمال کا پلہ ہلکا ہے ان سے کہا جائے کہ ٹھہرو! معبود! میں نہیں جانتا کہ میرا شمار ان لوگوں میں ہوگا کہ جن کے نیک اعمال کا پلہ بھاری ہے یا ان لوگوں میں ہوگا کہ جن کے نیک اعمال کا پلہ ہلکا ہے؟

اے اللہ جتنی میری عمر بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی میری خطائیں بڑھتی جاتی ہیں اب وقت آگیا ہے کہ میں توبہ کروں اس کے بعد آپ نے گریہ کیا اور یہ دو شعر پڑھے:

اتحرقنی بِالنّار یا غایة المنٰی فاین رجائی ثم این محبتی

اتیت باعمال قباح ردیة وما فی الوریٰ خلق جنی کجنایتی

اے میری آخری امید کیا تو مجھے آگ میں جلائے گا؟ تو میری امید کا کیا ہوگا اور میری محبت کا کیا ہوگا؟ میں برے اعمال کے ساتھ تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں اور دنیا میں میری خطا کی سی کسی کی خطا

---

[۱] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۱ ص ۳۰۵، بحار الانوار ج ۴۶ ص ۷۸ تا ۷۹

نہیں ہے۔

اس کے بعد گریہ کیا اور سجدہ میں گئے گویا آپ پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی، طاؤس کہتے ہیں میں آپ کے سرہانے پہنچا رونے لگا، میرے آنسو کے قطرے جب آپ کے رخ انور پر گرے تو فرمایا: کون ہے جو مجھے میرے رب کے ذکر سے روک رہا ہے؟ میں نے عرض کی: اے فرزند رسولؐ میں طاؤس ہوں آپ ایسا کیوں کررہے ہیں؟ یہ کیسی آہ وزاری ہے؟ ہم اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ آپ کی اقتداء کریں مولا آپ کے والد کا یہ مرتبہ ہے اور فاطمہ آپ کی ماں ہیں اور رسول آپ کے جد ہیں آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میرے ماں، باپ اور جد کی بات چھوڑ دو خدا نے جنت طاعت گزار لوگوں کے لئے بنائی ہے خواہ وہ حبشی غلام ہو اور جہنم معصیت کرنے والوں کے لئے بنایا ہے خواہ وہ قرشی سید ہی ہو کیا تم نے خدا کا یہ قول نہیں سنا ہے کہ فرماتا ہے: **فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بينهم يومئذ ولا يتساءلون.** [1]

نماز اور گناہوں کی بخشش

نماز کے حق کے آخر میں امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: نماز میں تم خدا سے یہ طلب کرو کہ وہ تمہارے ان گناہوں کو بخش دے جو تمہیں گھیرے ہوئے ہیں اور تمہاری ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ نماز برائیوں اور بدکاریوں سے روکتی ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ رسولؐ نماز کو کس طرح بخشش کا سبب قرار دیتے ہیں:

ابو بصیر نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا: رسولؐ نے فرمایا ہے: اگر تم میں سے کسی کے گھر کے دروازے پر نہر بہہ رہی ہو اور وہ ہر روز اس میں پانچ مرتبہ نہائے تو کیا اس کے بدن پر میل باقی رہ سکتا ہے؟ میں نے عرض کی: نہیں: فرمایا: نماز بھی بہتی ہوئی نہر ہی کی مانند ہے جب تم کوئی نماز پڑھتے ہو تو اس وقت وہ گناہ کا اثر ختم ہو جاتا ہے جو تم نے اس پہلی نماز کے درمیان میں کیا تھا۔ [2]

رسولؐ کی اس مثال میں گناہ اس صورت میں بخشا جاتا ہے کہ جب اس کے شرائط پر عمل کیا

---

[1] بحار الانوار ج ۴۶ ص ۸۱۔۸۲ [2] وسائل الشیعہ ج ۳ ص ۷

ہو۔ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ فرماتے ہیں:

آپ نے اپنے اصحاب کو نصیحت و وصیت کی: نماز کے پابند ہو جاؤ اور اس کا خیال رکھو۔ زیادہ نماز پڑھو اور اس کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کرو کہ یہ مومنوں پر وقت کے ساتھ واجب ہوئی ہے: کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ جب اہل جہنم سے یہ سوال کیا جائے گا کہ تمہیں کس چیز نے جہنم میں پہنچا دیا؟ تو وہ کہیں گے: ہم نماز گزار نہیں تھے۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: نماز انسان کے بدن سے اسی طرح گناہوں کو جھڑا دیتی ہے جس طرح درخت سے پتے گرتے ہیں۔ اور نمازی کو اس طرح خطاؤں سے آزاد کر دیتی ہے جس طرح غلام، غلامی سے آزاد ہوتا ہے۔[1]

[1] وسائل الشیعہ ج ۸ ص ۱۹

روزہ کا حق

واما حق الصوم فان تعلم انه حجاب ضربه الله على لسانك وسمعك وبصرك وفرجك وبطنك ليسترك به من النار، فان تركت الصوم خرقت ستر الله عليك، وهكذا جاء في الحديث: الصوم جنة من النار، فان سكنت اطرافك في حجبتها رجوت ان تكون محجوبا، وان انت تركتها تضطرب في حجابها وترفع جنبات الحجاب فتطلع الى ما ليس لها بالنظرة الداعية للشهوة والقوة الخارجة عن حد التقية لله لم تامن ان تخرق الحجاب وتخرج منه ولا قوة الا بالله۔

لیکن روزہ کا حق یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ روزہ ایک پردہ ہے جو خدا نے تمہاری زبان، تمہارے کان، تمہاری آنکھ، تمہاری شرم گاہ اور تمہارے پیٹ پر ڈال دیا ہے تا کہ اس کے ذریعہ تمہیں آگ سے بچائے پھر اگر تم نے روزہ چھوڑ دیا تو تم نے اپنے اوپر پڑے ہوئے خدا کے پردہ کو چاک کر ڈالا، اسی طرح حدیث میں بھی بیان ہوا ہے، روزہ جہنم سے بچنے کے لئے تمہاری زرہ ہے۔

اگر اس پردہ سے تمہارے اعضاء و جوارح کو آرام ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یہ امید ہو گئی ہے کہ تم پردے میں ہو اور اگر تم نے اس پردہ کا پاس و لحاظ نہ کیا تو تم نے اس کے پردے میں خلل و رخنہ ڈال دیا اور جب تم نے پردہ اٹھا دیا تو تمہاری نگاہ اس چیز کو دیکھے گی کہ جس کو تمہیں نہیں دیکھنا چاہئے وہ شہوت کو بھڑکانے والی ہے۔ وہ تمہیں خدا کی پناہ سے نکال دے گی اور جہاں پردہ چاک ہو جائے اور تم اس سے باہر نکل جاؤ تو وہاں تمہیں خود کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہئے، قوت و طاقت خدا ہی کی ہے۔

''الطرف'' مصدر ہے اس کی جمع اطراف آتی ہے'' يقال : نظر بطرف خفي اى غض معظم عينه و نظر بباقيها من الخوف والاستحياء '' [1] کہا جاتا ہے کہ اس نے آنکھ کے ایک گوشہ سے دیکھا اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے شرم و خوف سے آنکھ کا زیادہ حصہ بند رکھا اور باقی سے دیکھا۔

''الجنب مصدر ہے جس کے معنی پہلو اور طرف کے ہوتے ہیں، کہتے ہیں: قعدت الی جنب فلاں میں فلاں کے پہلو میں فلاں جانب میں بیٹھا۔ [2]

۱۔ المنجد، مادہ طرف ۲۔ مادہ جنب

فلسفۂ روزہ امام زین العابدینؑ کی نظر میں

امام زین العابدینؑ نے اس عبادت کا فلسفہ، ضبط نفس اور گناہ سے پرہیز کرنا بیان کیا ہے کیونکہ زیادہ تر گناہ زبان، آنکھ، کان، شکم اور جنسی میلان کی آزادی کی وجہ سے ہوتے ہیں آپ نے روزہ کو پردہ قرار دیا ہے کہ یہ اعضاء کو گناہ سے باز رکھتا ہے۔

قرآن مجید نے بھی روزہ کا یہی عظیم فلسفہ بیان کیا ہے چنانچہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ [۱]

ایمان لانے والو تم پر روزے اسی طرح لکھے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والے لوگوں پر لکھے گئے تھے ہوسکتا ہے تم تقویٰ اختیار کرو۔

اس آیت میں روزہ لکھنے کے معنی روزہ کا واجب ہونا ہے اور اس آیت میں مومنوں کو بطور خاص اس لئے مخاطب قرار دیا ہے کہ ان کے اندر قبول کرنے کی صلاحیت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے روزہ کا فلسفہ گناہ سے بچنے اور تقویٰ اختیار کرنے کو قرار دیا ہے۔

''صوم'' کے معنی باز رہنے اور پرہیز کرنے کے ہیں، خاموشی کو اس لئے صوم کہا جاتا ہے کہ انسان بولنے سے پرہیز کرتا ہے۔ ان معنی میں صوم سورۂ مریم میں استعمال ہوا ہے۔ **فاما ترین من البشر احدا فقولی انی نذرت للرحمن صوما فلن اکلم الیوم انسیا۔** [۲]

پھر کسی انسان کو دیکھو تو (اشارہ سے) کہہ دو کہ میں نے خدا کیلئے خاموشی کے روزہ کی نیت کرلی (اور جب تک میں روزہ سے ہو اس وقت تک میں) ہرگز بات نہیں کرسکتی۔

روزہ اسلام سے پہلے

آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ تمہارے اوپر اسی طرح روزہ واجب کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والے لوگوں پر واجب کیا گیا تھا یہ کوئی نیا واجب نہیں ہے اور اس عبادت کی مشقت صرف مسلمانوں

---

[۱] بقرہ: ۱۸۳ [۲] مریم: ۲۶

ہی پر نہیں ڈالی گئی ہے بلکہ ان سے پہلے والے لوگوں پر بھی تھی رہی یہ بات کہ اس امت کا روزہ گذشتہ امتوں کے روزہ کی مانند ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا ان پر بھی اتنے ہی روزے واجب تھے یا کسی اور اعتبار سے؟ کہتے ہیں کہ اس امت کے روزہ کو گذشتہ امتوں کے روزہ سے واجب ہونے کے لحاظ سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی تم پر انہیں دنوں میں روزہ واجب کیا گیا ہے جن میں تم سے پہلے والے لوگوں پر واجب تھا لیکن ہوسکتا ہے کہ وقت زمانہ اور عدد کے لحاظ سے تشبیہ دی ہو۔

روزہ توارت کی نظر میں

توارت میں اس طرح بیان ہوا ہے: جب میں پتھر کی تختیاں لینے کے لئے پہاڑ پر آیا اور چالیس دن اور چالیس رات وہاں رہا تو نہ میں نے کھایا نہ پیا۔[۱]

روزہ انجیل کی نظر میں

انجیل میں تحریر ہے: جب عیسیٰ روح کے ذریعہ بیابان میں لے جائے گئے تا کہ ابلیس ان پر اپنا حربہ استعمال کر کے دیکھے چونکہ چالیس دن رات تک روزہ رکھا تھا لہذا بھوکے ہو گئے۔[۲]

عیسیٰ کے بعد حواریوں کا روزہ

پھر انہوں نے کہا: کیا سبب ہے کہ یحییٰ کے شاگرد زیادہ روزہ رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں ایسے ہی فریسیان کے شاگرد بھی ہیں لیکن آپ کے شاگرد کھاتے، پیتے ہیں؟! بلکہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں ان سے داماد چھین لیا جائے گا اس وقت وہ روزہ رکھیں گے۔[۳]

مذکورہ بالا عبارتیں توارت وانجیل میں آیات کے عنوان سے نقل ہوئی ہیں اور اس سے ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ بھی روزہ رکھتے تھے اور دونوں عبارتوں میں چالیس دن رات کی مدت بیان ہوئی ہے لیکن ان کے روزہ رکھنے کی کیا کیفیت تھی یہ معلوم نہیں ہے۔

۱۔ توارت سفر تثنیہ باب ۹ شمارہ ۹ ۲۔ انجیل متی باب ۴، شمارہ ۱۔۲ ۳۔ انجیل لوقا، باب ۵، شمارہ از ۳۳ تا ۳۵

قرآن میں روزہ کا زمانہ

ایاما معدودات فمن کان منکم مریضا او علیٰ سفر فعدة من ایام اخر و علی الذین یطیقونه فدیة طعام مسکین فمن تطوع خیرا فهو خیر له وان تصوموا لکم ان کنتم تعلمون [۱]

معین دنوں، رمضان بھر، روزہ رکھو پھر جو تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزہ رکھے اور جو لوگ زحمت و مشقت کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکیں (جیسے بوڑھے، مرد و عورت، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں) تو ہر روزہ کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جو شخص زیادہ نیکی کرے گا تو اس کے لئے یہی بہتر ہے اور تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

''معدودات'' یعنی معین دن: ان دنوں کے بارے میں دو نظریئے ہیں:

۱۔ اس سے مراد ماہ رمضان نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر ماہ کے تین روزے ہیں ابن عباس کے بقول ان روزوں میں عاشورہ کا روزہ بھی شامل ہے، بعض لوگوں نے ان روزوں کو مستحب اور بعض نے واجب قرار دیا ہے لیکن یہ نظریہ رمضان کے سبب منسوخ ہو گیا۔

۲۔ دوسرا نظریہ، یہ ہے کہ اس سے مراد رمضان ہے۔ اس نظریہ کو اکثر مفسرین نے قبول کیا ہے اور کہا ہے: خدا نے رورہ کو بطور اجمال بیان کیا ہے کہ ایک روزہ ہے یا دو روزے ہیں۔ پھر فرماتا ہے: ایام معدودات، بیان کیا ہے کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ یہ نظریہ صحت مند ہے اور اس پر زیادہ تر مفسرین کا اتفاق ہے۔ اور اس میں نسخ کی ضرورت بھی نہیں ہے، وہ مسافر اور مریض جو روزہ کے شرائط کے حامل نہیں ہیں ان کا روزہ نہ رکھنا آیت سے سمجھ میں آتا ہے اور خدا نے سفر و مرض میں رمضان کے روزہ کی قضا رکھی ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: **قال رسول الله الصائم فی السفر کالمفطر فی الحضر** [۲] رسولؐ نے فرمایا: سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے وطن میں روزہ نہ رکھنے والا۔ اسی سے ملتی جلتی حدیث امام صادقؑ سے منقول ہے:

روی اصحابنا عن ابی عبدالله علیه السلام انه قال : الصائم فی شهر

۱۔ بقرہ ۱۸۴ ۲۔ مجمع البیان ج ۲ ص ۲۷۴

رمضان فی السفر کالمفطر فیه فی الحضر۔ [۱]

ماہ رمضان میں سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے وطن میں بے روزہ صاحب تفسیر مجمع البیان نے درج ذیل آیت کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے:

عیاشی نے مرفوع طریقہ سے محمد بن مسلم سے نقل کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: رسولؐ نہ سفر میں واجب روزہ رکھتے تھے اور نہ مستحب یہاں تک ''کراع الغمیم'' میں نماز ظہر کے وقت یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے پانی کا ظرف طلب کیا اور اس سے پانی پیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ بھی پئیں ایک گروہ نے کہا: دن تو ختم ہو رہا ہے اگر روزہ پورا کر لیا جاتا تو اچھا تھا۔ رسول اللہ نے انہیں عصاۃ یعنی گناہگار کا نام دیا چنانچہ وہ لوگ رسولؐ کے زمانہ تک اسی نام سے پکارے گئے۔ [۲]

رمضان کے معنی

رمضان ''رمض'' سے مشتق ہے، اس کے معنی ریگ زاروں پر سورج کی شدید دھوپ پڑنے کے ہیں، اسی لئے رمضان کا نام رکھا گیا ہے کہ عرب مہینوں کا نام اس زمانہ کی مناسبت سے رکھتے تھے کہ جس موسم میں وہ مہینہ آتا تھا چونکہ رمضان شدید گرمی کے زمانہ میں آتا تھا اس لئے اس کو رمضان کہا گیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ رمضان خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے لہذا حدیث میں بیان ہوا ہے کہ رمضان نہ کہا کرو بلکہ ماہ رمضان کہا کرو۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس مہینہ کو اس لئے رمضان کہا گیا ہے کہ یہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ [۳]

روزہ اور صبر

قرآن مجید میں روزہ کو صبر بھی کہا گیا ہے۔ امام صادقؑ سے خداوند عالم کے اس قول ''واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ'' میں صبر سے مراد روزہ ہے اور فرمایا: جب کسی شخص کے سامنے کوئی اہم چیز آئے اور اس کو

---

[۱] مجمع البیان ج۲ ص۲۷۴ [۲] ایضا ص۲۷۵ [۳] ایضا ص۲۷۵

کسی حادثہ کا سامنا ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہئے کہ خداوند عالم فرماتا ہے: روزہ سے مدد حاصل کرو۔[1]

مرحوم مجلسی نے "مراۃ العقول میں اس طرح تحریر کیا ہے: صبر یعنی حبس" روزہ کو اس لئے صبر کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کو کھانے، پینے اور ہمبستری کی لذت سے روک دیتا ہے۔[2]

احادیث میں روزہ کی فضیلت

اب ہم حدیث اور روایات کی کتابوں کے مطالعہ کی روشنی میں روزہ کی اہمیت بیان کرتے ہیں۔

۱۔ امام محمد باقرؑ نے زرارہ سے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے، نماز، زکواۃ، حج روزہ اور ولایت[3]

مجلسی نے مراۃ العقول میں اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے اور ان پانچ چیزوں کو اسلام کی بنیاد قرار دینے کے سلسلہ میں لکھا ہے: شاید یہ اسلام کو کامل کرنے والی ہوں کیونکہ ان کے بغیر اسلام متزلزل ہے یا یہ کہ ان پانچ چیزوں پر ایمان رکھنا اسلام کا جز ہے۔ یا ایمان سے مراد اسلام ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ولایت سے امامت کا اعتقاد رکھنے کے علاوہ محبت مراد ہو۔

۲۔ اسمٰعیل بن ابی زیاد نے امام صادق سے اور انہوں نے اپنے آباء کرام سے نقل کیا ہے کہ رسولؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

کیا میں تمہیں وہ چیز بتاؤں کہ اگر تم اسے انجام دو تو شیطان تم سے اتنی دور ہو جائے جتنا مشرق و مغرب میں فاصلہ ہے؟

سب عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ بتایئے: فرمایا: رمضان کا روزہ شیطان کے چہرہ کو کالا کر دیتا ہے۔

صدقہ دینا شیطان کی کمر کو توڑ دیتا ہے اور خدا کے لئے محبت کرنا اور نیک عمل انجام دیتے رہنا اس کی جڑ کو کاٹ دیتا ہے اور استغفار کرنا اس کے دل کی رگ کو پھاڑ دیتا ہے اور ہر چیز کی ایک زکوۃ ہے اور

۱۔ مراۃ العقول ج ۱۶ ص ۲۰۱ ۲۔ مراۃ العقول ج ۱۶ ص ۲۰۱ ۳۔ ایضاً ص ۱۹۷

بدن کی زکوٰۃ روزہ ہے۔ [۱]

۳۔ ابن ابی عمیر نے امام صادقؑ کے بعض اصحاب سے روایت کی ہے: خدا نے موسیٰ پر وحی نازل کی: مجھ سے مناجات کرنے میں کون چیز مانع ہوئی؟ عرض کی: میرے منہ کی بو چونکہ میں روزہ رکھتا ہوں۔ ندا آئی اے موسیٰ! میں روزہ دار کی بو کو مشک کی بو سے بہتر سمجھتا ہوں۔ [۲]

مجلسی لکھتے ہیں: سید داماد کہتے ہیں: خلوف، خ کے پیش کے ساتھ، منہ کی بو ہے پھر لکھتے ہیں کسی کو یہ نہیں کہنا چاہئے بوئیں ایسی چیزیں ہیں جو خدا تک پہنچنے کی لیاقت نہیں رکھتی ہیں یا خدا بو سے منزہ ہے چونکہ ہم کہتے ہیں: اطیب سے مراد اقبل ہے یعنی زیادہ قبول ہونے والی اور روزہ دار کے منہ کی بو کو خدا زیادہ قبول کرتا ہے یا یہ کہ اگر خدا کے لئے طیب کا تصور کیا جا سکتا ہے تو منہ کی بو اطیب ہے۔

۴۔ رسولؐ نے فرمایا: روزہ ایسی سپر ہے جو انسان کو آتش جہنم سے بچاتی ہے۔

روزہ اور گناہوں کی بخشش

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ رسولؐ نے جابرؓ بن عبداللہ سے فرمایا: اے جابر! یہ ماہ رمضان ہے جو شخص اس کے دنوں میں روزہ رکھے اور اس کی راتوں میں عبادت کرے اور اپنے پیٹ اور شرم گاہ کو حرام سے محفوظ رکھے اور زبان پر قابو رکھے وہ اپنے گناہوں سے اسی طرح نکل جاتا ہے جس طرح ماہ رمضان سے خارج ہوتا ہے۔ [۳]

جابرؓ نے عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ یہ حدیث کتنی دلچسپ ہے: رسولؐ نے فرمایا: اے جابرؓ اس کی شرطیں کتنی سخت ہیں اس حدیث میں انہیں چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جن کو امام زین العابدینؑ نے روزہ کے حق میں بیان فرمایا ہے یعنی زبان، شکم، شرم گاہ کو محفوظ رکھنا اور گناہوں کا بخشا جانا۔

آپ ہی نے دوسری حدیث میں بیان فرمایا ہے: روزہ دار ہر وقت عبادت میں رہتا ہے بشرطیکہ وہ غیبت نہ کرے خواہ بستر پر لیٹا ہی ہو۔ [۴]

۱۔ ایضاً ص ۲۰۳ — ۲۔ محجۃ البیضاء ج ۲ ص ۱۲۳

۳۔ بحار الانوار ج ۹۶ ص ۳۷۱ — ۴۔ محجۃ البیضاء ج ۲ ص ۱۲۳

روزہ اور مالدار و نادار میں مساوات

صحیح حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: روزہ کو خدا نے بس اس لئے واجب کیا ہے تاکہ مالدار، فقیر و نادار مساوی ہو جائیں کیونکہ اگر روزہ نہ ہو تو مالدار بھوک کا مزہ نہیں چکھ سکتا کہ اس کے احساسات بیدار ہوں اور وہ فقیروں کو کھانا کھلائے کیونکہ ثروت مند جو چاہتا ہے وہ اسکے لئے فراہم ہو جاتا ہے، خدا نے یہ چاہا کہ اس کے بندوں کے درمیان مساوات ہو جائے اور امیر بھوک کا مزہ چکھیں تاکہ وہ کمزور لوگوں پر ترس کھائیں اور بھوکے پر رحم کریں۔[1]

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ماہ رمضان کے روزہ کا ایک فلسفہ اس طبقاتی فاصلہ کو کم کرنا ہے جو امیر و غریب کے درمیان ہے، ثروت معاشرہ کو ہمیشہ امیر و غریب میں تقسیم کرتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے مالدار اور خوش حال طبقہ کو نادار و کمزور طبقہ کے لوگوں کی تکلیفوں کا احساس نہیں ہوتا ہے لیکن جب وہ روزہ رکھتے ہیں اور انہیں بھوک لگتی ہے اور شدید پیاس لگتی ہے تو ان کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے پھر وہ بھوکے کو سیر کرنے کی سوچتے ہیں اور اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ فقہی لحاظ سے کوئی مالدار اپنا روزہ فقیر و نادار سے نہیں رکھوا سکتا۔ اگر، خاکم دہن، اس عبادت کا کوئی اور فائدہ نہ ہوتو یہی کافی تھا۔

روزہ حضرت علیؑ کی نظر میں

نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ نے مختلف لفظوں میں روزہ کے بارے میں بیان کیا ہے۔ ہم یہاں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ایک جگہ فرماتے ہیں: ''وزکوٰۃ البدن الصیام''[2] روزہ رکھنا بدن کی زکوٰۃ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زکوٰۃ کے معنی رشد و نمو کے بھی ہیں اور پاکیزگی و طہارت کے بھی اس جملہ میں آپ نے روزہ کا فلسفہ بدن کی سلامتی قرار دیا ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''صوم شهر رمضان فانه جنة من العقاب''[3] ماہ رمضان کا روزہ عقاب خدا سے بچنے کے لئے سپر ہے۔

---

[1] مجمۃ البیضاء ج۲ ص ۱۲۴ [2] نہج البلاغہ صبحی صالحی حکمت ۱۳۶ [3] ایضا خطبہ ۱۱۰ فیض الاسلام

برادران کے بارے میں مختلف انداز میں اظہار خیال فرماتے ہیں انہیں میں سے یہ بھی ہے:

خمص البطون من الصیام، ذبل الشفاه من الدعا، صفر الالوان من السهر علیٰ وجوههم عبرة الخاشعین اولیئك اخوانی الذاهبون۔ [۱]

ان کے پیٹ روزہ رکھنے کی وجہ سے لاغر اور ان کے لب دعا کرنے کے سبب مرجھائے اور بیدار رہنے کے باعث ان کے رنگ زرد، ان کے چہروں پر خشوع کا غبار ہے، یہ تھے میرے بھائی جو چلے گئے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''والصیام ابتلاء لا خلاص الخلق'' [۲] روزہ خلوص کی آزمائش کے لئے ہے دوسرے کلمہ حکمت میں فرماتے ہیں: وقال فی بعض الاعیاد: انما هو عید لمن قبل الله صیامه و شکر قیامه و کل یوم لا یعصی الله فهو عید [۳] کسی عید میں آپ نے فرمایا: عید تو بس اسی کی ہے جس کے روزہ کو خدا نے قبول کرلیا ہے اور جس کے قیام کی قدر کی گئی اور ہر وہ دن عید ہے جس میں گناہ نہ ہو۔

آپ نے ایک وصیت و نصیحت میں فرمایا: اوصیکم و جمیع ولدی ...و صلاح ذات البین افضل من عامة الصلوٰة والصیام [۴] تم کو اور اپنے تمام بیٹوں کو وصیت کرتا ہوں ...کہ ان آدمیوں یا گروہوں میں صلح کرا دینا ایک سال کے نماز روزے سے افضل ہے جن میں دشمنی ہو۔

بے بہرہ روزہ دار

آپ ہی کا ارشاد ہے: کتنے ہی روزہ رکھنے والے ایسے ہیں جن کا روزہ بھوک اور پیاس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اور کتنے ہی شب بیداری کرنے والے فضول میں زحمت اٹھاتے ہیں، ذہین لوگوں کا سونا اور ان کا افطار کرنا کتنا اچھا ہے۔ [۵]

خطبہ قاصعہ میں فرماتے ہیں: نماز، زکوٰۃ، اور واجب روزہ رکھنے کے سبب سے خدا اپنے مومن

---

[۱] ایضا خطبہ ۱۲۰ فیض الاسلام [۲] نہج البلاغہ، صبحی صالحی حکمت ۲۵۲ [۳] ایضا حکمت ۴۲۸

[۴] نہج البلاغہ، فیض الاسلام حکمت ۱۳۷ [۵] ایضا وصیت ۴۷،

بندوں کی حفاظت کرتا ہے چونکہ ان اعمال کے سبب ہاتھ، پیر گناہوں سے باز رہتے ہیں اور ان کے باعث آنکھیں جھکی رہتی ہیں اور نفس قابو میں رہتا ہے، دل جھکتا ہے اور وہ غرور و تکبر سے پرہیز کرتے ہیں ان کی پیشانیاں سجدے کی وجہ سے خاک آلود اور سجدے کی حالت میں ان کے اعضاء کے زمین سے اتصال کی وجہ سے چھوٹے اور ان کے شکم روزہ رکھنے کی وجہ سے کمر سے چپک گئے ہیں۔ [1]

یہ تھے روزے سے متعلق جناب امیر المومنین کے بعض اقوال جو نہج البلاغہ میں مرقوم ہیں۔ آپ نے روزہ کے مثبت و منفی آثار کو بیان کیا ہے، اس کے مثبت آثار یہ ہیں، بدن کی زکوۃ، جہنم سے بچانے کے لئے سپر، آزمائش و امتحان، خلوص اور گناہوں کا برطرف ہونا اور اس کے منفی آثار میں سے یہ ہے کہ روزہ سے استفادہ نہ کرنا تو صرف بھوکا رہنا ہے۔

کہتے ہیں: ایک عرب اونٹ پر سوار چلا جارہا تھا بیابان میں ایک نماز گزار کے پاس سے گزرا، اسے اس کا قیام و قعود اور سجدہ بھلا معلوم ہوا چنانچہ وہ اونٹ سے اتر کر خلوص کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے کہنے لگا، تم نے کتنی اچھی نماز پڑھی ہے؟! صحیح معنوں میں تم ہی نمازی ہو! اس نے جواب دیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں روزہ سے بھی ہوں اس کے روزہ، نماز نے اس شتر سوار کو مطمئن کر دیا تو اس نے اپنا اونٹ امانت کے طور پر اس نمازی کے پاس چھوڑ دیا اور کہیں چلا گیا جب واپس آیا تو دیکھا کہ نہ وہاں نمازی ہے نہ اونٹ اس وقت اس عرب نے انگشت بدنداں ہو کر یہ شعر پڑھا:

صلّی فاعجبنی وصام فرّابنی نح القلوص عن المصلّی الصائم [2]

اس کی نماز نے میرا دل جیت لیا اور اس کے روزہ نے میرے خلوص میں اضافہ کر دیا۔ خبردار اپنے اونٹ کو ایسے نمازی کے پاس نہ چھوڑنا جو روزہ دار ہو!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں صاحب جواہر شیخ الفقہا، آیت اللہ شیخ محمد حسن کے بیان کردہ روزے کے مثبت آثار کی طرف اشارہ کر دیں موصوف اس حدیث "الصوم لی وانا اجزی بہ" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

حدیث قدسی ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دونگا یا

---

[1] خطبہ ۱۹۲، صبحی صالحی، المعروف بہ قاصعہ [2] سرمایہ سخن ج ۱ ص ۱۴

یہ کہ میں ہی روزہ کی جزا ہوں صاحب جواہر فرماتے ہیں کہ روزے کے خدا سے مخصوص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ روزہ ایک مخفی چیز ہے جس کو خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا ہے۔ نماز و حج کے بالکل برخلاف کہ ان کو لوگ دیکھتے ہیں لیکن روزہ کو خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا ہے شاید یہ اس لئے ہو کہ روزہ سے بدن کمزور ہو جاتا ہے اور عقل قوی ہو جاتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ خدائی الطاف اور معارف ربانیہ تک پہنچ جاتا ہے اور اسے مطلوبہ کمال حاصل ہو جاتا ہے، نفس انسانی کی بہترین حالت ہے۔ [1]

روزہ کے آثار، غزالی کی نظر میں

ابو حامد لکھتے ہیں: روزہ خدا کے لئے ہے اور یہ مخصوص شرف کا حامل ہے اگر چہ ساری عبادتیں ایسی ہی ہیں لیکن روزہ میں دو چیزیں ہیں:

۱۔ روزہ بہت سی چیزوں سے باز رہنا اور ان سے دست کش ہونا ہے اور یہ ایسی چیز ہے کہ جس کا مشاہدہ نہیں کیا جا سکتا جبکہ دیگر عبادات و طاعت کو لوگ دیکھتے ہیں مگر روزہ کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے کیونکہ یہ باطنی عمل ہے جو صبر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

۲۔ ترک، یہ خدا کے دشمن شیطان کے لئے کاری ضرب ہے۔ کیونکہ شیطان کا ہتھیار شہوتیں ہیں اور شہوتیں کھانے، پینے سے قوی ہوتی ہیں۔ رسولؐ فرماتے ہیں:

شیطان انسان کے اندر اس طرح چلتا ہے جیسے بدن میں خون کا دوڑتا ہے۔

لہٰذا شیطان کے اس راستہ کو بھوک کے ذریعہ سے بند کر دو جس کے ذریعہ وہ دوڑتا ہے۔ [2]

روزہ کی حالت میں بھوکا رہنا شیطان کی کمر توڑ دیتا ہے اور اس کے راستہ میں عظیم رکاوٹ ہے اور جو شخص شیطان کو شکست دیتا ہے وہ خدا کی مدد کرتا ہے اور خدا کی مدد اپنی طرف سے اسے توفیق دینا ہے ارشاد ہے:

ان تنصروالله ینصرکم و یثبت اقدامکم [3]

جدوجہد اور کوشش بندے کی طرف سے اور اس کی جزا خدا کی طرف سے ہے۔

---

[1] جواہر الکلام ج۱۶ ص۱۸۲ [2] کیمیائے سعادت ج۱ ص۲۰۸ [3] محمد: ۷

جیسا کہ ارشاد ہے: والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین[۱]

دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے: ان اللہ لا یغیر بقوم حتی یغیر ما بانفسھم[۲]

بیشک خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت نہیں بدلتی ہے۔

حالت بدلنے سے مراد شہوتوں کو مغلوب کرنا ہے۔ شہوت شیطان کی چراگاہ ہے چنانچہ جب تک چراگاہ ہری رہے گی اس وقت تک وہ اس سے نہیں نکلے گا اور جب تک انسان کے وجود میں شیطان کی آمد ورفت رہے گی اس وقت تک انسان پر خدا کا جلال منکشف نہیں ہوگا لہذا رسولؐ نے فرمایا:

لو لا ان الشیاطین یحرمون علیٰ قلوب بنی آدم لنظروا الی ملکوت السماء[۳]

اگر انسان کے دل میں شیطانوں کی آمد ورفت نہ ہوتی تو وہ آسمانوں کے ملکوت کو دیکھتے۔

روزہ اور انسان کی تندرستی

روزہ واجب ہونے کا فلسفہ انسان کے بدن کی صحت وتندرستی ہے انسان کے بدن کی صحت و تندرستی کو بیان کرنے سے پہلے ہم ان بیماریوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے کہ وہ کس طرح انسان کے بدن میں سرایت کرتی ہیں؟ اس سلسلہ میں پہلے ہم اولیائے دین کے نظریہ کو بیان کریں گے:

۱۔ رسول اللہ نے فرمایا: "المعدۃ بیت کل داءٍ والحمیۃ راس کل دواءٍ[۴]

معدہ ہر بیماری کا گھر اور پرہیز ہر دوا کا سر ہے۔

۲۔ امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں: الحمیۃ راس کل دواءٍ والمعدۃ بیت الادواء[۵]

پرہیز ہر دوا کا لب لباب اور معدہ ہر بیماری کا گھر ہے۔

۱۔ عنکبوت: ۶۹ ۔۔۔ ۲۔ رعد: ۱۱ ۔۔۔ ۳۔ محجۃ البیضاء ج ۲ ص ۱۲۵

۴۔ سفینۃ البحار ج ۲ ص ۷۸ ۔۔۔ ۵۔ ایضا ص ۷۹

آپ ہی کا ارشاد ہے: لیس من دواء الا و یھیج داء ولیس شیء فی البدن انفع من امساك البدن مما یحتاج الیه [۱]

جس دوا کو بھی انسان پیتا ہے وہی دوسرے مرض کو پیدا کرتی ہے اور بدن کے لئے اس سے زیادہ مفید کوئی چیز نہیں ہے کہ اس کو ان غذاؤں سے باز رکھا جائے جن کی اسے احتیاج ہے۔

۳۔ رسولؐ فرماتے ہیں: صوموا تصحوا روزہ رکھو تا کہ صحت مند و تندرست ہو جاؤ۔

ان حدیثوں میں رسولؐ اور ساتویں امام علیہ السلام نے کہ جن کے علم کا سرچشمہ وحی ہے، صحت و تندرستی کا طریقہ بھی بتا دیا ہے اور مرض و سستی کا راستہ بھی اور معدہ کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ ہر مرض اس سے پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ اصبغ بن نباتہ کہتے ہیں: میں نے امیر المومنین سے سنا کہ اپنے فرزند حسن مجتبیٰ سے فرماتے ہیں: بیٹا! کیا میں تمہیں چار ایسے کلمات بتاؤں کہ جن کے ذریعہ طبیب سے بے نیاز ہو جاؤ؟ عرض کی: ہاں اے امیر المومنینؑ فرمایا جب بھوک لگے تو کھانا اور کچھ بھوک رہ جائے تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لینا، کھانے کو خوب چبا کر کھانا، اور سونے سے پہلے بیت الخلاء جانا اگر تم ان باتوں پر عمل کرو گے تو طبیب سے بے نیاز ہو جاؤ گے یعنی تمہیں کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ [۲]

اس حدیث میں بھی کھانے، معدہ، پرخوری، پرہیز اور خوب چبانے ہی کو موضوع بنایا گیا ہے، مختصر یہ کہ مرض معدہ اور کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔

بدن سے نکلنے والی چیزوں میں نظم اور اس میں داخل ہونے والی چیزوں میں بے نظمی۔

گردے، جگر و کلیجی اور کھال صادر کرنے والے نمائندے ہیں اور یہ منظم طریقہ سے کام کرتے ہیں گردوں کا نظم دیکھئے کہ جب انسان رات میں سوتا ہے اور پیشاب کے لئے نہیں اٹھنا چاہتا تو گردے نیند کی شدت اور تاریکی کے لحاظ سے کم پیشاب بناتے ہیں ایسے ہی کھال اور جگر و کلیجہ بھی۔ لیکن بدن میں داخل ہونے والی چیزوں میں نظم نہیں ہے کبھی انسان پاک، صاف اور حلال غذا کی بجائے، گرد و غبار، دھواں اور الکحل کو بدن میں انڈیل لیتا ہے اور نتیجہ میں (Metobol) کی ٹنکی میں شگاف پڑ جاتا ہے اور

---

[۱] ایضاً ۷۸ [۲] سفینۃ البحار ج ۲ ص ۷۹۔۸۰

آدمی کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

بدن ایک ذخیرہ کئے گئے ڈیم کی مانند ہے اور چونکہ کھائی جانے اور پی جانے والی بہت سی چیزیں بدن میں داخل ہوتی ہیں چنانچہ بہت سے اعضاء زہر کے اثر کو ختم کرنے کے لئے مستقل طور پر کام میں لگے رہتے ہیں لہذا بدن کو اس لئے کچھ فرصت ملنا چاہئے کہ وہ زہر کے اثر کو دفع کرنے کے لئے اس طرح کام کر سکے۔ اور یہ روزہ رکھنے اور بدن میں داخل ہونے والی غذا کی کیفیت اور اس کے مواد کی کیست کے منظم کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ [۱]

غدود

الف: ترشح کرنے والے غدود کا باہم اتصال کہ اگر ان میں سے کوئی کم و زیادہ ہو جاتا ہے تو دوسرے میں خلل پڑ جاتا ہے۔

ب۔ ہپوفیز: ان غدود میں سے ہے کہ جو ان اہم غدودوں سے متصل ہے جو اہمیت کے حامل ہیں خصوصاً گردے کے اوپر کی جھلی سے متصل ہے۔

ج۔ گردوں کے اوپر کی جھلی کے ترشحات بہت اہم ہیں وہ بدن کے تمام خلیوں میں کام آتے ہیں۔ خراب کھانا اور پرخوری اس پر برا اثر ڈالتی ہے۔

د۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ لوز المعدہ کے غدود گردوں کے اوپر جھلی کے ساتھ عمر کے دوام میں نہایت موثر ہیں۔

ھ۔ یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ لوز المعدہ اور گردوں کے اوپر کے حصہ میں قریبی ارتباط ہے۔

د۔ اس بات کی بھی تحقیق ہو چکی ہے کہ جیسے جیسے سن بڑھتا ہے لوز المعدہ کے ہارمون کے ترشحات گھٹتے جاتے ہیں لیکن گردوں کے اوپر کے غدود ہارمون بناتے ہیں اس پر زمانہ کے گزرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

---

[۱] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر ج ۳ ص ۳۷۔ ۳۸

ز۔ کچھ زمانہ پہلے بیو کیمیکل کے استاد ''ولاڈیمیری نیکی تین'' نے برسوں کے تجربہ کے بعد جنگلی چوہوں پر تجربہ کیا اور اس بات کو ثابت کیا کہ چوہوں کو بھوکا رکھکر ان کی عمر کو دوگنا بڑھایا جا سکتا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ اگر گردوں کے اوپر کے غدودوں کو ایک مدت تک بھوکا رکھا جائے تو وہ لامحالہ اضافی ہارمون کو جو کہ عدم تعادل کا باعث ہوتا ہے، کھا جائیں گے۔ بنا براین اگر سال بھر میں غلط کھانے وغیرہ کے سبب غدود کے ترشحات کا توازن بگڑ گیا ہوگا تو روزہ ان میں از سر نو تعادل و توازن پیدا کر دیگا۔[۱]

بوٹالسم کی تحقیق

یہ تصور کیا جاتا ہے کہ جو چیز ہم کھاتے ہیں وہ بدن کے لئے ایندھن کا کام دیتی ہے، اس کے لئے انرجی فراہم کرتی ہے اور باہر نکل جاتی ہے، لیکن یہ تصور صحیح نہیں ہے ایسا نہیں ہے کہ ہمارا بدن حوض و ٹنکی کی مانند ہو کہ جس میں ایک طرف سے کھانا داخل ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف سے نکل جاتی ہے۔ مثلا ایک طرف سے شکر کا مواد داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے جو چیز داخل ہوتی ہے وہ تازہ ہوتی ہے اور تازہ ہونا چاہئے اور اسے جو خارج ہوتی ہے وہ باسی اور تلچھٹ ہوتی ہے اسے خارج ہونا چاہئے ایسے ہی اس دنیا کی مثال ہے کہ بچے آتے ہیں اور بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ جو آکسیجن آج بدن میں داخل ہوئی ہے وہ چھ مہینے بعد خارج ہوگی اور جو کیلشیم آج بدن کے اندر گئی ہے وہ چھ ماہ بعد استعمال ہوگی، اگر کھانے میں ازٹ راڈیو اکتیو نہ ہو تو کئی ہفتہ بعد دوا میں اس کو دیکھا جاتا ہے۔ بنابرایں یہ توقع نہیں رہنا چاہئے کہ خراب و فاسد چیزیں اتنی جلد اپنی جگہ تازہ اور نئی چیزوں کو دے دیں گی۔ بلکہ اس کے لئے پے در پے کئی روز گزرتے ہیں۔

ڈاکٹر (ژان فرموزان) کہتے ہیں: جگر کے گلیکوزن اور خون کے پروٹین اور چربی کا ذخیرہ جو کہ مرد میں ۳۰ فیصد اور عورت میں ۲۰ فیصد ہوتا ہے وہ بدن کے لئے ایک ماہ تک کافی ہے۔

ڈاکٹر الکسیس کارل اپنی کتاب ''انسان موجود ناشناختہ'' میں روزہ کے متعلق لکھتے ہیں: روزہ سے جگر میں موجود خون کی شکر صاف ہو جاتی ہے اور کھال کے نیچے جمع ہو جانے والے چربی کے ذخیرہ اور

---

[۱] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر ج ۳ ص ۴۰ و ۴۱

عضلات و غدد اور جگر کے خلیئے آزاد ہو جاتے ہیں اور بدن کے کام آجاتے ہیں بقول ژان فرو موزان" بعض عناصر بدن کے لئے ایک ماہ کا ذخیرہ ہوتے ہیں ان تمام باتوں کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ روزہ رکھنے والا آدمی ایک ماہ کی مدت میں ایک نیا اور فرسودگی و سموم کی قید سے آزاد بدن حاصل کر لیتا ہے۔ [1]

کیا روزہ سے معدہ میں زخم ہوتا ہے؟

غلط پروپیگنڈوں اور اسلام کے خلاف تبلیغات نے جہاں لوگوں کے ذہنوں میں اور شبہات پیدا کئے ہیں وہاں ایک شبہہ یہ بھی پیدا کر دیا ہے کہ روزہ رکھنے سے معدہ میں زخم ہو جاتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ اگر روزہ رکھنے سے معدہ میں زخم ہوتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ جن قوموں میں روزہ نہیں رکھا جاتا ان میں زخم معدہ والوں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ کیوں ہے؟

ہاں اگر زخم معدہ میں صرف مسلمان ہی مبتلا ہوتے اور دوسری قوموں میں یہ مرض نہ ہوتا تو یہ بات طے ہو جاتی کہ یہ مرض صرف مسلمانوں میں روزہ رکھنے والوں ہی کو لگتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ زخم معدہ والوں کی تعداد مغربی ممالک میں بڑھتی ہی جارہی ہے۔

دوسرے اگر روزہ معدہ میں زخم ہونے کا باعث ہوتا تو صدیوں سے دہرائے جانے والے اس عمل سے یہ مرض مسلمانوں میں ہی محدود نہ رہتا بلکہ یہ موروثی مرض بن جاتا اور نسلوں میں منتقل ہوتا رہتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ [2]

زخم معدہ کے اسباب

۱۹۶۶ء میں ٹوکیو میں امراض معدہ کے بارے میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی تھی جس میں اس مرض کے پیدا کرنے والے اسباب کے بارے میں بحث و تمحیص ہوئی اس کانفرنس میں شرکت کرنے

---

[1] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر ج ۳ ص ۴۰ و ۴۱ [2] اہمیت روزہ از نظر علم روز ص ۲۲۳

والے ہر نمائندے نے اس مرض کو پیدا کرنے والے ان اسباب کو۔ جو کہ اس کے ملک کے حفظان صحت اور طبی ادارہ کی تحقیقات کا نتیجہ تھے۔ کانفرنس میں پیش کیا ان رپورٹوں میں سب سے زیادہ بیڑی، سگریٹ پینے، گرم غذاؤں کا زیادہ استعمال، زیادہ پانی پینے، مستقل طور پر چائے وقہوہ نوشی، کھٹی چیزوں کا حد سے زیادہ استعمال اور ایسے مشروبات کو اس مرض کا سبب بتایا گیا تھا جن میں اسپرٹ شامل ہوتی ہے۔

ترکی کے نمائندہ نے ماہ رمضان کے بعد اس طرح اظہار خیال کیا: ماہ رمضان کے روزہ سے یہ مرض جلد پیدا ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ روزہ رکھنا اس مرض کو پیدا نہیں کرتا ہے لیکن جب اس مرض کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں تو روزہ کی وجہ سے وہ جلد پیدا ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اسلام کے آئین میں یہ بات نظر آتی ہے کہ بیمار یا جس شخص کو یہ علم ہو جائے کہ اگر وہ روزہ رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا تو اس وقت اس پر روزہ واجب نہیں ہوتا بلکہ دوسرے وقت پر موقوف ہو جاتا ہے۔

روزہ طبی تھیوری

گوناگوں اور مختلف قسم کے کھانے کی وجہ سے کچھ کھانا ہاضمہ کی مشینری سے گزر جاتا ہے اور بدن کے خلیوں کے کام نہیں آتا ہے بلکہ کھال کے نیچے اور دل کے اطراف اور حساس جگہوں میں جمع ہو جاتا ہے اس سے بدن میں عفونت پیدا ہو جاتی ہے جس سے مختلف قسم بیماریاں پیدا ہوتی ہیں عفونت وگندگی جتنی زیادہ ہوگی بیماری اتنی ہی شدید ہوگی اور نئے نام سے پہچانی جائے گی، ان بیماریوں کی اصل اور جڑ ایک ہی ہے، اور وہ ہے ایسے میکروب اور وائرس ہیں جو کثافت وگندگی ہی کے ماحول میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ بیماریوں کا علاج کرنے اور میکروب کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلے کوڑے کرکٹ اور گندگی کو دور پھینکنا چاہئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ بدن کو کھانا نہ دیں بلکہ پانی پر اکتفا کریں اس صورت میں بدن خود بخود عفونت اور اضافی مواد کو جڑوں سے باہر نکال کر استعمال کرے گا اس وقت بیماری کی جڑ کٹ جائے گی اور بدن ان چیزوں کے ختم ہونے کی نشانی پیش کر دے گا۔ اس طریقہ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ یہ طبیعی طور پر بیماریوں کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور بدن کا خود بخود علاج ہو جاتا ہے۔ جب کہ دوسری

صورتوں میں میکروب کو مارنے کے لئے زہریلی دواؤں کا استعمال ہوتا ہے اور یہ دوائیں بدن کی سالم ساخت پر برا اثر ڈالتی ہیں اور بدن ردّ عمل کرتا ہے، لیکن روزہ میں ایسا نقصان نہیں ہے۔ اس طریقہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ہی دفع میں ساری بیماریوں کا علاج کر دیتا ہے۔[1]

یہ تھا بیماریوں کے علاج اور صحت پانے کے بارے میں اطباء کا نظریہ کہ جس کا اہم حصہ پرہیز کرنا اور روزہ رکھنا ہے۔ بلکہ تمام طریقوں سے بہتر روزہ رکھنا ہے۔ یہ خداوند عالم نے، جو کہ انسان کا خالق ہے، اس لئے واجب کیا ہے تا کہ انسان اس عبادت کے ذریعہ عبودیت و بندگی کی روح حاصل کرنے کے علاوہ بدن کی صحت بھی حاصل کرے۔ اور گزشتہ صفحات میں آپ یہ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ امام زین العابدینؑ نے روزہ کے فلسفہ میں زیادہ اعضاء و جوارح کو قابو میں رکھنے اور ان کو اس راہ میں استعمال کرنے کو بیان کیا ہے کہ جس کو خدا نے بنایا ہے۔

روزہ کے اسرار اور اس کے باطنی شرائط

علماء نے روزے کے تین مراتب بیان کئے ہیں، عام روزہ خاص روزہ اور خاص الخاص روزہ عام روزہ شکم و شرم گاہ کو شہوتوں اور جنسی لذتوں سے محفوظ رکھنا، خاص روزہ آنکھ، کان، ہاتھ پیر اور تمام اعضاء کو گناہ سے بچانا امام صادقؑ کی حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے:

امام صادقؑ فرماتے ہیں: جب تم روزہ رکھو تو تمہارے تمام اعضاء، کان آنکھ، بال اور کھال کا روزہ ہونا چاہئے... تمہارا روزہ رکھنا اور نہ رکھنا یکساں نہ ہو، دوسری حدیث میں فرمایا: ریاکاری اور خادم کو اذیت دینا چھوڑ دو تمہارے چال چلن پر روزہ کا اثر ہونا چاہئے۔ رسولؐ نے سنا کہ ایک روزہ دار عورت اپنی کنیز کو گالیاں دے رہی ہے۔ آنحضرتؐ نے اس کے سامنے کھانا رکھا اور فرمایا: کھاؤ اس نے عرض کی: میں روزہ سے ہوں آپ نے فرمایا: تمہارا کیسا روزہ ہے؟ جبکہ تم اپنی کنیز کو گالیاں دے رہی ہو روزہ صرف کھانے سے باز رہنا ہی نہیں ہے۔[2]

لیکن خاص الخاص روزہ، دل کا پست اور ماسوا اللہ کے خیالات سے پرہیز کرنا ہے، یہ کھانے،

---

[1] روزہ روش نوین برائے درمان بیماریہا: ترجمہ امامی ص ۱۲

[2] محجۃ البیضاء ج ۲ ص ۱۳۱

پینے کی طرح مبطلات روزہ میں سے نہیں ہے بلکہ غیر خدا اور دنیوی امور کے بارے میں غور کرنا ہے، یہاں تک بعض دل والوں نے یہ کہہ دیا ہے: جو شخص اس چیز کے بارے میں سوچے گا جس سے وہ افطار کرتا ہے تو یہ اس کے لئے غلطی لکھی جاتی ہے کہ یہ خدا کے فضل پر ایمان کی کمزوری اور اس رزق کا یقین نہ ہونے کی بنا پر ہوتا ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ تیسرا مرتبہ، انبیاء و صدیقین کا اور ان لوگوں کا ہے جو خدا کے مقرب ہیں خدا نے اپنے رسولؐ سے فرمایا: "قل الله ثم ذرهم" [1] خدا کہو اور اس کے غیر کو چھوڑ دو۔ اسی چیز کی طرف امام صادقؑ کی حدیث میں بیان ہوا ہے: انه قال : قال رسولؐ : الصوم جنة ای ستر من آفات الدنیا و حجاب من عذاب الآخر، یعنی روزہ دنیوی آفتوں کیلئے کی سپر ہے اور عذاب آخرت سے (بچانے کے لئے) پردہ ہے۔ [2]

---

[1] انعام: ۹۱ [2] محجۃ البیضاء ج ۲ ص ۱۳۱

حج کا حق

وحق الحج ان تعلم انه وفادة الیٰ ربك و فرار الیه من ذنوبك و فیه قبول توبتك و قضاء الفرض الذی اوجبه الله علیك۔ [1]

حج کا حق یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف ایک سفر اور تمہارا اپنے گناہوں سے اس کی طرف فرار ہے حج کے وسیلہ سے تمہاری توبہ قبول ہوتی ہے اور تم اس واجب عمل کو انجام دیتے ہو کہ جس کو خدا نے تم پر واجب کیا ہے۔

لفظ حج کے معنی قصد کے ہیں اسی لئے راستہ اور جادہ کو "محجہ" کہتے ہیں جو کہ "مودۃ" کے وزن پر ہے کیونکہ یہ انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے برہان کو بھی حجت کہتے ہیں کہ یہ بحث میں مقصد کو واضح کرتی ہے لیکن مخصوص مراسم کو اس لئے حج کہتے ہیں کہ جب انسان ان مراسم میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوتا ہے تو وہ خانۂ خدا کی زیارت کا قصد کرتا ہے۔

کعبہ سب سے پہلا گھر

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکا و هدی للعالمین فیه آیات بینات مقام ابراهیم ومَن دَخله کان آمِنا ولله علیٰ النّاس حِجُّ الْبیت من استطاع اِلیهِ سبیلا ومّن کَفر فان الله غنی عن العالمین۔ [2]

بیشک سب سے پہلے مکان جو لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے وہ بابرکت اور عالمین کے لئے ہدایت ہے اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں (ان ہی میں سے) مقام ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے وہ محفوظ ہے اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا واجب ہے اگر اس کی راہ کی استطاعت رکھتے ہوں اور جو کافر ہو گیا تو خدا عالمین سے بے نیاز ہے۔

---

[1] مکارم الاخلاق ص۴۱۹، جیسا کہ مقدمہ میں بیان کیا جا چکا ہے یہ عبارت تحف العقول میں نہیں ہے۔

[2] آل عمران ۹۶۔۹۷

یہ گھر توحید کا اولین مرکز ہے اور روئے زمین پر سب سے پہلا عبادت خانہ ہے اس سے پہلے پروردگار کی عبادت کیلئے کوئی مرکز نہیں تھا اسلامی تواریخ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خانہ کعبہ کو حضرت آدم نے تعمیر کیا تھا پھر اسے طوفان سے صدمہ پہنچا اس کے بعد جناب ابراہیم کے بدست اس کی تعمیر نو کی دلیل سورۂ ابراہیم کی ۳۷ ویں آیت ہے جناب ابراہیم کی زبانی نقل ہوا ہے:۔

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم۔

ہمارے پروردگار میں نے اپنی بعض ذریت کو بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے نزدیک چھوڑ دیا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ابراہیم اپنے شیر خوار بچے اور اس کی ماں کے ساتھ اس سرزمین پر پہنچے تو اس وقت مکہ کی سرزمین پر خانہ کعبہ کا وجود تھا۔

اسی طرح سورۂ بقرہ ۱۲۷ ویں آیت میں آیا ہے:

واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت و اسمعیل ربنا تقبل منا انك انت السمیع العلیم۔

اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم واسمٰعیل خانہ کعبہ کے پایوں کو بلند کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے؛ پروردگار ہمارے اس عمل کو قبول فرما کہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خانہ کعبہ کی بنیادیں موجود تھیں بس حضرت ابراہیم و اسمٰعیل نے اس کے پایوں کو بلند کیا ہے۔ حضرت امیر المومنینؑ کے خطبۂ قاصعہ سے بھی یہ بات روشن ہوتی ہے:

کیا تم نہیں دیکھتے کہ خداوند عالم نے اولاد آدم میں سے اگلے والوں اور بعد والوں کو اس دنیا کے ایسے پتھروں کے ذریعہ آزمایا ہے جو نفع پہنچاتے ہیں نہ نقصان جو دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں پھر خدا نے اپنے گھر کو محترم قرار دیا... پھر آدم کی اولاد کو یہ حکم دیا کہ وہ اس کی طرف رخ کریں۔[۱]

مذکورہ آیتوں اور حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے خطبہ سے اس تاریخ کی تائید ہوتی ہے کہ خانہ

---

[۱] نہج البلاغہ صالحی خطبہ ۱۹۲

کعبہ کی پہلی تعمیر حضرت آدم کے ہاتھ سے ہوئی تھی لیکن جب وہ طوفان نوح میں منہدم ہو گیا تو حضرت ابراہیم نے اس کی تجدید کی۔

خانۂ کعبہ کے امتیازات

قرآن مجید اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ یہ توحید کا اولین مرکز ہے پھر اس کے امتیازات کو بیان کرتا ہے:

۱۔ یہ کہ وہ بابرکت ہے یعنی وہ مادی و معنوی اعتبار سے برکت والا اور فائدہ رساں ہے۔ معنوی تو اس لحاظ سے کہ اس کے سایہ میں خصوصاً حج کے مراسم میں خدائی اور اتحادی جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ مادی نقطۂ نظر سے یہ زمین بے آب و گیاہ ہے اور طبیعی زاویہ نگاہ سے یہ کسی اعتبار سے بھی زندگی بسر کرنے کے لائق نہیں ہے جبکہ یہ ہمیشہ سے ایک بارونق اور زندگی کے لئے مناسب رہی ہے یہاں تک کہ تجارت کے لئے بہترین شہر رہا ہے۔

۲۔ "ھدی للعالمین" سارے جہان والوں کے لئے ہدایت ہے یہاں تک کہ بت پرست بھی اس گھر کی ہدایت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

۳۔ "آیات بینات" اس گھر میں توحید اور خدا پرستی کی واضح نشانیاں موجود ہیں چنانچہ ان نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ان قوی دشمنوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ایسے قائم و ثابت رہا ہے جو اسے نابود کرنا چاہتے تھے۔

زمزم، صفا و مروہ، رکن، حطیم، حجر اسود اور حجر اسمٰعیل ہر ایک عظیم اور دائمی یادداشتوں کو واضح کرنے والا ہے اور یہ سب خدا کی روشن نشانیاں ہیں خانہ کعبہ کی چاروں سمتوں میں سے ہر ایک سمت کو رکن کہتے ہیں اور خانہ کعبہ کے دروازہ اور حجر اسود کے درمیان جو فاصلہ ہے اسے حطیم کہتے ہیں یہاں بہت اژدھام ہوتا ہے یہی آدم کی توبہ کا مقام ہے، حجر اسمٰعیل بھی ایک مخصوص جگہ ہے جو کعبہ کے شمال مغرب میں کمان نما بنی ہوئی ہے۔

ان روشن نشانیوں میں سے ایک مقام ابراہیم ہے جس کا بطور خاص آیت میں ذکر ہوا ہے یہ وہ

جگہ ہے جہاں کھڑے ہو کر خانہ کعبہ بنایا تھا یا عام لوگوں کو مراسم حج کے لئے دعوت دی تھی۔

۴۔ یہ امن کی جگہ ہے "جو اس میں داخل ہو گیا وہ محفوظ ہے" حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد خدا سے اس شہر کی امنیت طلب کی اور عرض کی: میرے رب اسے محفوظ شہر قرار دے، خدا نے اس کو امن وامان کی جگہ قرار دیا خدا نے ابراہیم کی دعا قبول کی اور مکہ کو جائے امن قرار دیا اور فقہی و مذہبی قوانین کے اعتبار سے بھی اسے محترم شمار کیا گیا ہے کہ اس میں ہر قسم کی جنگ وجدال منع ہے یہاں تک کہ اس سرزمین کے جانور بھی محفوظ ہیں اور کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ انھیں ستائے اور حرم میں شکار کرنا بھاری کفارہ کا سبب ہوتا ہے۔

حج ایک خدائی فریضہ

حج عمر بھر میں ہر اس مسلمان پر ایک مرتبہ واجب ہے جس میں واجب ہونے کے شرائط پائے جاتے ہوں اور اگر وہ اپنی حیات میں حج نہیں کر سکا تو اس کے مرنے کے بعد نائب کے ذریعہ اس کا واجب حج کرنا چاہئے، فقہا نے حج کے واجب ہونے کے لئے تین شرطیں رکھی ہیں، ۱۔ بدنی لحاظ سے استطاعت رکھتا ہو۔ ۲۔ مالی اعتبار سے استطاعت رکھتا ہو، ۳۔ حج کا راستہ کھلا ہو، اگر یہ تینوں شرط ہوں تو انسان پر واجب ہے کہ وہ حج بجالائے جو آیت ہم نے پہلے بیان کی ہے وہی حج کے واجب ہونے کو بیان کر رہی ہے:

ولله على الناس حج البيت من استطاع اليه سبيلا.

اس آیت میں تمام لوگوں کو کو حج کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حج کو ایسا قرض قرار دیا گیا ہے جو تمام لوگوں کو ذمہ ہے کیونکہ یہ کہا گیا ہے: خدا کے لئے لوگوں کے ذمہ ہے اسی آیت سے دوسری بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حج مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ سب کا فریضہ ہے کیونکہ آیت میں لفظ ناس استعمال ہوا ہے اور مشہور قاعدہ ہے "الكفار مكلفون بالفروع كما انهم مكلفون بالاصول" یعنی جس طرح اصول دین پر عمل کرنا کافروں کا فریضہ ہے اسی طرح فروع دین پر عمل کرنا بھی ان کا فریضہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج سب پر واجب ہے لیکن اس کے قبول ہونے کے لئے

اسلام لانا شرط ہے۔ اسلام قبول کئے بغیر اس کے عمل کی کوئی حقیقی قیمت نہیں رہے گی بلکہ ممکن ہے شبہہ میں بھی مبتلا ہو جائے۔ [1]

ابن ابی العوجاء اور اس کی بے بنیاد باتیں

یہ کافر الحاد میں مشہور تھا، بے باک اور بد زبان خطیب تھا اس کے زمانہ کے اکثر صاحبان علم اس سے بچتے تھے، حج کے زمانہ میں ایک دن ابن ابی العوجاء اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ حاجیوں کے اعمال کو دیکھ رہا تھا۔ امام صادقؑ بھی مسجد الحرام کے ایک گوشہ میں تشریف فرما تھے شیعہ آپ کی خدمت میں شرفیاب ہوتے اور مسائل دریافت کرتے تھے، ابن ابی العوجاء کے دوستوں نے کہا: جعفر بن محمد سے بحث کرنے کے لئے یہ بہترین موقع ہے۔ اس نے کہا: یہی کیا جائے۔

وہ امام صادقؑ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: اے ابو عبداللہ یہ بزم و مجلسیں امانت ہیں اس طرح امام صادقؑ سے امن مانگ رہا تھا تا کہ اس کی کفر آمیز باتوں سے لوگوں کا غیظ و غضب نہ بھڑکے جس شخص کے سینہ میں بلغم پھنسا ہوا اور اس سے اسے اذیت ہو رہی ہو وہ کھانسی کے ذریعہ اسے باہر نکال کر پھینکنے پر مجبور ہے (یعنی جس شخص کے دل میں کوئی شبہہ ہوتا ہے جو اسے بے چین کرتا ہے وہ مجبور ہے کہ اپنے شبہہ کا اظہار کرے اور سوال کرے) اجازت ہے سوال کروں؟ امامؑ نے اسے سوال کرنے کی اجازت دی اس نے بے حیائی کے ساتھ کہا:

اس روندے ہوئے خرمن اور اس پتھر سے تم کب تک پناہ لیتے رہو گے اور گارے اور پتھر سے بنے ہوئے اس گھر کی کب تک پرستش کرتے رہو گے اور بھاگے ہوئے اونٹ کی مانند کب تک اس گھر کے چاروں طرف ہرولہ کرتے رہو گے؟! جو بھی اس کے بارے میں غور و فکر کرے گا اسے معلوم ہو جائیگا کہ اس کا حکم دینے والا عقلمند ہے نہ صاحب نظر جواب دیجئے کہ آپ اس مذہب کے راس و رئیس ہیں اور آپ کے آباء اجداد اس کے بانی اور محافظ ہیں۔

یہ ہیں اس کے جملے جن سے اس کے باطن کی خباثت آشکار ہے یہ مادی انسان ہر چیز کو مادہ کی

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۳ ص ۱۴ تا ۱۷

عینک سے دیکھتا ہے یقیناً برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ امامؑ نے اس کا جواب دیا:

بیشک جس کو خدا گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کے دل کو اندھا بنا دیتا ہے اور جس سے حقائق کو سمجھنے کی توفیق چھین لیتا ہے تو شیطان اس کا ولی و سرپرست بن جاتا ہے اور اسے ہلاکت کے گھاٹ اتار دیتا ہے کہ جہاں سے وہ کبھی نہیں نکل سکے گا۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: اس گھر کو خدا نے بندوں کی آزمائش کا وسیلہ قرار دیا ہے اور انہیں اس کی زیارت کا حکم دیا ہے تا کہ امر عبادت میں خلوص و تسلیم کی روش کا معیار قرار پائے، یہ گھر پیغمبروں کی قیام گاہ اور نمازیوں کا قبلہ ہے۔ نہ سنگ پرستی مقصد ہے اور نہ اس گھر کی عبادت بلکہ معبود برحق خدا ہے جو آدمیوں کے جسم و جان کا خالق ہے۔ [۱]

حج، انسان کے روحی سفر کی مکمل نمائش

اس بات پر توجہ رکھنا چاہئے کہ حج اور تمام عبادت کے اعمال کی صورت درحقیقت انبیاء و اولیائے خدا کے روحی و معنوی مقامات و مراتب کی تشریح ہے سالکین الی اللہ کے روحانی سیر و سفر کا ایک تجزیہ کہ انہوں نے عبودیت و بندگی کی منزلوں کو کس طرح طے کیا آخر کار قرب ربوبی کے مقام پر پہنچے۔
واضح ہے کہ حقیقتِ عبادت، خدا کی طرف روحِ انسان کا سفر ہے رسولؐ فرماتے ہیں:

نماز، حج، طواف اور دوسرے مناسک کو انجام دینا خدا کو یاد کرنے کے لئے واجب کیا گیا ہے۔ پس جب تمہارا دل اصل مقصود و مطلوب خدا کی یاد سے اور اس کے خوف و خشیت سے خالی ہو تو زبان کی حرکت اور بدن کے اعمال بجالانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ [۲]

بنا برایں، اعمال حج، انسان کامل کی منظم روحانی سیر کا نمائندہ ہیں جو نپے، تلے انداز میں عبودیت کے مراحل کو طے کرتا ہے اور خود کو مادی رشتوں اور دنیا کی پیچ دھج سے آزاد کرا لیتا ہے اور نفس کی تاریکیوں کے غار سے خود کو کھینچ لاتا ہے اور عالم ربوبیت کے نور میں مستغرق ہو جاتا ہے۔

حقیقی حج، ایک سفر ہے جو روح میں ہوتا ہے۔ ایک سیر و تبدیلی ہے جو نفس کے جوہر میں ہوتی

---

۱ بحار الانوار ج ۱۰ ص ۲۰۹-۲۱۰ ۲ حج برنامہ تکامل ص ۸۰ تا ۹۳

ہے، حج ناقص کا کامل میں تبدیل ہونا ہے۔ قوہ سے فعل میں آنا ہے، خام کو پختہ کرنا ہے اور ایک دھات کو دوسری دھات میں تبدیل کرنا ہے یہ کوئی کھیل نہیں ہے جیسا کہ بعض نادانوں کا خیال ہے ان کے بچکانہ افکار و خیالات کجا اور سالکین الی اللہ کی لرزہ براندام کرنے والی سیر و تبدیلی کجا۔

مالک ابن انس کہتے ہیں: ایک سال میں امام صادقؑ کے ہمراہ حج کرنے گیا، جب آپ احرام کی حالت میں اپنی سوار پر سوار تھے تو آپ نے ہر چند چاہا کہ لبیک کہیں لیکن آپ کی آواز گلے ہی میں رندھ کر رہ گئی آپ سواری سے نیچے اتر آئے میں نے عرض کی: فرزند رسولؐ! لبیک کہئے آخر لبیک کہنا ہے فرمایا:

اے عامر کے بیٹے! میں "لبيك اللّهم لبيك" کہنے کی کیسے جرأت کروں جبکہ مجھے خوف ہے کہ خدا کی طرف سے یہ ندا نہ آئے کہ میں تمہیں قبول نہیں کرتا ہوں۔ [1]

اگر انسان اپنے جوہر نفس کو محرم بنالے اور خانۂ کعبہ کے پاس جائے، حجر اسود کو ہاتھ سے مس کرے، اس کا دل عرفات کے پہاڑ میں مقیم ہو اور اسکی روح مشعر الحرام میں واصل خدا ہو جائے اور یقین کی چھری سے وہ خواہشِ نفس کے مینڈھے کا سر کاٹ دے اور واپسی پر وہ آسمانی لعل و یاقوت بن گیا ہو تو وہ حاجی ہے ورنہ:

حاجی تو نیستی، شتر است از برائے آنکہ　　بیچارہ خار می خورد و بار می برد

حج اور گناہوں کی بخشش

امام زین العابدینؑ حج کے حق کے بارے میں فرماتے ہیں: "وفرار اليه من ذنوبك" حج گناہوں سے بھاگ کر خدا کے قرب میں پناہ لینا ہے جب وہ حج کرکے واپس آتا ہے تو وہ گناہوں سے ایسے ہی پاک ہو جاتا ہے جیسے روز ولادت تھا، گناہوں کا بھاری بوجھ اس سے اتر جاتا ہے اس موضوع کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک بادیہ نشین نے رسولؐ سے ملاقات کی اور

---

[1] ایضا بنقل از خصال ج ۱ ص ۱۶۰

عرض کی اے اللہ کے رسولؐ! میں حج کے ارادہ سے نکلا تھا لیکن کچھ رکاوٹیں پیش آجانے کی وجہ سے حج چھوٹ گیا میں مالدار آدمی ہوں مجھے حکم دیجئے کہ میں ایسا کام انجام دوں جس سے خدا مجھے اتنا ہی اجر و ثواب عطا کرے جتنا حج کرنے والے کو عطا کرتا ہے رسولؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کوہ ابوقبیس کو دیکھو! اگر یہ پہاڑ سرخ سونے کا ہوتا اور تمہاری ملکیت میں ہوتا اور تم اس کو راہ خدا میں خرچ کر دیتے تب بھی تمہیں اتنا ثواب نہ ملتا جتنا خدا حج کرنے والے کو عطا کرتا ہے۔ پھر فرمایا: جب حاجی حج کے لئے تیاری کرتا ہے تو وہ جو چیز اٹھاتا اور رکھتا ہے خدا اس کے لئے نیکی لکھتا ہے اور اس کے دس گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور خدا کے نزدیک اس کے دس درجے بلند ہوتے ہیں اور جب وہ سواری پر سوار ہوتا ہے اور وہ جو قدم اٹھاتا ہے اور زمین پر رکھتا ہے تو خدا ہر ایک کے عوض مذکورہ اجر عطا کرتا ہے اور جب وہ خانہ کعبہ کا طواف کرتا ہے تو گناہوں سے نکلتا ہے اور رمی جمرات کرتا ہے تو گناہوں سے خارج ہوتا ہے راوی کہتا ہے کہ اسی طرح رسولؐ نے ایک ایک موقف کو شمار کرایا اور فرمایا: جب وہ موقف میں کھڑا ہوتا ہے تو اپنے گناہوں سے خارج ہوتا ہے پھر فرمایا: تمہیں اتنا ثواب کہاں سے مل جائے گا جتنا حاجی کو ملتا ہے؟ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: حج سے واپس آنے کے بعد حاجی کا کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا ہے اور اس کی نیکیاں لکھی جاتی رہتی ہیں مگر یہ کہ وہ کسی بڑے گناہ کا مرتکب ہو۔ [1]

حج اور خدا کے غیر سے سوال

امام زین العابدینؑ نے سنا کہ ایک سائل لوگوں سے مانگ رہا ہے فرمایا: تمہارے اوپر افسوس ہے تم اس جگہ بھی خدا کے غیر سے مانگ رہے ہو؟ حالانکہ آج تو خدا کی رحمت ہر ایک کو شامل ہے امید ہے کہ اس کو بھی خدا کی رحمت نصیب ہوگی جو پہاڑوں کے پیٹ میں ہے اور وہ خوشبخت ہو جائے گا۔ [2]

مرحوم فیض اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہر چیز کی سعادت و خوش بختی اسی کے شایان شان ہوتی ہے بنابریں جو پہاڑوں کے پیٹ کے اندر ہے اس کی سعادت کا مطلب یہ ہو کہ وہ جماد سے نبات بن جائے اور پے در پے تبدیلیوں سے نطفہ بن جائے اور اس سے سعید و نیک بخت

---

[1] محجۃ البیضاء ج ۲ ص ۱۴۷ [2] حج برنامہ تکامل ص ۲۲۸، جیسا کہ وافی ج ۲ ص ۴۴ پر منقول ہے

انسان بن جائے دوسری روایت میں جو کہ مستدرک میں نقل ہوئی ہے الجبال کے بجائے الحبالیٰ آیا ہے جس کے معنی حاملہ عورتیں ہیں، اس صورت میں حدیث کے معنی زیادہ روشن ہو جائیں گے۔ ایک شخص نے مسجد الحرام میں امام صادقؑ سے دریافت کیا: سب سے بڑا گناہگار کون ہے؟ فرمایا: جوان دونوں موقفوں عرفہ و مزدلفہ، میں ٹھہرے اوران دونوں پہاڑوں، صفاومروہ، کے درمیان سعی کرے اوراس گھر (کعبہ) کا طواف کرے اور مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھے اوران تمام اعمال کے باوجودوہ یہ گمان کرے کہ خدا نے اس کونہیں بخشا ہے یہ شخص سب سے بڑا گناہگار ہے۔ [1]

(یعنی خدا کے بارے میں بدگمانی کرنا اوراس کی رحمت سے مایوس ہونا سب سے بڑا گناہ ہے)

امام صادقؑ فرماتے ہیں: کسی گاؤں آبادی کا جو مومن بھی عرفات میں ٹھہرتا ہے خدا اس آبادی کے تمام مومنوں کو بخش دیتا ہے اور جس مومن خاندان کا کوئی شخص عرفات میں وقوف کرتا ہے خدا اس گھر کے تمام مومنوں کو بخش دیتا ہے۔ [2]

البتہ یہ بات یادرہے کہ ہر حدیث میں ایمان کی قید لگادی گئی ہے اور ایمان تقوے کے ظاہر ہونے کا سرچشمہ ہے اس سے بے ایمان افراد خارج ہیں۔

حج کی دعوت، انسان کے اوپر خدا کا احسان:

خداوند متعال انسان پر احسان کرنے اوراس کے سر پر تاج کرامت رکھنے کے لئے اس کی سوئی ہوئی فطرت کو بیدار کرتا ہے اوراس کے اندر حق شناسی اور شکر گزاری کے جذبہ کو ابھارتا ہے اوراسکو اپنے گھر کے حج کی دعوت دیتا ہے۔ ''ولله علی الناس حج البیت من استطاع الیه سبیلا'' [3] خدا کے لئے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج فرض کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ استطاعت کی صورت میں حج کریں یعنی تم انسان ہو اور فطرتا حق شناس ہو، میں تمہارا خالق ورازق اور تمہارا منعم ہوں، لہذا تمہارے اوپر میرا یہ حق ہے کہ تم شکر گزاری کے عنوان سے میرے گھر آؤ تاکہ تمہاری آدمیت کا شرف محفوظ رہے۔

---

[1] حج برنامہ تکامل ص ۲۲۸ جیسا کہ اس میں ''وافی'' ج ۲ ص ۴۲ سے منقول ہے [2] ایضا [3] آل عمران: ۹۷

حج کی حیرت انگیز برکتیں

خانہ کعبہ کے زائر و حاجی کو خدا کی طرف سے جو برکتیں اور بخششیں ملتی ہیں ان کی عظمت کو سمجھنے کے لئے اس کے ثواب کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو روایات و احادیث میں بیان ہوا ہے (ثواب سے متعلق کچھ حدیثیں ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں) سعد اسکاف کہتے ہیں: میں نے امام باقرؑ کو فرماتے ہوئے سنا: جو شخص عازم حج ہوتا ہے اور حج کی تیاری کرتا ہے اور حج کی تیاری کے لئے جو قدم اٹھاتا ہے خدا اسکے عوض دس نیکیاں اور حسنہ لکھتا ہے اور اس کے دس گناہوں کو محو کرتا ہے اور اس کے دس درجات کو بلند کرتا ہے یہاں تک کہ وہ تیاری سے فارغ ہو جاتا ہے اور حج کے لئے گھر سے نکلتا ہے اور اس سے عظیم فائدہ حاصل کرتا ہے۔ [1]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: واپس آنے والے حاجیوں کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو آگ و جہنم سے نجات پاتا ہے، دوسرا گناہوں سے اس طرح خارج ہو جاتا ہے جس طرح وہ پیدائش کے وقت گناہوں سے پاک تھا، تیسرا صحیح، سالم اپنے اہل و عیال کے پاس لوٹ آتا ہے یہ معمولی ثواب ہے جو حج کرنے والے کو نصیب ہوتا ہے۔ [2]

فرق کی وجہ بھی واضح ہے کیونکہ ان کی نیت میں اختلاف ہے اور یہ رب البیت کی معرفت کے مدارج میں اور عبادت کے اسرار و لطائف کے درک کرنے میں اور حج کے مناسک کے روح پر اثر انداز ہونے میں مختلف ہیں۔

---

[1] حج برنامہ تکامل ص ۴۸ جیسا کہ اس میں وافی ج ۲ ص ۴۵۲ [2] ایضا وافی ج ۲ ص ۴

صدقے کا حق

واما حق الصدقة فان تعلم انها خرك عند ربك و وديعتك التى لا تحتاج الى الاشهاد فاذا علمت ذالك كنت بما استودعته سرا اوثق بما استودعته علانية وكنت جديرا ان تكون اسررت اليه امرا اعلنته و كان الامر بينك فيها سرا على كل حال ولم تستظهر عليه فيما استودعته منها باشهاد الاسماع والابصار عليه بها كانها اوثق فى نفسك لاكانك لاتثق به فى تادية وديعتك اليك ، ثم لم تمتن بها على احد لانها لك فاذا امتننت بها لم تامن ان تكون بها مثل تهجين حالك منها الى من مننت بها عليه لان فى ذلك دليلا على انك لم ترد نفسك بها ولو اردت نفسك بها لم تمتن بها على احد، ولا قوة الا بالله۔

صدقہ کا حق، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تمہارے پروردگار کے پاس تمہارا ذخیرہ اور امانت ہے کہ جس کے لئے گواہ لانے کی ضرورت نہیں ہے اور جب تمہیں یہ معلوم ہوگیا تو جو صدقہ تم خفیہ طور پر دوگے اس سے تم اس صدقہ کی بہ نسبت زیادہ مطمئن رہو گے جو تم کھلم کھلا دیتے ہو تمہارے شایان شان یہی ہے کہ جو تم نے آشکارا طور پر کیا ہے اب اسے چھپا کر انجام دو بہر حال تم اس طرح صدقہ دو کہ اسے کان سنیں اور نہ آنکھیں دیکھیں بلکہ سربستہ طور پر دو تمہیں اس پر یہ اعتماد ہے کہ وہ تمہاری طرف پلٹ آئیگا اس شخص کی مانند نہ ہو جاؤ کہ جو صدقہ کے واپس لوٹنے پر اعتماد نہیں رکھتا ہے۔

پھر اپنے صدقہ کے ذریعہ کسی پر احسان نہ جتاؤ کیونکہ وہ تمہارا ہی ہے اگر اس پر احسان جتاؤ گے تو تم محفوظ نہیں رہو گے، بلکہ اسی بدحالی میں مبتلا ہو گے جس میں وہ شخص مبتلا ہے جس پر تم نے احسان جتایا ہے کیونکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم نے یہ نہیں چاہا کہ وہ مال تمہارا رہے اگر تم یہ چاہتے کہ وہ تمہارے لئے باقی رہے تو کسی پر احسان نہ جتاتے، طاقت صرف خدا کی ہے۔

''ھجن'' کے معنی فرومایہ اور پست ہوجانا ہیں ''ھجن الامر'' اس نے اس میں عیب نکالا اور اسے برا سمجھا۔[1]

---

[1] فرہنگ بزرگ جامع نوین مادہ ھجن۔

امام زین العابدینؑ صدقہ کے حق کے بارے میں تین اہم مطالب کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

۱۔ صدقہ محفوظ شدہ ذخیرہ ہے وہ نابود ہونے والا نہیں ہے۔ درحقیقت یہ نظریہ ختم ہو جاتا ہے کہ مال صدقہ دینے والے کے ہاتھ سے نکل گیا اور نابود و برباد ہو گیا بلکہ اس کے برخلاف دنیا سے حصہ لینے کے لئے ایک تشویق ہے قرآن کہتا ہے: ولا تنس نصیبك من الدنیا [1] دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے اسے فراموش نہ کرو۔

اس کا بہترین مصداق، صدقہ ہے وہ جاوداں اور باقی رہنے والا ہے، فانی نہیں ہے۔

۲۔ پوشیدہ طور پر دیا جانے والا صدقہ آشکار طور پر دیئے جانے والے صدقہ سے اہم ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جو صدقہ کھلم کھلا دیا جاتا ہے اس میں ریا اور تکبر کا شائبہ ہوتا ہے اور صدقہ لینے والا بھی دیکھنے والوں کی نظر میں حقیر ہو جاتا ہے۔

۳۔ صدقہ کے ساتھ احسان نہ ہو کہ احسان سے صدقہ کا اثر ختم ہو جاتا ہے یہ بات ہم بعد میں بیان کریں گے کہ صدقہ پہلے خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ صدقہ دینے والے کے ذہن میں پہلے یہ بات آتی ہے کہ مالک حقیقی خدا ہے اور یہ صدقہ دینے والا صرف ایک وسیلہ ہے لہذا صدقہ دینے سے اس کے اندر عبودیت و بندگی کی روح پیدا ہوتی ہے۔

صدقہ قرآن کی نظر میں

صدقہ کے بارے میں جو کچھ امام زین العابدینؑ نے فرمایا ہے وہی مختلف مثالوں اور تشبیہات کے ساتھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے یہاں ہم ان میں سے بعض آیتوں کو بیان کرتے ہیں لیکن ان آیات کے بیان کرنے سے پہلے ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ صدقہ اس چیز کو کہتے جو کو انسان اپنے مال میں سے قربۃ الی اللہ دیتا ہے یہ زکوۃ سے اعم ہے صدقہ واجب کو بھی کہتے ہیں اور مستحب کو بھی لیکن زکوۃ صرف واجب کے لئے ہے۔ [2]

---

[1] قصص : ۷۷
[2] قاموس قرآن ج ۴ ص ۱۱۶

سورۂ بقرہ میں خداوند عالم فرماتا ہے:

مثل الّذین ینفقون اموالھم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مئة حبة والله واسع علیم [1]

جو لوگ اپنے اموال کو راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو ان کے اس مال کی مثال اس دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیاں نکلتی ہیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوتے ہیں اور خداوند عالم وسعت دینے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت میں دانہ اور اس کے اگنے کی مثال بیان کی گئی ہے اور صدقہ کی افزائش و نمو کو بیان کیا گیا ہے اور راہ خدا میں خرچ کرنے والوں کو پر برکت دانوں سے جو تشبیہ دی ہے وہ بڑی حسین و عمیق تشبیہ ہے۔

قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہر انسان کا عمل اس کے وجود کا پرتو ہے جتنی اس کے عمل میں وسعت پیدا ہوگی اتنا ہی اس کا وجود وسعت پذیر ہوگا ایسا نہیں ہے کہ انسان کا عمل اس کی قوت اور جسمی مواد کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ مثل درحقیقت ثابت شدہ یا مفروض حصہ ہے جو دوسری چیز سے مشابہت رکھتا ہے اور اس مثل کو اسلئے لایا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ مخاطب کے ذہن کو اس چیز کے کمال کی طرف متوجہ کیا جائے جس کے لئے مثال لائی گئی ہے اس آیت میں انفاق کرنے والوں کی مثال اس شخص سے دی گئی ہے جو ایک دانہ بوئے اور اس پر سات بالیاں لگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ اس قصہ کی حقیقت نہ ہو اور فرضی و خیالی ہو۔ ہر آیت میں فی سبیل اللہ سے مراد وہ چیز ہے جو خدا کی رضا کا باعث ہوتی ہے۔

صدقہ، سماجی مشکلات کا حل

سماج کی ایک بہت بڑی مشکل کہ جس سے انسان ہمیشہ دوچار رہا ہے اور اس زمانہ میں صنعتی ترقی کے سبب اس شکل میں اور زیادہ شدت پیدا ہوگئی ہے اور طبقاتی فاصلہ اور زیادہ ہوگیا ہے ایک طرف

---

[1] بقرہ : ۲۶۱

فقر و تنگدستی ہے دوسری طرف ثروت اندوزی ہے واضح ہے کہ جس معاشرہ کا ایک حصہ ثروت مندی اور دوسرا حصہ فقر و ناداری پر استوار ہو اس میں دوام و ثبات نہیں ہو سکتا اور وہ حقیقی سعادت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا ایسے معاشرہ میں ہمیشہ اضطراب و بے چینی اور جنگ و جدال بپا رہے گا۔

قرآن مجید کی آیتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا ایک مقصد یہ ہے کہ سماجی ناانصافیوں کی وجہ سے ثروت مند اور نادار طبقہ میں جو اختلافات رونما ہوتے ہیں انہیں برطرف کیا جائے اور ان لوگوں کی زندگی کی سطح کو بلند کیا جائے جو اپنی ضرورتوں کو دوسروں کی مدد کے بغیر پورا نہیں کر سکتے، کم از کم ان کے پاس روزمرہ کے استعمال کی چیزیں تو ہوں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اسلام نے سود خوری کو مطلق طور پر حرام قرار دیا اور اسلامی مالیات، زکوٰۃ و خمس دینے کو واجب کیا ہے اور انفاق، وقف، قرض الحسنہ اور مختلف طریقوں سے مالی مدد کرنے کی تشویق کی۔

انفاق کے گوناگوں محرکات و نتائج

درج ذیل آیات میں صدقہ و انفاق کے گوناگوں نتائج کو تشبیہات اور مثالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذیٰ کالذی ینفق ماله رئاء الناس ولا یومن بالله والیوم الآخر فمثله کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا لا یقدرون علیٰ شیء مما کسبوا والله لا یهدی القوم الکافرین۔ [1]

ایمان والو! اپنے صدقوں اور بخششوں کو احسان جتا کر اور آزار پہنچا کر برباد نہ کرو اس شخص کی مانند کہ جو لوگوں کو دکھا کر انفاق کرتا ہے اور خدا اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے کام کی مثال اس پتھر کی سی ہے کہ جس پر گرد پڑی ہو اور اس پر شدید بارش پڑ جائے (جس سے وہ گرد دھل جائے) اور پتھر صاف ہو جائے وہ جو کام انجام دیتے ہیں اس کا انہیں کوئی صلہ نہیں ملے گا اور خدا کافروں کی ہدایت نہیں

[1] بقرہ : ۲۶۴

کرتا ہے۔

''صفوان'' جمع ہے اس کا مفرد صفوانہ ہے یعنی صاف پتھر ''وابل'' موٹی بوند والی شدید بارش کو کہتے ہیں ''صلدا'' کے معنی صاف پتھر ہیں۔

ایک مضبوط پتھر فرض کریں کہ جس کے اوپر گرد و خاک کی ہلکی پرت جم گئی ہو، اس خاک پر بیج بکھرے دیئے جائیں جو ہوا اور سورج کی دھوپ کی زد میں ہیں پھر اس پر موٹی بوند والی بارش پڑ جائے واضح ہے کہ شدید بارش اس پتھر پڑی ہوئی گرد کو بیج سمیت بہا لے جائے گی اور سخت پتھر اپنی سختی کے ساتھ آشکار ہو جائے گا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آفتاب کی دھوپ، کھلی ہوا اور بارش کے پڑنے کا کوئی برا اثر ہے بلکہ بیج نامناسب جگہ بویا گیا تھا جس کا ظاہر تو صحیح تھا لیکن باطن بہت سخت تھا وہ قابل نفوذ نہ تھا، صرف اس پر گرد جم گئی تھی جبکہ نباتات زمین کی ظاہری سطح کی آمادگی کے علاوہ اس کی باطنی سطح اور گہرائی کی آمادگی بھی چاہتے ہیں تاکہ اس میں ان کی جڑیں اتر جائیں اور وہ اس سے غذا حاصل کریں۔

قرآن نے ریاکارانہ اعمال اور احسان جتانے اور آزار رسانی کے ساتھ دیئے گئے صدقہ کو سخت پتھر پر پڑی ہوئی خاک سے تشبیہ دی ہے جس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا بلکہ اس سے بیج بونے والے اور باغبان کی زحمت میں ہی اضافہ ہوگا۔ امام زین العابدینؑ نے صدقہ کے حق کے بارے میں فرمایا ہے: ''ثم لم تمنن علیٰ احد لانها'' اپنے صدقہ کو کسی پر احسان نہ قرار دو کیونکہ اس کا فائدہ تمہیں کو ملے گا۔

اس آیت کے ذیل میں تفسیر نمونہ میں درج ذیل نکات بیان ہوئے ہیں:

۱۔ **لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذی**'' سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ممکن ہے کہ بعض اعمال، نیک اعمال کے نتائج کو برباد کر دیں یہی احباط ہے کہ جس کی وضاحت سورہ بقرہ کی ۲۱۷ ویں آیت کے ذیل میں کی جا چکی ہے۔

۲۔ ریاکارانہ عمل کو اس پتھر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس پر خاک پڑی ہو اور اس نے پتھر کو ڈھانک لیا ہو یہ نہایت ہی بولتی ہوئی تشبیہ ہے، کیونکہ ریاکار لوگ اپنے باطن کی سختی و قساوت کو نیک اعمال

کے ذریعہ چھپاتے ہیں اور وہ جو اعمال انجام دیتے ہیں ان کے وجود میں اس کی جڑ نہیں ہوتی ہے۔ لیکن زندگی کے حوادث اس پردہ کو ہٹا دیتے ہیں اور ان کے باطن کو آشکار کر دیتے ہیں۔[1]

قرآن ہی سے دوسری مثال

ومثل الذین ینفقون اموالهم ابتغاء مرضات الله تثبیتا من انفسهم[2]

جو لوگ اپنے اموال کو خدا کی رضا حاصل کرنے اور اپنے نفس کے اطمینان کے حصول کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی مثال اس باغ کی سی ہے جو کسی بلندی پر ہو اور تیز بارش اس کے پھل کو دوگنا کر دے اور اگر تیز بارش نہ برسے تو معمولی بارش ہی اس کے لئے کافی ہو جائے اور خدا تمہارے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے۔

ایک سرسبز اور ہرے بھرے درخت کو فرض کریں جو زرخیز و بلند جگہ پر کھلی ہوا اور دھوپ میں واقع ہو اور نفع بخش بارش اس پر برستی ہو اور جب بارش نہیں برستی تو پھوار اور شبنم ہی باغ کی شادابی کے لئے کافی ہو جاتی ہے نتیجہ میں ایسا باغ دوسرے باغات کی بہ نسبت دوگنا پھل دیتا ہے چونکہ بلندی پر واقع ہے کھلی ہوا اور آفتاب کی دھوپ سے مالا مال ہے۔ اس کا حسین منظر ہر دیکھنے والے کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے اور سیلاب کے خطرہ سے محفوظ رہتا ہے چنانچہ ان لوگوں کی مثال اس باغ کی سی ہے جو اپنے اموال کو خدا کی رضا اور اپنے دل میں ایمان و یقین کے جاگزیں ہونے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر نمونہ میں اس آیت کے ذیل میں دو نکات بیان ہوئے ہیں:

۱۔ یہ جملہ "**ابتغاء مرضات الله و تثبیتا من انفسهم**": خدا کے لئے کئے جانے والے انفاق کے محرکات کو بیان کر رہا ہے، وہ دو ہیں: خدا کی رضا کا حصول، روح ایمان کی تقویت اور دل و روح میں سکون کو جاگزیں کرنا، اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ: حقیقی معنی میں انفاق کرنے والے وہ لوگ ہیں جو صرف خدا کی رضا حاصل کرنے اور انسانی فضائل و کمالات کو پروان چڑھانے اور محروموں کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کے احساس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اضطراب سے آرام پانے کے لئے

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۲۴۳
[2] بقرہ : ۲۶۵

انفاق کرتے ہیں:

۲۔''واللہ بما تعملون بصیر ''اس بات سے خبردار کرتا ہے کہ جو بھی نیک عمل انجام دینا چاہتا ہے اس کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ نیت یا طریقۂ کار کے لحاظ سے معمولی سی آلودگی بھی پیدا نہ ہونے پائے کہ خداوند عالم ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے[1]

پوشیدہ اور آشکار صدقات

امام زین العابدینؑ نے پوشیدہ طور پر صدقہ دینے کی زیادہ تاکید فرمائی ہے اور وہ اس طرح کہ صدقہ دینے میں کانوں اور آنکھوں کو گواہ نہ بناؤ، شاید اس کا تعلق مستحب صدقات سے ہے ورنہ واجب صدقات، جیسے زکوٰۃ کو کھلم کھلا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے سورہ بقرہ میں خداوند عالم اس طرح ارشاد فرماتا ہے:

ان تبدوا الصدقات فنعما ھی وان تخفوھا وتؤتوھا الفقرآء فھو خیر لکم ویکفر عنکم من سیّأتکم واللہ بما تعملون خبیر۔[2]

اگر تم علی الاعلان صدقہ دو گے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر اسے چھپا کر ناداروں کو دو گے تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اس سے تمہارے بہت سے گناہ بھی بخش دیئے جائیں گے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے خوب باخبر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آشکار اور مخفی صدقات دونوں ہی کا اچھا اثر ہوتا ہے آشکار صدقہ اگر واجب ہو تو قطع نظر اس کے کہ نیک کام کی طرف لوگوں کی تشویق ہوگی یہ الزام بھی نہیں رہے گا کہ وہ اپنے واجب فریضہ پر عمل نہیں کرتے ہیں؛ اور اگر مستحب ہے تو یہ ایک قسم کی عملی تبلیغ ہے اس سے بھی نیک کام، محروم لوگوں کی حمایت اور رفاہ عام قسم کے کاموں کی طرف لوگوں کی تشویق و ترغیب ہوتی ہے۔

جو صدقہ مخفی طور پر، اور لوگوں سے چھپا کر دیا جاتا ہے یقیناً اس میں خودنمائی اور ریاکاری کم اور خلوص زیادہ ہوتا ہے اور اس سے محروموں کی آبرو کی اچھی طرح حفاظت ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۲۴۲ [2] بقرہ: ۲۷۱

بعض احادیث میں اس بات کی تصریح ہوئی ہے کہ واجب صدقات کو ظاہر کرنا اور مستحب صدقات کو چھپانا بہتر ہے۔ یہ چیز علی بن ابراہیم کی تفسیر سے مجمع البیان میں نقل ہوئی ہے۔

الزکوٰۃ المفروضۃ تُخرج علانیۃ وتدفع علانیۃ وغیر الزکوٰۃ ان دفعہ سراً فھو افضلُ۔ [1]

اور جملۂ یکفر عنکم من سیاتکم سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے راہ خدا میں انفاق کرنے کا گناہوں کی بخشش میں گہرا اثر ہوتا ہے البتہ اس سے سارے گناہ نہیں بخش دیئے جاتے۔ صدقہ دینے اور انفاق کرنے میں جو چیز موثر ہے وہ پاک نیت اور با خلوص عمل ہے لوگوں کے جاننے یا نہ جاننے کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے خدا جانتا ہے یہی کافی ہے کیونکہ وہی انسان کے اعمال کی جزا دیتا ہے وہ ہر پوشیدہ و آشکار سے آگاہ ہے۔

انسان کی زندگی پر صدقہ کا اثر

لیس علیك ھداھم ولکن اللہ یھدی من یشاء وماتنفقوا من خیرفلانفسکم وما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون۔ [2]

ان کی ہدایت کی ذمہ داری آپ کی نہیں ہے لیکن خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور مال میں سے جو تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے ہی لئے ہے لیکن خدا کے علاوہ کسی کے لئے انفاق نہ کرو اور مال میں سے تم جو خرچ کرتے ہو وہ تمہیں واپس لوٹا دیا جائے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں کیا جائیگا۔

تفسیر مجمع البیان میں اس آیت کی شان نزول میں ابن عباس سے منقول ہے کہ مسلمان غیر مسلموں پر خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو یہ اجازت دی گئی کہ جہاں ضروری ہو وہاں یہ کام انجام دو۔

جملہ ''وما تنفقوا من خیر فلا نفسکم '' سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انفاق وصدقہ کا جو فائدہ ہے وہ خود صدقہ دینے والے ہی کو ملتا ہے اس طرح قرآن انفاق کرنے والوں کو اس انسانی عمل

---

[1] مجمع البیان ج ۲ ص ۳۸۴ — [2] بقرہ : ۲۷۲

کی طرف رغبت دلاتا ہے یہ بات یقینی ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے کام کا پھل خود اسی کو ملیگا تو وہ اس کام میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔

صدقہ وانفاق کے مادی ومعنوی دونوں اعتبار سے اہم اثرات ہیں، معنوی لحاظ سے یہ انفاق کرنے والے کے لئے موثر ذریعہ ہے اور مادی اعتبار سے اس کے سبب طبقاتی فرق وفاصلہ کم ہوتا ہے جیسا کہ ہم اس بات کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ معاشرہ میں نادار ومحروم لوگوں کا وجود ایک خطرناک دھماکہ کا باعث ہوتا ہے جو مالدار اور نادار دونوں کی زندگی کو دشوار بنا دیتا ہے۔ بنابرایں انفاق و صدقہ اجتماعی وسماجی، اقتصادی حفاظت اور مادی ومعنوی لحاظ سے خود انفاق کرنے والے کے حق میں ہے۔

معنیٰ وجہ اللہ" لغت میں وجہ کے معنی چہرہ کے ہیں کبھی ذات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ممکن ہے یہ معنی ہوں کہ انفاق کرنے والوں کی نظر پروردگار کی ذات پر ہونا چاہئے لفظ وجہ کنایہ کے طور پر خدا کی ذات کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ خداوند عالم نہ جسم رکھتا ہے نہ صورت وچہرہ۔

جملہ" وماتنفقوامن خیریوف الیکم "اس بات کو واضح کرتا ہے کہ تم یہ نہ سوچو کہ تمہیں انفاق وصدقات کا مختصر نفع ملے گا بلکہ جو تم صدقہ دیتے ہو وہ پورا پورا ملے گا اور تم پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا یہ آیت تجسم اعمال کی ایک دلیل ہو سکتی ہے کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے: جو چیز تم نے انفاق کی ہے تمہیں وہی دی جائے گی۔ اب ہم اس سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث میں سے بعض کو یہاں نقل کرتے ہیں۔

صدقہ کے اثرات احادیث کی روشنی میں

احادیث وروایات میں صدقہ کے بہت سے آثار وفوائد نقل ہوئے ہیں لیکن ہم ان میں سے ں کے نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں:

صدقہ روزی میں اضافہ کا باعث

صدقہ رزق میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔اس اثر کی طرف درج ذیل تین حدیثوں میں اشارہ ہوا ہے:

عن السکونی عن ابی عبد الله علیه السلام قال : قال رسول الله صلی الله علیه وآله : تصدقوا فان الصدقة تزید فی المال کثرة فتصدقوا رحمکم الله[1]

سکونی نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:صدقہ دو، بیشک صدقہ مال میں برکت واضافہ کا باعث ہوتا ہے صدقہ دو خدا تم پر رحم کرے گا۔

عن ابی الحسن قال :استنزلوا الرزق بالصدقة[2]

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں: صدقہ کے ذریعہ رزق اتارو!

عن الرضا عن آبائه علیهم السلام قال : قال النبی صلی الله علیه وآله : خیر مال المرء و ذخائره الصدقة[3]

امام رضاؑ نے اپنے آباء سے روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:انسان کا بہترین مال اور اس کا ذخیرہ صدقہ ہے۔

صدقہ بیماری سے شفا

قال رسولؐ :داووا مرضاکم بالصدقة[4]

رسولؐ نے فرمایا: اپنے بیماروں کا صدقہ کے ذریعہ علاج کرو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیماروں کا دوا کے ذریعہ بھی علاج ہو سکتا ہے اور صدقہ کے ذریعہ بھی۔

عن عبدالله بن سنان قال قال ابو عبدالله علیه السلام : داووا مرضاکم بالصدقة وادفعوا البلاء بالدعاء واستنزلوا الرزق بالصدقة فانها تفك من بین لحی سبعمأة شیطان[5]

---

۱ وسائل الشیعہ ج ۴ ص ۲۵۷ ۲ ایضا ۳ ایضا ص ۲۵۸ ۴ ایضا ص ۲۴۰ ۵ ایضا

عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ امام صادقؑ نے فرمایا: صدقہ کے ذریعہ اپنے بیماروں کا علاج کرو۔ اور دعا کے وسیلہ سے بلاؤں کو دفع کرو اور صدقہ کے ذریعہ رزق اتارو کیونکہ صدقہ انسان کو سات سو شیطانوں کی ملامت وسرزنش سے محفوظ رکھتا ہے۔

عن عبدالله بن سنان ابی عبدالله علیه السلام قال : سمعته یقول : یستحب للمریض ان یعطی السائل بیده و یؤمر السائل ان یدعوله۔ [1]

عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا: مستحب ہے کہ بیمار اپنے ہاتھ سے سائل کو صدقہ دے اور سائل سے یہ کہا جائے کہ وہ اس کے لئے دعا کرے۔

صدقہ بلاؤں سے بچاتا ہے

عن موسیٰ بن ابی الحسن عن ابی الحسن الرضا علیه السلام قال:ظهر فی بنی اسرائیل قحط شدید سنین متواترة ، وكان عند امرأة لقمة من خبز فوضعته فی فمها لتأكله فنادی السائل یا امة الله الجوع ، فقالت المرأة اتصدق فی مثل هذا الزمان فاخرجتها من فيها و دفعته الی السائل وكان لها ولد صغير يحتطب فی الصحراء فجاء الذئب فحمله فوقعت الصيحة فعدت الام فی اثر الذئب، فبعث الله عز و جل جبرئيل عليه السلام فاخرج الغلام من فم الذئب فدفعه الی امه ، ثم قال لها جبرئيل : یا امة الله ارضيت لقمة؟ بلقمة۔ [2]

موسیٰ بن حسن نے امام رضاؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: بنی اسرائیل میں سالہاسال شدید قحط پڑا ایک عورت کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جس کو اس نے کھانے کے لئے منہ میں رکھا ہی تھا کہ سائل نے آواز دی: اے خدا کی کنیز! میں بھوکا ہوں، عورت نے اپنے دل میں سوچا یہ وقت صدقہ دینے کا ہے اس نے ٹکڑا منہ سے نکال کر سائل کو دیدیا اس عورت کا ایک کمسن لڑکا تھا جو صحرا میں لکڑی چننے گیا تھا ایک بھیڑیا اس پر جھپٹا ایک شور بلند ہوا ماں شور کی آواز سن کر دوڑی خدا نے جبریل کو بھیجا، جبریل نے اس

---

[1] وسائل ج ۴ ص ۲۴۲ [2] وسائل الشیعہ ج ۶ ص ۲۶۵

کے بچہ کو بھیڑیئے کے منہ سے نکال کر ماں کے سپرد کر دیا۔ اور عورت سے فرمایا: کیا تم لقمہ کے عوض لقمہ سے راضی ہو؟

صدقہ کے حق کے سلسلہ میں امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: خدا اسکی حفاظت کرتا ہے اور تمہیں کو لوٹا دے گا۔ صدقہ کا ایسا اثر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ صدقہ کے اثر کے ذریعہ بلا اور اس کے تلخ نتیجہ کے دفع ہونے کو بیان کرتا ہے۔

اس داستان سے ملتی جلتی دوسری داستان رسولؐ سے منقول ہے۔

علی بن ابراہیم نے احمد بن محمد سے انہوں نے سالم بن مکرم سے انہوں نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے ایک یہودی کی داستان نقل کی جو کہ رسولؐ کے زمانہ میں کہیں جا رہا تھا، اس کے بارے میں رسولؐ نے فرمایا: اس یہودی کو ایک کالا سانپ ڈسے گا اور یہ مر جائیگا امام صادقؑ فرماتے ہیں: یہودی گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جمع کی ہوئی لکڑیوں کا بار اٹھائے ہوئے واپس آ گیا رسولؐ نے فرمایا: لکڑیوں کے اس بار کو نیچے رکھو، یہودی نے بار اتار کر زمین پر رکھدیا، اس سے ایک کالا سانپ نکلا، رسول نے فرمایا: اے یہودی آج تو نے کیا کام کیا ہے؟ اس نے عرض کی: میں نے ان لکڑیوں کے اکٹھا کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا ہے۔ ہاں میرے پاس دو روٹیاں تھیں ان میں سے ایک میں نے کھائی اور دوسری کو ایک بینوا کو صدقہ دیدی۔ رسولؐ نے فرمایا: اسی صدقہ کے سبب خدا نے تم سے بلا کو دفع کر دیا۔ پھر فرمایا: صدقہ انسان کو بری موت مرنے سے بچاتا ہے۔ [۱]

حنان بن سدیر نے اپنے والد سے اور انہوں نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: بیشک صدقہ دنیوی بلاؤں میں سے ستر بلاؤں کو دفع کرتا ہے اور صدقہ دینے والے کو بری موت مرنے سے بچاتا ہے اس کے علاوہ اس کے لئے آخرت میں ثواب ذخیرہ ہو جاتا ہے۔ [۲]

جس طرح قرآن کی آیتوں میں ہمارے لئے یہ نقل ہوا ہے کہ مخفی اور آشکار دونوں صورتوں میں صدقہ دینا ثواب ہے اور صدقہ دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی طرح روایات و احادیث میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے:

---

۱ وسائل ج ۶ ص ۲۶۸ ۲ [illegible]

امام صادقؑ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: خفیہ طور پر صدقہ دینا غضب پروردگار کو خاموش کرتا ہے۔

عمر بن یزید نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: علانیہ صدقہ ستر قسم کی بلاؤں کو دفع کرتا ہے اور خفیہ طور پر دیا جانے والا صدقہ رب کے غضب کو خاموش کرتا ہے۔

فضل بن حسن طبرسی نے مجمع البیان میں تحریر کیا ہے: امامؑ نے فرمایا: پوشیدہ، صدقہ پروردگار کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور گناہوں کو اسی طرح ختم کرتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور بلا کے ستر دروازوں کو بند کرتا ہے۔

امام صادقؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: مومن کی جائے قیام کے علاوہ زمینِ قیامت آگ ہوگی

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں: پوشیدہ صدقہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور آشکار صدقہ مال میں اضافہ کرتا ہے۔

صاحب مجمع البیان نقل کرتے ہیں کہ امام نے فرمایا: روز قیامت جس دن کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ سات قسم کے لوگ پروردگار کے سایہ کے نیچے ہونگے پھر فرماتے ہیں: ان میں سے وہ شخص بھی ہے جس نے پوشیدہ طور پر اس طرح صدقہ دیا کہ اس کے دائیں ہاتھ کو یہ خبر نہ ہو کہ بائیں سے کیا دیا۔

قربانی کا حق

وَاما حق الھدی فان تخلص بھا الا رادۃ الی ربك والتعرض لرحمته و قبوله ولا ترید عیون الناظرین دونه، فاذا کنت کذالك لم تکن متکلفا ولا متصنعا و کنت انما تقصد الی الله ،واعلم ان الله یرادبالیسیر ولا یراد بالعسیر کما اراد بخلقه التیسیرولم یرد بھم التعسیر، و کذالك التذلل اولیٰ بك من التدھقن لان الکلفة والمؤنة فی المتدھقنین واما التذلل و التمسکن فلا کلفة فیھما ولا مؤنة علیھما لانھما الخلقة وھما موجودان فی الطبیعة، ولا قوۃ الا بالله۔

قربانی وھدی کا حق یہ ہے کہ تم اسے اپنے پروردگار کے لئے خالص کرو اور اسے اسکی رحمت و قبولیت کے لئے پیش کرو لوگوں کو کھانے کے لئے نہیں اگر تم اس طرح قربانی کرو گے تو خود کو زحمت میں نہیں ڈالو گے اور نہ تکلف کرو گے کیونکہ اس سے تمہارا مقصد قربانی ہے جان لو کہ تم خداوند عالم کی بارگاہ میں آسانی سے باریاب ہو گے اور زحمت و مشقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ جیسا کہ خدا نے بندوں کی تکلیف کو آسان کر دیا ہے انہیں سختی میں مبتلا نہیں کرنا چاہا۔

اسی طرح اس کی بارگاہ میں تمہارا فروتنی کرنا تمہارے لئے تکبر کرنے سے بہتر ہے کیونکہ کلفت و مشقت جاہ و منصب کے بھوکے لوگوں کے لئے ہے لیکن فروتنی اور درویش منشی میں کوئی تکلیف ہے اور نہ کوئی خرچ کیونکہ یہ فطرت و سرشت کے مطابق ہے اور طبیعت میں موجود ہے اور طاقت وقوت صرف خدا ہی کی ہے۔

ھدی کے لغوی معنی

''ھدی''، ''فلس'' کے وزن پر ہے یعنی حج اور بیت اللہ الحرام سے مخصوص قربانی؛ دوسری قربانی کو ''اضحیہ'' کہتے ہیں: شاید اس کی وجہ تسمیہ یہ ہو کہ خانہ کعبہ سے منسوب ہونے کی وجہ سے قربانی کا خاص احترام و اکرام ہے کہ ھدی اور ھدایت میں لطف کے معنی ہیں: یا اسکی یہ وجہ تسمیہ اس لئے ہے کہ

اسے کعبہ و حرم کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے" هدی العروس الی بعلها " یعنی دلہن کو شوہر کے کمرہ کی طرف لے جانا۔ [۱] قرآن مجید میں آیا ہے" ولا تحلقوا رؤسكم حتى يبلغ الهدی محله"۔ [۲]

جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ تراشو!

جیسا کہ مفردات سے سمجھ میں آتا ہے ھدیہ کو اس لئے ھدیہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک کا دوسرے پر لطف و مہربانی ہے مثلاً ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان کے لئے ھدیہ بھیجا تھا اور قرآن مجید میں یہ قصہ موجود ہے: وانی مرسلة اليهم بهدية فناظرة بم يرجع المرسلون [۳] میں ان کے لئے ایک تحفہ بھیجوں گی تا کہ یہ دیکھوں کہ بھیجے ہوئے افراد کس چیز کے ساتھ لوٹتے ہیں۔

قرآن مجید میں سات جگہ "ھدی" استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ حج و عمرہ کی قربانی کے بارے میں آیا ہے، اس کا واحد "ھدیہ" ہے جیسے تمر و تمرۃ اور جمع ھدیٌ ہے۔ [۴] فعیل کے وزن پر۔

قربانی

جو لوگ حج تمتع کرتے ہیں ان کے لئے منیٰ میں دوسرا واجب عمل قربانی کرنا ہے اور چونکہ یہ عمل عبادت ہے اور خدا سے قریب ہونے کا وسیلہ ہے اس لئے اس کو قربان کہتے ہیں۔ مجمع البحرین میں مرقوم ہے" والقربان ما يقصد به القرب من رحمة الله من اعمال البر " [۵] ہر نیک عمل کو قربانی کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصد خدا کی رحمت سے قریب ہونا ہے۔

ہم یہاں ھدی کے حق کے سلسلہ میں امام زین العابدینؑ کے بیان کی تشریح کرنا چاہتے ہیں لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی ھدی کا ذکر ہوا ہے اسے یہاں بیان کر دیا جائے تا کہ اس موضوع کی اہمیت واضح ہو جائے:

حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے تمام کرو پھر اگر گرفتار ہو جاؤ تو جو قربانی ممکن ہو وہ دیدو اور جب تک

---

[۱] قاموس قرآن ج ۷ ص ۱۵۰ [۲] بقرہ: ۱۹۶ [۳] نمل: ۳۵

[۴] قاموس قرآن ج ۷ ص ۱۵۰ [۵] مجمع البحرین "قرب"

قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ منڈانا پھر اگر تم میں سے کوئی بیمار ہے یا اس کے سر میں درد ہے تو روزہ یا صدقہ یا گوسفند کا کفارہ دینا چاہیئے جب تم دشمن اور بیماری کی طرف سے مطمئن ہو جاؤ تو جس نے عمرہ سے حج تمتع کا ارادہ کیا ہے تو اسے جو قربانی میسر ہو دیدے۔

اس آیت میں خدا نے تین بار ھدی کے موضوع کو بیان کیا ہے ا۔ جب احرام باندھ لیا جائے لیکن بیماری یا راستہ میں رکاوٹ آجائے تو یہاں لازم ہے کہ ایک قربانی دی جائے ۲۔ عید کے دن سر منڈانے سے پہلے اور کنکری مارنے کے بعد قربانی کی جائے اور جب تک قربانی نہ کی جائے سر منڈانا جائز نہیں ہے۔ ۳۔ اطمینان حاصل ہونے کے بعد جو حاجی حج تمتع کرنا چاہتا ہے اسے منیٰ میں قربانی کرنا چاہیئے۔

ایمان لانے والو! خدا کی نشانیوں (حج کے اعمال و مراسم) کی بے حرمتی نہ کرنا اور نہ حرمت والے مہینوں اور نہ بے پٹے کے قربانی کے جانور اور نہ پٹے والے قربانی جانور کی بے حرمتی کرنا اور نہ ان لوگوں کی بے حرمتی کرنا جو دخدا کا فضل ڈھونڈنے کے لئے خانہ کعبہ کی طرف آتے ہیں۔

اس آیت میں آٹھ حکم بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک ھدی و قربانی کا موضوع ہے حج کی قربانی کو، خواہ پٹے دار ہو یا بے پٹے کے ہو، ھدی کہتے ہیں اور اس کی جمع ھدیہ ہے یعنی وہ حیوان جن کو قربانی کیلئے خانہ خدا کو اھدا کیا جاتا ہے۔

قلائد "قلادۃ" کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو انسان یا کسی جانور کے گلے میں ڈالدی جاتی ہے اس آیت میں وہ چوپائے مراد ہیں جن پر حج کی قربانی کے لئے نشان لگا دئے جاتے ہیں۔

درج ذیل آیت میں بھی یہی موضوع ہے:

جعل الله الكعبة البيت الحرام قياما للناس والشهر الحرام والهدى والقلائد[1]

خدا نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے لوگوں کے لئے جائے قیام قرار دیا ہے اسی طرح قربانی کے عام جانوروں کو اور ان جانوروں کو کہ جن کے گلے میں پٹہ ڈال دیا گیا ہے۔

---

[1] مائدہ : ۹۷

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

ایمان لانے والو! احرام کی حالت میں شکار نہ مارو! اور جو تم میں سے جان بوجھکر شکار مارے گا اس کی سزا و کفارہ ایسا ہی جانور ہے جیسا اس نے مارا ہے جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل افراد کریں اور اس قربانی کو کعبہ تک جانا چاہئے۔ [۱]

اس کفارہ کے جانور کو کہاں ذبح کیا جانا چاہئے؟ فرماتا ہے کہ اسے کعبہ تک پہنچنا چاہئے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ ہمارے زمانہ کے فقہا کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ عمرہ کے احرام کی حالت میں شکار کرنے کے کفارہ کے جانور کو مکہ میں ذبح ہونا چاہئے اور حج کے احرام کی حالت میں کئے گئے شکار کے کفارہ کے جانور کو منیٰ کی قربان گاہ میں ذبح ہونا چاہئے۔

درج ذیل آیت میں بھی "ھدی" ہی بیان ہوا ہے:

ھم الذین کفروا وصدوکم عن المسجد الحرام والھدی معکوفا ان یبلغ محلہ۔ [۲]

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا اور آپ کو مسجد الحرام میں نہیں داخل ہونے دیا اور ھدی یعنی قربانی کے جانوروں کو روک دیا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ سکیں۔

یہ تھے وہ سات مقامات جن میں خدا نے ھدی کے موضوع کو بیان فرمایا اور اسکی اہمیت کو گوش گزار کیا اس سے ہم اس بات کی طرف متوجہ ہو گئے کہ قربانی خدا کے حکم کو بجالانے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے وہ بھی کعبہ یا قربان گاہ تک پہنچانے کے لئے۔

قربانی کی تاریخ

جن چیزوں کے بارے میں ہر شخص جاننا پسند کرتا ہے ان میں سے ایک قربانی ہے کہ قربانی کی رسم کب سے شروع ہوئی ہے؟ تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے قربانی مختلف قوموں اور ملتوں میں مختلف صورتوں میں رہی ہے۔

---

[۱] مائدہ: ۹۵ [۲] فتح: ۲۵

خوش قسمتی سے قرآن مجید نے اس کی ابتدا کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ قربانی کی رسم انسان کی خلقت کے بعد آدم کے بیٹوں سے شروع ہوئی ہے سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

انہیں آدمؑ کے دونوں بیٹوں کی داستان حق کے ساتھ سنا دیجئے جب ان میں سے ہر ایک نے تقرب خدا کے لئے قربانی پیش کی تو ایک کی قربانی کو قبول کر لیا گیا اور دوسرے کی قربانی کو قبول نہیں کیا گیا پھر جس کی قربانی کو قبول نہیں کیا گیا اس نے کہا:

خدا کی قسم میں تمہیں ضرور قتل کرونگا۔ اس نے کہا: خدا بس پرہیزگاروں کی قربانی کو قبول کرتا ہے۔ [1]

اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خدا کے تقرب کا ایک طریقہ قربانی کرنا ہے اور آدم کے بیٹوں نے قرب خدا کے معیار کو اسی طریقہ سے سمجھا تھا۔

حضرت ابراہیم فرماتے ہیں: صدقہ دے کر خدا کا تقرب حاصل کرو، چنانچہ توریت کے سفر تکوین سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم کو حیوانات ذبح کرنے کا حکم دیا [2] اور حضرت ابراہیم کے بیٹوں نے قربانی، ھدی اور ذبیحہ کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کیا۔

حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ذبیحوں کی دو قسمیں تھیں ایک کو ذبح کیا جاتا تھا اور دوسری کو راہ خدا میں چھوڑ دیا جاتا تھا ذبح کی جانے والی قسم کی تین قسمیں تھیں:

۱۔ جلایا جانے والا ذبیحہ

۲۔ گناہ کا کفارہ ذبیحہ

۳۔ سلامتی کا ذبیحہ

پہلی قسم کے ذبیحہ کا گوشت جلایا جاتا تھا اور کھال کاہن کو دی جاتی تھی، دوسری قسم کے ذبیحہ کا نصف گوشت جلایا جاتا تھا اور نصف کاہن کا حصہ ہوتا تھا، تیسری قسم کا ذبیحہ سب کے لئے حلال تھا۔

روم والے بھی اپنے خداؤں کے لئے قربانی کرتے تھے اور ان کے کاہن قربانی کے وقت، پانی، گلاب اور شہد چھڑکتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے اس قسم کی قربانی کے سلسلہ میں صرف بھیڑ

---

[1] مائدہ: ۲۷ [2] شرح رسالۃ الحقوق، قبانچی ج ۱ ص ۳۶۵

اور جانوروں ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ کبھی انسانوں کو بھی قربانی کے عنوان سے ذبح کیا ہے۔ بعض فینیقین، کنعانین، صورییین، فارس اور روم کے باشندوں کی یہی عادت تھی یہاں تک کہ ۶۵۷ء میں روم کے سر بر آوردہ افراد کی ایک کمیٹی نے اس پر پابندی لگائی۔

کہا جاتا ہے کہ مصر والے ماہ قبطی میں ہر سال ایک باکرہ لڑکی کو سجا سنوار کر اسلئے دریائے نیل کی بھینٹ چڑھاتے تھے تاکہ اس عمل کے ذریعہ وہ اپنے خداؤں کا تقرب حاصل کریں۔ یہ رسم اسی طرح جاری تھی یہاں تک عمرو بن عاص نے، عمر بن خطاب کی موافقت سے اس پر پابندی لگائی۔ یہ بات صاحب رسالۃ الحقوق نے جامعہ ازہر کے استاد احمد جرجانی کی کتاب "حکمة التشریع وفلسفه" سے نقل کی ہے۔

اسلام نے ان تمام قربانیوں کو ممنوع قرار دیا جو بتوں اور انسانوں کے لئے دی جاتی تھیں اور اپنے ماننے والوں کو صحیح قربانی سکھائی جس کو ہم نے آیات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ درحقیقت اسلام نے آدمی کی فطرت اور اس کے ضمیر کو، کہ جس میں خدا پرستی کا اعتقاد رچا بسا ہوا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں قربانی پیش کرے، قربانی کرنے کا طریقہ اور اس کی قسم کی تعلیم دی ہے: تم یہ گمان نہ کرو کہ تمہارے اس ذبیحہ کا گوشت یا خون خدا تک پہنچے گا ہرگز، بلکہ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان خدا سے قریب ہو جائے، لہذا قربانی میں قصد قربت ہونا چاہئے اور ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا چاہئے۔

ھدی ایک شرعی اور عقلی چیز ہے

گذشتہ بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ھدی ایک عقلی بات ہے لہذا شارع مقدس نے بھی اس کو پسند اور تسلیم کیا ہے کہ اس سے روح سنورتی ہے اور معاشرہ کی اقتصادی بنیاد مضبوط ہوتی ہے، قربانی کا مقصد یہ ہے کہ اس کا گوشت ناداروں کو دیا جائے اور یہ صرف خدا کے لئے کی جائے۔ یہ بات اس روایت سے سمجھ میں آتی ہے جو علل الشرایع میں نقل ہوئی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے قربانی کو معاشرہ کی اقتصادی خوشحالی اور ناداروں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے قرار دیا ہے انہیں اس کا گوشت کھلاؤ۔

ابو بصیر کہتے ہیں: میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: قربانی کرنے کا کیا فلسفہ ہے؟ فرمایا: قربانی کے خون کے اولین قطرہ کے زمین پر گرتے ہی قربانی کرنے والے کے گناہ بخش دئے جاتے ہیں اور یہ کہ معلوم ہو جائے کہ غیب سے کون ڈرتا ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے: اس کا گوشت خدا تک پہنچتا ہے اور نہ اس کا خون کیونکہ خدا اس کا محتاج نہیں ہے بلکہ قربانی تقوے اور پرہیزگاری کی نشانی ہے پھر فرمایا: غور کرو کہ خدا نے ہابیل کی قربانی کو قبول کر لیا اور قابیل کی قربانی کو رد کر دیا۔ [1]

اس حدیث میں ثواب، قربانی کرنے والے کے گناہوں کی مغفرت اور اس کے خلوص کو پہچاننے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ قربانی میں کیا عظمت و راز ہے تو وہ قرض لیکر قربانی کرتے قربانی کے اولین قطرہ کے زمین پر گرتے ہی قربانی کرنے والے کے گناہوں کو بخش دیا جاتا ہے۔ [2]

وسائل الشیعہ میں منقول ہے کہ رسولؐ نے اپنی دختر حضرت فاطمہؑ سے فرمایا: اپنی قربانی کے ذبح کے وقت تم موجود رہو بیشک اس کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی خدا تمہاری فروگزاشتوں کو معاف کر دے گا۔ یہاں تک کہ فرمایا: یہ ثواب عام مسلمانوں کے لئے ہے۔ [3]

حضرت موسیٰ بن جعفرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: رسولؐ کا ارشاد ہے: اپنی قربانی کے جانوروں کو فربہ بناؤ کہ یہ پل صراط سے گزرنے کے لئے تمہاری سواریاں ہیں۔ [4]

---

[1] علل الشرائع: ۴۳۷
[2] علل الشرائع: ۴۳۸
[3] شرح رسالۃ الحقوق (قپانچی) ج ۱ ص ۳۶۹
[4] علل الشرائع: ۴۳۸ باب ۱۷۹

حاکم کا حق

واما حق سائیسک بالسلطان فان تعلم انك جعلت له غتنة وانه مبتلى فيك بما جعله اللّه له عليك من السلطان وان تخلص له فى النصيحة وان لا تماحكه وقد بسطت يده عليك فتكون سبب هلاك نفسك و هلاكه ، و تذلل و تلطف لاعطائه من الرضا ما يكفه عنك ولا يضر بدينك و تستعين عليه فى ذلك باللّه ، ولا تعازه ولا تعانده فانك ان فعلت ذلك عققته و عققت نفسك فعرضتها لمكروهه و عرضته للهلكة فيك و كنت خليقا ان تكون معينا له على نفسك و شريكا له فيما اتى اليك ، ولا قوة الا باللّه.

پیشوائے حکومت کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اس کے لئے آزمائش وامتحان کا سبب قرار دیئے گئے ہو اور اس کا جو تسلط تم پر ہے وہ بھی اس کے ذریعہ آزمایا جاتا ہے۔ لہٰذا اسکی بات کو تم خلوص کے ساتھ سنو اور اس سے اس وقت جھگڑا نہ کرو جب وہ تمہارے اوپر تسلط رکھتا ہو کہ اس صورت میں تم اپنی اور اسکی ہلاکت کا سبب بنو گے اس کے ساتھ اتنی نرمی اور فروتنی سے پیش آؤ کہ اس کی رضا حاصل کرلو تا کہ وہ تمہارے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچائے اور اس سلسلہ میں تم خدا سے مدد طلب کرو اس پر برتری حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو اور اس سے دشمنی نہ کرو اگر ایسا کرو گے تو اسے بھی نقصان پہنچاؤ گے اور خود کو بھی، اسے اپنی طرف سے متنفر کرو گے اور اسے معرض ہلاکت میں پہنچاؤ گے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم ضرر میں اس کے معاون ہو جاؤ اور وہ جو بھی تمہارے ساتھ کرے اس کے شریک ہو جاؤ اور خدا کے علاوہ کوئی قوت و طاقت نہیں ہے۔

لغت میں ''سلطہ'' کے معنی قدرت کے ہیں، مفردات اور اقرب الموارد میں سلطہ کے معنی قہر و غلبہ کے ساتھ تمکّن وقدرت لکھے ہیں: سلّطہ علیہ، یعنی اسے دوسرے پر غالب کیا۔

اس جملہ میں امام زین العابدینؑ معاشرہ کے حکام کے حقوق کو بیان کرتے ہیں پہلے معاشرہ کے حاکم وسلطان کے حق کو بیان کرتے ہیں اور سلطان سے مراد صاحب قدرت ہے یعنی جس کے ہاتھ

میں امور کی زمام ہے۔

اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ معاشرہ میں حاکم وسلطان کا وجود ضروری ہے تاکہ اس کی حکومت کے زیر سایہ اجتماعی قوانین ومقررات کا اجراء ہو اور نظم ونسق کا بول بالا ہو سکے اور معاشرہ میں فتنہ وفساد، جنگ وخونریزی کا سد باب ہو اور معاشرہ کے لوگ اپنے تکامل کے سفر کو جاری رکھیں۔

حضرت علیؑ کی نظر میں حاکم کی ضرورت

لوگوں کے لئے ایک حاکم وامیر کا ہونا ضروری ہے خواہ وہ نیک ہو یا بد، مومن اس کی حکومت میں طاعت میں مشغول رہتا ہے اور کافر اپنے لحاظ سے فائدہ ولذت اٹھاتا ہے اور اس کے زمانہ میں خدا ہر ایک کی اجل کو مقدر کرتا ہے، اسی کے ذریعہ فئی ومالیات جمع ہوتے ہیں، اور دشمن سے جنگ ہوتی ہے، راستے محفوظ ہوتے ہیں زبردست وقوی سے کمزور کا حق لیا جاتا ہے یہاں تک کہ نیک آرام پاتا ہے اور بد کار سے محفوظ رہتا ہے۔

یہ جملے آپ نے اس وقت بیان فرمائے تھے جب خوارج نے لا حکم الا للّٰہ کا شور مچا رکھا تھا۔ اس خطبہ سے آپ نے یہ ثابت کیا تھا کہ حاکم کا وجود ناگزیر ہے کیونکہ اسی وقت معاشرہ میں آرام وچین ہوتا ہے کہ جب میں قوی وطاقتور حکومت ہوتی ہے۔

امام رضاؑ کے نقطہ نگاہ سے

معاشرہ میں حاکم کے وجود کی ضرورت کے سلسلہ میں فضل بن شاذان نے امام رضاؑ سے ایک مفصل حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں:

اس کا فلسفہ یہ بھی ہے کہ ہم کو فرقوں میں سے کوئی فرقہ اور ملتوں میں سے کوئی ملت ایسی نہیں ملتی کہ جس نے رئیس ورہبر کے بغیر زندگی گزاری ہو کیونکہ ان کے لئے دین ودنیا میں اس کا وجود ضروری ہے لہذا حکیم کی حکمت میں یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے لوگوں کو حاکم ورہبر کے بغیر چھوڑ دے کہ ان

کے لئے اس کا وجود ضروری ہے اور اسی پر ان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ دشمن سے جنگ کرتے اور غنیمت تقسیم کرتے ہیں، اپنا جمعہ اور جماعت قائم کرتے ہیں اور اپنے مظلوم سے ظالم کو دفع کرتے ہیں۔

امام رضاؑ کے اس کلام سے معاشرہ میں حاکم کے وجود کی ضرورت کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے۔

عادل امام و پیشوا اور ان کے مخصوص صفات

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے، رہبر دو قسم کے ہیں۔ عادل اور ظالم ان دونوں کے کچھ مخصوص صفات ہیں ان کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:

اور ہم نے ان کو امام بنایا وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کو نیک کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی ہے اور وہ ہمارے ہی عبادت گزار تھے۔ [1]

اس آیت میں خدا نے امام بنانے کی نسبت اپنی طرف دی ہے اور ان کے یہ خصوصیات بیان کئے ہیں کہ وہ لوگوں کی ہدایت و راہنمائی کرتے ہیں، ان پر خدا کی طرف سے یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ وہ نیک کام کریں، نماز قائم کریں جو کہ خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ ہے، زکوٰۃ دیں کہ نادار و مالداروں کے درمیان رابطہ ہے اور ان کی آخری خصوصیت یہ ہے کہ وہ عبادت گزار تھے چنانچہ جب انہوں نے عبودیت کی منزل سر کی تو ان کو لوگوں کی قیادت و رہبری ملی۔

قیادت کامیابی کا سبب

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ قدرت و اقتدار عادل امام کے لئے ہے اس سلسلہ میں اس نے کچھ نمونے بیان کئے ہیں ان میں سے ایک طالوت کا قصہ بھی ہے، طالوت دراز قد، طاقتور اور حسین و جمیل تھے، قوی ہیکل اور ذہین و زیرک تھے بعض لوگوں نے ان کے دراز قد ہونے ہی کو ان کے انتخاب کا سبب سمجھا ہے۔

---

[1] انبیاء: ۷۳

کیا تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں سے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا: آپ کسی کو ہمارا زمامدار مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس کی قیادت میں راہ خدا میں جہاد کریں۔

ان کے نبی نے ان سے کہا: بیشک خدا نے تمہارے لئے زمامدار مقرر کر دیا ہے انہوں نے کہا: وہ ہم پر کیسے حکومت کر سکتے ہیں جبکہ ہم ان سے زیادہ حکومت کے حقدار ہیں ان کے پاس مال بھی ہم سے زیادہ نہیں ہے؟ نبی نے کہا: خدا نے انہیں تمہارے اوپر مقرر کیا ہے اور انکے علم و جسم میں وسعت دی ہے خدا جس کو چاہتا ہے اپنا ملک عطا کرتا ہے اور اللہ صاحب وسعت اور علم والا ہے۔ [1]

ہم کہہ چکے ہیں کہ قیادت و رہبری کامیابی کا سبب ہے بشرطیکہ وہ طاقتور اور باتدبیر ہو، یہی بات اس آیت میں واضح طور پر نظر آتی ہے کہ جب بنی اسرائیل میں سے بعض لوگوں نے اپنے نبی سے رہبر مقرر کرنے کا تقاضا کیا تو نبی نے بھی ان کے لئے ایسے شخص کو رہبر بنایا جو علم و جسم کے لحاظ سے قوی تھا اور جن لوگوں نے طالوت کے رہبر بننے پر اعتراض کیا تھا ان کے جواب میں خدا نے فرمایا: مال کی کمی کا قیادت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، بلکہ علمی و جسمی طاقت و توانائی اہم چیز ہے۔

طالوت اور سپہ سالاری

طالوت نے فوج کی سپہ سالاری قبول کر لی اور تھوڑی ہی مدت میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ امور مملکت اور سپہ سالاری کی صلاحیت ولیاقت رکھتے ہیں۔ پھر طالوت نے ان لوگوں کو اس دشمن سے جنگ کرنے کی دعوت دی کہ جس سے ان کی ہر چیز کو خطرہ لاحق تھا اور لوگوں سے یہ فرمادیا کہ میرے ساتھ وہی آئے جو جہاد کرنا چاہتا ہے چنانچہ بنی اسرائیل، قوی رہبر کے وسیلہ سے جالوت پر فتحیاب ہوئے۔

اس قصہ میں قیادت کے بنیادی شرائط، خدا کا انتخاب، علم و دانائی اور طاقت و قوت بیان ہوئے ہیں رہبر و قائد اپنے علم سے معاشرہ کی فلاح و سعادت کی تشخیص کرتا ہے اور اس کے اصول بناتا ہے اور اپنی طاقت و قدرت سے بروقت ان کا اجراء کرتا ہے۔ **ان اللّٰہ اصطفاہ علیکم و زادہ بسطۃ فی العلم و الجسم۔**

---

[1] بقرہ: ۲۴۷

امام زین العابدینؑ نے رہبر و پیشوا کے حق کے سلسلہ میں یہ فرمایا: وانه مبتلى فيك بما جعله الله له عليك من السلطان اس کی سلطنت و پیشوائی کو خدا نے قرار دیا ہے اور اسکی قدرت و طاقت کے بارے میں فرمایا ہے: "وقد بسطت يده عليك " وہ تمہارے اوپر اختیار رکھتا ہے اسے تم پر بالادستی حاصل ہے اور اس کی قدرت و اختیار سے بے اعتنائی کرنا تمہاری ہلاکت کا سبب ہوگا۔

امام زین العابدینؑ ایک اور بات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں: پیشوا اور اس کے پیروؤں دونوں کی آزمائش ہوتی ہے طالوت کے قصہ میں آزمائش و امتحان کا ذکر بھی ہوا ہے:

جب طالوت اپنے سپاہیوں کے ساتھ بستی سے باہر گئے تو ان سے فرمایا: یقیناً خدا ایک نہر کے ذریعہ تمہارا امتحان لے گا پھر جو لوگ اس نہر کا پانی پئیں گے وہ مجھ سے نہیں ہیں اور جو اس سے چلو بھر پئیں گے وہ مجھ سے ہیں چنانچہ چند افراد کے علاوہ سب نے اس کا پانی پیا۔

طاقت کا بہترین استعمال، ذوالقرنین کا قصہ

قرآن مجید دوسری قوم کے رہبر کی داستان سناتا ہے وہ بھی طاقتور و توانا تھا اور اس نے لوگوں کو نجات دلانے کے سلسلہ میں بہترین طریقہ سے اپنی طاقت سے استفادہ کیا تھا اور وہ ہے ذوالقرنین۔

یہاں تک کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان میں پہنچا تو وہاں اس نے ان دونوں کے علاوہ ایک اور قوم کو دیکھا وہ لوگ کوئی بات نہیں سمجھتے تھے۔ [1]

یعنی وہ ایک پہاڑی علاقہ میں پہنچے اور وہاں مشرق و مغرب کے لوگوں کے علاوہ کچھ لوگ دیکھے کہ جن کا کوئی خاص تمدن و تہذیب نہیں تھی اگر یہ کوئی بات کہتے تھے تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ بشریت کے واضح تمدن، یعنی بات کہنے، سے بھی عاجز تھے یا وہ فکری اعتبار سے پست تھے۔

ان لوگوں نے اسکندر سے خونخوار دشمن' یاجوج و ماجوج کی شکایت کی کہ یہ لوگ ہمارے علاقہ میں فساد پھیلاتے ہیں۔ ہم آپ کو پیسہ دیتے ہیں آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار اور سد بنا دیجئے۔

---

[1] کہف: ٩٣

انہوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج وماجوج ہماری سرزمین پر فساد پھیلاتے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے بجٹ فراہم کردیں کہ آپ ہمارے اوران کے درمیان ایک سد ودیوار بنادیں؟ (اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی مالی حالت بہتر تھی لیکن صنعت وغیرہ سے وہ نابلد تھے) ذوالقرنین نے کہا: خدا نے جو کچھ مجھے دیا ہے وہ بہتر ہے مجھے تمہارے پیسہ کی ضرورت نہیں ہے اپنی طاقت وقوت سے میری مدد کروتا کہ میں تمہارے اوران دوقوموں کے درمیان دیواروسد بنادوں۔

''رَدْم'' بروزن ''مرذ'' کے معنی شگاف کو پتھر سے بند کرنا تھے لیکن پھر یہ وسیع معنی میں استعمال ہونے لگا اور ہر سد درکاوٹ یہاں تک کپڑے پر پیوند لگانے کو بھی ردم کہا جانے لگا، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ردم مضبوط وٹھوس چیز کو کہا جاتا ہے اور سد اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ [1]

پھر ذوالقرنین نے حکم دیا: تم میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ۔ ''زبر'' زبرہ کی جمع ہے جس کے معنی لوہے کے بڑے اور ضخیم ٹکڑے کے ہیں ۔ جب لوہے کے ٹکڑے فراہم ہو گئے تو ان کو ایک دوسرے کے اوپر رکھنے کا حکم دیا یہاں تک دو پہاڑوں کے درمیان کا درہ پورے طریقہ سے پر ہو گیا۔ اور صدف کے معنی پہاڑ کے کنارہ کے ہیں اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ پہاڑ کے دو کناروں کے درمیان میں ایک شگاف تھا اسی سے یاجوج وماجوج آتے تھے۔

ذوالقرنین نے آخری فرمان یہ دیا کہ اسے اتنا پھونکو کہ یہ آگ ہو جائے اور میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ تا کہ اس کو میں اس سد پر ڈال دوں اور اس طرح اس دیوار کو پگھلے ہوئے تانبے سے ڈھانک دیا تا کہ وہ ہوا کے نفوذ اور گلنے سے محفوظ رہے۔

ذوالقرنین نے اگر چہ یہ بہت بڑا کام انجام دیا ہے اور تکبر کرنے والوں کی مانند انہیں اس پر فخر کرنا چاہئے تھا، یا ان لوگوں پر احسان جتانا چاہئے تھا لیکن چونکہ وہ اللہ والے تھے اس لئے یہ کہتے ہیں: یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے۔

اس داستان میں قوی رہبر نے اپنی طاقت کو معاشرہ کے فائدہ کے لئے استعمال کیا تو لوگوں

---

[1] تفسیر ج ۱۲ ص ۵۳۴

ـنے ان کا شکریہ ادا کیا؛ یہ تھے اس عادل وقوی رہبر کے صفات کہ جس کو حضرت علیؑ نے اپنے کلام میں معاشرہ کو نجات دلانے والا قرار دیا ہے۔

فان الرعية الصالحة تنجو بالامام العادل الا وان الرعية الفاجرة تهلك بالامام الفاجر [1]

نیک لوگ عادل امام کے ذریعہ نجات پاتے ہیں اسی طرح فاجر وبدکار لوگ فاجر وبدکار حاکم وامام کے ذریعہ ہلاک ہوتے ہیں۔

عادل رہبر کی پہچان اور اس کی اطاعت

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

امام حسینؑ اپنے اصحاب کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: لوگو! خدا نے بندوں کو نہیں پیدا کیا مگر اسلئے تا کہ وہ اسے پہچانیں پھر جب وہ اسے پہچان لیتے ہیں تو اس کی عبادت کرتے ہیں اور خدا کے غیر کی عبادت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں ایک شخص نے عرض کی: فرزند رسولؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! معرفت خدا کیا ہے؟ فرمایا:: لوگوں کا اپنے زمانہ کے اس امام کو پہچاننا کہ جس کی اطاعت ان پر واجب ہے۔ [2]

اس حدیث میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ خدا کی معرفت عادل امام کی معرفت ہی سے ہو سکتی ہے۔

عادل وعالم امام کے سبب مصر والوں کی نجات

قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت یوسف قید سے آزاد ہوئے اور مصر کے حاکم کے نزدیک آپ کی صلاحیت ولیاقت واضح ہوگئی تو اس نے آپ سے بڑی ذمہ داری قبول کرنے کی درخواست کی، حضرت یوسف نے اس سے فرمایا:

اجعلني علىٰ خزائن الارض انی حفيظ عليم۔

---

[1] الحیاۃ ج ص ۳۸۵ [2] ایضا: منقول از بحار ج ۵ ص ۳۱۲

مجھے ملکِ مصر کا وزیرِ خزانہ بنا دیجئے کہ میں ان دو خصوصیتوں کی بنا پر اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں ا۔ میں لوگوں کے مال کا محافظ ہوں، اور امانت داری جو کہ امامت و رہبری کی شرط ہے، وہ میرے اندر موجود ہے ۲۔ علم اور اقتصاد کی مہارت، میں جانتا ہوں کہ ملک کو آمد و خرچ کے لحاظ سے کس طرح چلایا جاتا ہے۔ بادشاہ مصر نے یہ حساس و نازک عہدہ ان کے سپرد کر دیا اور حضرت یوسف نے قحط کے سالوں میں ملک کا نظم و نسق کچھ اس طرح برقرار رکھا کہ معاشرہ کو قحط سے نجات ملی اور قرآن نے انہیں شائستہ و لائق زمام داروں کی فہرست میں رکھا ہے۔

عادل بادشاہ لائق احترام ہے

بادشاہ کے احترام اور اس کا حق ادا کرنے کے بارے میں رسولؐ اور ائمہ معصومین سے بہت سی حدیثیں نقل ہوئی ہیں جو کہ حاکم اور عادل بادشاہ سے مربوط ہوتی ہیں یہاں ان میں سے بعض یہ ہیں:

ا۔ رسولؐ نے فرمایا: سلاطین اور بادشاہوں کا احترام کرو کیونکہ اگر وہ عادل ہیں تو روئے زمین پر خدا کا سایہ ہیں (عادل حاکموں کا احترام کرو ظالم و جابر کا نہیں)

۲۔ کہتے ہیں: میں نے رسولؐ سے عرض کی: مجھے ان حاکموں کے بارے میں خبر دیجئے کہ جن کے سامنے گردنیں خم ہوتی ہیں اور جسم جھکتے ہیں؟ فرمایا: جو روئے زمین پر خدا کا سایہ ہیں اگر نیکی کریں تو ان کے لئے اجر ہے اور تمہارے لئے بھی اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے اور اگر وہ بدی کریں تو تم صبر اور بردباری سے کام لو۔

اس حدیث میں رسولؐ نے عادل بادشاہ کا شکریہ ادا کرنے کو لازم قرار دیا ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ بن جعفرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے اپنے شیعوں سے فرمایا: حاکموں کے حکم و فرمان کو ٹھکرا کر ذلت و خواری کے اسباب فراہم نہ کرو اگر وہ عادل ہے تو خدا سے اس کو باقی رکھنے کے لئے دعا کرو اور اگر ظالم ہے تو خدا سے دعا کرو کہ اس کی اصلاح کر دے، کیونکہ بادشاہ ہی کی بھلائی میں تمہاری بھلائی ہے، عادل بادشاہ مہربان باپ کی مانند ہے اسکے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جو اپنے لئے پسند نہ کرو اسے اس کے لئے بھی پسند نہ کرو۔

اس حدیث میں ساتویں امام نے عادل بادشاہ کو مہربان باپ کی مانند قرار دیا ہے بالکل ایسے ہی جیسے نیک وشریف باپ معاشرہ کی خدمت میں نیک وشریف بیٹا پیش کرتا ہے اسی طرح عادل بادشاہ بھی معاشرہ کو کمال کی طرف لے جاتا ہے۔

۴۔رسولؐ نے فرمایا: خدا نے تین چیزوں، سورج، چاند اور ستاروں، کے ذریعہ آسمان کو زینت دی ہے، زمین کو بھی تین چیزوں علماء، بارش اور عادل بادشاہ سے آراستہ کیا ہے۔

اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسانی معاشرہ عادل وشائستہ حاکم کے وجود کے سایہ میں آباد وشاداب رہتا ہے۔

ہلاکو خان کا استفتا

۶۵۶ھ میں جب ہلاکو خان نے بغداد کو فتح کیا اور یہ حکم دیا کہ بغداد کے علماء سے یہ معلوم کرو کہ کافر عادل بادشاہ افضل ہے یا ظالم مسلمان بادشاہ؟ مدرسۂ مستنصریہ میں علماء جمع ہوئے اور اس سوال کو دیکھا تو اس کا جواب دینے سے انکار کر دیا اس مجلس میں رضی الدین علی بن طاؤس موجود تھے اور علماء کو ان کی شخصیت کا اعتراف تھا جب انہوں نے یہ دیکھا کہ علماء اس سوال کا جواب دینے سے پہلو تہی کر رہے ہیں تو انہوں نے قلم اٹھایا اور تفصیل سے تحریر کیا: کافر عادل، ظالم مسلمان سے بہتر وافضل ہے اور یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو رسولؐ سے نقل ہوئی ہے۔

الملك بالعدل مع الكفر و لا يبقى بالجور مع الايمان [1]

کافر عادل بادشاہ کے ہوتے ہوئے ملک وحکومت باقی رہ سکتی ہے لیکن ظالم بادشاہ کے ہوتے ہوئے حکومت باقی نہیں رہ سکتی خواہ وہ مسلمان ہی ہو۔

حکومت کے امور سے آگاہی

اچھے اسلامی حاکم کی ایک خصوصیت یہ ہے وہ حکومت کے امور سے آگاہی رکھتا ہو اور طالوت

---

[1] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۱ ص ۳۸۵

کے قصہ میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ وہ جسمانی لحاظ سے قوی اور قیادت و معاشرہ کے مسائل سے آگاہ تھے، حکومت کے امور سے حاکم کا آگاہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے مشعل راہ کہ جو اسے تاریکی میں گرنے سے بچاتا ہے۔

بعض حکماء کا قول ہے: اگر حاکم و قائد کے پاس علم نہ ہو تو وہ اس ہاتھی کی مثل ہے جو حملہ کے وقت کسی چیز کا خیال نہیں کرتا ہر ایک کو کچل دیتا ہے کیونکہ نہ اس کے پاس عقل ہوتی ہے اور نہ علم؛ عقل اور علم دونوں ہی ظلم سے باز رکھتے ہیں۔

خوف وہراس

اچھے حاکم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا ہو، خوف خدا ہر خوبی کی اساس اور برکت کی کنجی ہے۔ جب بادشاہ کے اندر یہ صفت ہوتی ہے تو رعیت اس کے شر سے امان میں رہتی ہے۔ حضرت علیؑ کے حالات میں بیان ہوا ہے کہ ایک روز آپ نے کسی غلام کو آواز دی۔ اس نے اعتناء نہ کی آپ نے دوبارہ آواز دی پھر اس نے کوئی جواب نہ دیا آپ نے پھر آواز دی اسی اثنا میں ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے امیر المومنین! وہ دروازہ کے پیچھے کھڑا ہے مگر جواب نہیں دے رہا ہے۔

اسی دوران غلام بھی آگیا۔ آپ نے اس سے معلوم کیا، کیا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی؟ عرض کی: سنی تھی، تو تم نے جواب کیوں نہیں دیا؟ اس نے کہا: چونکہ میں آپ کے ظلم و سزا سے محفوظ تھا۔ آپ نے فرمایا: شکر خدا کہ اس نے مجھے ان لوگوں میں قرار دیا کہ جن سے اس کی مخلوق امان میں ہے۔

عفو و بخشش

حاکم کی ایک اور بہترین خصوصیت، عفو و درگزر کرنا اور لوگوں کی چھوٹی موٹی لغزشوں سے چشم پوشی کرنا ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے: اور تمہیں معاف کرنا اور درگزر کرنا چاہئے کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تمہارے گناہوں کو بخش دے۔ [۱]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: جب تم دشمن پر فتحیاب ہو جاؤ تو اس پر تمہاری فتحیابی کا شکریہ، یہ ہے کہ اسے معاف کردو۔ [۲]

اور مالک اشتر کے نام اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں: خبردار عفو درگزر کرنے پر پشیمان نہ ہونا اور سزا و عقاب دینے پر خوش نہ ہونا۔ [۳]

پھر اسی خط میں تحریر فرماتے ہیں: اپنی عفو و بخشش سے انہیں اس طرح مالا مال کردو جس طرح تم خدا کی بخشش و درگزر سے مالا مال ہونا چاہتے ہو، کیونکہ تم ان سے بلند رتبہ پر فائز ہو اور ولیٔ امر تم سے اوپر ہے اور خدا اس پر حاکم ہے جس نے تم کو ولی و حاکم مقرر کیا ہے۔

وفائے عہد

جو نمایاں صفات حاکم میں ہونا چاہئیں ان میں سے اس کا عہد وفا کرنا اور وعدہ وفائی کرنا ہے

اس سلسلہ میں خدوند عالم فرماتا ہے: واوفوا باعهد ان العهد كان مسئولا [۴]

اور اپنے عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں سوال کیا جائیگا۔

ملک وملت کی حالت سے آگاہی

حاکم کی ایک اور بہترین خصوصیت یہ ہے کہ ملک کے امور پر اس کی نگاہ ہو اور معاشرہ کے حالات پر اس کی نظر ہو، مثلاً لوگ کس پریشانی میں مبتلا ہیں، ان کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ ان کی ترقی کے لئے زمین ہموار کرنا اور ان کے مشکلات کو برطرف کرنا اس سلسلہ میں مالک اشتر سے فرماتے ہیں:

اے مالک! لوگوں سے زیادہ دن تک پوشیدہ نہ رہو کیونکہ حاکم کا رعیت سے زیادہ دنوں تک مخفی رہنا ایک قسم کی تنگی اور ان کے امور سے نادانی و بے خبری ہے۔ اور حاکم پر لوگوں کے موجودہ حالات

---

[۱] نور: ۲۲ [۲] نہج البلاغہ، فیض الاسلام، کلمہ قصار: ۱۰ [۳] نہج البلاغہ مکتوب: ۵۳ [۴] اسراء: ۳۴

پوشیدہ ہوں اور انہیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو تو حاکم ان حقائق سے محروم ہو جائیگا جن سے واقف ہونا اس کے لیے ضروری ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان کے نزدیک چھوٹی چیز بڑی اور بری چھوٹی ہو جائے گی اور اچھی چیز بری اور بری چیز اچھی ہو جائیگی اور حق و باطل میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ [1]

حضرت علیؑ نے اس خط میں حاکم و عوام کے روابط کو بیان کیا ہے۔ حاکم کو معاشرہ کے امور اور اس پر گزرنے والے حالات سے باخبر ہونا چاہئے یہی چیز حاکم کی کامیابی کا راز سمجھی جاتی ہے۔ یہ تھی عادل بادشاہ کی خصوصیت اب ظالم و استبداد گر بادشاہ کی خصوصیت اور معاشرہ پر اس کا اثر ملاحظہ فرمائیں۔

سرکش حکام

قرآن مجید نے حاکموں کی دو قسمیں بیان کی ہیں: خدائی نمائندے عادل امام، جہنم کے ظالم امام، سرکش حاکموں کے کردار کو قرآن مجید اس طرح بیان کرتا ہے: وجعلنا هم ائمة يدعون الى النار و يوم القيامة لا ينصرون [2]

ہم نے ان کو امام و پیشوا بنایا ہے وہ لوگوں کو جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں اور قیامت کے دن ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا باطل کے پیشوا و امام مقرر کرے جبکہ انبیاء کا یہ کام ہے کہ وہ نیکی و سعادت کی طرف راہنمائی کریں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ: ائمہ ضلال (گمراہی کے امام) درحقیقت ان کے اعمال کا نتیجہ ہے اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ ہر سبب کا اثر خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ایسا راستہ اختیار کیا ہے کہ جو گمراہ لوگوں کی امامت پر منتہی ہوتا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ دوزخ والوں کے ہاتھ کا کھلونا ہیں جس طرح وہ دنیا میں گمراہ لوگوں کے ہاتھ کا کھلونا تھے۔ لہٰذا وہ دنیا و آخرت میں ملعون ہیں اسی آیت کے بعد خداوند عالم فرماتا ہے:

واتبعناهم فى هذه الدنيا لعنة ويوم القيامة هم من المقبوحين. [3]

اور ہم نے دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت میں وہ روسیاہ ہونگے۔

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب: ۵۳ [2] قصص: ۴۱ [3] ایضا: ۴۲

خدا کی لعنت یہ ہے کہ ان کو رحمت سے دور کر دیا گیا ہے ادر فرشتوں اور انسانوں کی لعنت و نفرین ہے جوان پر ہمیشہ پڑتی رہتی ہے۔ خدا کے نمائندے معصوم امام، سیدھے راستہ کی طرف بلاتے تھے اور یہ گمراہی وہ جہنم کی طرف بلاتے تھے۔

ان دونوں اماموں کے خصوصیات امام صادقؑ کی حدیث میں اس طرح بیان ہوئے ہیں، پہلا گروہ خدا کے حکم کو مخلوق کے حکم پر اور اپنے ارادہ پر مقدم کرتا ہے اور اس کے حکم کو بلند سمجھتا ہے جب کہ دوسرا گروہ اپنے حکم و فرمان کو خدا کے فرمان پر مقدم تصور کرتا ہے۔ [1]

بالکل اسی طرح جیسے ہر سیاست مدار دنیا میں ایک گروہ کو اپنے پیچھے، پیچھے لیکر چلتا ہے آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ بشر بن غالب نے امام حسینؑ سے روایت کی ہے کہ میں نے آپ سے اس آیت ''یوم ندعوا کل اناس بامامھم'' [2] کی تفسیر معلوم کی تو فرمایا:

ایک وہ امام ہے جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے اور کچھ لوگ اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں اور ایک امام وہ ہے جو ضلالت و گمراہی کی طرف بلاتا ہے اور ایک گروہ اس کی دعوت کو قبول کرتا ہے۔ پہلا گروہ جنت میں اور دوسرا جہنم میں جائیگا اور یہی خدا کے قول کے معنی ہیں کہ ایک گروہ جنتی ہے اور ایک گروہ جہنمی ہے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

ان فی ولایة الوالی الجائر دروس الحق و احیاء الباطل کله و اظهار الظلم والجور و الفساد [3]

ظالم و جابر حاکم کی حکومت میں حق فرسودہ و پرانا ہو جاتا ہے اور باطل زندہ ہو جاتا ہے اور ظلم و جور اور فتنہ و فساد آشکار و ظاہر ہو جاتا ہے۔

رسولؐ فرماتے ہیں: **لکل شیء آفة یفسده و آفة هذاالدین ولاة السوء** [4]

ہر چیز کے لئے ایک آفت ہے جو اسے خراب کر دیتی ہے اور دین کی آفت برے بادشاہ

---

[1] تفسیر نمونہ ج۱۶ ص۱۹۲ اس میں تفسیر صافی سے منقول ہے
[2] اسراء: ۷۲
[3] الحیاۃ ج۲ ص۴۰۵
[4] نہج الفصاحت حدیث ۲۱۵۵

اور نا ہنجار پیشوا ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام: لیس لھم حرمۃ، صاحب ھوی مبتدع، والامام الجائر، والفاسق المعلن الفسق[1]

تین افراد کا معاشرہ میں کوئی احترام نہیں ہے ایک بدعت گزاری کی ہوس رکھنے والا، دوسرے ظالم راہنما و حاکم تیسرے وہ فاسق جو کھلم کھلا بدکاری کرتا ہے۔

مذکورہ حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرکش حاکم کے وجود سے معاشرہ میں حق نابود اور باطل زندہ ہو جاتا ہے اور معاشرہ میں فتنہ و فساد کا پھوٹ پڑتا ہے۔

طاغوتی نظام، روشنی سے نکلنا اور تاریکی میں داخل ہونا

خداوند عالم قرآن مجید میں فرماتا ہے: والذین کفروا اولیائھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات[2]

جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے سرپرست طاغوت ہیں جو ان کو نور سے نکال کر تاریکی میں کھینچ لے جاتے ہیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اس شخص کا کوئی دین نہیں ہے جو ظالم امام کی ولایت وحکومت کے سایہ میں جاتا ہے اور اس شخص کو کوئی خوف نہیں ہے جو خدا کی طرف سے منصوب عادل امام سے قریب ہوتا ہے، ابن ابی یعفور کہتے ہیں میں نے امام سے دریافت کیا: کیا ان لوگوں کا کوئی دین نہیں ہے اور ان لوگوں کے لئے کوئی خوف نہیں ہے؟ فرمایا: ان کا کوئی دین نہیں ہے اور ان کے لئے کوئی خوف و باک نہیں ہے۔ کیا تم نے خدا کا قول نہیں سنا کہ فرماتا ہے: خدا ان مومنوں کا ولی ہے جو تاریکی سے نکل کر نور و روشنی میں آئے ہیں (لیکن اس کے بر خلاف کافر سرپرست لوگوں کو روشنی و نور سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں)[3]

---

[1] الحیاۃ ج۲ ص۳۹۱ [2] بقرہ: ۲۵۷ [3] الحیاۃ ج۲ ص۴۰۴

علی کی نظر میں خیانت کار حاکم

حضرت علیؑ نے ''اردشیر حرہ'' کے حاکم مصقلہ بن ہبیرہ شیبانی کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے: میں نے تمہارے بارے میں ایک بات سنی ہے اگر تم نے ایسا کیا ہے تو اپنے خدا کو غضبناک کیا اور امامت سے روگردانی کی:

مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم نے اس مال کو، کہ جس کو مسلمانوں نے اپنے نیزوں اور گھوڑوں کے ذریعہ اور اپنا خون بہا کر جمع کیا ہے، اپنے ان عرب رشتہ داروں کے درمیان تقسیم کیا ہے جنھوں نے تم کو منتخب کیا ہے۔ اس خدا کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ اور انسان کو پیدا کیا ہے اگر یہ خبر سچی ہوگی تو تم مجھ سے اچھا سلوک نہیں دیکھو گے اور میرے نزدیک تمہارا کوئی وزن نہیں رہے گا۔ پس اپنے پروردگار کے حق کو حقیر نہ سمجھو اور اپنے دین کو برباد کر کے اپنی دنیا کو آباد نہ کرو کہ گھاٹا اٹھانے والوں میں ہو جاؤ گے۔ [1]

بحار میں اس خط کی عبارت اس طرح ہے:

بیشک امت سے خیانت کرنا بہت بڑی خیانت ہے اور بہت بڑا مکر و حیلہ ہے یہ امام سے خیانت ہے تمہارے پاس مسلمانوں کے حقوق میں سے پانچ سو درہم ہیں، جب تمہارے پاس میرا قاصد آئے تو انہیں میرے پاس بھیج دینا۔ [2]

چونکہ مصقلہ نے مسلمانوں کے مال پر دست تعدی دراز کیا تھا اس لئے حضرت علیؑ نے اسے اس خط میں ملامت و سرزنش کی ہے، حضرت علیؑ کی نظر میں حاکم کا خیانت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

ابوذر کی درخواست کا رد کیا جانا

ابوذر کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے رسولؐ کی خدمت میں عرض کیا: کیا مجھے حکومت کا منصب نہیں دیجئے گا؟ ابوذر کہتے ہیں: آپ نے میرے شانے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابوذر تم ضعیف ہو اور حکومت ایک امانت ہے اور قیامت کے روز یہ شرمندگی اور رسوائی کا باعث ہوگی

---

[1] نہج البلاغہ فیض الاسلام مکتوب: ۴۳ [2] بحار الانوار ۳۳ ص ۴۱۶

مگر اس شخص کے لئے کہ جو اسے حق کے ساتھ لے اور حق کے ساتھ ادا کرے۔ [1]

اس قصہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجودیکہ ابوذر حضرت رسول خدا کے خاص افراد میں سے تھے لیکن رسولؐ ان سے یہ فرماتے ہیں: تمہارے اندر حکومت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ حاکم کے اتنے ہی حقوق کے بیان کرنے پر اکتفاء کی جاتی ہے۔

---

[1] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۱ ص ۳۷۴

استاد کا حق

اما حق سائیسك بالعم فالتعظیم له و التوقیر لمجلسه و حسن الاستماع والیه و الاقبال علیه و المعونة له علی نفسك فیما لا غنی بك عنه من العلم بان تفرغ له عقلك و تحضره فهمك و تزكی له قلبك وتُجلّی له بصرك بترك اللذآت ونقص الشهوات وآن تعلم اِنّك فیما القیٰ (الیك) رسوله الی من لقیك من اهل الجهل فلزمك حسن التادیة عنه الیهم ولا تخنه فی تادیة رسالته و القیام بها عنه اذا تقلك تهاء ولا حول و لاقوة الابالله.

تمہارے اوپر معلم واستاد کا حق یہ ہے کہ اس کی تعظیم کرو اور اس کے درس کی مجلس کا احترام کرو اور اس کے درس کو غور سے سنو اور ہمہ تن گوش اس کی طرف متوجہ رہو، اسکی مدد کرو تا کہ وہ تمہیں اس چیز کی تعلیم دے جس کی تمہیں ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں تم اپنی عقل کو آمادہ کرو اور اپنے فہم وشعور اور دل کو اس کے سپرد کر دو اور لذتوں کو چھوڑ کر اور خواہشوں کو گھٹا کر اپنی نظر کو اس پر مرکوز کر دو تمہیں یہ جان لینا چاہئے کہ جو چیز وہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے اس میں تم اس کے قاصد ہو چنانچہ تمہارے اوپر لازم ہے کہ اس چیز کی تم دوسروں کو تعلیم دو اور اس فرض کو تم بخوبی ادا کرو اور اس کا پیغام پہنچانے میں خیانت نہ کرو اور جس چیز کو تم نے اپنے ذمہ لیا ہے اس پر عمل کرو اور طاقت وقوت صرف خدا کی طرف سے ہے۔

کتاب مکارم الاخلاق میں یہ جملے نقل ہوئے ہیں:

اور استاد کے مقابلہ میں اپنی آواز بلند نہ کرو اور اس سے سوال کرنے والوں میں سے کسی کا جواب نہ دو یہاں تک کہ وہ خود اس کا جواب دے اور اس کی مجلس میں کسی سے بات نہ کرو اور کسی سے اس کی غیبت نہ کرو اور جب تمہارے سامنے اس کا ذکر بدی کے ساتھ کیا جائے تو تم اس کا دفاع کرو اور اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرو اور اس کے دوست سے دشمنی نہ کرو، اگر تم ایسا کرو گے تو خدا کے فرشتے گواہی دیں گے کہ تم نے خدا کا قصد کیا تھا اور تم نے خدا کے واسطہ اس کا علم سیکھا تھا نہ کہ لوگوں کے لئے۔

امام زین العابدینؑ نے معلم واستاد کے جو حقوق بیان کئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ استاد کی تعظیم و تکریم۔

۲۔ تحصیل علم کے سلسلہ میں استاد سے مدد لینا

۳۔ استاد سے علم حاصل کرنے کیلئے دل کو آمادہ کرنا۔

۴۔ اپنی آواز کو استاد کی آواز پر بلند نہ کرنا

۵۔ جب اس سے سوال کیا جائے تو اس سے پہلے جواب نہ دینا

۶۔ استاد کے سامنے کسی سے بات نہ کرنا

۷۔ کسی سے غیبت نہ کرنا

۸۔ اگر استاد کی بدگوئی کی جائے تو اس کا دفاع کرنا

۹۔ اپنے استاد کے عیوب کو چھپانا

۱۰۔ اس کے فضائل و مناقب کو آشکار کرنا

۱۱۔ استاد کے دشمن کے پاس نہ بیٹھنا

۱۲۔ اس کے دوست سے دشمنی نہ کرنا

علم کی اہمیت

معلم و استاد کے حق سے بحث کرنے سے پہلے لازم ہے کہ مختصر طور پر اسلام و قرآن کی نظر میں علم کی اہمیت کو بیان کر دیا جائے علم کی اہمیت تو ہر ایک پر روشن ہے اور ہر شخص فطری طور پر علم کو دوست رکھتا ہے اور علم و عالم کا احترام کرتا ہے۔ رسولؐ پر اولین وحی میں اور مبداء عالم سے ارتباط میں علم کو پیش کیا جاتا ہے:

اقراء باسم ربك الذی خلق۔ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام سے کہ جس نے پیدا کیا۔

رب اور تربیت اور مسئلہ خلقت اہم ترین علوم کے مسائل میں شمار ہوتا ہے، پھر قلم کے ذریعہ تعلیم کو بیان کیا گیا ہے۔ **الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم**[۱] تعلیم: پڑھنا لکھنا اور آخر

---

[۱] علق: ۵

میں یہ کہ انسان کچھ بھی نہیں جانتا تھا یہ اہم موضوع وحی کے آغاز میں انسان کا علم کے بلند ترین مرتبہ پر پہنچنے سے پہلے اور عالم ناسوت سے عالم لاہوت کی طرف پرواز اور خدا تک رسائی کے شروع میں بیان ہوا ہے۔

رسد آدمی به جائی که به جز خدا نبیند　　بنگر تا چه حد است مقام آدمیت

علم و دانش کے بارے میں قرآن مجید انسان کے ضمیر سے فیصلہ چاہتا ہے:

کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ لوگ جو نہیں جانتے دونوں برابر ہیں؟ اس بات کو عقل والے ہی سمجھتے ہیں [۱] (واضح ہے کہ دونوں کو ہرگز کو برابر نہیں سمجھا جاسکتا)

قرآن کہتا ہے: قل لا یستوی الخبیث والطیب - [۲] خبیث و پلید اور پاک و صاف برابر نہیں ہیں۔

وما یستوی الاعمی والبصیر ولا الظلمات ولا الظل ولا الحرور [۳] اور نہ اندھا اور دیکھنے والا اور نہ نور و ظلمت اور نہ سایہ و گرمی برابر ہیں۔ طیب، بصیر، نور و ظل سے مراد علم ہے جیسا کہ خبیث، اعمٰی اور ظلمات و حرور سے مراد جہالت و نادانی ہے۔

قل کفی باللہ شھیدا بینی و بینکم ومن عندہ علم الکتاب [۴] کہہ دیجئے کہ تمہارے اور میرے درمیان خدا اور وہ شخص گواہ ہے جس کے پاس علم کتاب ہے۔ اس آیت میں "عالم" شاہد کے عنوان سے خدا کے ساتھ بیان ہوا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم کو خدا کا تقرب حاصل ہے۔

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات - [۵]

خدا تم میں سے ان لوگوں کے کہ جو ایمان لائے ہیں اور ان لوگوں کے درجات بلند کرتا ہے جن کو علم دیا گیا ہے۔

یہ تھی علم کی اہمیت اور اسکی قدر و قیمت اب معلم کی اہمیت و عظمت ملاحظہ ہو۔

---

[۱] زمر: ۹　　[۲] مائدہ: ۱۰۰　　[۳] فاطر: ۲۰

[۴] رعد: ۴۳　　[۵] مجادلہ: ۱۱

معلم کی اہمیت

رسولؐ خدا فرماتے ہیں: علما کی زیارت وملاقات خدا کے نزدیک خانۂ کعبہ کے ستر طوافوں سے زیادہ محبوب ہے، اور ستر مقبول حج وعمرہ سے افضل ہے، اور خدا علماء کی زیارت کرنے والے کے ستر درجات بلند کرتا ہے اور خدا اس پر رحمت نازل کرتا ہے اور فرشتے یہ گواہی دیتے ہیں کہ اس پر جنت واجب ہوگئی ہے۔ [۱]

اس حدیث میں رسولؐ نے لوگوں کو علماء کے درس میں شریک ہونے کی ترغیب دلائی ہے۔

رسولؐ نے فرمایا: اے ابوذر! عالم کے پاس اس وقت ایک گھنٹہ بیٹھنا جب وہ علمی مذاکرہ میں مشغول ہو خدا کے نزدیک ان ہزار راتوں سے زیادہ محبوب ہے جن میں سے ہر رات میں ہزار رکعت نماز پڑھی ہو۔ اے ابوذر عالم کے پاس بیٹھنا جبکہ وہ علمی مذاکرہ کر رہا ہو خدا کے نزدیک ہزار جنگوں میں شرکت کرنے اور پورے قرآن کی تلاوت کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔ [۲]

رسولؐ کا ارشاد ہے: جو مومن ایک گھنٹہ عالم کے پاس بیٹھتا ہے اسے اس کا پروردگار ندا دیتا ہے تم میرے حبیب کے پاس بیٹھے! قسم ہے مجھے میری عزت وجلال کی میں تمہیں اس کے ساتھ جنت میں جگہ دونگا اور اس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ [۳]

اس بیان میں اس استاد کو خدا کا حبیب ودوست قرار دیا گیا ہے جو علمی مذاکرہ میں مشغول ہو اور اس کا یہ مرتبہ بیان کیا گیا ہے کہ جو طلبہ اس کے درس میں شرکت کرتے ہیں ان سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ البتہ یہ کہنا چاہئے یہ ثواب اس استاد وشاگرد کو ملے گا جو خدا کے لئے درس دے گا اور جو خدا کے لئے درس پڑھے گا۔

استاد کا کردار

امام محمد تقیؑ فرماتے ہیں جو کہنے والے کی بات کو سنتا ہے وہ اس کی پرستش کرتا ہے، اگر کہنے والا خدا کی طرف سے ہوتا ہے تو وہ خدا کی بات کہتا ہے اور سننے والا خدا کی عبادت کرتا ہے اور اگر کہنے والا

۱۔ الحیات ج۲ ص ۲۷۲ ۲۔ ایضا ۳۔ ایضا

شیطان کی زبان سے بولتا ہے تو سننے والا شیطان کی عبادت کرتا ہے۔[۱]

اس حدیث میں بیان کی یہ تاثیر بیان کی گئی ہے کہ اگر سننے والا کہنے والے کو استاد سمجھتا ہے تو وہ اس کی باتوں کو بہت اہمیت دیتا ہے اور کبھی تو اسے وحیٔ منزل سمجھتا ہے۔

مالک اشتر کو علیؑ کی نصیحت

اے مالک علماء کے پاس بیٹھو اور حکماء سے گفتگو کرو اور ملک کے امور کو برقرار رکھنے میں اور جو تم سے پہلے لوگوں نے کیا ہے اسے قائم کرنے میں ان کے بیان سے استفادہ کرو۔

ایک استاد کا کردار

۱۔ عمر بن عبدالعزیزؒ جو کہ بنی امیہ سے تھا، بچوں کے ساتھ کھیلتے وقت حضرت علیؑ پر سب و شتم والی اس رسم بد کو دہراتا تھا جو معاویہ نے جاری کی تھی۔ ایک روز اس کا استاد اس کے پاس سے گزرا اور اس کی زبان سے سب و شتم سنی تو درس کے جلسہ میں اس سے سختی سے پیش آیا جب عمر بن عبدالعزیز نے ناراض ہونے کا سبب معلوم کیا تو معلم نے کہا: بیٹا آج میں نے سنا کہ تم حضرت علیؑ پر سب و شتم کر رہے تھے تمہیں یہ کب معلوم ہوا کہ وہ لعنت کے مستحق ہو گئے تھے؟! عمر بن عبدالعزیز نے استاد سے وعدہ کیا کہ اب ایسا نہیں کرے گا یہ سلوک اس بات کا سبب ہوا کہ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوا تو اس نے اس رسم کو ممنوع قرار دیا اور اس کی جگہ آیہ: ان اللہ یامر بالعدل والاحسان کو پڑھنے کا حکم دیا یہ تھا معلم کے کردار کا معمولی اثر[۲]

جب یزید کا بیٹا معاویہ تخت خلافت پر بیٹھا تو لوگوں کو بلایا اور منبر پر گیا اور خلافت سے استعفیٰ دیدیا اس کی ماں اور مروان نے اس کو بہت سمجھایا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا آخر کار وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ معاویہ نے خلافت سے استعفیٰ کیوں دیا ہے؟ تحقیق کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ معاویہ کی فکر کو بدلنے میں اس کے استاد، عمر المقصوص کا اہم کردار ہے۔ انہوں نے اسے طلب کیا اور اس سے کہا: تم نے

---

[۱] تحف العقول ص ۳۳۶۔ [۲] کامل ابن اثیر ج ۵ ص ۴۲

اس کے دل میں علی کی محبت کو کیوں زندہ کیا؟ اس جرم کی پاداش میں اس کو ایک گڑھے میں زندہ دفن کر دیا۔[1]

یہ ہے معلم کا کردار کہ کسی بھی شخص کی زندگی کی ڈگر کو بدل دیتا ہے جس کے نتیجہ میں قوم کی زندگی کی ڈگر بدل جاتی ہے۔

کس استاد کا انتخاب کریں؟

اس چیز کو خداوند عالم نے قرآن مجید میں ہمارے لئے روشن کر دیا ہے کہ ہم کس استاد سے سبق لیں اور اپنے لئے کیسے استاد کا انتخاب کریں۔

انسان کو اپنے کھانے کو دیکھنا چاہئے ہم نے پانی کو نیچے اتارنے کی طرح نیچے اتارا پھر ہم نے زمین کو شگافتہ کرنے کی طرح شگافتہ کیا پھر ہم نے اس میں دانے اگائے۔

بظاہر یہ آیتیں آدمی کی جسمانی غذا کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ اس میں بارش، شگافتہ کرنا زمین اور اناج کا اگنا بیان ہوا ہے لیکن قرآن و وحی کے عالم ائمہ ھدیٰ نے اسے آیت کو انسان کی معنوی وروحانی غذا پر حمل کیا ہے۔ مرحوم فیض کاشانی تفسیر صافی میں اس طرح نقل کرتے ہیں جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

امام محمد باقرؑ سے خدا کے اس قول **فلینظر الانسان الیٰ طعامه ان صببنا المآ صبًا ثم شققنا الارض شقًا فانبتنا فیها حبًا**[2] کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ طعام کے یہاں کے معنی ہیں؟ فرمایا: اس سے علم مراد ہے یہ خیال رکھنا چاہئے کہ کس استاد سے علم حاصل کر رہے ہو۔

اس کے بعد مرحوم فیض لکھتے ہیں: طعام کی دو قسمیں ہیں جسمانی اور روحانی چونکہ انسان جسم و روح سے مل کر بنا ہے لہذا جس طرح اسے جسمانی غذا کے بارے میں یہ سوچنا چاہئے کہ کس طرح بارش ہوئی، زمین شگافتہ ہوئی اور دانے سخت زمین سے اگے اسی طرح اسے روح و جان کی غذا کے بارے میں غور کرنا چاہئے کہ علم کس طرح وحی کی صورت میں زمینِ نبوت اور قلب پیغمبر پر نازل ہوا ہے اور جن لوگوں

---

[1] حیاۃ الحیوان ج ۱ ص ۸۸

[2] عبس: ۲۴ تا ۲۷

کے دلوں میں تربیت پانے کی قابلیت ہے وہ باران وحی سے کس طرح استفادہ کرتے ہیں اور اس غذا سے مراد یہ ہے کہ اھل بیت صلوات اللہ علیھم اجمعین کی راہ سے علم حاصل کرو۔

واضح ہے کہ جس طرح ناقص وزہریلی غذا آدمی کے بدن پر غلط اثر ڈالتی ہے اور کبھی اسے موت کی منزل تک پہنچا دیتی ہے اسی طرح سنی جانے والی باتیں اور بادی النظر میں بھلی لگنے والی چیز بھی انسان کی فکر کو متاثر کرتی ہیں اور اسے منحرف کر دیتی ہے اور آدمیت کی سعادت وکامیابی کے محل کو ویران کر دیتی ہیں اور انسان کی دنیا وآخرت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم کان اور سنی جانے والی چیزوں کے بارے میں پہلے بیان کر چکے ہیں۔

استاد کے حقوق کی رعایت امام محمد باقرؑ کی نظر میں

حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: جب تم کچھ سننے کے لئے استاد کے سامنے بیٹھو تو تم کہنے سے زیادہ سننے کی حرص کرو اور اچھی طرح سننے کا طریقہ سیکھو جس طرح تم اچھی طرح بولنا سیکھتے ہو اور کسی کے بولتے وقت اس کے کلام کو قطع نہ کرو۔

کسی کے سلسلۂ کلام کو قطع کرنا مذموم اور خلاف اخلاق ہے خصوصا اگر استاد بول رہا ہے تو ادب اقتضا یہ ہے کہ صبر کرو تا کہ استاد کی بات مکمل ہو جائے اس کے بعد اپنی کہو۔ اس حدیث میں امام محمد باقرؑ نے ان بعض حقوق کی طرف اشارہ کیا ہے جو امام زین العابدینؑ نے بیان فرمائے ہیں۔

استاد کا حق حضرت علیؑ کی نظر میں

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں: حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے استاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اس سے زیادہ سوال نہ کرو اس کا لباس نہ پکڑو اس کے پاس جاؤ اور اس کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوں تو تم سب کو سلام کرو اور استاد کو خاص طور پر سب سے الگ سلام کرو اس کے سامنے بیٹھو اس کے پیچھے نہ بیٹھو اور نہ آنکھ سے اشارہ کرو اور نہ ہاتھ سے۔ اس کے سامنے اس کے قول کے خلاف زیادہ بات نہ کرو اور اس

کے پاس زیادہ نہ بیٹھو کہ وہ اکتا جائے، عالم کی مثال تو بس اس پھل دار درخت کی سی ہے جس سے پھل گرنے کی توقع رہتی ہے۔ انسان کو استاد کے ذہن کی طرف نظر رکھنا چاہئے کہ کب اس کے ذہن سے علم کا گوہر نکلے۔[1]

حضرت علیؑ کی اس حدیث میں بھی ان بعض حقوق کی طرف اشارہ ہوا ہے جو امام زین العابدینؑ نے بیان فرمائے ہیں۔ اب ہم ان استاد و شاگرد کا قصہ بیان کرتے ہیں جو خدا کے اولوالعزم پیغمبر ہیں کہ انہوں نے استاد کے حقوق کی رعایت کس طرح کی اور سب کو سوال کرنے اور علم سیکھنے کا سلیقہ سکھایا۔

استاد کا احترام قرآن کی نظر میں

حضرت موسیٰ اور جناب خضر کی دلچسپ داستان قرآن کے سورۂ کہف میں بیان ہوئی ہے حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے کہ استاد تلاش کرو اور جو نہیں جانتے اس سے سیکھو قرآن مجید نے صریح طور پر خضر کا نام نہیں لیا ہے بلکہ "عبدا من عبادنا" کہا ہے یعنی ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ لیکن احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس استاد کا نام خضر ہے۔

موسیٰ اگرچہ کلیم اللہ ہیں صاحب رسالت اور اولوالعزم ہیں اور صاحب شریعت ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہیں یہ حکم ہوتا ہے کہ استاد کے پاس جائیں موسیٰ بنی اسرائیل کے رشید و شجاع یوشع بن نون، کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں اور استاد کو تلاش کرتے ہیں اور اسے پا لیتے ہیں۔

آخرکار موسیٰ اور ان کے ساتھی نے اس استاد کو تلاش کر لیا۔ اس عظیم استاد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عبودیت کے بلند و رفیع مرتبہ پر فائز ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس پر خدا کی طرف سے رحمت کا نزول ہو چکا ہے اور تیسری خصوصیت یہ ہے کہ خدا نے اسے اپنا علم تعلیم کیا ہے۔

یہ تو طے ہے کہ یہ شاگرد بعض باتوں میں استاد سے افضل ہے لیکن استاد ہوتے ہوئے بھی وہ یہ جانتے ہیں کہ انہیں تمام علوم نہیں دیئے گئے ہیں، اس سفر کی مشقت اٹھاتے ہیں تا کہ استاد کے مخصوص علوم سے بہرہ مند ہوں جب استاد سے ملاقات ہوئی تو نہایت ہی ادب کے ساتھ اس طرح گزارش کی:

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۳۷

کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تا کہ آپ مجھے ان حقائق کی تعلیم دیں جو آپ کو سکھائے گئے ہیں؟۔

وہ کہتے ہیں: تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے اور تم اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہو جس کو تم نہیں جانتے؟ موسیٰ نے کہا: انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے حکم کی مخالفت نہیں کرونگا۔

سوال و جواب کے اس سلسلہ میں کچھ آداب نظر آتے ہیں جن کی رعایت کرنا شاگرد کے لئے ضروری ہے:

ا۔ موسیٰ خود کو استاد کا تابع قرار دیتے ہیں لہذا اپنے مرتبے کو استاد کے مرتبہ سے کم جانتے ہیں۔

۲۔ یہ بہت بڑا مبالغہ ہے کہ استفہامیہ انداز میں اجازت چاہتے ہیں (کیا اجازت ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہکر علم حاصل کروں؟ اپنے استاد کے سامنے انتہائی خاکساری کا اظہار کرتے ہیں۔

۳۔ یہ شاگرد خود کو استاد کے سامنے ہیچمداں ظاہر کرتے ہیں اور ''ان تعلمن'' کے ذریعہ اس کے بلند مرتبہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۴۔ استاد کے کے لئے شاگرد کے فریضہ کی طرف اشارہ ہوا ہے: پیروی، تعلیم، خدمت، یعنی شاگرد کو پہلے مرحلہ میں استاد کے تابع ہونا چاہئے تا کہ علوم کے آخری درجہ پر پہنچ سکے۔

۵۔ ''ان تعلمن'' سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موسیٰ صرف طالب علم ہیں، جاہ ومنصب اور مال کے طلبگار نہیں ہیں، یہ اہم نکتہ ہے اس سے تمام طلبہ کو دوران تعلیم استفادہ کرنا چاہئے اور استاد سے علم کے علاوہ اور کسی چیز کی توقع نہیں رکھنا چاہئے۔

۶۔ "مما علمت" موسیٰ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ خضر کے پاس وہ علوم ہیں: جو انہیں خدا نے تعلیم کئے ہیں اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ استاد ایک الٰہی منصب ہے اور انسان نے خدا سے علم لیا ہے۔

۷۔ کلمہ ''رشد'' درخواست وارشاد کی حکایت کر رہا ہے، موسیٰ چاہتے ہیں کہ خضر کے ارشاد و ہدایت سے استفادہ کریں۔

استاد کی باتیں تربیتی نکات

۱۔"انك لن تسطيع معی صبرا" سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے عجلت و بے صبری سے علم حاصل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ علم حاصل کرنے کے لئے انسان کو ہر مشکل کا مقابلہ کرنا چاہئے دوسرے یہ سمجھنا چاہئے کہ صبر کرنے والوں کا بڑا رتبہ ہے۔

۲۔استاد موسیٰ کے صبر کی نفی کر رہے ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ خضر کے کاموں کے فلسفوں کو سمجھنے کے لیے عجلت سے کام نہ لیں۔

۳۔اس سفر کی زحمت کو برداشت کر کے موسیٰ کیا چیز تلاش کر رہے ہیں؟ لائق و شائستہ استاد ڈھونڈ رہے ہیں، اس سے ہمیں یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ اچھا استاد تلاش کرنے کے لئے رنج و مشقت اٹھانا چاہئے جیسا کہ گذشتہ احادیث میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ائمہ نے یہ حکم دیا ہے: ہر شخص سے علم نہ لو بلکہ ہمیں مکتب ولایت سے علم حاصل کرنا چاہئے۔

موسیٰ علمی سفر میں اپنے استاد کے کاموں پر اس وقت اعتراض کرتے ہیں جب استاد کشتی میں سوراخ کرتے ہیں، بچہ کو مار ڈالتے ہیں اور ٹوٹی، پھوٹی دیوار کو بنا دیتے ہیں سب پر موسیٰ اعتراض کرتے ہیں لیکن بعد میں ان کے فلسفہ و اسرار سے واقف ہو جاتے ہیں۔ یہ داستان سورہ کہف میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

استاد کا مرتبہ غزالی کی نظر میں

محمد غزالی کہتے ہیں: انسان جن علوم کو حاصل کرتا ہے ان میں اس کی چار حالتیں ہوتی ہیں جیسے مال جمع کرنے والے کی۔

۱۔مال جمع کرنے کی حالت

۲۔مال ذخیرہ کرنے کی حالت

۳۔مال سے خود استفادہ کرنے کی حالت

۴۔ راہ خدا میں خرچ کرنے اور دوسروں کی مدد کرنے کی حالت یہ مال کسب کرنے والے کی بہترین حالت ہے اسے تخی کہا جاتا ہے۔

عالم بھی پہلے علم حاصل کرتا ہے کسب کنندہ ہے لیکن مال کا نہیں۔ دوسرے علم کو ذخیرہ کرتا ہے تیسرے وہ خود علم سے استفادہ کرتا ہے چوتھے وہ حاصل کئے ہوئے علم کو دوسروں کو تعلیم دیتا ہے یہ حالت سب سے بہترین حالت ہے کہ اس سے وہ معاشرہ کو ہلاکت سے نجات دلاتا ہے۔

یعنی غزالی اس بات کے معتقد ہیں کہ عالم کی بہترین حالت یہ ہے کہ وہ درس دے اور دوسرے اس کے علم سے استفادہ کریں اور وہ لوگوں کو بصیرت وفکری رشد کے طریقے سکھائے۔ [۱]

استاد یا ماہر نفسیات

شاگرد کو چاہئے کہ وہ استاد کو ماہر نفسیات سمجھے جس طرح ڈاکٹر دوا اور علاج کے ذریعہ مریض کو صحت وسلامتی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح استاد بھی شاگرد کو عقل ودین کی سلامتی اور کمال انسانیت کی طرف بلاتا ہے اور اس سلسلہ میں شفا بخش دواؤں، وعظ ونصیحت سے استفادہ کرتا ہے۔ لہٰذا شاگردوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ استاد کی باتوں کو اچھی طرح سنیں تا کہ تعلیم حاصل کرنے کے ضمن میں وہ طمع وتکبر اور غرور ایسے امراض سے نجات پائے۔ [۲]

استاد کی تعظیم علم کی تعظیم ہے

علمائے سلف میں سے ایک عالم جب استاد کے جلسہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوتے تھے تو فقیر کو کچھ صدقہ دیتے تھے اور کہتے تھے: اے اللہ! میری نظر سے میرے استاد کے عیوب کو مخفی رکھ اور ان کے علم ودانش کی برکتوں سے مجھے محروم نہ کر۔

دوسرے عالم کہتے ہیں: میں استاد کی ہیبت کی وجہ سے کتاب کا ورق بھی آہستہ سے کھولتا تھا تا کہ کاغذ کی آواز سے استاد کو تکلیف نہ ہو۔ [۳] البتہ اس قسم کی مراعات اسے شخص سے مربوط ہوتی ہیں

---

[۱] محجۃ البیضاء ج ۱ ص ۱۱۹ [۲] آداب تعلیم وتعلم در اسلام ص ۳۳۳ [۳] ایضا

جس نے خود کو پالیا ہو۔

خویش را صافی کن از اوصاف خود تا ببینی ذات پاک صاف خود

بینی اندر دل علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

بے صحیحین و احادیث و روات بلکہ اندر مشرب آب حیات

حمدان اصفہانی کہتے ہیں: میں ''شریک'' کے پاس موجود تھا کہ اچانک خلیفہ عباسی یعنی مہدی کا بیٹا داخل ہوا اور دیوار سے ٹیک لگا کر استاد سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا۔ لیکن شریک نے اسکی طرف توجہ نہ کی۔ اس نے اپنی بات کی تکرار کی پھر بھی شریک نے کوئی اعتناء نہ کی۔

خلیفہ کے بیٹے نے شریک کو مخاطب کر کے کہا: کیا آپ خلفا کی اولاد کی توہین کرتے ہیں؟ شریک نے کہا: نہیں، مگر یہ کہ علم کا مرتبہ خدا کے نزدیک اس سے کہیں بلند ہے کہ میں اسے دوسروں کے حسب منشاء تباہ کروں۔ خلیفہ کا بیٹا آگے بڑھا اور شریک کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ اس وقت شریک نے کہا: اس طرح علم حاصل کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: شاگرد کو استاد کے سامنے فروتنی کرنا چاہئے: استاد و معلم، روحانی باپ ہے جو شاگرد کو روحی و فکری غذا دیتا ہے اس لئے اس کے اوپر استاد کا احترام لازم ہے۔ یہ غذا استاد قوت سامعہ کے ذریعہ شاگرد کے اندر منتقل کرتا ہے۔ لہذا طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اچھی طرح استاد کی باتیں سنے۔

شاگرد کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ معلم و استاد اس کا علمی باپ شمار ہوتا ہے اور علمی باپ کا احترام جسمی باپ کے احترام سے کم نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ ہے اس لئے اس کی آواز پر آواز بلند نہیں کرنا چاہئے بلکہ استاد کے سامنے باتیں کرنے میں بھی احتیاط کرنا چاہئے۔

شاگرد کو چاہئے کہ وہ استاد کے عیوب کو چھپائے اور اس کے فضائل و خوبیوں کو ظاہر کرنے میں کوشاں رہے۔ اسکندر سے کہا گیا: آپ اپنے استاد کا اتنا احترام کرتے ہیں اسے اپنے ماں باپ سے زیادہ سمجھتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: استاد میری حیات ابدی کا سبب ہے جبکہ ماں، باپ میری دنیوی اور فانی زندگی کا سبب ہیں۔

اجتماعی تکامل کا ایک مرحلہ جو کہ معاشرہ کے حصہ میں آتا ہے، اچھا اور لائق استاد ہے۔ اساتذہ معاشرہ کو زندہ کرنے اور اسے جہالت و نادانی اور فکری وثقافتی لٹیروں سے بچانے کے لئے اٹھے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنا عظیم سرمایہ یعنی اپنی عمر کو قربان کیا ہے، سقراط کو قید کر دیا جاتا ہے تو اس کے شاگرد اسے رہا کرانے کے لئے جان کی بازی لگانے کا اقدام کرتے ہیں لیکن اس نے قانون شکنی پر موت کا جام پینے کو ترجیح دی اور شاگردوں کو اس کی اجازت نہ دی۔

آخر میں ہم امام حسینؑ کے طریقہ کار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ابوعبدالرحمٰن سلمی' نے امام حسین کے کسی بچہ کو سورہ حمد یاد کرایا تو آپ نے اسے ہزار اشرفی اور ہزار جامے عطا کئے اور اس کا منھ موتیوں سے بھر دیا۔ بعض لوگوں نے اس عطا کو زیادہ خیال کیا آپ نے فرمایا: یہ عطا اس کی عطا کا جبران و تلافی نہیں کر سکتی، قرآن کی تعلیم کے عوض جتنا بھی دیا جائے کم ہے۔ [۱]

---

[۱] لولو ومرجان ص ۱۴۴ اس میں مناقب ابن شہر آشوب سے منقول ہے۔

مولا کا حق

واما حق سائیسك بالملك فنحومن سائسك بالسلطان الا ان هذا يملك ما لا يملكه ذاك، تلزمك طاعته فيما دق و جل منك الا ان تخرجك من وجوب حق الله ، و يحول بينك وبين حقه و حقوق الخلق فاذا قضيته رجعت الى حقه فتشاغلت به و لا قوة الا بالله۔

لیکن اس شخص کا حق جو تم پر سلطنت رکھتا ہے (مالک کا حق، بادشاہ کے حق کی مانند ہے)۔

وہ بادشاہ ہی کی مانند ہے مگر یہ کہ مالک خاص حق رکھتا ہے جو بادشاہ نہیں رکھتا اور اس کا یہ مخصوص حق ہر کم وبیش میں تم پر اس کی اطاعت کو لازم کرتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا حق خدا کے واجب حق کے بر خلاف نہ ہو اور تمہارے اور خدا کے حق کے درمیان حائل نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو خدا کا حق مقدم ہے۔ اور جب تم خدا کا حق ادا کر دو گے تو پھر مالک کے حق کی نوبت ہے اس کو ادا کرو۔ خدا کی طاقت وقوت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مکارم الاخلاق میں اس طرح نقل ہوا ہے:

لیکن مالک کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تم اسکی اطاعت کرو اس کی نافرمانی نہ کرو مگر اس چیز میں جو خدا کی ناراضگی وغضب کا باعث ہو کیونکہ خدا کی معصیت میں کسی بندہ کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔

امام زین العابدینؑ کے بیان سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مالک اور بادشاہ کا حق ایک جیسا ہے مگر یہ کہ مالک کا حق اپنے غلام پر زیادہ حق ہے وہ اسے مطیع بنالیتا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حق کی شرح میں یہ بیان کیا جائے کہ غلامی کا آغاز کس زمانہ سے ہوا ہے اوا س کا سرچشمہ کیا ہے؟ البتہ یہاں عام ملکیت مراد ہے صرف غلامی ہی نہیں۔

غلامی کی تاریخ

غلامی کی تاریخ کہاں سے شروع ہوئی ہے یہ واضح نہیں ہے اس کے سرچشمہ کے بارے میں

مختلف نظریات کا اظہار ہوا ہے "مونٹسکیو" غلامی کے عوامل کے بارے میں لکھتا ہے: ممکن ہے غلامی کا عامل درج ذیل عوامل میں سے کوئی ایک ہو:

۱۔ بین الاقوامی قانون یہ رہا ہو کہ جنگی قیدی غلاموں کے حکم میں ہیں تا کہ وہ قتل ہونے سے بچ جائیں۔

۲۔ جو لوگ اپنا قرض ادا نہیں کر سکتے تھے ان کو روم کے قانون نے یہ اجازت دی تھی کہ وہ خود کو فروخت کر کے اپنا قرض ادا کر سکتے ہیں یا قرض خواہ کے قرض کے عوض اس کے غلام بن جائیں۔

۳۔ قانون تبعیت غلام باپ کے بچہ کو بھی غلام بنا دیتا ہے بنا بریں بچہ باپ کے تابع ہے۔

۴۔ غلامی کے حق کا سرچشمہ ایک قوم کا دوسری قوم کو حقیر سمجھنا ہے جس کی بنیاد عادات و رسوم کا اختلاف ہوتا ہے۔

۵۔ اس کا اصلی سرچشمہ انسانی معاشرہ میں قوی و کمزور افراد کا وجود ہے۔

اس کے بعد "مونٹسکیو" لکھتے ہیں:

ارسطو یہ ثابت کرنے چاہتے ہیں: غلام فطرتاً غلام تھا اور رہے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے بعض انسانوں کو غلام پیدا کیا ہے۔ تا کہ وہ دوسروں کے غلام رہیں۔ اگر ہم اس فلسفی کی بات کو قبول کر لیں اور غلامی کو فطری سمجھ لیں تو غلاموں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا بے فائدہ اور فطرت کے خلاف ہوگا۔ یہ تھی وہ تاریخ جو مونٹسکیو نے روح القوانین میں غلامی کی بحث میں تحریر کی ہے۔ [1]

غلامی کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اسلام کے آئین میں غلامی فطری نہیں ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے، ارسطو کی منطق کے خلاف، انسان کو آزاد پیدا کیا گیا ہے:

قال علی علیہ السلام الناس کلھم احرار اِلّامن اقر علیٰ نفسہ بالعبودیۃ۔ [2]

---

[1] روح القوانین ص ۳۰۸۔۳۱۳ [2] اسلام و حقوق بشر، ص ۱۹۸

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: سارے انسانوں کو آزاد پیدا کیا گیا ہے مگر یہ کہ کوئی شخص اپنے خلاف غلامی کا اقرار کرے (یا ایسا کام کرے جس سے غلامی کے اسباب فراہم ہو جائیں)

دوسرے بیان میں فرماتے ہیں:

لا تکن عبد غیرك و قد جعلك الله حرا[1]

دوسروں کے غلام نہ بنو جبکہ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔

یہ تھے انسان کے آزاد ہونے کے سلسلہ میں آپ کے دو اقوال انسان ماں کے شکم سے آزاد پیدا ہوتا ہے غلام بنتا ہے تو خارجی عوامل کی بنا پر بنتا ہے اور اسکی غلامی وقتی ہوتی ہے نہ کہ دائمی، ماضی میں غلاموں پر کیا گزری ہے؟

تاریخ روم کے مولف البر مالہ "غلاموں کے بارے میں رومیوں کے عقیدے کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

قانون کی نظر میں غلام؛ انسان یا آدمی نہیں ہے بلکہ غلام کی حیثیت ایک بے جان چیز یا اس اوزار کی سی ہے جو بات کرسکتا ہے بنابرایں وہ کوئی حق نہیں رکھتا ہے۔[2]

منتسکیو" لکھتا ہے: افلاطون کے قانون میں یہ لکھا تھا کہ غلام اپنا دفاع نہیں کرسکتا چنانچہ جب اس پر حملہ ہوتا تھا تو اس سے اس کے فطری دفاع کے حق کو بھی سلب کرلیا جاتا تھا اور اسے شہری حق بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ وہ عدالت میں حاضر ہو کر شکایت نہیں کرسکتا تھا۔ اسپارٹ میں غلام عدالت میں جا کر اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی شکایت نہیں کرسکتے تھے اسپارٹ کے غلام اتنے مظلوم تھے کہ وہ کسی ایک آدمی کے غلام نہیں بلکہ پورے معاشرہ کے غلام سمجھے جاتے تھے۔[3]

پستی کی انتہا

روم کے شرفاء کی یہ بھی ایک تفریح ہوتی تھی کہ وہ غلاموں اور بھوکے درندوں کو ایک میدان میں چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی درندہ کسی غریب دبے چارہ غلام کو دبوچ لیتا تھا اور وہ فریاد کرتا اور چلاتا

۱۔ نہج البلاغہ مکتوب: ۳۱ ۲۔ اسلام و حقوق بشر ص ۲۰۰ ۳۔ روح القوانین ص ۴۲۶

تھا تو روم کے مالدار خوشی سے اچھل پڑتے تھے۔

اسی طرح ان شریف و نجیب لوگوں کی ایک تفریح یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ غلاموں کی دو جماعتوں میں برہنہ شمشیر کے ساتھ جنگ کراتے تھے تاکہ وہ ایک دوسرے کو زخمی کر کے لہولہان کر دیں اور ظالم مالدار کہ جن کو شرفاء کہا جاتا تھا اس سنسنی خیز منظر کو دیکھکر خوش ہوتے تھے۔ اور اگر غلام اس کام کو انجام دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے تو ان کو وہ سپاہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تھے جو ان کو گھیرے رہتے تھے۔

روم کے شرفاء کی دوسری تفریح یہ تھی کہ وہ غلاموں کو بھڑ، کے چھتے یا بچھوؤں کے جھرمٹ میں ہاتھ ڈالنے پر مجبور کرتے تھے تاکہ ان کے آقا ان کے چہروں کے تشنجات کو دیکھکر مسرور ہوں اور ہنسیں۔ ۱؎

غلام حیوانات کی مانند سخت و مشکل کام کرتے تھے، جیسے خندقوں اور راستوں کو صاف کرنا کانٹوں کو تراشنا باغات میں پھاوڑا چلانا، چراگاہوں سے نقصان دہ گھاس کو اکھاڑنا، گیہوں کو کوٹنا اور بیت الخلاء کو صاف کرنا وغیرہ اگر کوئی غلام ایسا کام کرنے سے انکار کرتا تھا تو اسے سخت سزا بھگتنا پڑتی تھی، کوڑے اور لاٹھیاں کھاتا تھا، قید کر دیا جاتا تھا، اونٹ اور گھوڑے کی مانند چکی میں جوت دیا جاتا تھا، کان کنی میں لگا دیا جاتا تھا، تاریک تہ خانوں میں بند کر دیا جاتا تھا یہاں تک عید کے روز چوپایوں کو کام سے چھٹی مل جاتی تھی لیکن غلاموں کو چھٹی نہیں ملتی تھی۔ ۲؎

اسلام میں غلاموں کی تدریجی آزادی

یہ بات تاریخ کے مسلمات میں سے ہے کہ اسلام نے غلام سازی سے جنگ کی اور غلاموں کو تدریجی طور پر آزاد کیا ہے اگر یہ سوال کیا جائے کہ اسلام نے غلاموں کو تدریجی طور پر کیوں آزاد کیا ہے یکبارگی کیوں نہیں آزاد کیا؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے:

ا۔ جس زمانہ میں اسلام آیا تھا اس زمانہ میں عرب کے تاریک ماحول میں غلامی معاشرہ کے اقتصادی ارکان میں شمار ہوتی تھی اور بہت سے لوگوں کی تجارت اور زندگی غلاموں کی خرید و فروخت ہی سے چلتی تھی لہذا رسول اسلام یکبارگی اس رسم کو بند نہیں کر سکتے کیونکہ اقتصادی نظم و نسق بگڑ جاتا، اس کے

۱؎ اسلام و حقوق بشر ص ۲۰۱ ۲؎ ایضاً منقول از تاریخ روم ص ۱۵۰

علاوہ جن لوگوں نے اپنی ساری ثروت کے غلام خرید رکھے تھے وہ اس رسم کو بند کرنے کے حق میں نہیں تھے کیونکہ کچھ تن پرور اور بیکار لوگ اس کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے تھے اسلام نے پہلے تو لوگوں کے سامنے کام کرنے کے ثواب اور بیکاری و تن پروری کی مذمت کی وضاحت کی اور کام کو اپنی عبادت کا جز قرار دیا اور کام کے نتیجہ کو کام کرنے والے ہی کا حق قرار دیا کہ جس سے بیکار لوگ بھی رفتہ رفتہ کام کرنے لگے اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ دوسروں کے خون پسینہ کی کمائی کو تاراج نہیں کرنا چاہئے۔

۲۔ اگر اسلام غلاموں کو یکبارگی آزاد کر دیتا تو ممکن تھا وہ اپنے اس عقیدہ سے متاثر ہو کر جو کہ ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا خونی انقلاب برپا کر دیتے جس سے امن عالم کو خطرہ لاحق ہو جاتا تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں: "منٹسکیو" یکبارگی غلاموں کو آزاد کرنے کے مفاسد و خرابیوں کے بارے میں لکھتا ہے۔

ایک قانون بنا کر بیشمار غلاموں کو آزاد کرنا بہتر نہیں ہے کیونکہ اس سے معاشرہ کا نظم و نسق درہم و برہم ہو جائیگا وہ کہتا ہے: مثلاً "ولسینی" میں جب غلام آزاد ہوئے اور انہیں الیکشن و انتخابات میں ووٹ دینے کا حق مل گیا اور انہوں نے اکثریت حاصل کر لی تو آزاد شدہ غلاموں نے ایک قانون بنایا کہ آزاد لوگوں میں سے جو بھی شادی کرے گا اس کی دلہن پہلی رات میں کسی غلام کے پاس رہے گی دوسری رات میں اصلی شوہر کے سپرد کی جائے گی۔ [۱]

تیسری دلیل کے طور پر اس بات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو "گوستالوبون" نے لکھی ہے وہ یہ ہے: چونکہ غلاموں نے ایک زمانہ تک غلامی کی زندگی بسر کی ہے اسلئے وہ طفیلی زندگی گزارنے کے سبب ناتجربہ کار اور بے استعداد رہ گئے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام سارے غلاموں کو یک بارگی آزاد کر دیتا تو وہ کافی تجربہ نہ رکھنے کے سبب مستقل طور پر زندگی نہیں گزار سکتے تھے اور وہ امریکہ کے غلاموں کی مانند آزاد ہونے کے بعد مذکورہ علت کے تحت نابود ہو جاتے۔ [۲]

مذکورہ علل کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے یک بارگی غلاموں کو آزاد نہیں کیا بلکہ تدریجی طور پر ان کی آزادی کے اسباب فراہم کئے اب دیکھا جائے کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی اور

---

[۱] روح القوانین ص ۴۲۸ [۲] تاریخ تمدن اسلام و عرب ص ۴۶۷

ان کی رہائی کے لئے کون سے راستے اختیار کیے ہیں پہلے ہم اس راستہ کو بیان کرتے ہیں جس کو اسلام نے قانونی حیثیت دی ہے اور اسلام کی فقہ میں بیان ہوا ہے پھر اخلاقی طریقوں کو بیان کریں گے۔

فقہی نقطۂ نظر سے غلاموں کی آزادی کے طریقے

۱۔ مکاتبہ: ایک معاہدہ ہے جو غلام و مولا کے درمیان ہوتا ہے اور اس میں یہ طے پاتا ہے کہ غلام کچھ پیسہ ادا کرے گا تو آزاد ہو جائیگا اور اگر وہ طے شدہ پیسہ دینے سے عاجز ہوگا تو حاکم شرع بیت المال (سرکاری خزانہ) سے پیسہ دیکر اسے آزاد کرائے گا۔

۲۔ تدبیر: یعنی مولا یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا غلام آزاد ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص اپنے باپ، ماں دادا، دادی، بیٹے پوتے، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی کا آقا و مالک ہو جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتے ہیں۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کے بعض حصہ کو آزاد کرے تو وہ پورا غلام آزاد ہو جائے گا۔

۵۔ اگر کنیز کے شکم سے اس کا بچہ پیدا ہوگا تو وہ آزاد ہو جائے گی۔

۶۔ اگر کوئی غلام بلاد کفر میں اپنے مولا و آقا سے پہلے مسلمان ہو جائے تو وہ آزاد ہے۔

۷۔ اگر مولا اپنے غلام کا کان یا ناک یا کوئی دوسرا عضو کاٹے تو اس سے غلام آزاد ہو جائیگا۔

۸۔ اگر کوئی غلام اندھا مجذوم مبروص، لنگڑا اور اپاہج ہو جائے تو وہ آزاد ہو جائے گا اور اس کے اخراجات بیت المال سے پورے ہونگے۔

۹۔ اگر ایسا مالدار مر جائے کہ جس کے وارث نہ ہوں تو اسکے غلام کو اس کے پیسہ سے خرید کر آزاد کیا جائے گا اور اس کا مال اس آزاد شدہ غلام کو ملے گا۔

۱۰۔ وسائل الشیعہ میں ایک باب قائم کیا ہے کہ جس کی حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومن غلام سات سال خدمت کرنے کے بعد آزاد ہو جاتا ہے۔

۱۱۔ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے ایک، غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا ہے۔

۱۲۔ اگر کوئی شخص اپنی نذر و عہد کو پورا نہ کرے یا قسم توڑ دے یا عمداً اپنا روزہ کو توڑ دے یا غلطی

سے کسی کو قتل کر دے یا ظہار کرے تو اسے کفارہ دینا چاہئے اور کفارات میں سے غلام آزاد کرنا بھی ہے۔ [1]

عملی اور اخلاقی طریقے

دین اسلام نے عملی اور اخلاقی لحاظ سے غلاموں کو آزاد کرنے کا وسیلہ فراہم کیا ہے۔ مثلاً ہم رسولؐ اور ائمہ معصومینؑ کی عملی زندگی کو دیکھتے ہیں:

مورخین لکھتے ہیں: رسولؐ نے متعدد غلاموں کو آزاد کیا ہے جیسے "زید بن حارثہ" پھر یکے بعد دیگر، مسلمانوں نے رسولؐ کی تاسی کی اور غلاموں کو آزاد کیا۔ رسولؐ نے زید بن حارثہ کو آزاد کرنے کے علاوہ زینب بنت جحش کے ساتھ ان کی شادی بھی کر دی کچھ مدت تک انہیں اپنے ساتھ رکھا پھر ان کے بیٹے، اسامہ بن زید کو لشکر اسلام کا سپہ سالار مقرر کیا اور بڑے بڑے مہاجرین و انصار کو ان کے لشکر میں شریک ہونے کا حکم دیا۔

حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے ہزار غلام آزاد کئے۔

جرجی زیدان لکھتے ہیں: عبداللہ بن عمر نے ہزار غلام اور محمد بن سلیمان نے ستر ہزار کنیزیں اور غلام آزاد کئے ہیں۔

اخلاقی دستورات

جو لوگ اپنے غلاموں کو آزاد کرتے ہیں اسلام ان کے لئے اتنی اخروی جزا قرار دیتا ہے جس سے دوسرے مسلمانوں کو اپنے غلاموں کو آزاد کرنے کی تشویق ہوتی ہے۔ سورۂ بلد میں ارشاد ہے:

الم نجعل له عينين و لسانا و شفتين، ولساناو شفتين، وهديناه النجدين، فلا اقتحم العقبة، وما ادريك ما العقبة، فك رقبة، او اطعام فی يوم ذی مسغبة، يتيماذا مقربة، اومسكينا ذا متربة [2]

کیا ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو لب نہیں قرار دیئے اور اسے دو راہوں

---

[1] اسلام و حقوق بشر ص ۲۱۹، جواہر، شرائع اور وسائل [2] بلد: ۸ تا ۱۴

کی ہدایت نہیں کی؟ پھر اس نے مشکل کام کے لئے کیوں قدم نہیں اٹھایا؟ کیا تم جانتے ہو کہ مشکل کام کیا ہے؟ کسی غلام کو آزاد کرنا یا بھوک کے دن میں قریبی یتیم یا خاکسار مسکین کو کھانا کھلانا۔

رسولؐ فرماتے ہیں: جو شخص مسلمان غلام کو آزاد کرے گا خداوند عالم اس کے ہر عضو کے عوض آزاد کرنے والے کے اعضاء کو جہنم کی آگ سے آزاد کرے گا۔

امام رضاؑ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جس نے اپنا غلام آزاد کیا تھا: خداوند عالم اس کے ہر عضو کے عوض آزاد کرنے والے کے عضو کو آزاد کرے گا۔

آخر میں ہم امام زین العابدینؑ کے اس قول کو نقل کرتے ہیں جو اس زمانہ سے مربوط ہے کہ جس میں غلام ابھی آزاد نہ ہوا ہو اور اس پر اس کے مولا کا ایسا حق ہو جیسا کہ بیان ہوا ہے۔ یہ بحث وسیع ہے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ماتحتوں کے حقوق

لوگوں کے حقوق

واما حقوق رعيتك بالسلطان فان تعلم انك انما استرعيتهم بفضل قوتك عليهم فانّه انّما احلهم محل الرعية لك ضعفهم و ذلهم ، فما اولىٰ من كفاكه ضعفه و ذله حتى صيره لك رعية و صير حكمك عليه نافذا ،لايمتنع منك بعزّة ولا قوة ولا يستنصر فيما تعاظمه منك الا (بالله) بالرحمة والحياطة والاناة، وما اولاك اذا عرفت ما اعطاك اللّه من فضل هذه فالعزة والقوّة التى قهرت بها ان تكون لله شاكرا ومن شكر الله اعطاه فيما انعم عليه ولا قوة الا بالله۔

لیکن جب رعیت پر تمہاری حکومت ہو تو اس وقت تمہارے اوپر اس کے یہ حقوق ہیں، تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تم نے اپنی زیادہ طاقت سے انہیں اپنی رعیت بنالیا ہے تو یہ ان کی کمزوری وعاجزی تھی جس نے انہیں رعیت کی جگہ پہنچادیا تو اس کا کیا حق ہے کہ جس کے ضعف وذلت نے تمہیں اتنا بے نیاز کر دیا کہ اسے تمہاری رعیت بنا دیا اور اس پر تمہارے حکم کو نافذ کر دیا، اب وہ اپنی طاقت وعزت کے ساتھ تمہارے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا، اسے تمہارے ترحم وحمایت اور صبر وتسلی کے علاوہ تمہاری جو بات ناگوار گزرتی ہے تو اس میں وہ خدا ہی سے مدد چاہتا ہے اور جب تمہیں یہ معلوم ہو کہ خدا نے تمہیں کتنی عزت و قوت عطا کی ہے کہ جس کے ذریعہ تم دوسروں پر غالب آگئے تو اس وقت تمہارا کیا فریضہ ہے؟ سوائے اس کے کہ تم خدا کے شکر گزار ہو جاؤ اور جو خدا کا شکر ادا کرتا ہے خدا اس کو زیادہ نعمت عطا کرتا ہے۔ اور خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مکارم الاخلاق میں اس طرح تحریر ہے:

لیکن جو لوگ تمہارے زیر تسلط ہیں ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنی کمزوری اور تمہاری طاقت کی وجہ سے تمہاری رعیت بن گئے ہیں؛ پس تمہارے اوپر واجب ہے کہ ان کے

درمیان عدل کرو اور ان کے لئے مہربان باپ جیسے بن جاؤ اور ان سے بھولے سے جو غلطی ہو جائے تو اسے معاف کر دو اور ان کے کسی غلط کام کی سزا دینے میں جلدی نہ کرو اور خدا نے ان پر جو قوت تمہیں دی ہے اس کا شکر ادا کرو۔

امام زین العابدینؑ بادشاہ کے حق کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: رعیت کو اس کا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہئے اس سے دشمنی نہیں کرنا چاہئے اور اس کے حق کے مقابلہ میں فرماتے ہیں: اور بادشاہ کو جو قوت و غلبہ حاصل ہے اس کے سبب اسے عدل سے کام لینا چاہئے اور رعیت کا پورا خیال رکھنا چاہئے: اس حق میں امام زین العابدینؑ نے چند اہم موضوع بیان فرمائے ہیں۔ اول؛ بادشاہ کا عادل ہونا دوسرے؛ بادشاہ کا مہربان باپ کی مانند ہونا، تیسرے؛ رعیت سے لغزش اور خطا ہوتی ہے اسے معاف کرنا۔ چوتھے: خدا نے جو تمہیں طاقت و غلبہ عطا کیا ہے اس کا شکر ادا کرنا۔

قائد کو عادل ہونا چاہئے

لوگ اس شخص کو عادل کہتے ہیں جو اپنی حکومت کے زمانہ میں کسی کے لئے برا ارادہ نہیں کرتا، دوسروں کے حقوق کو غصب نہیں کرتا اور ان کے درمیاں طبقاتیت کا قائل نہیں ہوتا اور اپنی حکومت کے زمانہ سب کو ایک نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو شخص دوسروں کے حقوق کو غصب کرتا ہے اور جہاں تک اس کی حکومت ہے وہاں تک وہ لوگوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتا؛ ظالموں کا ساتھ دیتا ہے اور کمزور و مظلوم کو کچلتا ہے تو اسے ظالم کہتے ہیں۔

بنا بر ایں یہ کہا جا سکتا ہے: ہر صاحب حق کو اس کا حق دینے کو بشری معاشرہ کی اجتماعی عدالت کہا جاتا ہے کہ جس کی بشری قانون میں رعایت ہونا چاہیے۔ مولوی اپنے مشہور اشعار میں کہتے ہیں:

عدل چه بود ؟ وضع اندر موضعش   ظلم چه بود؟ وضع در نا موضعش

عدل چه بود؟ آب ده اشجار را   ظلم چه بود ؟ آب دادن خار را

خواجہ نصیر الدین نے ایک رباعی میں، کہ جس کو ریاض العارفین میں نقل کیا ہے، کہا ہے:

جز حکم حقی که حکم را شاید نیست   حکمی که ز حکم حق فزون آید نیست

آن چیز که هست آنچنان می باید ، آن چیز که آنچنان نمی باید نیست

خدا نے سارے انسانوں کو عدل کرنے کی دعوت دی ہے: ان اللہ یامر بالعدل والاحسان [1] بیشک خدا عدل واحسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

رسول نے فرمایا: الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم [2]
بادشاہت کفر کے ساتھ باقی رہتی ہے لیکن ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔

رسول نے فرمایا: عدل ساعة خير من عبادة ستين سنة .
ایک ساعت کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

جود اور عدل کا فرق

جود وعدل کے فرق کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا بہترین قول ہے، جب آپ سے سوال کیا گیا: عدل بہتر ہے یا سخاوت و بخشش؟ تو آپ نے فرمایا:

عدل چیزوں کو ان کی جگہ پر رکھتا ہے اور بخششیں انہیں ان کی جگہ سے باہر نکالتی ہے (حق استحقاق سے زیادہ دیتا ہے) عدل سب کا خیال رکھتا ہے جبکہ جود کسی خاص فرد سے متعلق ہوتا ہے پس عدل زیادہ افضل وبرتر ہے۔

انبیاء اور دعوت عدل

معاشرۂ انسانی کے لئے مبعوث ہونے والے انبیاء نے آدمی کے کمال وسعادت کو اخلاق و عدل کے کمال کے سایہ میں جانا ہے ہم یہاں عدل کے بارے میں نازل ہونے والی آیتوں میں سے بعض آیتیں نقل کرتے ہیں:

ا۔ یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی واتقوا اللہ انّ اللہ خبیر بما

[1] نحل: ۹۰ [2] رسالۃ الحقوق قبانچی ج ا ص ۳۸۵

تعملون [۱]

اے ایمان والو! خدا کے لئے قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو خبر دار کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو عدل و انصاف کرو کہ یہ تقوے سے زیادہ قریب ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو بیشک خدا تمہارے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے۔

اسلام میں جتنی اہمیت عدل کو دی گئی ہے اتنی اہمیت شاید ہی کسی مسئلہ کو دی گئی ہو کیونکہ عدل بھی توحید کی مانند اسلام کے تمام اصول و فروع میں پھیلا ہوا ہے۔ جس طرح عقیدتی و عملی، فردی و اجتماعی اور اخلاقی و حقوقی مسائل خدا کی توحید و وحدانیت سے جدا نہیں ہیں اسی طرح ان میں سے کوئی بھی عدل سے الگ نہیں ہے لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ عدل کو اصول مذہب اور مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔

اس آیت میں جس موضوع کو اہمیت دی گئی ہے وہ عدل و انصاف سے انحراف ہے۔ مسلمانوں کو خبر دار کیا جا رہا ہے کہ کینہ توزی، قومی تعصب اور نجی حساب کی بے باقی ایسی چیز ہے جو عدل نہیں کرنے دیتی اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے کا سبب ہوتی ہے اور عدالت ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔

قول میں عدل

۲۔ ولا تقربوا مال اليتيم الا بالتي هي احسن حتى يبلغ اشده و اوفوا الكيل والميزان بالقسط لا نكلف نفسا الا وسعها واذا قلتم فاعدلوا ولو كان ذا قربى و بعهد الله اوفوا ذلكم و صاكم به لعلكم تذكرون۔ [۲]

اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر بہتر طریقہ سے یہاں تک کہ وہ رشید و توانا ہو جائے اور ناپ تول میں پورا پورا دو اور ہم کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے ہیں اور جب تم کوئی بات کہو تو انصاف کو ملحوظ رکھو خواہ اپنے عزیز کے خلاف ہی ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو اسی کی تم کو وصیت کی

---

[۱] مائدہ : ۸ [۲] انعام: ۱۵۲

ہے کہ شاید تم عبرت حاصل کر سکو۔

اس آیت میں خداوند عالم یتیم کے مال کے سرپرستوں، فروخت کرنے والوں اور تولنے والوں کو عدل کی دعوت دیتا ہے بلکہ بات کہنے میں عدل کا خیال رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ بنابرایں آیت میں قول میں عدل، معاملہ میں عدل اور معاشرہ کے بے سرپرست لوگوں کے ساتھ عدل کرنے پر زور دیا ہے۔

یتیم کے مال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے قریب نہ جاؤ ایسے ہی قرآن میں بعض گناہوں کے بارے میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ ان گناہوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے جو وسوسہ انگیز ہیں جیسے زنا، بدکاری اور یتیموں کا مال، ان کے بارے میں لوگوں کو خبردار کیا جارہا ہے کہ ان کے قریب نہ جاؤ تاکہ وسوسوں کی زد میں نہ آؤ۔

حکومت میں عدل

۳۔ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الأمانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا بصیرا۔ [۱]

بیشک خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں تک پہنچا دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ و حکم کرو تو عدل کے ساتھ کرو بیشک خدا تمہیں بہترین چیز کی نصیحت و وعظ کرتا ہے۔ یقیناً خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں امانت کو اس کے اہل کے سپرد کرنے کے بعد حکومت میں عدل کا مسئلہ بیان ہوا ہے اور حکومت میں عدل کے مسئلہ کو امر کے پہلو کے علاوہ اسے بہترین وعظ و نصیحت قرار دیا گیا ہے یہ بیان ہوا ہے کہ خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاکم کو یہ جان لینا چاہئے کہ خدا اس کے ہر قول و فعل کو دیکھ رہا ہے۔

دوسری آیت میں عدل و احسان کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے:

۱۔ نساء : ۵۸

۴۔ان الله یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربی و ینهی عن الفحشاء والمنکر و البغی یعظکم لعلکم تذکرون۔ [۱]

بیشک خداوند عالم عدل واحسان کا حکم دیتا ہے اور قرابت داروں کو ان کا حق دینے کا حکم دیتا ہے بدکاری اور برائی اور تجاوز وسرکشی سے روکتا ہے ان چیزوں کے بارے میں خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

۵۔ یا داؤد ان جعلناک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الهوی فیضلک عن سبیل الله ان الذین یضلون عن سبیل الله لهم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب [۲]

اے داؤد ہم نے تمہیں روئے زمین پر خلیفہ بنایا ہے پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں راہ خدا سے ہٹا دے گی بیشک جو لوگ راہ خدا سے بھٹک جاتے ہیں وہ روز حساب کو بھول جاتے ہیں اسلئے ان کے لئے شدید عذاب ہے۔

اس آیت میں پہلے تو یہ بیان ہوا ہے کہ داؤد کو خدا نے خلیفہ بنایا ہے دوسرے عدل سے منحرف ہونا تیسرے یہ کہ عدل کی ایک آفت خواہش نفس کی پیروی ہے اور گمراہیاں روز حساب کو فراموش کرنے کا نتیجہ ہیں۔

ان پانچ آیتوں کو ہم نے نمونہ کے طور پر نقل کیا ہے کہ عدل کتنا اہم موضوع ہے اور اسلامی حاکم کو معاشرہ کے تمام افراد کے ساتھ عدل کرنا چاہئے اب ہم احادیث کی روشنی میں عدل کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں نمونے کے طور پر درج ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں:

ابو علی اشعری نے حسن بن علی کوفی سے انہوں نے عبیس بن ہشام سے انہوں نے عبدالکریم سے انہوں نے حلبی سے انہوں نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: عدل اس پانی سے بھی زیادہ خوشگوار ہے جو پیاسے کو ملتا ہے اگر عدل سے کام لیا جائے تو اس کا دامن بہت وسیع ہے اگرچہ اس کے موارد کم ہیں۔

---

[۱] نحل: ۹۰ [۲] ص: ۲۶

حسن بن علی نے ابن محبوب سے انہوں نے معاویہ بن وہب سے انہوں نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: عدل شہد سے زیادہ شیریں ہے اور مکھن سے زیادہ نرم ہے اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔

معن لایحضرہ الفقیہ میں اپنی اسناد سے ابن ابی یعفور سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابن ابی یعفور سے عرض کی: مرد کی عدالت مسلمانوں کے درمیان کس چیز کے ذریعہ پہچانی جاتی ہے تا کہ ان کے حق میں یا ان کے خلاف اس کی گواہی قبول کی جاسکے؟ آپ نے فرمایا: وہ شرم گاہ کو چھپانے، پاک دامنی اختیار کرنے اور شکم و شرم گاہ کو حرام سے بچانے، زبان و ہاتھ پر قابو رکھنے اور شراب خوری، زنا کاری، سود خوری، والدین کی نافرمانی اور محاذ جنگ سے بھاگنے کے گناہوں سے پرہیز کرنے سے پہچانی جاتی ہے کہ جن پر خدا نے عذاب دینے کا وعدہ کیا ہے، ان تین حدیثوں میں عدل کی اہمیت بیان ہوئی ہے۔

حاکم اور لوگوں کے ایک دوسرے پر حقوق

اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

اے لوگو! تم پر میرا ایک حق ہے اور تمہارا بھی مجھ پر ایک حق ہے میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہیں نصیحت کروں اور تمہاری غنیمت و فئی کو مساوی طور پر تمہارے درمیان تقسیم کروں اور تمہیں تعلیم دوں تا کہ تم نادان نہ رہو اور تمہاری تربیت کرنا ہے تا کہ تم سیکھ لو اور تمہارے اوپر میرا حق یہ ہے کہ تم بیعت پر باقی و ثابت رہو اور پوشیدہ و آشکارا طور پر خیر خواہ رہو اور جب میں تمہیں پکاروں تو لبیک کہو اور جب تمہیں حکم دوں تو اطاعت کرو۔

حاکم و محکوم کے اس حق میں آپ نے معاشرہ میں نصیحت و موعظت اور اس کے مالی و اقتصادی مسائل، تعلیم و تربیت اور انسانوں کی پرورش کی طرف اشارہ کیا ہے. حاکم پر واجب ہے کہ وہ معاشرہ کی مالی حالت اور لوگوں کی تعلیم کا ہر لحاظ سے بندوبست کرے لیکن معاشرے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ حاکم کی بیعت پر باقی رہیں اور ظاہر و باطن میں اس کے خیر خواہ رہیں اس کی آواز پر لبیک کہیں اور اس کے حکم کے

تابع رہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

خداوند عالم نے ان حقوق میں سے جو سب سے بڑا حق واجب کیا ہے وہ حاکم کا حق ہے جو رعیت پر اور رعیت کا حاکم پر حق ہے یہ ایک واجب عمل ہے جو خدا نے ہر ایک کے لئے دوسروں پر واجب کیا ہے اور ان حقوق کی رعایت کو ان کی الفت ومحبت اور ان کے دین کی عزت قرار دیا ہے اور رعیت کے امور کی اصلاح نہیں ہوسکتی مگر ان کے ولی وحاکم کے صالح ہونے سے اور حاکم کی اصلاح نہیں ہوسکتی مگر رعیت کی ثابت قدمی سے اگر یہ دونوں ایک دوسرے کا حق ادا کریں تو ان کے درمیان حق عزیز ہوجائے اور دین کے طریقے قائم ہوجائیں اور عدل کے نشان استوار ہوجائیں اور سنت الٰہی اپنی ڈگر پر جاری ہوجائے ان حقوق واصول کی رعایت سے زمانہ کی اصلاح ہوجائے اور حکومت زیادہ باقی رہے اور دشمنوں کی امیدیں یاس میں بدل جائیں۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

لیکن اگر رعیت حاکم کے حکم کی اعتنا نہ کرے یا حاکم رعیت پر ظلم کرے تو اس وقت اختلاف ہو جائیگا اور ظلم وستم کی نشانیاں ظاہر ہوجائیں گی اور دین میں ایسی چیزیں داخل ہوجائیں گی جو دین کی تباہی کا سبب ہوتی ہیں اور سنت الٰہی اپنی ڈگر سے ہٹ جائیں گی اور ہواوہوس پر عمل ہوگا اور احکام کو چھوڑ دیا جائیگا ۔فردی واجتماعی امراض پھیل جائیں گے پھر چھوڑے گئے حقوق کی عظمت کا کوئی خوف نہیں رہیگا اور بڑے گناہوں کی برائی ختم ہوجائیگی نتیجہ میں نیک لوگ ذلیل اور شر پسند لوگ معزز ہونگے اور بندوں کے مشکلات خدا کے نزدیک عظیم ہونگے۔

اس خطبہ میں حضرت علیؑ حکومت کی بقا ودوام اور حاکم ورعیت کی صلح وصفائی اور اس کے نتیجہ میں معاشرہ کی کامیابی وسعادت کو بیان فرماتے ہیں اور اس خطبہ کے دوسرے جز میں، حکومت کے سقوط و نابودی اور معاشرہ میں اکرام وامن کا فقدان معاشرہ سے شریف ونیک لوگوں کے نکلنے اور معاشرہ پر شر پسند لوگوں کے مسلط ہونے اور نتیجہ میں دین کی نشانیوں کے مٹنے اور ضلالت وگمراہی کے پرچم کے بلند ہونے اور معاشرہ کی تباہی کو بیان کرتے ہیں۔

حضرت علیؑ سرحد کی حفاظت کرنے والوں کو ایک خط میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں؛

اما بعد فان حقا علی الوالی ان لا یغیرہ علی رعیته فضل ناله، ولا طول خص به و ان یزیدہ ما قسم اللّٰه له من نعمة دنوا من عبادہ و عطفا علی اخوانه۔[1]

اما بعد والی وحاکم کا ہر ایک کی گردن پر جو حق ہے وہ یہ ہے کہ اسے رعیت پر جو فضیلت حاصل ہے اس سے رعیت کو محروم نہ کرے اسے نہ بدلے اور اسے جو مخصوص نعمت ملتی ہے اس سے رعیت کو بھی نوازے اور جو نعمت خدا نے اس کے نصیب میں لکھی ہے اس میں سے اس کے بندوں کو بھی دے اور اپنے بھائیوں پر لطف وکرم کرے۔

حضرت علیؑ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے آپ خود بھی اس پر عمل فرماتے تھے حقیقت یہ ہے آپ کی حکومت، عدل کی حکومت تھی آپ معاشرہ کیلئے مہربان باپ تھے فرماتے تھے: اقنع نفسی بان یقال امیر المومنین، ولا اشارکھم فی مکارہ الدھر۔[2] کیا میں اسی پر قناعت کرلوں کہ مجھے امیر المومنین کہا جائے اور میں ان پر پڑنے والی زمانہ کی سختیوں میں ان کا شریک نہ بنوں؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

حضرت امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: حاکم کو معاشرہ کے لئے مہربان باپ کی مانند ہونا چاہئے تاکہ وہ ان کو اپنی اولاد سمجھے اور ان کے درمیان مساوات قائم کرے ایسا حضرت علیؑ کی حکومت کے دوران ہوا ہے جیسا کہ آپ نے مالک اشتر کے نام اپنے مشہور خط میں تحریر کیا ہے:

اور رعیت کے لئے اپنے دل کو نرم ومہربان بناؤ ان کے لئے درندہ نہ بنو کہ جو ان کو چٹ کر جانے کو غنیمت سمجھتا ہے کیونکہ لوگوں کی قسمیں ہیں یا تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں یا وہ خلقت و پیدائش کے لحاظ سے تمہیں جیسے انسان ہیں۔

حضرت امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: رعیت اور عوام دونوں سے لغزش ہوتی ہے حاکم کو اس سے چشم پوشی کرنا چاہیے اور انہیں معاف کردینا چاہئے حضرت علیؑ مالک اشتر کو لکھتے ہیں:

---

[1] نہج البلاغہ (فیض الاسلام) نامہ ۵۰ [2] نہج البلاغہ (صبحی صالح) نامہ ۴۵

فان فی الناس عیوبا الوالی احق من سترها، فلا تکشفن عما غاب عنك منها فانما علیك تطهیر ما ظهر لك۔

بیشک لوگوں میں عیب ہوتے ہیں اور حاکم ان کو چھپانے کا زیادہ حقدار و سزاوار ہے اور ان کے ان عیوب کی ٹوہ میں نہ لگو جوتم پر پوشیدہ ہیں تمہارا کام تو بس اس چیز پر پردہ ڈالنا ہے جوتم پر آشکار ہوگئی ہے۔

ان جملوں میں جان بوجھکر غافل بننے اور لوگوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنے کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور یہ ان صفات میں سے ہے جن سے حاکم اور معاشرہ کے سربراہ کو متصف ہونا چاہئے۔

رعیت کے حق کے آخر میں امام زین العابدینؑ ایک اور موضوع کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور وہ ہے کہ حاکم کو اس کا نعمت کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اسے لوگوں پر حکومت حاصل ہے اور اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا کچھ نہیں ہے یہ اقتدار اسے خدا نے عطا کیا ہے وہ تو ایک حقیر و کمزور بندہ ہے۔ حضرت علیؑ مالک اشتر کو حکم دیتے ہیں: اگر تم اپنی حکومت کے عہد میں اپنے اندر غرور و تکبر کا احساس کرو تو خدا کی عظمت و بزرگی کا خیال کرو کہ سب کچھ اسی کا ہے یہ حکومت تمہیں اس لئے دی ہے تا کہ تمہیں آزمایا جائے بہتر ہے کہ حاکم خدا کی اس نعمت کا شکریہ ادا کرتا رہے۔

شاگرد کا حق

واما حق رعيتك بالعلم فان تعلم ان الله قد جعلك لهم فيما آتاك من العلم، وولاك من خزانة الحكمة، فان احسنت فيما ولاك الله من ذلك و قمت به لهم مقام الخازن الشفيق الناصح لمولاه فى عبيده ، الصابر المحتسب الذى اذا راى ذا حاجة اخرج له من الاموال التى فى يديه كنت راشدا و كنت لذلك آملا معتقدا ، والا كنت له خائنا ولخلقه ظالما و لسلبه و عزه متعرضا۔

لیکن تمہاری علمی رعیت، شاگردوں، کا حق یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ خدا نے تمہیں جو علم عطا کیا ہے اور حکمت کا جو خزانہ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں شاگردوں کا سرپرست بنایا ہے پھر اگر تم نے اس سرپرستی کے حق کو اچھی طرح ادا کر دیا اور ان کے لئے مہربان خزانچی اور خیر خواہ مولا قرار پائے جو کہ صابر خدا خواہ ہے جب وہ کسی ضرورت مند کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے پاس موجود اموال میں سے اسے دیتا ہے تم رشد یافتہ اور باایمان خادم ہو ورنہ خدا کے خیانت کار اور اس کی مخلوق کے لئے ظالم اور عزت و نعمت کے سلب ہونے کا سبب ہو۔

اور مکارم الاخلاق میں کچھ اس طرح تحریر ہے:

پھر اگر تم لوگوں کو تعلیم دینے میں نیکی کرو گے اور ان کے ساتھ سختی و بدخلقی سے پیش نہیں آؤ گے تو خدا اپنے لطف و کرم سے تمہارے علم میں اضافہ کرے گا اور اگر تم لوگوں کو اپنے علم سے محروم کرو گے اور سبق لیتے وقت ان کے ساتھ سختی و بدخلقی سے پیش آؤ گے تو خدا کو یہ حق ہے کہ وہ تم سے علم چھین لے اور لوگوں کے دلوں سے تمہاری عظمت و منزلت کو ختم کر دے۔

اس عبارت میں امام زین العابدینؑ نے درج ذیل حقوق کی طرف اشارہ فرمایا:

۱۔ جو علم و حکمت استاد نے حاصل کیا ہے وہ خدا کے لطف و عنایات سے حاصل کیا ہے۔ ذاتی طور پر اس کا کچھ نہیں بھی ہے، یہ چیز استاد کے علمی غرور کو برطرف کرتی ہے۔

۲۔ اس علم و حکمت میں استاد دوسروں کا خزانچی ہے اور اس علم و حکمت کو تقسیم کرتے وقت اسے

مہربانی وخندہ پیشانی سے پیش آنا چاہئے۔

۳۔امام زین العابدینؑ استاد کو علم وحکمت کا خزانہ دار سمجھتے ہیں اور علم کے خزانے کو خرچ کرنے کو مال خرچ کرنے کے برابر سمجھتے ہیں کہ اس میں کنجوسی نہیں کرنا چاہئے۔

۴۔اگر استاد اپنے فریضہ کو ادا کرتا ہے تو اس کی مثال اس امانت دار کی سی ہے جو امانت کو بچانے اور اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اپنے فریضہ پر عمل نہیں کرتا ہے تو اس کی مثال خیانت کار لوگوں کی سی ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور انہیں ان کی عزت وحقوق سے محروم رکھتے ہیں۔

استاد کو چاہئے کہ وہ طلبہ کو شائستہ اور بہترین طریقہ سے تعلیم دے تا کہ ان کے دل میں علم کا شوق پیدا ہو استاد کی سختی وبد خلقی اور غصہ سے طلبہ کی امنگ پر اوس پڑ جاتی ہے کبھی تو وہ انہیں باتوں کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ استاد اپنے اس عمل کے ذریعہ اپنے علم وحکمت کا ذخیرہ اندوز بن جاتا ہے اور شاگردوں کو علم سکھانے میں بخل کرتا ہے۔

استاد کے خصوصیات

ایک بہترین استاد اور اچھا معلم وہی ہے کہ جس میں استادی، تدریسی اور شاگرد سے اچھی طرح پیش آنے کے خصوصیات ہوں شائستہ استاد اور لائق استاد وہ ہے جو درج ذیل خصوصیات کا حامل ہے:

۱۔بہترین استاد وہ ہے کہ جو اہلیت وقابلیت پیدا کرنے سے پہلے مسند درس پر نہ بیٹھے اس سلسلہ میں اس منزل پر پہنچ جائے کہ نیک وشریف لوگ اس کے استاد ہونے کی تصدیق کریں۔

۲۔ذلت وحقارت کا باعث نہ ہو یعنی نا اہل لوگوں کو علم نہ دیں۔

۳۔استاد اپنے علم پر بھرپور طریقہ سے عمل کرے اور اس کے وجود سے علم کی روشنی حاصل کی جاتی ہو اگر اس کے اندر یہ خصوصیات نہ ہوں تو وہ اس آیت کا مصداق ہوگا: اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم[1] کیا تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو۔

---

[1] بقرہ: ۴۴

انما یخشی الله من عباده العلماء[1] کے بارے میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

من صدق فعله قوله و من لم یصدق قوله فعله فلیس بعالم[2] عالم وہ ہے جس کا فعل اس کے قول کے مطابق ہو اور جس کا قول اس کے فعل کی تصدیق نہ کرے وہ عالم نہیں ہے۔

۴۔ استاد کا حسن خلق سے پیش آنا اور نرمی و محبت کے ساتھ تعلیم دینا۔ علماء کے بارے میں رسولؐ فرماتے ہیں: علماء امتی کا نبیاء بنی اسرائیل[3] میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء جیسے ہیں جس طرح وہ درجہ نبوت پر فائز ہوتے ہوئے حسن خلق سے پیش آتے تھے، تبلیغ میں حسن خلق کا مظاہرہ کرنا لازمی ہے اساتذہ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

۵۔ کسی کو تعلیم نہ دینے کا یہ بہانہ نہ بنائے کہ وہ خلوص نیت کا حامل نہیں ہے بلکہ اسے برداشت کرے اور تعلیم کے دوران آہستہ آہستہ اس کے اندر خلوص پیدا کرے کیونکہ اگر علم کے ساتھ خلوص نہ ہوگا تو حضرت علیؑ فرماتے ہیں: ہیرے جواہرات کا گلوبند ہے جو سور کے گلے میں ڈالدیا گیا ہے۔[4]

۶۔ جب دل تیار ہوں اور قابلیت پائی جاتی ہو تو علم دینے سے دریغ نہ کرے کہ جابر جعفی نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

زکوٰة العلم ان تعلمه عباد الله[5] علم کی زکوٰة یہ ہے کہ تم خدا کے بندوں کو اس کی تعلیم دو۔

۷۔ معلم و استاد کے افعال و کردار اس کے قول کے خلاف نہ ہوں؛ مثلاً کسی چیز کو حرام سمجھتا ہے اور اسی کو انجام بھی دیتا ہے۔

۸۔ اپنی طاقت کے مطابق اظہار حق کرتا ہو اور سستی نہ کرتا ہو: رسولؐ فرماتے ہیں:

اذا ظهرت البدع فی امتی فلیظهر العالم علمه فمن لم یفعل فعلیه لعنة الله[6]

جب میری امت میں بدعت اور خلاف واقع باتیں ظاہر ہونے لگیں تو عالم پر واجب ہے کہ وہ

---

[1] فاطر: ۲۸ [2] اصول کافی ج ۱ ص ۳۶ [3] منیۃ المرید ص ۱۸۲
[4] ایضا ۱۸۲ [5] اصول کافی ج ۱ ص ۴۱ [6] ایضا ج ۱ ص ۵۴

اپنے علم کو ظاہر کرے اور اگر ایسا نہ کرے تو اس پر خدا کی لعنت۔

شاگردوں اور کلاس سے متعلق اچھے استاد کے فرائض

۱۔ استاد کو چاہئے کہ وہ شاگردوں کو اچھے اخلاق و آداب اور دینی مسائل کی بتدریج تعلیم دے اور ان کے اندر دنیا سے بے رغبتی کی فکر پیدا کرے۔

۲۔ ان پر علم کی فضیلت اور اس کی قدر و قیمت کو واضح کرے اور انہیں علماء و انبیاء کا مرتبہ سمجھائے۔

۳۔ ان کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے کرتا ہے اور جو چیز اپنے لئے پسند نہیں کرتا اسے ان کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

۴۔ طلبہ کو بداخلاقی حرام کاموں کے ارتکاب اور ان چیزوں سے روکنا چاہئے جو ان کے لئے مضر ہوں۔

۵۔ طلبہ کے سامنے فخر و مباہات نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کے ساتھ فروتنی سے پیش آنا چاہئے کہ رسول کا ارشاد ہے: لینوا لمن تعلمون ولمن یتعلمون منه تعلیم لینے اور تعلیم دینے والے کے لئے نرم ہو جاو ان کے ساتھ خاکساری سے پیش آؤ۔

۶۔ طلبہ کی دل جوئی کرے اگر وہ حاضر نہ ہوں تو ان کے حاضر نہ ہونے کی علت دریافت کرے خود یا کسی کے ذریعہ ان کا سراغ لگائے اگر وہ مریض ہوں تو ان کی عیادت کو جائے اگر ان کو کوئی حاجت درپیش ہو اور وہ اس کو رفع کر سکتا ہو تو اس کو رفع کرے۔

۷۔ ان کے نام اور خصوصیات کے ساتھ ان کا تعارف کرائے۔

۸۔ ان کو تعلیم دینے کے لئے آسان طریقہ اختیار کرے پہلے انہیں ضروری چیزوں کی تعلیم دے اور ان کی استعداد کے مطابق تعلیم دے۔

۹۔ کلاس میں رغبت و شوق کے ساتھ جائے اور ایسے مشکل مسائل بیان کرنے سے پرہیز کرے کہ جن کو سمجھنے کی طلبہ میں استعداد نہ ہو۔

۱۰۔ اگر طلبہ ایک درجے اور ایک رتبہ کے ہوں تو ان کو ایک نظر سے دیکھے، ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے لیکن اگر ان میں درجے اور عمر کا فرق ہو تو اس کا احترام زیادہ کرے جو زیادہ با استعداد ہے تا کہ دوسروں میں اقدار کے حصول کا شوق پیدا ہو۔

درس دیتے وقت استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ درج ذیل نکات کو ملحوظ رکھے۔ [1]

۱۔ پورے رعب و وقار کے ساتھ جائے، صاف، ستھرا لباس پہن کر اور بدن کی ظاہری طہارت سے آراستہ ہو کر کلاس میں جائے۔

۲۔ کلاس میں جاتے وقت بسم اللہ پڑھے اور نبی وائمہ سے وارد ہونے والی دعائیں پڑھے جو کہ بلند معانی و مضامین پر مشتمل ہیں مثلاً یہ کہے: اے اللہ مجھے گمراہ ہونے، گمراہ کرنے، کج فہمی و بد اندیشی سے محفوظ رکھ اس دعا کے ساتھ درس شروع کرے۔

۳۔ کلاس میں پہنچ کر، حاضرین کو سلام کرے اور اگر کسی مسجد میں درس دیتا ہے تو دو رکعت نماز تحیت بجالائے اور خدا سے دعا کرے کہ اسے غلطی سے بچائے اور اسے اپنی توفیق سے نوازے۔

۴۔ مسند درس پر سکون و وقار اور پوری تیاری کے ساتھ بیٹھے اور پہلے مطالعہ کے ساتھ درس شروع کرے۔

۵۔ جہاں تک ممکن ہو قبلہ رو بیٹھے اور فضول باتوں سے پرہیز کرے۔

۶۔ خلوص نیت کے ساتھ کلاس میں جائے اور احکام خدا کو پہنچانے اور علم پھیلانے کو اپنا مقصد قرار دے۔

۷۔ درس دیتے وقت مزاح و مذاق سے پرہیز کرے اگر ہو سکے شائستہ مذاق اور لطیفہ کے ذریعہ کلاس کے طلبہ کی تھکن کو دور کرے۔

۸۔ ایسی جگہ بیٹھے جہاں سے اسے سارے شاگرد دکھائی دیں پڑھاتے وقت اس کی توجہ سب پر مساوی ہونی چاہئے اور اگر کوئی طالب علم سوال کرے تو پوری توجہ کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہئے۔

۹۔ خندہ پیشانی اور تبسم کے ساتھ درس دینا چاہئے ترش روئی اور سخت لہجہ میں نہیں۔

---

[1] منیۃ المرید سے اقتباس ص ۲۰۴ تا ۲۱۰

۱۰۔ درس شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید کی کچھ آیات کی تلاوت کرے۔

۱۱۔ استاد کے لئے یہ بات بہت اہم ہے کہ اگر اس سے کوئی سوال کیا جائے اور وہ اس کا جواب نہ جانتا ہو تو اسے پورے وقار کے ساتھ یہ کہنا چاہئے کہ "میں نہیں جانتا" کیونکہ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

اذا سُئِلتم عما لا تعلمون فاهربوا قالوا: کیف الهرب ؟ قال : تقولون : الله اعلم ۔[1]

جب تم سے ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے جس کا تمہیں علم نہ ہو تو اس سے بھاگو لوگوں نے عرض کی: کیسے بھاگیں؟ فرمایا: یہ کہہ دو! اللہ بہتر جانتا ہے

واضح رہے اگر وہ یہ کہدے کہ مجھے علم نہیں ہے تو اس سے اس کی قدر و منزلت کم نہیں ہوگی بلکہ لوگوں میں اس عزت اور بڑھ جائے گی اور وہ اس کی اس بات کو اس کے تقوے اور دیانت کی دلیل سمجھیں گے۔

طلبہ کا مرتبہ رسولؐ کی نظر میں

منیۃ المرید میں شہید ثانیؒ نے بہت سے آداب نقل کئے ہیں ہم اتنے ہی پر اکتفاء کرتے ہوئے طلبہ کا مرتبہ اور ان کے ثواب کو بیان کرتے ہیں:

۱۔ رسولؐ فرماتے ہیں: جو شخص علم کی تلاش میں جاتا ہے اور اسے حاصل کر لیتا ہے خدا اسے دہری جزا عطا کرتا ہے اور جو شخص علم کی تلاش میں جاتا ہے اور علم حاصل نہیں کر پاتا ہے خداوند عالم اسے ایک اجر عطا کرتا ہے۔

۲۔ جو شخص ان لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہے جن کو خدا نے جہنم سے آزاد کر دیا ہے تو اسے طلبہ کو دیکھنا چاہئے قسم اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے جو طالب علم کسی عالم کے گھر آمد و رفت رکھتا ہے خداوند عالم اس کے ہر قدم پر ایک سال کی عبادت لکھتا ہے اور ہر قدم پر اس کے لئے جنت میں ایک

---

[1] منیۃ المرید : ص ۲۱۵

شہر بناتا ہے اور جب وہ زمین پر چلتا ہے تو زمین اس کے لئے استغفار کرتی ہے اس کی صبح و شام مغفرت کی حالت میں ہوتی ہے اور خدا کے فرشتے اس کے لئے یہ گواہی دیتے ہیں کہ وہ جہنم سے خدا کے آزاد کئے ہوئے ہیں۔

۳۔ رسولؐ فرماتے ہیں: طالب علم دن میں روزہ رکھنے والے اور رات میں عبادت کرنے والے کی مانند ہے اور وہ علم کا جو باب حاصل کرتا ہے وہ اس کے لئے اس سے بہتر ہے کہ کوہ ابوقبیس اس کے لئے سونا ہو اور وہ اسے راہ خدا میں لٹا دے۔

۴۔ رسولؐ فرماتے ہیں جس کو علم حاصل کرتے ہوئے موت آجائے تو جنت میں اس کے اور انبیاء کے درمیان ایک درجہ ہے بشرطیکہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کے لئے علم حاصل کر رہا ہو۔

شریک حیات کا حق

اما حق رعیتك بملك النكاح فان تعلم ان الله جعلها سكنا و مستراحا و انساً وواقية ، و كذلك كل واحد منكما يجب ان يحمد الله على صاحبه، و يعلم ان ذلك نعمة منه عليه ، و وجب ان يحسن صحبة نعمة الله و يكرمها و يرفق بها ، وان كان حقك عليها اغلظ و طاعتك بها الزم فيما احببت و كرهت ما لم تكن معصية، فان لها حق الرحمة والموانسة ، وموضع السكون اليها قضاء اللذة التى لا بد من قضائها، و ذلك عظيم ، ولا قوة الا بالله۔

نکاح کے ذریعہ جو حق تمہارے اوپر مسلم ہوگیا ہے وہ یہ ہے کہ تم یہ جان لو کہ اسے خدا نے تمہارے لئے باعث سکون و آرام اور مونس وانیس اور نگہبان قرار دیا ہے اسی طرح تم دونوں پر یہ فرض ہے کہ اپنے شریک حیات کے وجود پر خدا کا شکر ادا کرے اور یہ جان لے کہ یہ خدا کی نعمت ہے جو اس نے اسے عطا کی ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کی نعمت کی قدر کرے اور اس کے ساتھ نرمی سے پیش آئے اگر تمہاری شریک حیات پر تمہارا حق زیادہ سخت ہے اور جو تم پسند کرتے ہو اور جو پسند نہیں کرتے اس میں اس پر تمہاری طاعت زیادہ لازم ہے بس اس میں گناہ نہ ہو۔ لیکن اس کا بھی تم پر یہ حق ہے کہ تم اس کے ساتھ نرمی و محبت سے پیش آؤ اور وہ بھی اس لذت اندوزی کے لئے تمہارے لئے مرکز سکون ہے کہ جس سے مفر نہیں ہے اور یہ بجائے خود بہت بڑا حق ہے۔ اور خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مکارم الاخلاق یہ عبارت بھی نقل ہوئی ہے:

فان لها عليك ان ترحمها لانها اسيرك و تطعمها و تكسوها ، فاذا جهلت عفوت عنها۔

اس کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تم اس کے ساتھ نرمی و محبت سے پیش آؤ کہ وہ تمہاری اسیر ہے اسے کھانا کھلاؤ کپڑا پہناؤ اور اگر اس سے نادانی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معاف کردو۔

شرم گاہ کی بحث کے ذیل میں ہم نے شادی اور خاندان کی تشکیل کے بارے میں تفصیل سے

بحث کی ہے اور اس میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ بدکاری و گناہوں میں ملوث نہ ہونے کا بہترین ذریعہ شادی کرنا ہے وہاں ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ جسم و روح اور نفسیات پر بدکاری اور زنا کے مضر اثرات ہوتے ہیں۔ یہاں ہم جیسا کہ امام زین العابدینؑ نے فرمایا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں اختصار کے ساتھ شریک حیات کے فرائض کو بیان کرنا چاہتے ہیں:

یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ شادی مبارک و محکم رشتہ ہے کہ جس کو میاں بیوی ایک عہد و معاہدے کے ذریعہ استوار کرتے ہیں اور یہ رشتہ ان کی آخری سانس تک باقی رہتا ہے، وہ عمر بھر ایک دوسرے کے ساتھ مسرت و محبت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور اپنے وجود کے درخت سے مفید و شیرین پھل بیٹے اور بیٹیوں کی تربیت کر کے معاشرہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس رشتہ میں اسی صورت میں استحکام و دوام پیدا ہو سکتا ہے کہ جب مرد و عورت ان احکام سے واقف ہوں جن کو اسلام نے حق کے عنوان سے متعارف کرایا ہے ورنہ یہ رشتہ کمزور ہو جاتا ہے۔

مودت و رحمت

امام زین العابدینؑ نے جو پہلی خصوصیت بیان فرمائی ہے وہ آرام و سکون ہے خداوند عالم نے قرآن مجید میں مرد و عورت کی خلقت اور ان دونوں کے ایک ساتھ رہنے کو اپنی آیت و نشانی کے عنوان سے بیان کیا ہے:

اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے تمہاری شریک حیات کو پیدا کیا ہے تا کہ اس کے پاس تم آرام پاؤ اور اس نے تمہارے درمیان محبت و الفت قرار دی ہے بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

آرام و سکون کے مسئلہ کو سورۂ اعراف میں بیان فرماتا ہے:

خدا وہ ہے جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کی زوجہ کو بھی اس سے بنایا تا کہ وہ اس کے پاس آرام پائے۔

ان دونوں آیتوں میں آرام و سکون کو بیان کیا گیا ہے جو کہ خدا کی عظیم عطا ہے یہ آرام جسمی بھی

ہے اور روحی بھی اس میں فردی پہلو بھی ہے اور اجتماعی بھی ہے۔شادی نہ کرنے سے انسان کے بدن میں جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح وہ نفسیاتی الجھنیں بھی محتاج بیان نہیں ہیں کہ جن سے غیر شادی شدہ دوچار ہیں اجتماعی لحاظ سے غیر شادہ شدہ افراد ذمہ داری کا احساس کم کرتے ہیں خودکشی بھی زیادہ تر غیر شادی شدہ لوگ ہی کرتے ہیں اور وہی ظلم و جرائم زیادہ کرتے ہیں۔جو غیر شادی شدہ شادی کر لیتا ہے وہ اپنے اندر نئی شخصیت محسوس کرتا ہے اور ذمہ داری کا زیادہ احساس کرتا ہے۔

سکون و آرام کہ جس کو بہترین زندگی شمار کیا جاتا ہے اور جس کو بھی تلاش کرتے ہیں۔مودت و رحمت بیان ہوئی ہے۔درحقیقت یہ دونوں لفظ معاشرہ انسانی کی عمارت کو جوڑنے کا مصالح ہیں،مودت و رحمت میں بعض اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے:

۱۔کام کے آغاز میں مودت ارتباط کا محرک ہوتی ہے لیکن اختتام میں کہ جب ان دونوں میں سے ایک کمزور وضعیف ہو جاتا ہے اس وقت اسے رحمت کی ضرورت ہوتی ہے مودت کی نہیں۔

۲۔مودت بزرگوں کے لئے ہے وہ ایک دوسرے کی خدمت کر سکتے ہیں لیکن بچے رحمت کے سایہ میں پرورش پاتے ہیں۔

۳۔مودت میں زیادہ تر بدلے کا پہلو ہوتا ہے لیکن رحمت یک طرفہ اور ایثار کے ساتھ ہوتی ہے۔[1]

جس میاں بیوی کی زندگی سکون و آرام سے سرشار مودت و محبت سے ہمکنار اور لطف و رحمت سے مالا مال ہوتی ہے اس کی مثال غیر متزلزل عمارت کی سی ہے اس کے برخلاف ان چیزوں سے خالی زندگی کی مثال کمزور اور ویران عمارت کی سی ہے شادی اجتماعی زندگی کی پہلی کلاس اور حقوق کا سبق پڑھنے کا مدرسہ ہے۔جو حقوق اسلام میں زن و شوہر کے لئے مقرر کئے گئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں:۱۔قانونی حقوق، ۲۔اخلاقی حقوق

قانونی حقوق،عورت کا نفقہ،کھانا خوراک،مسکن و رہایش اور لباس،شوہر کے ذمہ ہے اس کے عوض عورت کو شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہوگی۔ان حقوق کی مثال ان مصالح کی سی ہے جو

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۱۶ ص ۳۹۳

عمارت کو مضبوط بناتے ہیں۔

اخلاقی حقوق: یہ وہ حقوق ہیں جن کی رعایت مرد کو بھی کرنا چاہیے اور عورت کو بھی لیکن اگر کسی ایک نے ان کی رعایت نہ کی تو اس میں کوئی قانونی گرفت نہیں ہے ہاں زندگی کا مزہ ان کی انجام دینے ہی میں ہے، مثلاً محبت وخلوص اور ایک دوسرے کی خاطر داری کرنا۔

فطرت وتخلیق کے قانون نے مرد وعورت کو ایک دوسرے سے اچھی طرح قریب کرنے اور خاندان کے پایہ کو، جو کہ بشر کی سعادت کا اصلی ستون ہے، استوار کرنے کے لئے مرد وعورت کو ایک دوسرے کا نیازمند پیدا کیا ہے اگر مالی لحاظ سے مرد کو عورت کا سہارا قرار دیا ہے تو عورت کو مرد کے روحی سکون وآرام کا سہارا قرار دیا ہے۔ یہ دونوں مختلف ضرورتیں انہیں ایک دوسرے سے نزدیک کرتی ہیں۔[1]

خاندان کے نظام کی سرپرستی

الرجال قوامون علی النساء بما فضّل اللہ بعضھم علیٰ بعضٍ وبما انفقوا من اموالھم فالصّالحات قانتات حافظات للغیب بما حَفِظَ اللہ واللّاتی تخافون نشوزھُنّ فعظوھُنّ واھجروھُنّ فی المضاجع واضربوھُن فان اطعنکم فلاتبغوا علیھن سبیلا اِنّ اللہ کان علیاً کبیرا۔[2]

مرد اس فضیلت کے سبب عورتوں کے وارث وسرپرست ہیں جو خدا نے بعض کو بعض پر عطا کی ہے اور پھر یہ کہ وہ اپنے اموال میں سے ان پر خرچ کرتے ہیں اور ان کی نیک وشریف عورتیں متواضع ہیں جو اپنے شوہروں کی عدم موجودگی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں لیکن وہ عورتیں کہ جن کی نافرمانی سے تم ڈرتے ہو، ان کو نصیحت کرو اگر نہ مانیں تو ان سے اپنا بستر الگ کرلو اگر اس کا بھی اثر نہ ہو تو مارو پھر اگر وہ تمہاری پیروی کریں تو ان پر ظلم نہ کرو بیشک خدا بلند اور بڑا ہے۔

واضح رہے کہ خاندان ایک چھوٹا معاشرہ ہے اس کو راہنما اور سرپرست کی ضرورت ہے مرد خاندان کا حاکم وسرپرست ہے اور عورت اسکی مددگار اور اس کے ماتحت ہے اور مرد کو یہ درجہ ان خصوصیات

---

[1] نظام حقوق زن دراسلام ص۲۲۲ [2] نساء:۳۴

کی بنا پر دیا گیا ہے جو اس کے اندر موجود ہیں کیونکہ اس کی فکری صلاحیت اس کے احساسات ومحبت پر بھاری ہوتی جبکہ عورتوں میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی اس کے اندر جسمانی طاقت زیادہ ہے، جس سے زندگی کا نقشہ پیش کرسکتا ہے اور خاندان سے دفاع کرسکتا ہے اور **بما فضل الله بعضهم علی بعض وبما انفقوا من اموالهم۔**

اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ بات بھی محتاج بیان نہیں ہے کہ اس ذمہ داری کا مرد کے سپرد کرنا اسکی انسانی شخصیت کے بلند ہونے کی دلیل نہیں ہے اور نہ اس کی فوقیت کا سبب ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک معاون کی انسانی شخصیت مختلف پہلوؤں سے ایک افسر سے زیادہ ہوتی ہے لیکن حاکم کے ذمہ جو کام کیا گیا ہے اس کے لے وہ معاون سے زیادہ لائق ہے۔

مذکورہ آیت کی رو سے عورتوں کو دو دستوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔: ا۔ نیک وشریف؛ یہ خاندان کے نظام کی پابند ہیں، شوہر کی موجودگی ہی میں اس کے مال وناموس اور اس کی شخصیت کی حفاظت نہیں کرتی ہیں بلکہ اس کی عدم موجودگی میں بھی حفاظت کرتی ہیں خدا نے ان کے لئے جو حقوق مقرر کئے ہیں اور جن کی طرف "**بما حفظ الله**" کے ذریعہ اشارہ کیا ہے وہ ان کی روشنی میں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتی ہیں۔

دوسرا دستہ: جو عورتیں اپنے فرائض کو پورا نہیں کرتی ہیں اور جن کے اندر نباہ نہ کرنے والے آثار نظر آتے ہیں۔ مردوں کو چاہئے کہ وہ پہلے دستہ کا احترام واکرام کریں اور دوسرے دستہ کو نصیحت کریں اور ان سے علیحدگی اختیار کریں اور اگر ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہو تو پھر ان پر اتنی تنبیہ کریں جتنی شریعت اسلامیہ میں بیان ہوئی ہے۔[1]

اس آیت کو نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس بات کی طرف متوجہ ہوجائیں کہ عورت کے اخراجات کو قرآن مجید نے مرد کے ذمہ کیا ہے، امام زین العابدینؑ بھی یہی وصیت فرماتے ہیں کہ عورت کے روٹی کپڑے کا خیال رکھو اور ان کے حقوق کی رعایت کرو بڑے فقہا نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے کہ نفقہ واجب ہے:

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۳ ص ۳۷۲

اما نفقة الزوجة الدائمة فتجب علی الزوج وهی الطعام والکسوة والسکنی والفراش و الغطاء وآلة التنظیف و سائر ما تحتاج الیه بحسب حالها بشرط ان تکون عنده فاذا خرجت من عنده ، تارکة له من دون مسوغ شرعی لم تستحق النفقة ، والمشهور ان وجوب النفقة مشروط بعدم النشوز۔ [1]

دائمی زوجہ کا نفقہ، کھانا، کپڑا، مکان، فرش و بستر، پردہ، صفائی کے آلات اور وہ چیزیں جن کی عورت کو ضرورت ہوتی ہے، مرد پر واجب ہیں، بشرطیکہ وہ مرد کے گھر میں رہے اور اس کی مطیع ہو، بنا بر ایں اگر وہ کسی شرعی جواز کے بغیر گھر سے نکلے تو وہ نفقہ کی مستحق نہیں ہے۔ اور مشہور فقہا ر نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ نفقہ اس صورت میں واجب ہے کہ جب عورت نافرمان نہ ہو۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عورت کے حقوق دو قسم کے ہیں: ایک قانونی حقوق جو نفقہ سے عبارت ہیں اگر مرد نفقہ نہ دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ قانونی چارہ جوئی کر کے مرد سے اپنا نفقہ لے دوسرے حقوق: اخلاقی و انسانی ہیں کہ ان کا پاس و لحاظ رکھنا زندگی کی بقاء و دوام کا سبب ہوتا ہے ان حقوق کی رعایت کرنے سے جو سکون و اطمینان اور آرام و چین ملتا ہے اسے ہم یہاں سپرد قلم کر رہے ہیں:

رسولؐ نے عورتوں اور ان کے حقوق کے بارے میں بہت تاکید فرمائی ہے ان میں سے بعض احادیث یہ ہیں:

رسولؐ فرماتے ہیں: تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو اپنے خاندان والوں کے لئے بہترین ہے اور میں تمہارے درمیان اپنے خاندان والوں کے لئے سب سے بہتر ہوں۔

مرد کی شریک حیات اس کے گھر میں ایک اسیر کی مانند ہے اور خدا کے نزدیک بہترین بندے وہ ہیں جو اپنی شریک حیات کے ساتھ نیک سلوک کرتے ہیں۔

امام محمد باقرؑ، رسولؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: جبرئیل نے عورت کے بارے میں مجھ سے اتنی سفارش کی ہے کہ میں یہ سوچنے لگا؛ اس کو طلاق نہیں دی جا سکتی مگر یہ کہ وہ کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب کرے۔

---

[1] منہاج الصالحین ج ۲ ص ۲۷۹

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں:

رسولؐ نے فرمایا: جو اپنی عورت کی حرکتوں، خواہ اسکی ایک بات، کو برداشت کرتا ہے خدا اسے جہنم سے آزاد کر دیتا ہے اور جنت کو اس پر واجب کر دیتا ہے اور اس کے لئے دو لاکھ نیکیاں لکھتا ہے اور اس کے دو لاکھ گناہوں کو محو کر دیتا ہے۔ اس کے دو لاکھ درجات کو بلند کرتا ہے اور اس کے لئے اتنے سال کی عبادت لکھتا ہے کہ جتنے اس کے بدن پر بال ہیں۔

عورت کے حقوق کے بارے میں رسول کی یہ حدیثیں بہترین دستور ہیں جو ہم تک پہنچے ہیں۔ مرد کا فریضہ ہے کہ وہ گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ مودبانہ اور شائستہ برتاؤ کرے اور اس کی لغزشوں سے چشم پوشی کرے اس کی بدتمیزی پر صبر کرے تاکہ اسے وہ عظیم جزا مل جائے جو رسولؐ نے بیان فرمائی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ گھر میں کچھ نہ کچھ ناچاقی ہوتی ہے کبھی مرد و عورت کے اخلاق میں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے کشمکش ہو جاتی ہے اور کبھی کوئی ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے کہ جس سے وہ ایک دوسرے سے مایوس ہو جاتے ہیں اور ان کے درمیان زیادہ فاصلہ ہو جاتا ہے اگر وہ اس کی تلافی نہ کریں تو ممکن ہے کہ طلاق ہو جائے خصوصاً اس مرد و عورت کے لئے کہ جنہوں نے ابھی زمانہ کے نشیب و فراز کو نہیں سمجھا ہے اور جوانی کی مستیوں میں چور ہیں، ان کو بہت جلد غصہ آتا ہے اور ایک دوسرے سے انتقام لینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان اسباب کا سد باب کرنے کی خاطر اسلام نے مرد و عورت کو کچھ نصیحت کی ہیں اور انہیں ایک دوسرے کی لغزش سے چشم پوشی کرنے کی تاکید کی ہے اور انہیں ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت کرنے کی وصیت کی ہے:

عمار بن اسحٰق نے امام صادقؑ سے دریافت کیا کہ مرد پر عورت کا کیا حق ہے؟ فرمایا: اس کو شکم سیر کرے اسے کپڑا پہنائے اور اس کی نادانیوں سے چشم پوشی کرے۔ خلیل خدا حضرت ابراہیم نے سارہ کے اخلاق کی شکایت کی تو خدا نے ان پر وحی نازل کی:

عورت پسلی یا خشک اور سوکھی لکڑی کی مانند ہے اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو ٹوٹ جائے گی۔ اور اگر اس سے درگزر کرو گے تو اس کے وجود سے لذت اندوز ہو گے۔

اہم ترین موضوع کہ جس کی طرف مرد کو زندگی میں متوجہ ہونا چاہئے یہ ہے: اسے یہ معلوم ہونا

چاہئے کہ اس کی بیوی اس کی شریک حیات ہے اس کے گھر میں اسیر نہیں ہے لہذا فقہی نقطۂ نگاہ سے مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو کام کرنے پر مجبور کرے اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنی شریک حیات کی مدد کرے ہمارے ائمہ معصومینؑ نے ان لوگوں کا بہت ثواب بیان کیا ہے کہ جو اپنی عورتوں کی مدد کرتے ہیں ان میں بعض درج ذیل ہیں:

شریک حیات کی مدد کی جزا

رسول اللہ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

اے ابوالحسن مجھ سے سنو کہ میں وہی کہتا ہوں جس کا مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے اور یہ کہ جو مرد بھی گھر میں اپنی عورت کی مدد کرتا ہے خدا کو اس کے بدن کے ایک ایک بال پر ایک سال کی نماز روزہ کا ثواب دیتا ہے اور اسے صابروں، داؤد ویعقوب اور عیسیٰ، جیسا ثواب عطا کرتا ہے۔

اس حدیث میں عورت کی مدد کی یہ تشویق اس بات کا سبب ہوتی ہے کہ مومن مرد اپنی شریک حیات کی مدد کرے اور اس پر حکمرانی کرنے سے پرہیز کرے۔

رسولؐ نے فرمایا: اے علی! جو شخص گھر میں بیوی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنے سے کبیدہ خاطر نہیں ہوتا ہے خداوند عالم اس کا نام شہیدوں کی فہرست میں لکھتا ہے اور ہر شب و روز میں اسے ہزار شہیدوں کا ثواب عطا کرتا ہے اس کے ہر قدم پر ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب لکھتا ہے اور اس کے لیے جنت میں اتنے ہی شہر بناتا ہے جتنی اس کے بدن میں رگیں ہیں۔

رسولؐ نے فرمایا: اے علیؑ! شریک حیات کی مدد کرنا بڑے گناہوں کا کفارہ ہے اور پروردگار کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور یہ جنت کی حوروں کا مہر بن جاتا ہے اور حسنات و درجات میں اضافہ کرتا ہے۔

سختی کرنے والے مردوں کی مذمت

رسولؐ نے فرمایا: جو شخص بلا خطا اپنی زوجہ کو مارتا ہے قیامت کے دن میں اس کا دشمن ہونگا اپنی

عورتوں کومت مارو کیونکہ جوشخص ناحق اپنی بیوی کو مارتا ہے وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرتا ہے۔

رسولؐ نے فرمایا: اس شخص کا ہم سے تعلق نہیں ہے جس کے پاس کافی مال و دولت ہو اور وہ اپنی بیوی پر جفا کرتا ہو اور اس کو تنگی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہو۔

شریک حیات کے لئے وسعت

امام زین العابدینؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ خوشنود وہ ہے جو اپنی شریک حیات کے اخراجات کو فراخی کے ساتھ پورے کرتا ہو۔

امام رضاؑ فرماتے ہیں: مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے عیال کو زندگی میں اتنی وسعت دے کہ جس سے وہ کسی وقت بھی مرنے کی تمنا نہ کرے۔

یہاں تک ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ مردوں کو چاہئے کہ وہ اپنی بیویوں پر مہربان رہیں، انہیں اذیت نہ دیں، رنجیدہ نہ کریں ان پر سختی نہ کریں بلکہ ان کی مدد کریں اب دیکھنا یہ ہے کہ مردوں کی ان خدمات کے عوض اسلام نے عورتوں کو کیا حکم دیا ہے اور زندگی کی میزان میں انہیں کیسا کردار ادا کرنا چاہئے۔

عورت پر مرد کے حقوق

حسن بن محبوب نے مالک بن عطیہ سے انہوں نے محمد بن مسلم سے انہوں نے محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک عورت رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! عورت پر مرد کا کیا حق ہے؟ آپ نے جواب دیا: اسے اپنے شوہر کی اطاعت کرنا چاہئے اس کی بات کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے اور اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں سے صدقہ نہیں دینا چاہئے اس کی اجازت کے بغیر مستحب روزہ نہیں رکھنا چاہئے خود کو اس کے اختیار میں دینا چاہئے اس کی خواہش کو پورا کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہئے خواہ وہ سواری پر سوار ہو، اس کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جانا چاہئے اگر اس کی اجازت کے بغیر نکلے گی تو اس پر زمین و آسمان اور غضب و رحمت کے فرشتے

لعنت کریں گے۔ عورت نے سوال کیا: اے اللہ کے رسولؐ! مردوں میں سے مرد پر کس کا حق زیادہ ہے؟ فرمایا: اس کے ماں باپ کا، پھر سوال کیا عورت پر سب سے زیادہ کس کا حق ہے؟ فرمایا: اس کے شوہر کا، عرض کی: کیا اس پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے؟ جتنا اس کا میرے اوپر ہے؟ فرمایا: نہیں بلکہ ایک فیصد بھی نہیں اس نے کہا: اس خدا کی قسم کہ جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، مرد ہرگز میرا مالک نہیں بن سکتا۔

رسولؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: عورت پر مرد کا حق یہ ہے کہ چراغ روشن کرے، کھانا پکائے جب شوہر کام سے واپس آئے تو دروازہ پر جا کر اس کا استقبال کرے اسے خوش آمدید کہے اس کے لئے طشت و تولیہ پیش کرے اس کے ہاتھ دھلوائے اور اس کی خواہش کو پورا کرنے میں دریغ نہ کرے مگر یہ کہ کوئی وجہ ہو۔

رسولؐ نے فرمایا: عورت اس وقت تک خدا کا حق ادا نہیں کرسکتی جب تک کہ شوہر کا حق ادا نہیں کرے گی۔

امام صادقؑ نے فرمایا: جو عورت رات میں سوئے اور اس کا شوہر اس سے ناراض ہو تو اس وقت تک اسکی نماز قبول نہیں ہوتی جب تک کہ اس کا شوہر خوش نہ ہو جائے۔

عورتوں کا جہاد

امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے مرد اور عورت پر جہاد واجب کیا ہے مرد کا جہاد یہ ہے کہ وہ راہ خدا میں جان و مال کو قربان کرے یہاں تک کہ شہادت ایسے بلند مرتبہ پر پہنچ جائے اور عورت کا جہاد یہ ہے کہ وہ شوہر کی اذیت اور اس کی غیرت پر صبر کرے۔

اس حدیث میں امام محمد باقرؑ نے گھر کو محاذ جنگ اور عورتوں کو فوج قرار دیا ہے اور صبر کو اس جنگ کا اہم ترین اسلحہ شمار کیا ہے اور مرد کی اذیت وایذا رسانی نیزہ وشمشیر ہے جو عورت پر پڑتی ہے عورت اس محاذ سے فرار نہیں کرسکتی بلکہ اسے صبر و ثابت قدمی سے اس کا مقابلہ کرتے رہنا چاہئے یہاں تک کہ زندگی کو بہترین نتیجہ پر ختم کردے بہت سی عورتیں ناتجربہ کاری اور عدم تربیت کی وجہ سے شکست کھا جاتی

ہیں وہ شوہر کا گھر چھوڑ دیتی ہیں اور اپنی اولاد کو ماں کی محبت وشفقت سے محروم کر دیتی ہیں اور ہمیشہ کے لئے اپنی اور شوہر واولاد کی زندگی کو مکدر بنا دیتی ہیں۔ان کے برخلاف صبر کرنے والی عورتیں اپنی زندگی کی کشتی کو شوہر کے غیظ وغضب کی بپھری ہوئی موجوں سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچا دیتی ہیں خود بھی کامیاب ہو جاتی ہیں اور بچوں کی عاقبت بھی سنوار دیتی ہیں۔

امام صادقؑ نے شوہر کے علاوہ دوسروں کے لئے زینت وسنگھار کرنے سے منع کیا ہے فرماتے ہیں:

جو عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور کے لئے خوشبو لگاتی ہے اسکی نماز قبول نہیں ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ اس خوشبو کو اس طرح دھودے جس طرح وہ غسل جنابت کرتی ہے۔

اپنے شوہر کی قدر نہ کرنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

جو عورت اپنے شوہر سے یہ کہتی ہے کہ مجھے تمہاری طرف سے ہرگز کوئی خوشی نہیں ملی،اس کے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔

اگر اسلامی معاشرہ کے مرد وعورت ان باتوں پرعمل کریں گے تو یقیناوہ کامیاب اوراچھی زندگی بسر کریں گے مرد وعورت کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

روزہ کی رات میں عورتوں سے ہم بستری کرنے کوتمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو (دونوں ایک دوسرے کی زینت ہو اور ایک دوسرے کی حفاظت کرنے والے ہو) یہ کتنا پیارا جملہ ہے کہ مرد وعورت ایک دوسرے کے لئے لباس کی مانند ہیں جس طرح بدن کو چھپانے اور اسے سردی وگرمی سے بچانے اور زینت کے لئے لباس ہوتا ہے اسی طرح ایک دوسرے کے لئے میاں بیوی بھی ہوتے ہیں وہ بھی ایک دوسرے کے عیوب کو چھپاتے ہیں اور ایک دوسرے کو آرام و سکون بخشتے ہیں یہ لباس ان کی زندگی کے ہر پہلو کو ڈھانک لیتا ہے میاں بیوی کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے عیوب اور خامیوں کو چھپائیں ایک دوسرے کی بداخلاقی وبدتمیزی کو دوسروں سے نہ بیان کریں اپنی اندرونی زندگی کا راز فاش نہ کریں ایک دوسرے کا احترام کریں ایک دوسرے پر تہمت نہ لگائیں کہ دونوں برباد ہو جائیں گے ایک دوسرے کی باتوں کو برداشت کریں تاکہ خدا انہیں وہ عظیم اجر عطا کرے

جس کا اس نے وعدہ کیا ہے۔

جیسا کہ امام زین العابدینؑ نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بڑی نعمت ہیں جس کا انہیں شکر ادا کرنا چاہئے زندگی کی خوشیوں اور تلخیوں کو آپس میں تقسیم کر لینا چاہئے فراخ دلی سے کام لینا چاہئے تا کہ ان کی اولاد بہترین و بلند مرتبہ انسان بن جائے شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی پر اپنی دلی محبت کو آشکار کرے بالکل اسی طرح جیسا کہ اس روایت میں بیان ہوا ہے:

مرد کی یہ بات عورت کے دل سے کبھی نہیں نکلتی کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اس سے وہ بھی مرد سے محبت کرتی ہے اور سختیوں میں وہ اس کی مدد کرتی ہے۔

غلام کا حق

واما حق رعيتك بملك اليمين فان تعلم انه خلق ربك ولحمك و دمك ، وانك تملكه لا انت صنعته دون الله ولا خلقت له سمعا ولا بصرا ولا اجريت له رزقا، ولكن الله كفاك ذلك ثم سخره لك و ائتمنك عليه واستودعك اياه لتحفظه فيه و تسير فيه بسيرته ، فتطعمه مما تاكل ، و تلبسه مما تلبس ، ولا تكلّفه مالا يطيق ، فان كرهته خرجت الى الله منه واستبدلت به ولم تعذب خلق الله ، ولا قوة الا بالله.

تمہارے مملوک وغلام کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہارے پروردگار ہی کا پیدا کیا ہوا ہے وہ بھی تمہاری ہی طرح گوشت اور خون رکھتا ہے تم اس لئے اس کے مالک نہیں ہو کہ تم نے اسے پیدا کیا ہے بلکہ اسے خدا نے پیدا کیا ہے اور نہ تم نے اسکو کان اور آنکھ عطا کی ہے اور نہ اسکی روزی تمہارے ہاتھ میں ہے بلکہ اس سلسلہ میں خدا نے تمہاری مدد کی ہے کہ اسے تمہارے تابع کر دیا اور تم کو اس کا امین قرار دیا اور اسے تمہارے سپرد کر دیا تا کہ تم اسکی حفاظت کرو اور اس کے ساتھ اسی جیسا سلوک کرو اسے وہی کھانا کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی کپڑا پہناؤ جو تم پہنتے ہو اور اس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو اگر وہ تمہیں پسند نہیں ہے تو تم اس کی اس ذمہ داری سے بری ہو جاؤ جو خدا کی طرف سے تم پر عائد ہوئی ہے اور اسکو دوسرے سے بدل لو خدا کی مخلوق کو تکلیف نہ دو، کہ خدا کے علاوہ کو طاقت وقوت نہیں ہے۔

مولا کے حق کے بارے میں امام زین العابدینؑ پہلے بیان فرما چکے ہیں اور مذکورہ عبارت غلاموں کے حقوق سے متعلق ہے۔

اس بحث میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ اسلام نے اپنے آغاز میں غلامی کو قبول کیا تھا ان کی آزادی کا یکبارگی اعلان کرنا ممکن نہ تھا بلکہ رفتہ رفتہ غلاموں کو آزاد کرایا کیونکہ اقتصادی لحاظ سے ان کی آزادی کا یکبارگی اعلان موزوں نہیں تھا لہذا جب غلامی کے نظریہ کو قبول کر لیا تو غلاموں کے حقوق بھی مقرر کئے اور

مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سنجیدگی سے غلاموں کے حقوق کو پورا کریں۔

اسلام اور غلاموں کی حیثیت

ا۔ اسلام نے غلام اور آقا کے فرق کو ختم کر دیا اور سب کو بھائی بھائی بنا دیا: رسولؐ فرماتے ہیں:

اخوانکم جعلهم اللّه فتنة تحت ایدیکم ،فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه من طعامه و لیلبسه من لباسه ولا یکلفه ما یغلبه فان کلفه ما یغلبه فلیعنه۔[1]

تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں خدا نے آزمائش کے لئے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے پس انہیں اپنے کھانے میں سے کھانا کھلاؤ اور انہیں ایسا ہی لباس پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دو اور اگر کوئی سخت کام اس کے ذمہ کرو تو اس میں ان کی مدد کرو۔

۲۔ رسولؐ نے غلاموں کے حقوق کچھ اس طرح مقرر کئے ہیں کہ ان کے لئے یہ بھی برداشت نہیں کیا کہ کوئی انہیں کنیز و غلام کہے:

لایقل احدکم هذا عبدی و هذه امتی ، ولیقل : فتای و فتاتی۔[2]

کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: یہ میرا غلام ہے یا یہ میری کنیز ہے بلکہ اسے یہ کہنا چاہئے کہ یہ جوان ہے یہ خاتون ہے۔

۳۔ اسلام نے غلاموں کی اصلاح کرنے کے لئے اتنی کوشش کی ہے کہ ان کو معزز و مکرم کہکر پہچنوایا کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو مارتا ہے تو اس کو بدترین انسان کہا جاتا ہے تاکہ کوئی دوسرا ایسی غلطی نہ کرے۔ خدا کے بندوں میں سے کسی کو آزار نہ پہنچاؤ اور ان پر ظلم نہ کرو، امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:

الاانبئکم بشر الناس ؟ قالوا: بلی یا رسول اللّه! فقال : من سافر وحده ، ومنع رفده ، و ضرب عبده۔[3]

---

[1] اسلام و حقوق بشر ص ۲۰۴ [2] ایضا [3] ایضا

کیا میں تمہیں یہ بتاؤں کہ سب سے بدترین آدمی کون ہے؟ اصحاب نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ضرور بتائیے! فرمایا: جو تنہا سفر کرے مہمان کو قبول نہ کرے اور اپنے غلام کو مارے۔

اس حدیث میں رسولؐ نے اس شخص کو بدترین انسان قرار دیا ہے جو اپنے غلام کو مارتا ہے۔

اپنے غلام پر حضرت علیؑ کا کرم

ایک روز حضرت علیؑ کھدر فروشوں کے بازار گئے اور دو لباس خریدے ایک تین درہم میں اور دوسرا دو درہم میں تین درہم والا لباس اپنے غلام قنبر کو بخش دیا اور دو درہم والا خود رکھ لیا غلام نے عرض کی: آپ امیر المومنین ہیں لوگوں کے درمیان خطبہ دیتے ہیں اسلئے تین درہم والا لباس آپ کے شایان شان ہے حضرت علیؑ نے فرمایا: مجھ شرم آتی ہے کہ میں تم پر برتری جتاؤں کیونکہ میں نے رسولؐ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: البسوهم مماتلبسون واطعموهم مما تاكلون.

جو تم پہنو وہی انہیں پہناؤ اور جو تم کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ۔ [1]

رسولؐ نے فرمایا: تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں ان کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ اپنے سخت اور مشکل کاموں میں ان سے مدد حاصل کرو اور دشوار کاموں میں ان کی مدد کرو۔ [2]

آپؐ ہی کا ارشاد ہے: اوصانی حبیبی جبرئیل بالرفق بالرقیق حتی ظننت انه سیضرب له اجلا یخرج فیه حرا۔ [3]

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں میرے دوست جبریل نے مجھ سے اتنی سفارش کی ہے کہ میں یہ سوچنے لگا کہ جبریل ان کو آزاد کرنے کا وقت معین کریں گے۔

ابوذر اور لباس کی تقسیم

ابوذر کے پاس دو قیمتی چادریں تھیں جن کو وہ اوڑھے رہتے تھے کچھ مدت کے بعد انہوں نے ایک کا لباس سلوا لیا اور اپنی عبا کے ساتھ پہن لیا اور دوسری چادر اپنے غلام کو دیدی، جب لوگوں نے

---

[1] اسلام و حقوق بشر [2] نہج الفصاحت ص ۵۲ [3] ہمان ص ۲۰۴

ابوذر کا یہ عمل دیکھا تو وہ انہیں سرزنش کرنے لگے اور کہنے لگے: اگر دونوں چادریں تم خود پہنتے تو بہتر تھا۔ ابوذر نے جواب دیا: میں نے رسولؐ سے سنا کہ فرماتے ہیں: اپنے غلاموں کو ایسا ہی لباس دو جیسا تم پہنتے ہو اور وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو۔ [1]

رسولؐ نے ایک سوار کو دیکھا کہ جس کا غلام اس کے پیچھے پیچھے پیدل چل رہا تھا، رسولؐ نے فرمایا: اپنے غلام کو بھی سوار کرلو وہ تمہارا بھائی ہے اور اس کی روح تمہاری ہی روح کی مانند ہے۔ [2]

امام رضاؑ اور غلام

یاسر اور نادر دونوں ہی آپ کے غلام تھے وہ روایت کرتے ہیں کہ امام رضاؑ نے فرمایا: اگر کبھی میں تمہارے پاس آؤں اور تم کھانا کھانے میں مشغول ہو تو کھانے سے فارغ ہونے سے پہلے اپنی جگہ سے نہ اٹھنا۔ [3]

غلاموں کے ساتھ امام صادقؑ کا سلوک

امام صادقؑ نے کسی غلام کو کسی کام کے لئے بھیجا اس کو دیر ہوگئی تو آپ اس کو تلاش کرنے کیلئے نکلے دیکھا کہ وہ سو رہا ہے اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگے جب وہ بیدار ہوگیا تو اس سے فرمایا تم دن میں بھی سوتے ہو اور رات میں بھی؟ رات تمہارے آرام کے لئے ہے اور دن کام کے لئے [4]

مذکورہ احادیث سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ائمہ معصومین غلاموں کے احترام میں کتنی کوشش فرماتے تھے۔

غلاموں کا عہد

رسولؐ نے غلاموں کا رتبہ بلند کرنے کے لئے بھی بہت سے اقدام فرماتے ہیں جیسے غلاموں کو

---

[1] بحار الانوار ج ۱۶ ص ۴۰ [2] تاریخ بروگی ص ۴۷ [3] بحار الانوار ۷۵ ص ۴۱ [4] روضۂ کافی ص ۸۷

آزادلوگوں کا بھائی بنادیا مثلاً: بلال حبشی، زید بن حارثہ اور خارجہ بن زید کو اور آزادلوگوں میں سے خالد بن رویحہ خثعمی، حمزہ بن ابی طالب اور ابو بکر بن قحافہ کو بھائی بھائی بنا دیا اور معزز خاندانوں میں غلاموں کی شادی کرائی پہلے مرحلہ میں زید بن حارثہ (جو کہ غلام تھے) کی شادی اپنی پھوپھی کی بیٹی زینب بنت جحش سے کرائی دوسرے مرحلہ میں جو یبر غلام کی شادی بنی بیاضہ کے رئیس زیاد بن لبید کی بیٹی سے کرائی اور آزاد مثلاً ابو بکر عمر اور مہاجرین وانصار میں سے دیگر لوگوں کے ہوتے ہوئے اسامہ بن زید کو لشکر اسلام کا سپہ سالار مقرر کیا اور رومی دشمنوں سے جنگ کے لئے شام کی طرف روانہ کیا۔

غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب

یہ تھے رسولؐ اور ائمہؑ کی حدیث کی روشنی میں غلاموں کے حقوق اب ہم اس بحث کے اختتام پر غلاموں کو آزاد کرنے کا ثواب بیان کرنا چاہتے ہیں مالک کے حق کے ذیل میں ہم نے غلاموں کی آزادی کے طریقوں کی وضاحت کر دی تھی؛ غلاموں کی آزادی کے ثواب کے بارے میں وسائل الشیعہ میں ایک کتاب العتق ہے اس کتاب کے باب استحباب میں بہت سی حدیث میں نقل ہوئی ہیں ان میں سے بعض کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

پہلی روایت:

محمد بن الحسن باسناده عن الحسين بن سعيد...عن ابى عبدالله جعفر بن محمد عليه السلام انه قال فى الرجل يعتق المملوك قال : يعتق الله عز وجل بكل عضو منه عضوا من النار۔[1]

شیخ طوسی نے اپنی سند سے حسین بن سعید اور دوسرے چند راویوں سے روایت کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: جو شخص اپنے غلام کو آزاد کرتا ہے خداوند عالم اس کے ہر عضو کو آزاد ہونے والے غلام کے عضو کے عوض آتش جہنم سے آزاد کرتا ہے۔

اس باب کی چوتھی روایت:

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۶ ص ۲ تا ۷

و عن الحسين بن محمد بن معلى بن محمد عن الحسن بن علي عن ابان عن بشير النبال قال: سمعت ابا عبدالله عليه السلام يقول : من اعتق نسمة صالحة لوجه الله كفر الله عنه مكان كل عضو منه عضوا من النار[1]

حسین بن محمد بن معلیٰ بن محمد سے انہوں نے حسن بن علی سے انہوں نے ابان سے اور انہوں نے بشیر بن نبال سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام جعفر صادقؑ سے سنا کہ فرماتے ہیں: جو شخص نیک و صالح غلام کو راہ خدا میں آزاد کرے گا خداوند عالم اس غلام کے ہر عضو کے بدلے اس کے عضو کو جہنم کی آگ سے آزاد کرے گا۔

عرفہ میں عصر کے وقت غلاموں کی آزادی

اس باب کی چھٹی روایت میں امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

امیر المومنین علی بن ابی طالب نے اپنی کمائی سے ہزار غلاموں کو آزاد کیا ہے۔

کتاب مذکور کے دوسرے باب میں عرفہ کے روز غلاموں کو آزاد کرنے کی تاکید کی گئی ہے چنانچہ امام صادقؑ کی دو حدیثوں میں بیان ہوا ہے:

يستحب للرجل ان يتقرب الى الله عشية عرفة و يوم عرفة بالعتق و الصدقة۔

مرد کے لئے مستحب ہے کہ وہ عرفہ کے روز عصر کے وقت غلام کو آزاد کر کے اور صدقہ دے کر خدا کا تقرب حاصل کرے۔ مذکورہ بیانات سے امام زین العابدینؑ کے اس بیان کے معانی اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں جو آپ نے غلاموں کے بارے میں صادر فرمایا ہے کہ ان کے حقوق کی رعایت کرو کیونکہ وہ خدا کی مخلوق ہیں نہ کہ تمہاری بنا برایں ان پر ظلم و ستم روا نہ رکھو، ان کے ساتھ اسی طرح نرمی سے پیش آؤ جس طرح رسولؐ اور ائمہؑ ان کے ساتھ پیش آئے تھے۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۶ ص ۲ تا ۷

عزیزوں کا حق

ماں کا حق

اما حق الرحم:

فحق اُمّك ان تعلم انها حملتك حيث لا يحمل احد احدا و اطعمتك من ثمرة قلبها مالا يطعم احد احدا و انها وقتك بسمعها و بصرها و يدها و رجلها و شعرها و بشرها و جميع جوارحها مستبشرة بذلك فرحة موابلة محتملة لما فيه مكروهها والمها و ثقلها و غمها حتى دفعتها عنك يد القدرة و اخرجتك الى الارض، فرضيت ان تشبع و تجوع هى و تكسوك و تعرى و ترويك و تظما و تظلك و تضحي و تنعمك ببوسها و تلذذك بالنوم بارقها، وكان بطنها لك وعاء و حجرها لك حِواء و ثديها لك سقاء و نفسها لك وقاء، تباشر حر الدنيا و بردها لك و دونك فتشكرها على قدر ذلك ولا تقدر عليه الا بعون الله و توفيقه۔

تمہارے اوپر تمہاری ماں کا حق یہ ہے کہ تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ تمہیں ایک مدت تک (پیٹ میں) اس طرح اٹھائے رہی کہ اِس طرح کوئی کسی کو نہیں اٹھاتا ہے (یعنی نو ماہ تک تمہارے حمل کو اپنے شکم میں رکھا) اور اپنے میوۂ دل دودھ سے تمہیں خوراک دی کہ اس طرح کوئی کسی کو خوراک نہیں دیتا ہے اپنے کان آنکھ ہاتھ پیر بال کھال سے تمہیں خوراک دی کہ اس طرح کوئی کسی کو نہیں دیتا ہے۔ اپنے کان، آنکھ، ہاتھ، پیر بال، کھال بلکہ اپنے تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ خوشی خوشی تمہارا بوجھ اٹھائے پھرتی رہی۔ اگرچہ اس کی وجہ سے مسلسل زحمتوں اور تکلیفوں اور مشکلوں میں مبتلا رہی، یہاں تک دست قدرت نے تمہیں اس سے جدا کر دیا اور تمہیں زمین پر اتار دیا تو اس نے تمہیں شکم سیر کیا خود بھوکی رہی تمہیں لباس پہنایا خود عریاں رہی، تمہیں سیراب کیا خود پیاسی رہی، خود دھوپ کی شدت میں رہی تمہیں سایہ میں رکھا اس کی بے چینیوں میں تم نے آرام پایا خود بیدار رہی تمہیں سلایا اس کا پیٹ تمہارا

مسکن، اس کا گھر تمہاری حفاظت کا محل تھا اس کے پستان تمہارے دودھ پینے کیلئے چشمہ اور اس کا نفس تمہارا نگہبان تھا تمہارے لئے اس نے سردی وگرمی کو برداشت کیا اس کی ان زحمتوں اور تکلیفوں کا شکریہ ادا کرو لیکن تم خدا کی مدد و توفیق کے بغیر اپنی ماں کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔

لفظ ام یعنی جڑ، بنیاد، ستون حدیث میں بیان ہوا ہے: شراب سے پرہیز کرو کہ یہ ام الخبائث ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ام مشترک معنوی ہے اس کے جامع معنی اصل اور پایہ ہی ہیں [۱] لیکن حقیقی ماں کے معنی میں یہ اتنی شہرت پا چکا ہے کہ اب یہ وہم ہونے لگا کہ اس کے حقیقی معنی ماں ہی ہیں اور دوسرے معنی میں مجازاً استعمال ہوتا ہے۔

قرآن میں لفظ ام کا استعمال

۱۔ حقیقی ماں، واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیه [۲] ہم نے موسیٰ کی والدہ پر وحی کی کہ ان کو دودھ پلا دو۔

۲۔ اصل اور پایہ وستون، مثلاً ام الکتاب، ھو الذی انزل علیك اُمّ الکتاب منه آیات محکمات ھن ام الکتاب و اخر متشابھات [۳] خدا وہ ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے اس کی بعض آیتیں محکمات ہیں اور وہ اس کتاب کی بنیاد و اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہہ ہیں، محکمات اور واضح المعنی آیتوں کو اس لئے ام الکتاب کہا جاتا ہے وہی کتاب بنیاد ہیں اور متشابہہ انہیں کے ذریعہ واضح ہوتی ہیں۔

۳۔ کسی چیز کا مرکز، مثلاً ام القریٰ مکہ مکرمہ کو کہا گیا ہے: لتنذر ام القریٰ کہتے ہیں کہ وہ حجاز کی آبادیوں کا مرکز تھا۔ راغب اور دوسرے صاحبان لغت نے لکھا ہے: مکہ اس لئے ام القریٰ ہے کہ وہیں سے زمین بچھائی گئی ہے روایات کی رو سے مکہ مکرمہ اولین خشک زمین اور پہلا خشک خطہ ہے۔

قرآن مجید میں رسول کی ازواج کو مومنین کی ماں قرار دیا گیا ہے؟ النبی اولیٰ بالمومنین انفسھم و ازواجه امھاتھم [۴] رسول مومنوں کے نفسوں پر خود ان سے زیادہ حق تصرف

---

[۱] نہایۃ ابن اثیر (ام) [۲] قصص: ۷ [۳] آل عمران: ۷ [۴] شوریٰ ۷

رکھتا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں[1]

مذکورہ تینوں معنی، حقیقی ماں، اصل و بنیاد اور مرکز کو ملاحظہ کرنے سے تینوں کا ارتباط و تناسب واضح ہو جاتا ہے۔ ماں؛ جڑ دار درخت کی اور اولاد اس کی شاخ کی مانند ہے، جتنی جڑ تر و تازہ ہوگی اسی لحاظ سے اسکی شاخ تر تازہ ہوگی، والدہ کی شرافت و نجابت اولاد سے عیاں ہوتی ہے۔

ماں کا مشقت اٹھانا

امام زین العابدینؑ حمل کے زمانہ سے ماں کے حقوق کو موضوع بحث قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں: ماں، تمہیں اتنی مدت تک اٹھائے رہی کہ اتنی مدت تک کوئی کسی کو نہیں اٹھاتا ہے یہی چیز قرآن مجید کے دو، سوروں میں پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان ہوئی ہے سورۂ احقاف میں ارشاد ہے:

ووصینا الانسان بوالدیه احسانا حملته امه کرها و وضعته کرها و حمله و فصاله ثلاثون شهرا حتی اذا بلغ اربعین سنة قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتك التی انعمت علیّ و علی والدیّ وان اعمل صالحا ترضاه واصلح لی فی ذریتی انی تبت الیك وانی من المسلمین۔[2]

اور ہم نے انسان کو یہ وصیت کر دی ہے کہ اپنے ماں، باپ کے ساتھ نیکی کرے۔ اس کی ماں رنج و تکلیف کے ساتھ اس سے حاملہ ہوئی اور رنج و کلفت کے ساتھ اسے پیدا کیا اور اس کے حمل و دودھ بڑھائی کی مدت تیس (دو سال چھ) ماہ ہے یہاں تک کہ جب وہ چالیس سال کا ہو گیا تو کہنے لگا: میرے پروردگار مجھے توفیق عطا کر کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں کہ جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا کی ہیں اور میں نیک و صالح عمل کروں جس سے تو مجھ سے خوش ہو جائے اور میری اولاد کو صالح و نیک کردار بنا دے میں تیری طرف پلٹ رہا ہوں اور میں مسلمان و تسلیم شدہ ہوں۔

سورۂ لقمان میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وصینا الانسان بوالدیه حملته امه وهنا علی وهن و فصاله فی عامین

---

[1] احزاب: ۵ [2] احقاف: ۱۵

ان شکر لی و لوالدیك الیّ المصیر۔[1]

ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں وصیت کردی ہے: اس کی ماں نے ان زحمتوں کے ساتھ اس کے حمل کو رکھا۔ اور اس کی شیر خوارگی کا زمانہ دو سال ہے اور اسے ہم نے یہ وصیت بھی کردی ہے کہ وہ میرا اور اپنے والدین کا شکریہ ادا کرے کہ تم سب کو میری ہی طرف آنا ہے۔

دودھ پلانے کا زمانہ ماں کے لئے سختی اور مشقت کا زمانہ ہے۔ انعقاد نطفہ کے وقت سے ماں کی حالت دیگر گوں رہتی ہے یکے بعد دیگرے اس پر تکلیفیں پڑتی رہتی ہیں، یہ بے آرامی اور مشکلیں کیوں پیش آتی ہیں؟ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ یہ اس لئے پیش آتی ہیں کہ ماں اپنے بدن کی انرجی بچہ کو دیتی ہے۔

ماں حمل کے دوران

جیسے جیسے جنین بڑھتا ہے اسی لحاظ سے وہ ماں سے زیادہ طاقت وقوت کو حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ ماں کی ہڈیوں اور اس کے اعصاب کو متاثر کرتا ہے بعض دفعہ وہ سونے اور کھانے سے بھی محروم ہو جاتی ہے حمل کے آخری زمانہ میں تو اس کے لئے چلنا اور اٹھنا، بیٹھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے، لیکن وہ عنقریب پیدا ہونے والے بچہ کی محبت وعشق کی وجہ سے ساری زحمتوں کو برداشت کر لیتی ہے۔

وضع حمل، پیدائش کا وقت ماں کے لئے سخت ترین وقت ہوتا ہے یہاں تک کہ کبھی وہ بچہ کے لئے اپنی جان تک دیدیتی ہے، اس زمانہ میں اس کے سپرد بڑی امانت ہوتی ہے ایک مسافر اس کے ذمہ ہوتا ہے کہ جس کو منزل مقصود تک پہنچانا ہے لہذا اس زمانہ میں ماں کو اس امانت کی حفاظت کے لئے تمام اقدامات کرنا چاہئیں، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے اور کھانے، پینے میں حفظان صحت کے اصول کی رعایت کرنا چاہئے۔

وہ جس مسافر کو اٹھائے ہوئے ہے اس کے سفر کی مدت دو چار ماہ نہیں ہے بلکہ نو مہینے ہیں، جس طرح مسافر سوار ہوتے ہی منزل مقصود پر نہیں پہنچتا ہے یا دس بارہ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے سے منزل پر نہیں پہنچتا ہے بلکہ اس وقت اس کا منزل پر پہنچنا تسلیم کیا جاتا ہے کہ جب وہ سلامتی وحفاظت کے

---
[1] لقمان: ۱۴

ساتھ منزل مقصود پر اتر جاتا ہے، ماں کا مسافر بھی ہر لحظہ خطرہ سے دوچار رہتا ہے اور اسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے لہذا جب وہ پیدا ہو جاتا ہے تو ماں آرام کی سانس لیتی ہے کہ اس نے مسافر کو منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ جنین کے اندر چار ماہ دس دن کے بعد روح پڑ جاتی ہے۔ وہ ماں کے پیٹ میں حرکت کرتا ہے تو ماں کو شدید درد محسوس ہوتا ہے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ خدا کا شکر ادا کرتی ہے کہ الحمدللہ میرا بچہ زندہ ہے اور خدا نے اپنی پیدا کی ہوئی روح اس میں ڈال دی ہے۔

اس طویل وسخت مدت کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ اسے پے در پے کمزور کرتا ہے، پھر دوسرا سخت زمانہ شروع ہوتا ہے اور وہ ہے دودھ پلانے اور رات دن اسکی حفاظت کرنے کا زمانہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں ماں کو بچہ کی ساری ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، یہ زمانہ ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بچہ بول نہیں سکتا وہ اپنے لئے مناسب جگہ کا انتخاب نہیں کرسکتا وہ رو سکتا ہے لیکن کچھ نہیں کرسکتا اس کے رونے ہی سے ماں اسکی ہر ضرورت کو سمجھ لیتی ہے اس زمانہ میں سخت ترین کام بچہ کو صاف ستھرا رکھنا ہے، اس زمانہ میں بچہ کو جو بیماریاں لگ سکتی ہیں، ماں ان کا مقابلہ نہایت ہی صبر وشکیبائی کے ساتھ کرتی ہے۔

دودھ پلانے کا زمانہ

قرآن کی رو سے دودھ پلانے کا زمانہ پورے دو سال ہیں چنانچہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

والوالدات يرضعن اولادهن حولين كاملين لمن اراد ان يتم الرضاعة[1]

مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں گی جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتی ہیں۔

سورہ احقاف کی آیت میں حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ بیان ہوئی ہے "و حمله و فصاله ثلاثون شهرا۔"[2]

دو سال کو تیس ماہ سے کم کر دیا جائے تو حمل کی مدت چھ ماہ بچتی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ حمل کی مدت چھ ماہ ہو؟ فقہا اور مفسرین نے اسلامی روایات کے مطالعہ کی روشنی میں یہ کہا ہے کہ حمل کی مدت کم

---

[1] بقرہ: ۲۳۳ [2] احقاف ۱۵

سے کم چھ ماہ ہے۔ اور دودھ پلانے کی مدت زیادہ سے زیادہ ۲۴ ماہ ہے۔'' جالینوس اور ابن سینا کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا: انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بچے چھ ماہ کے حمل سے پیدا ہوا۔

قرآن مجید کی آیت کے اس ٹکڑے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حمل کی مدت جتنی کم ہوگی دودھ پلانے کی مدت میں اتنا ہی اضافہ کر دیا جائیگا کہ جس سے حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہو جائے اگر وضع حمل چھ ماہ میں ہوا ہے تو چوبیس ماہ دودھ پلائے۔ [1]

فطرت بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ حمل کے زمانہ کی کمی کو دودھ پینے کی مدت میں پورا کیا جائے چنانچہ اسی آیت میں "و فصاله عامین" ہے اور دوسری آیت میں "حولین کاملین" ہے۔

بہرحال مائیں اس ۳۰ ماہ (حمل اور دودھ پلانے) کی مدت میں روحی وجسمی فداکاری سے اپنے بچہ کی خدمت کرتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید شروع میں ماں اور باپ دونوں کے لئے وصیت کرتا ہے لیکن جب تکلیفیں اور خدمتیں بیان کرتا ہے تو صرف ماں کی تکلیفیں بیان کرتا ہے تاکہ انسان کو اس کی فداکاری اور ماں کے عظیم حق سے آشنا کیا جا سکے۔ پھر فرماتا ہے میں نے انسان کو وصیت کر دی ہے: ''ان اشکر لی و لوالدیك'' میرا بھی شکر ادا کرو اور ماں باپ کا بھی شکر ادا کرو میرا شکر اس لئے ادا کرو کہ میں تمہارا خالق اور تمہیں نعمت دینے والا ہوں اور ماں باپ کا شکر یہ اس لئے ادا کرو وہ تم تک میری نعمت پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔

بچہ کی ساخت میں ماں کا حصہ

سورۂ احقاف وسورۂ لقمان میں و وصینا الانسان بوالدیه کے ذریعہ انسان کو ماں باپ کے بارے میں وصیت کی گئی ہے بچہ پر دونوں کا حق ہے لیکن دونوں میں سے کس کا حق زیادہ ہے؟ اس سلسلہ میں قرآن کی آیتوں نے حمل اور دودھ پلانے کے زمانہ کی زحمتوں کے لحاظ سے ماں کو زیادہ حصہ دیا ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۲۱ ص ۳۲۷

جب رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے اور بچہ کے اولین خلیے وجود میں آتے ہیں تو ان میں ماں اور باپ دونوں مساوی طور پر شریک ہوتے ہیں اور بچہ میں دونوں کا حصہ برابر ہوتا ہے۔ لیکن حمل کے دوران اور رحم میں بچہ کو غذا رسانی اور بچہ کے بدن کی ساخت میں ماں کا زیادہ حصہ ہوتا ہے۔

الکسیس کارل لکھتا ہے:

ان اولین خلیوں میں کہ جن سے بعد میں سارے خلیے وجود پذیر ہونگے ان میں ماں، باپ ایک حد تک دونوں ہی شریک ہیں لیکن ماں، نصف خلیوں کی شریک ہونے کے علاوہ اس مرکزی خلیہ کے اطراف میں پروٹوپلاسم، مادۂ اولی کو بھی پُر کرتی ہے اس طرح بچہ کے وجود میں لانے میں اس کا فریضہ باپ سے زیادہ اہم ہے تولید مثل میں باپ کا فریضہ بہت مختصر ہے لیکن عورت کا فرض تقریبا نو ماہ میں پورا ہوتا ہے اس مدت میں بچہ ماں کے خون سے غذا حاصل کرتا ہے۔ [1]

جنین پر ماں کے حالات کا اثر

ماں کے جسمانی حالات اور اسکی غذا وخوراک کے آثار بچہ پر مترتب ہوتے ہیں اسی طرح ماں کے اخلاق وخیالات بھی بچہ پر اثر انداز ہوتے ہیں، اگر کوئی ماں حمل کے زمانہ میں بہت زیادہ ڈرتی ہے اور اس حالت سے اس کے بدن پر نفسیاتی اثر ہوتا ہے مثلاً چہرہ کے رنگ کا فق ہوجانا تو اس سے بچہ کو بھی شدید صدمہ پہنچتا ہے۔

"اعجاز خوراکیہا نامی کتاب میں مرقوم ہے:

اگر حمل کے زمانہ میں کوئی عورت اتنی ڈرتی ہے کہ اس کا رنگ بدل جاتا ہے اور وہ کانپنے لگتی ہے تو اس کے نوزاد کے بدن پر ایک قسم کے داغ پڑ جاتے ہیں، جنھیں چاند گہن کا اثر کہتے ہیں۔ [2]

مختصر یہ کہ ماں کا غم وغصہ، غیظ وغضب، بدبینی، بدخواہی، کینہ توزی اور حسد بلکہ اس کے سارے پسندیدہ اور برے صفات بچہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

---

[1] کودک (گفتار فلسفی) ج ۱ ص ۹۶ منقول از "انسان موجود ناشناختہ" ص ۸۵۔۸۶

[2] اعجاز خوراکیہا ص ۱۷۲

دودھ پلانے کا زمانہ قرآن کی نظر میں

والوالدات یرضعن اولادهن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة و علی المولود له رزقهن و کسوتهن بالمعروف. لا تکلف نفس الا وسعها لا تضار والدة بولدها و لا مولود له بولده وعلی الوارث مثل ذلك فان اراد فصالا عن تراض منهما و تشاور فلا جناح علیهما و ان اردم ان تسترضعوا اولادکم فلا جناح علیکم اذا سلمتم ما آتیتم بالمعروف و اتقوالله واعلموا ان الله بما تعملون بصیر.

"والدہ" لغت عرب میں ماں ہی کو کہتے ہیں، لیکن "ام" کے معنی اس سے زیادہ وسیع ہیں، کبھی ماں کو اور کبھی ماں کی ماں اور کبھی ہر چیز کی اساس وبنیاد کو ام کہا جاتا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ان آیتوں میں قرآن نے بچہ کو دودھ پلانے، ماں، باپ اور اولاد کے مختلف دستورات اور گوناگوں حقوق بیان کئے ہیں:

۱۔ دو سال دودھ پلانا ماں کا مخصوص حق ہے اس زمانہ میں وہی بچہ کی حفاظت کرتی ہے، اگر چہ چھوٹے بچہ کا ولی باپ ہی ہوتا ہے، چونکہ اس مدت میں وہ دودھ اور عواطف کے ذریعہ بچہ کو غذا دیتی ہے اور بچہ کو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا لہذا اسکی حفاظت وسرپرستی بھی اسی کے ذمہ ہوتی ہے۔ بنابرایں حضانت وپرورش کا حق بھی ماں ہی سے مخصوص ہے۔" والوالدات یرضعن اولادهن حولین کاملین " مائیں پورے دو سال تک بچہ کو دودھ پلائیں گی۔

۲۔ کیا بچہ کو دودھ پلانے کی لازمی وحتمی مدت دو سال ہے؟ نہیں بلکہ یہ مدت اس کے لئے جو اس مدت کو پورا کرنا چاہتی ہے" لمن اراد ان یتم الرضاعة " لیکن ماؤں کو یہ حق ہے کہ وہ بچوں کی صحت وسلامتی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مدت کو کم کر سکتی ہیں۔

۳۔ بچہ کو دودھ پلانے کے زمانہ میں عورت کا نفقہ بچہ کے باپ کے ذمہ ہے یہاں تک کہ طلاق لینے کی صورت میں بھی تا کہ ماں فارغ البال ہو کر بچہ کو دودھ پلائے" وعلی المولود له رزقهن و کسوتهن " ان کا روٹی کپڑا بچہ کے باپ کے ذمہ ہے۔

۴۔ ماں باپ میں سے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بچہ کے فائدہ کو اپنے اختلافات پر قربان

کرے اور بچہ کے نفسیات کو نا قابل تلافی نقصان پہنچائے"لا تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده "مردوں کو چاہئے کہ وہ دودھ پلانے کے زمانے میں ماں سے بچہ کولیکر اسے نقصان نہ پہنچائیں اور عورتوں کو چاہئے کہ یہ جوحق ان کو دیا گیا ہے اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔

۵۔اگر باپ کا انتقال ہوجائے تو وارثوں کو چاہئے کہ دودھ پلانے کے زمانہ میں وہ بچہ کی ماں کے اخراجات پورا کریں"و علی الوارث مثل ذالك"

۶۔ بچہ کی دودھ بڑھائی کا حق ماں باپ کو دیا گیا ہے، اگر چہ پہلے جملہ میں دودھ پلانے کی مدت کا تعین ہو چکا ہے۔لیکن ماں باپ بچہ کے جسمانی حالات کے پیش نظر ایک دوسرے کے توافق سے بچہ کا دودھ چھڑا سکتے ہیں۔

فان اراد ا فصالا عن تراض منهما و تشار فلا جناح عليهما۔

۷۔ماں کے دودھ پلانے اور اس کی دیکھ بھال کے حق سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی مگر یہ کہ ماں ہی دودھ نہ پلائے یا وہ کسی وجہ سے دودھ نہ پلا سکے اس صورت میں ارشاد ہے:"لا جناح عليكم ان تسترضعوا اولاكم اذا سلمتم ما اتيتم بالمعروف" آپ اپنا بچہ کسی دائی کو دے سکتے ہیں کہ وہ اسے دودھ پلائے اور اس کی پرورش کرے یا اس کی ماں کا بار ہلکا کرنے کے لئے اسے دائی کے سپرد کر سکتے ہیں کہ وہ اسے صرف دودھ پلائے۔ [1]

قرآن کہتا ہے: دودھ پلانا ماں کا حق ہے جو خدا نے ایک فریضہ کے عنوان سے اس کے ذمہ کیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ماں کے بدن کے اندر یہ دودھ کس طرح بنتا ہے۔

دودھ کیسے بنتا ہے؟

ان لكم فی الانعام لعبرة نسقيكم مما فی بطونه من بين فرث و دم لبنا خالصا سائغا للشاربين۔

بیشک چوپایوں میں تمہارے لئے عبرت ہے ہم تمہیں ان کے پیٹ سے، گوبر وخون کے درمیان سے نکال کر خالص دودھ پلاتے ہیں جو کہ پینے والوں کے لئے لذیذ ہوتا ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۱۳۱ تا ۱۳۵

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ دودھ، ہضم شدہ کھانے اور خون سے نکلتا ہے اسی چیز کو آج فزیالوجی نے ثابت کیا ہے کہ جب کھانا ہضم ہو جاتا ہے تو معدے کے اندر بڑی سطح پر ہزاروں رگیں اس سے مفید اور ضروری عناصر جذب کرتی ہیں اور اس درخت تک پہنچا دیتی ہیں جس کی نوک نتھنوں کی نوک تک پہنچتی ہے ماں کھانا کھاتی ہے، اس کا نچوڑ خون میں داخل ہوتا ہے اور خون سے بچہ بنتا ہے اور جب تک بچہ ماں کے شکم میں رہتا ہے اسے ناف کے ذریعہ سے غذا پہنچتی ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ناف کاٹی جاتی ہے اب اسے خون کے ذریعہ غذا نہیں ملے گی، اب غذا پہنچانے والے قطب کی سوئی ماں کے سینہ کی طرف حرکت کرتی ہے اور پستان کی نوک ہو جاتی ہے اب ریفائنری خون و گوبر کے درمیان سے ایک نئی سیال چیز نکالتی ہے جس کو دودھ کہتے ہیں یہ بچے کے نرم و نازک بدن کے لئے سازگار ہے دودھ خون و فرث کے درمیان سے نکلتا ہے، نہ خون کا تصفیہ ہوا ہے اور نہ غذا ہضم ہوتی ہے۔ پہلے سے آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرے تک نہیں پہنچتا ہے پستان دودھ کا پروٹین مواد بنانے کے لئے بدن کے ذخیرہ کردہ اسید سے استفادہ کرتا ہے۔

دودھ میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں سے بعض خون میں نہیں ہوتی ہیں، وہ پستان کے غدود سے فتی ہیں جیسے کازوئین بعض چیزیں براہ راست خون سے ترشح کے ذریعہ دودھ میں پہنچتی ہیں جیسے وٹامن، نمک، سلفیٹ اور شکر جیسا مواد خون میں موجود شکر سے لیا جاتا ہے اس میں پستان ردوبدل کرتے ہیں اور اس کو موثر چیز میں تبدیل کرتے ہیں۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ دودھ، غذائی مواد کے جذب ہونے کے نتیجہ میں خون کے ذریعہ بنتا ہے اور خون کا ارتباط براہ راست پستان کے غدود سے ہے لیکن نہ دودھ میں فرث کی بو آتی ہے نہ اس کا رنگ آتا ہے سائنس داں کہتے ہیں: پستان میں ایک لیٹر دودھ بننے کے لئے اس عضو سے کم سے کم پانچ سو لیٹر خون گزرنا چاہئے تاکہ وہ ایک لیٹر دودھ کے لئے خون سے ضروری مواد کو اخذ کر سکے اور رگوں میں ایک لیٹر خون پیدا ہونے کے لئے کافی غذا درکار ہوتی ہے، یہاں ”من بین فرث و دم“ کا مفہوم بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ [۱]

---

[۱] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر ج ۶ ص ۷۱ تا ۷۷

دودھ میں، سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، میزیم، روی، لوہا، اسی طرح فاسفور، کلر وغیرہ اور آکسیجن اکسائیڈ کاربن بھی دودھ میں پائی جاتی ہے، دودھ میں شکر بھی ہوتی ہے۔ دودھ میں وٹامن بی، پی، اے اور وٹامن ڈی بھی ہوتی ہے رسولؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: لیس یجزی مکان الطعام والشراب الا اللبن کھانے اور پانی کی کمی کو صرف دودھ پورا کرتا ہے۔ [1]

دودھ طاقتور ترین چیز

دودھ، ایسی خالص ولذیذ غذا ہے جو ہر سن وسال کے انسان کے لئے بچپنے سے ضعیفی تک مفید اور سازگار ہے یہی وجہ ہے کہ بیماروں کے لئے دودھ تجویز کیا جاتا ہے، ہڈیوں کی مضبوطی کے لئے دودھ نہایت ہی مفید ہے چنانچہ ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو اس کے لئے دودھ بتایا جاتا ہے۔

خلوص کے ایک معنی پیوند اور جوڑنے کے ہیں شاید قرآن نے انہیں معنی کے پیش نظر، دودھ کو ''لبنا خالصا'' کہا ہے کہ ہڈی جوڑنے میں اس کا اہم اثر ہوتا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ رضاعت (دودھ پلائی) کے اسلامی احکام میں بھی یہ معنی پوری وضاحت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو ہمیں فقہا یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اگر کوئی بچہ کسی ماں کا اتنا دودھ پیتا ہے کہ جس سے ہڈی مضبوط ہو جائے اور گوشت بن جائے تو یہ بچہ اس کا محرم ہے دوسری طرف یہ کہتے ہیں:

پندرہ بار یہاں تک کہ ایک رات دن میں پے در پے دودھ پینے سے بچہ محرم بن جاتا ہے۔ اگر ہم ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھیں تو کیا ان کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ ایک رات دن دودھ پینے سے ہڈی مضبوط اور بدن فربہ ہوتا ہے؟ [2]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلامی دستورات میں دودھ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے یہاں تک کہ فقہی کتابوں میں تحریر ہے: بچہ کی زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے اسی وجہ سے بچہ کو دودھ پلانے کو واجبات میں قرار دیا گیا ہے۔ [3]

---

[1] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر ج ۶ ص ۱۰۰ [2] تفسیر نمونہ ۱۱ ص ۲۹۲ [3] شرح لمعہ، کتاب النکاح ج ۵ ص ۴۵۲

شاید اسی وجہ سے کہ سورۂ قصص کی ساتویں آیت میں حضرت موسیٰ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیه فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم۔

اور ہم نے موسیٰ کی ماں پر وحی کردی تھی کہ موسیٰ کو دودھ پلا دو اور جب تمہیں ان کے بارے میں کوئی خوف ہو تو انہیں دریا میں چھوڑ دو۔

ماں کی بہت سی خصلتیں اور عادتیں دودھ کے ذریعہ بچہ میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ حضرت علیؑ نے محمد حنفیہ کی کمر پر مارا اور فرمایا: ''ادرکك عرق من امك'' یہ ڈرنے والی رگ تم نے اپنی ماں سے ورثہ میں پائی ہے۔ شیر خوارگی کے زمانہ میں رسولؐ نے صرف جناب حلیمہ سعدیہ ہی کا دودھ قبول کیا تھا دوسری عورتوں کا دودھ نہیں پیا تھا۔

ماں ہمہ تن بچہ کی خدمت میں

ماں بچہ کی پیدائش ہی سے تمام وقت اسکی خدمت میں گزارتی ہے اگر کبھی ماں لمحہ بھر کے لئے بھی اس سے غافل ہو جائے تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں رات دن اسکی نگہداشت کی وجہ سے ماں کا آرام و چین چھن جاتا ہے لیکن مادری محبت و سرشت کی وجہ سے یہ ساری تلخیاں اس کے لئے شہد جیسی شیریں بن جاتی ہیں اس چیز کو امام زین العابدینؑ نے ''مستبشرۃ بذالك'' کے جملہ میں بیان فرمایا ہے۔

ماں کی محبت

محبت، انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے، انسان کے ساتھ ساتھ محبت طلبی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ کھانے، پانی کے بعد انسان کو محبت کی ضرورت ہوتی ہے ماہرین نفسیات نے محبت کو شدید ترین روحی ہیجان قرار دیا ہے۔ صرف بچپنے میں ہی انسان کو محبت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ عمر کے ہر موڑ پر کسی نا کسی صورت میں انسان کو محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔

محبت طلبی اور شفقت جوئی کے جلوہ کو بچوں کے اندر دیکھا جا سکتا ہے چنانچہ اگر ان سے محبت میں کمی آ جاتی ہے تو وہ ماں باپ سے لپٹ جاتے ہیں اور اگر کسی بچہ سے زیادہ محبت ہو جاتی ہے تو دوسرے بچے اس سے حسد کرنے لگتے ہیں بڑی عورتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سوتن سے گلہ مند رہتی ہیں اور جوان دلوں کو موہ لینا چاہتے ہیں یا ان پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔

بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ بچوں کو ایک خاص ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت ماں کے بدن کی گرمی و حرارت، اس کی لوریوں اور اس کے پیار و محبت سے پوری ہوتی ہے اور اگر اس کی اس ضرورت کو پورا نہ کیا جائے تو اس کا اس کے جسم و روح پر بہت برا اثر ہوگا۔ ایک مشہور انسان شناس اس نظریہ سے متاثر تھا وہ اپنی تقریر میں کہتا تھا:

نوزاد بچوں کو پیدائش کے بعد ان کی ماؤں کے پہلو میں لٹایا جائے انہیں پرورش گاہ میں نہیں بھیجنا چاہئے کیونکہ پرورش گاہ میں ان کو ماں کے بدن کی گرمی و حرارت نہیں ملے گی جس کی ان کو ضرورت ہوتی ہے۔

بعض ماہرین نفسیات تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ماں بعض وجوہ کی بنا پر بچہ کے پاس نہ رہ سکے تو دوسری عورت کو چاہئے کہ وہ بچہ کی اس ضرورت کو پورا کرے انہیں اسباب کی بنا پر پرورشگاہ بنائی گئیں ہیں۔

کیا نوزاد ماں کی محبت و حرارت کے فقدان کا احساس کرتا ہے؟

نوزاد اس زمانہ میں بول نہیں سکتا بنا برایں اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے کچھ تجربہ گاہ بنائی گئیں لیبارٹی وجود میں آئی۔ اور وہاں بندر کے بچوں کے لئے ایک مصنوعی ماں بنائی گئی اور اسے ان کے پاس رکھ دیا گیا تو بندر کے بچے اس بناوٹی ماں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے جیسے بچہ حقیقی ماں کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے۔ بندر کے بچوں نے لکڑی اور اسفنج وغیرہ سے بنی ہوئی ماں کو حقیقی ماں کا جانشین سمجھ لیا تھا۔ واضح رہے یہ کاٹھ کی ماں جو حقیقی ماں کی جانشین تھی بندر کے بچوں کو دودھ پلاتی تھی لیکن اس میں اس کے بدن جیسی گرمی و حرارت نہیں تھی وہ انہیں گود میں نہیں لے سکتی تھی اسے پیٹھ پر سوار نہیں کر سکتی تھی۔

اس تجربہ گاہ میں یہ دیکھا گیا کہ جب بندر کے بچہ کو کوئی تکلیف وخوف محسوس ہوتا تھا تو وہ اس کاٹھ کی ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ کیا اس تجربہ اور تحقیق سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بندر اور انسان کے بچہ کو اپنی ماں کے بدن کی گرمی کی ضرورت ہے؟

ماں کی فدا کاری

ماں بچہ کے وجود کو اپنے وجود پر مقدم کرتی ہے اور کبھی بچہ پر قربان ہو جاتی ہے، وہ اپنی آنکھ میں پڑنے والے خار کی تکلیف برداشت کر لیتی ہے لیکن بچہ کے رونے کو برداشت نہیں کرتی ہے۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: وہ اسے سیراب کرتی ہے خود پیاسی رہتی ہے اسے کپڑا اڑھاتی ہے خواہ خود کو نہ چھپا سکے۔

ماں کو بچہ سے دو طرح کی محبت ہوتی ہے، ایک حسی دوسرے عقلی واورا کی، ماں کی حسی محبت تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے کہ وہ بچہ کی آنکھ سے بہتے ہوئے آنسو کو نہیں دیکھ سکتی اس کے رونے کی آواز کو نہیں سن سکتی، عقلی محبت یہ ہے کہ جب اس کا بچہ بیمار ہو جاتا ہے تو وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہے اور ضرورت کے وقت اسے آپریشن کے لئے ڈاکٹر کے سپرد کر دیتی ہے وہ اس کا آپریشن کرتا ہے، باوجودیکہ ماں آنسو بہا رہی ہے لیکن برداشت کرتی ہے، اگر ہم اس سے معلوم کریں تم نے اپنا بچہ ڈاکٹر کے حوالے کیوں کر دیا؟ تو وہ جواب دے گی چونکہ مجھے اس کی سلامتی وصحت سے محبت ہے لہذا میں اس کے بڑے فائدہ کے لئے اس مختصر تکلیف کو برداشت کر رہی ہوں۔ اور وہ فائدہ بچہ کی سلامتی اور صحت ہے جو کہ میرا اصل مقصد ہے۔

جنت، ماں کے پاؤں کے نیچے

ماں کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جنت، ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔ جبکہ دوسری جگہ یہ فرمایا ہے کہ جنت ان مجاہدوں کی تلواروں کے نیچے ہے جو راہ حق میں جہاد کرتے ہیں ماں کے حق

کے سلسلہ میں رسولؐ سے جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

قال رسول الله الجنة تحت اقدام الامهات: جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

قال موسیٰ بن عمران: یا رب اوصنی! قال: اوصیك بی۔ قال: فقال: رب اوصنی! قال: ثم من؟ قال: اباك۔ قال: اوصیك بی ثلاثا۔ قال: رب اوصنی! قال: اوصیك بامك۔ قال: یا رب اوصنی! قال: اوصیك بامك۔ قال: یا رب اوصنی! قال: اوصیك بابیك۔

موسیٰ بن عمران نے تین بار خدا سے التجا کی کہ مجھے نصیحت فرمایئے! ہر دفع یہی ندا آئی میں تمہیں اپنے بارے میں تاکید و نصیحت کرتا ہوں پھر عرض کی پھر! ارشاد ہوا تمہارے والد کے بارے میں پھر عرض کی: اس کے بعد فرمایا: میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں تاکید کرتا ہوں، میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں تاکید کرتا ہوں میں تمہیں تمہاری ماں کے بارے میں تاکیدکرتا ہوں۔

جاء رجل الی النبی فقال یا رسول الله !من ابر ؟ قال أمك، قال: ثم من؟ قال: امك قال: ثم من ؟ قال: امك۔ قال: ثم من ؟قال: اباك۔

ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی! اے اللہ کے رسولؐ میں کس کے ساتھ نیکی کروں؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ عرض کی پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ۔ عرض کی: پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ۔ اس کے بعد عرض کی: پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنے والد کے ساتھ۔

مذکورہ دونوں روایتوں سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ ماں کا حق زیادہ ہے یا باپ کا؟

جواب یہ ہے کہ ماں کے تین حصے ہیں اور باپ کا ایک حصہ۔ کیونکہ ماں، حمل، دودھ پلانے اور پروان چڑھانے کے زمانہ میں زحمت اٹھاتی ہے اگر چہ باپ، ماں اور بچے دونوں کا خرچ برداشت کرتا ہے اور اس کی زندگی کی ہر ضرورت کو پورا کرتا ہے، لیکن وہ لمحہ بھر میں بچہ کو ماں کے حوالہ کر کے الگ ہو جاتا ہے اس کے بعد اسے ماں ہی پروان چڑھاتی ہے۔

ماں کی خدمت یا جنگ کا محاذ؟

جاء رجل وامه الی النبی وهویرید الجهاد وامه تمنعه فقال النّبی صلی اللّٰه علیه آله : عند امك قر وان لك من الاجر عندها مثل ما لك فی الجهاد۔

ایک جوان جو کہ جہاد پر جانا چاہتا تھا اور اس کی ماں اسے منع کرتی تھی اپنی والدہ کے ساتھ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسولؐ نے فرمایا: تم اپنی ماں کی خدمت رہو۔ تمہارا وہی ثواب ہے جو جہاد کرنے والوں کا ہے۔

باپ کا حق

واما حق ابيك فتعلم انه اصلك وانّك فرعه وانك لولاه لم تكن ، فمهما رايت في نفسك مما يعجبك فاعلم ان اباك اصل النعمة عليك فيه و احمد الله واشكره على قدر ذلك ، ولا قوة الا باللّه.

تمہارے اوپر تمہارے باپ کا حق یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ تمہاری اصل و بنیاد ہے اور تم اس کی شاخ و فرع ہو اگر وہ نہ ہوتے تو تمہارا وجود نہ ہوتا پس جب تم اپنے اندر کوئی ایسی چیز دیکھو کہ جو تمہیں خود پسندی میں مبتلا کر دے تو اس وقت تم یہ خیال کرو کہ اس نعمت کا سبب تمہارا باپ ہے اور اس پر خدا کا شکر و ثنا کرو اور خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

باپ اصل اور بیٹا فرع

حضرت امام زین العابدینؑ اس حق کے پہلے جملہ میں ایک علمی و فلسفی اصل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور وہ اصل یہ ہے کہ معلول علت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر علت نہ ہو تو معلول بھی نہیں ہوگا بلکہ معلول کا وجود ایک غیر مستقل وجود ہے یہ اصل ساری مادی دنیا میں کارفرما ہے۔ امام زین العابدینؑ باپ کی عظمت کو اولاد کے گوش گزار کر رہے ہیں اور واضح لفظوں میں فرماتے ہیں: باپ اصل ہے اور اولاد فرع ہے اگر اصل نہ ہو تو فرع و شاخ کا وجود بھی نہیں ہوگا۔ پس اولاد میں جو صفت بھی پیدا ہوتی ہے وہ اپنی اصل کی غماز ہوتی ہے۔

ایک دوسرا موضوع جس کی طرف امام زین العابدینؑ اشارہ فرماتے ہیں یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے اور کمال کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو ممکن ہے اس وقت باپ کی مادی ترقی موقوف ہوگئی ہو یا عنقریب موقوف ہو جائے گی۔ اس مادی حرکت میں باپ رو بزوال ہے اور بیٹا رو بہ کمال۔ باپ دن بدن کمزوری اور ناتوانی محسوس کرتا ہے اور بیٹا، طاقت، تازگی و فرحت محسوس کرتا ہے اور خود کو باپ سے زیادہ قوی سمجھتا ہے ممکن ہے یہاں اسے غرور ہو جائے اور خود کو باپ سے برتر و بلند سمجھنے لگے اور باپ کے

احترام کے فریضہ کو پورا نہ کرے۔

امام زین العابدینؑ بیٹے کو یہ بات سمجھاتے ہیں جب تمہارے اندر کوئی ایسا احساس بیدار ہو اور خدانخواستہ تم خود پسندی میں مبتلا ہو جاؤ تو اس وقت تم یہ سوچنا کہ تمہارا جو بھی کمال و ہنر ہے اس کا سبب تمہارا باپ ہے تمہارا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تم نے یہ بات سوچ لی تو تم عجب و خود پسندی سے نجات پا جاؤ گے۔

اس حق میں امام زین العابدینؑ نے تیسرا موضوع یہ بیان فرمایا ہے کہ نعمت کی معرفت اور تشکر کی حس بیدار کرنے کے لئے نعمت کا شکر ضروری ہے جب بچہ اس بات کی طرف متوجہ ہوگا تو اپنے فریضے کو سمجھے گا کہ اس نے خدا کے مقرر کردہ تمام فرائض کو انجام دیدیا ہے اور والدین کے عاق کرنے سے جو نقصان پہنچ سکتا تھا اس سے اس نے نجات حاصل کر لی ہے۔ آخر میں امام اس بات کی وضاحت فرماتے ہیں کہ باپ کے حق کی طرف متوجہ ہونا اور اس نعمت کو پہچاننا اور اس سے متعلق فرائض کو انجام دینا صرف خدا کی توفیق ہی سے نصیب ہوتا ہے لہذا خدا ہی سے ان امور کی توفیق طلب کرنا چاہیے۔

ہم نے ماں کے حق کے ذیل میں سورۂ لقمان واحقاف کی دو آیتیں نقل کی ہیں ان میں انسان کو یہ وصیت کی گئی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرے، یہاں ہم ان حدیثوں کی روشنی میں باپ کے مرتبہ کو بیان کریں گے جو ان آیتوں کی تفسیر کے عنوان سے نقل ہوئی ہیں۔

احادیث میں باپ کا مرتبہ

محمد بن یحییٰ، عن احمد بن محمد بن عیسیٰ، وعلی بن ابراهیم عن ابیه، جمیعا عن الحسن بن محبوب، عن ابی ولاد الحناط قال: سئلت ابا عبد الله علیه السلام عن قول الله عز و جل وبالوالدین احسانا، ما هذا الاحسان؟ فقال: الاحسان ان تحسن صحبتهما وان لا تکلفهما ان یسالاك شیئا مما یحتاجان الیه وان کانا مستغنیین، الیس یقول الله عز وجل: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔

محمد بن یحییٰ نے احمد بن عیسیٰ اور علی بن ابراہیم نے ... رانہوں نے اپنے والد سے اور سب نے حسن بن محبوب سے انہوں نے ابو ولاد حناط سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام صادقؑ سے اس آیت ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو کے بارے میں سوال کیا: یہ احسان کیا ہے؟ ماں باپ کے ساتھ ان کے ساتھ رہنے اور زندگی گزارنے میں جہاں تک ہو سکے نیکی کرو اور انہیں اس چیز کے مانگنے کی زحمت نہ دو کہ جس کی ان کو ضرورت ہے۔ خواہ وہ مستغنی اور بے نیاز ہی ہوں اور قرآن مجید کی دوسری آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک تم اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہیں کرو گے نیکی تک نہیں پہنچ سکو گے۔

روایت کے دوسرے ٹکڑے میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ثم قال ابو عبدالله علیه السلام واما قول الله عز وجل اما یبلغن عندك الکبر احدهما او کلاهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما قال : ان اضجراك فلا تقل لهما اف ، ولا تنهرهما ان ضرباك. قال: وقل لهما قولا کریما قال : ان ضرباك فقل لهما: غفر الله لکما ،فذلك منك قول کریم ـ قال: واخفض لهما جناح الذل من الرحمة قال: لا تملا عینیك من النظر الیهما الا برحمة ورقة ولا ترفع صوتك فوق اصواتهما ولا یدك فوق ایدیهما ولا تقدم قدامهما. [۱]

پھر امام صادقؑ نے فرمایا: لیکن خداوند عالم کا یہ قول: جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو ان کے سامنے اف تک نہ کہو اور انہیں جھڑکو نہیں۔ یعنی اگر تمہیں ماریں تو بھی اف نہ کرو ان سے نرم لہجہ میں بات کرو اور وہ اس طرح کہ اگر وہ تمہیں ماریں تو تم یہ کہو: خدا آپ دونوں کی مغفرت کرے یہی تمہارا کریم قول ہے اور انکساری سے ان کے سامنے اپنے شانوں کو جھکا دو یعنی انہیں محبت و الفت کی نظر سے دیکھو اور ان کی آواز پر آواز بلند نہ کرو، اور نہ ان کے ہاتھ اٹھانے پر ہاتھ نہ اٹھاؤ اور ان کے آگے آگے نہ چلو۔ یعنی انہیں کسی بھی اعتبار سے رنج نہ پہنچاؤ۔

اصول کافی کے اسی باب کی دوسری حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ابن محبوب ، عن خالد بن نافع البجلی عن محمد بن مروان قال :

۱۔ اصول کافی ج ۲ ص ۱۵۷

سمعت ابا عبدالله عليه السلام يقول: ان رجلا اتى النبى صلى الله عليه وآله فقال : يا رسول الله!اوصنى ۔ فقال: لا تشرك بالله شيئا وان حرقت بالنار و عذبت الا و قلبك مطمئن بالايمان ، و والديك فاطعهما و برّهما حيين او ميتين ،وان امراك ان تخرج من اهلك و مالك فافعل فان ذلك من الايمان۔ [1]

ابن محبوب نے خالد بن نافع بجلی سے انہوں نے مروان سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام جعفر صادقؑ سے سنا کہ فرماتے ہیں: ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے وصیت و نصیحت کیجئے آپ نے فرمایا: خدا کا شریک نہ قرار دو خواہ تمہیں آگ میں جلا دیا جائے اور تمہیں سخت ترین سزا دی جائے لیکن تمہارا دل مطمئن ہو اور ماں باپ کی اطاعت کرو اور ان کے ساتھ نیکی کرو خواہ زندہ ہوں یا مردہ اگر وہ تمہیں اہل و مال سے دست بردار ہونے کا حکم دیں تو اس پر بھی عمل کرو اس کا تعلق ایمان سے ہے۔

اس باب کی پانچویں حدیث میں رسولؐ نے باپ کے احترام کو مدنظر رکھا ہے:

علی بن ابراهيم عن محمد بن عيسىٰ بن عبيد ، عن يونس بن عبدالرحمن ، عن درست بن ابى منصور عن ابى الحسن موسى عليه السلام قال : سال رجل رسول الله صلى الله عليه وآله : ما حق الوالد على ولده؟ قال : لا يسميه ولا يمشى بين يديه ولا يجلس قبله ولا يستسب له۔ [2]

علی بن ابراہیم نے محمد بن عیسیٰ بن عبید سے انہوں نے یونس بن عبدالرحمٰن سے انہوں نے درست بن ابی منصور سے انہوں نے امام موسیٰ کاظمؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک شخص نے رسولؐ سے دریافت کیا: بیٹے پر باپ کا کیا حق ہے؟ فرمایا: باپ کا نام نہ لے راستہ چلنے میں اس پر سبقت نہ کرے اس کے سامنے نہ بیٹھے اور ایسے کام نہ کرے کہ جس سے باپ کو برا کہا جائے۔ بنا بر این بیٹے کا فرض ہے کہ وہ ماں باپ کا احترام کرتا رہے۔

اس باب کی تیرہویں حدیث میں بیان ہوا ہے:

---

[1] ہمان ص ۱۵۷ [2] ایضا

محمد بن یحییٰ ...عن ابراهیم بن شعیب قال قلت لابی عبدالله ان ابی قد کبر جدا و ضعف فنحن نحمله اذا اراد الحاجة؟ فقال: ان استطعت ان تلی ذلك منه فافعل و لقمه بیدك فانه جنة لك غدا.[۱]

محمد بن یحییٰ نے چند واسطوں سے ابراہیم بن شعیب سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت امام صادقؑ سے عرض کی: میرے والد بوڑھے ہو گئے ہیں اور اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ ضروریات کے لئے بھی مجھے لے جانا پڑتا ہے۔ کیا میرے لیے ایسا کام کرنا صحیح ہے؟ آپ نے فرمایا اگر تم ایسا کام کر سکتے ہو تو اسے ضرور انجام دو، اپنے ہاتھ سے انہیں کھانا کھلاؤ کہ اس کی جزا میں تمہیں قیامت میں جنت کا باغ ملے گا۔

اس حدیث کے ذریعہ امام صادقؑ اولاد کو یہ درس دینا چاہتے ہیں کہ جس طرح تم ایک دن کمزور و ناتواں تھے اور باپ تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں رفع حاجات کے لئے لے جاتا تھا اب تمہارا فریضہ ہے کہ ایسا کام کرو۔

آج تو بوڑھوں کے لئے اولڈ فالکس ہوم (Old Folks home) بنا دیئے گئے ہیں کہ جہاں وہ تنہا، بے کس، بیمار و مریض رہتے ہیں اسی طرح کچھ بوڑھے رضا کارانہ طور پر وہاں زندگی گزارتے ہیں اگر چہ یہ کام صحیح ہے لیکن یہ افسوس کی جا ہے کہ بیٹے اور پوتے ایسے اداروں کے ذریعہ ایسے مقاصد پورے کراتے ہیں جو انسانی و اخلاقی اصولوں کے منافی ہیں اور باپ دادا کو زبردستی سے گھر اور خاندان سے نکال کر اولڈ فالکس میں پہنچا دیتے ہیں ان کی اس حرکت سے انہیں دلی صدمہ ہوتا ہے اور ان کا غم و اندوہ بڑھ جاتا ہے جس سے وہ جلد مر جاتے ہیں ماں باپ کا حق اتنا عظیم ہے کہ اگر وہ مسلمان بھی نہیں ہیں تو بھی اسلام نے ان کے احترام کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی ہے اسی باب کی پندرہویں حدیث میں اس طرح ہے:

علی بن ابراهیم ...عن عنبس بن مصعب، عن ابی جعفر علیه السلام قال: ثلاث لم یجعل الله عز و جل لاحد فیهن رخصة: اداء الامانة الی البر والفاجر: و بر الوالدین برین کانا او فاجرین۔[۲]

---

[۱] اصول کافی ج ۲ ص ۱۶۲ [۲] ایضا

علی بن ابراہیم نے چند واسطوں سے عنبسہ بن مصعب سے اور انہوں نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے کسی کو تین چیزیں چھوڑنے کی اجازت نہیں دی ہے: امانت ادا کرنے کی خواہ نیک آدمی کی ہو یا بدکار کی، عہد پورا کرنے کی خواہ نیک سے کیا ہو یا بد سے اور ماں باپ کے ساتھ احسان و نیکی کرنے کی خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔

جوانوں کا فریضہ

مذکورہ احادیث سے، اسلام کا عقیدہ رکھنے والے اور رسولؐ کی پیروی کرنے والے جوانوں کا فریضہ معین و مشخص ہو گیا، جوانوں کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کے اوپر ماں باپ کا بہت بڑا حق ہے انہیں ماں باپ کا حق شناس ہونا چاہئے ان سے لاپروائی اور ناراض ہونے سے پرہیز کرنا چاہئے خواہ ماں باپ اپنے فریضہ کو بخوبی انجام نہ دیں، امام صادقؑ فرماتے ہیں:

من نظر الی ابویه نظر ماقت وهما ظالمان له لم یقبل الله له صلوٰة [1]

جو شخص اپنے ماں باپ کو غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے اگر چہ انہوں نے اپنی اولاد کے فرائض کو پورا نہ کیا ہو، تو بھی خدا اسکی نماز قبول نہیں فرماتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر ماں باپ نے بیٹے پر ظلم بھی کیا ہے تو بھی بیٹے کو اس سے چشم پوشی کرنا چاہئے۔

باپ کے قتل کا اثر

محمد بن سہیل سے منقول ہے کہ منتصر کے زمانہ خلافت میں، میں نے ایک قالین دیکھا کہ جس پر بادشاہوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور ان کے نیچے فارسی میں لکھا ہوا تھا، میں نے اس کو غور سے دیکھا تو مجھے ایک بادشاہ کی تصویر نظر آئی کہ جس کے سر پر تاج ہے اور اس کے نیچے مرقوم ہے کہ یہ "شیرویہ" کی تصویر ہے جس نے اپنے باپ خسرو پرویز کو قتل کیا تھا۔ لیکن اپنے باپ کو قتل کرنے کے بعد یہ

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۳۴۹

چھ ماہ سے زیادہ بادشاہت نہیں کر سکا۔ پھر میں نے دوسرے بادشاہوں کی تصویریں دیکھیں میری نگاہ قالین کے بائیں طرف پڑی تو ایک بادشاہ کی تصویر نظر آئی جس کے نیچے تحریر تھا کہ یہ تصویر یزید بن ولید بن عبدالملک کی ہے جس نے اپنے چچا ولید بن یزید بن عبدالملک کو قتل کیا تھا اس کی بادشاہت کی مدت بھی چھ ماہ ہے پھر میں نے منتصر کی تصویر دیکھی، میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ منتصر کی حکومت بھی چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوگی کیونکہ اس نے بھی اپنے باپ کو قتل کیا ہے۔ ل

بنی عباسی میں سے ایک خلیفہ متوکل بھی گزرا ہے وہ امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابی طالب سے بغض رکھتا تھا اگر کبھی آپ کا ذکر کرتا تو صرف ابوتراب کہتا تھا، اپنے دربار میں آپ کی شان میں گستاخی کیا کرتا تھا، منتصر عباسی اس کا بیٹا تھا جو اس کا ولیعہد تھا اور جوان تھا وہ اپنے باپ سے اسلئے ناراض رہتا تھا کہ وہ حضرت علیؑ بن ابی طالب کی شان میں گستاخی کرتا ہے کبھی تو وہ کھلے لفظوں میں باپ پر اعتراض کر دیتا تھا اور کبھی خاموش رہتا تھا۔ ایک روز متوکل کے دربار میں ملک کے سربرآوردہ لوگ جمع تھے کہ متوکل نے بے ادبی سے آپ کا نام لیا، منتصر کو اس بات پر غصہ آگیا اور نہایت ہی تند لہجہ میں باپ پر اعتراض کیا۔ متوکل نے لوگوں کے سامنے منتصر کو سرزنش کی اور یہ شعر پڑھا:

غضب الفتی لابن عمه   راس الفتی فی حر اُمّه

اس جوان کو دیکھو کہ اپنے چچا کے بیٹے کی حمایت میں غضبناک ہو رہا ہے اپنی ماں کی ایسی تیسی میں جائے۔

پچیس سالہ جوان منتصر کی پورے ملک کے سربرآوردہ لوگوں کے سامنے ہتک ہوگئی چونکہ یہ گستاخی اور توہین ناقابل برداشت تھی لہذا اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور اس نے اپنے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا۔

متوکل کا قتل اور اس کا اثر

جب منتصر نے اپنے باپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیا اس وقت دربار میں چند غلام ترک تھے

ل تتمۃ المنتہی ص ۲۴۳

جومتوکل کے راز دار تھے منتصر نے اپنا منصوبہ ان کے سامنے بیان کیا اوران کے تعاون سے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا۔

ایک رات متوکل نے اپنے مخصوص محل میں بزم مے کشی سجائی اور اپنے ندیموں کے ساتھ نصف شب تک مے کشی میں مشغول رہا محل کے تکلفات کے انچارج بغاء صغیر نے کہا: اب خلیفہ کے آرام کا وقت ہے۔ سب اس کے محل سے نکل گئے وہاں صرف فتح بن خاقان باقی بچا جو متوکل کا مقرب تھا۔ اسی وقت غلاموں نے تلواروں سے حملہ کر دیا فتح بن خاقان نے خلیفہ کی جان بچانے کی خاطر خود کو اس کے اوپر گرا دیا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا دونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور اسی رات میں انہیں خون آلودہ تلواروں سے منتصر کو خلیفہ کے عنوان سے سلامی دی گئی۔

اس ماجرے میں اگر چہ متوکل (فرض ناشناس باپ) خود اپنے قتل کا سبب بنا ہے اور حضرت رسول کی اس حدیث کا مصداق قرار پایا ہے کہ۔ یا علی! لعن الله والدین حملا ولدهما علیٰ عقوقهما [۱] اے علی! خدا لعنت کرے ان والدین پر جو اپنے بچوں کو اپنے عاق کرنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن دوسری طرف باپ کے قتل کے وضعی آثار کا نتیجہ یہ ہوا کہ منتصر بھی چھ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔

متوکل کی سرزنش اور لعنت ملامت کے سبب انتقام کی آگ شعلہ ور ہوگئی اور اپنے ہی بیٹے کے ہاتھ سے مارا گیا اس سلسلہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں: الافراط فی الملامة تشب نیران اللجاج [۲] زیادہ ملامت وسرزنش کرنے سے انتقام وعناد کی چنگاریاں بھڑکتی ہیں۔

بیٹے پر باپ کا فقہی حق

محقق اردبیلی کہتے ہیں: العقل والنقل یدلان علی تحریم العقوق ویفهم وجوب متابعة الوالدین و طاعتهما من الآیات والاخبار... وقال الفقهاء: للوالدین منع الولد عن الغزو، والجهاد مالم یتعین علیه بتعیین الامام علیه السلام او بهجوم الکفار علی المسلمین۔ [۳]

---

[۱] جوان "گفتار فلسفی" ص ۳۶۲ [۲] تحف العقول ص ۸۴ [۳] حاشیہ اصول کافی ج ۲ ص ۳۴۹

عقل و نقل دونوں ہی والدین کی نافرمانی کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور آیات و روایات سے والدین کی اطاعت کا واجب ہونا سمجھ میں آتا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں فقہاء کہتے ہیں: ماں باپ اپنے بچہ کو جنگ و جہاد پر جانے سے روک سکتے ہیں بشرطیکہ محاذ پر جانے کے لئے امام کا حکم نہ ہو یا کافروں نے مسلمانوں کے شہروں پر حملہ نہ کیا ہو۔

کتاب "قواعد" میں شہید نے اس طرح تحریر فرمایا ہے:

لا ریب ان کل مایحرم او یجب للاجانب یحرم او یجب للابوین و ینفردان بامور : ١۔تحریم السفر بغیر اذنہ[1] و کذا السفر المندوب ۔٢۔ قال بعضھم : یجب علیہ طاعتھما فی کل فعل و ان کان شبھۃ لان طاعتھما واجبۃ و ترک الشبھۃ مستحب ۔٣۔لو دعواہ الی فعل و قد حضرت الصلوٰۃ فلیتاخر الصلوٰۃ و لیطعھما ۔ ٤۔لھما منعہ من الصلوٰۃ جماعۃ فی بعض الاحیان ۔ ٥۔ لھما منعہ من الجھا د مع عدم التعین۔[1]

جو بھی غیروں پر حرام ہے وہی ماں باپ پر حرام ہے یا جو کچھ غیروں پر واجب ہے وہی والدین پر واجب ہے۔ لیکن کچھ چیزوں میں وہ منفرد ہیں: ١۔ مباح سفر ماں باپ کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتے ٢۔ بچہ پر ماں باپ کی اطاعت واجب ہے اگر چہ مشتبہ ہو کیوں کہ اطاعت واجب ہے اور شبہہ کو چھوڑنا مستحب ہے ٣۔ اگر والدین اس سے کوئی کام کہیں اور نماز کا وقت بھی ہو گیا ہو تو نماز میں تاخیر کر کے ان کی اطاعت کرے ٤۔ بعض اوقات ماں باپ بیٹے کو نماز جماعت میں شریک ہونے سے روک سکتے ہیں ٥۔ ماں باپ بیٹے کو جہاد اور محاذ پر جانے سے منع کر سکتے ہیں بشرطیکہ تعین نہ ہوا ہو۔

---

[1] حاشیہ اصول کافی ج ٢ ص ٣٤٩

اولاد کا حق

اما حق ولدك فتعلم انه منكو مضاف اليك فى عاجل الدنيا بخيره و شره و انك مسئول عما وليته من الادب و لادلالة على ربه والمعونة له على طاعته فيك و فى نفسه فمثاب على ذلك و معاقب ، فاعمل فى امره عمل المتزين بحسن اثره عليه فى عاجل الدنيا، المعذر الى ربه فيما بينك و بينه بحسن القيام عليه والاخذ له منه ، ولا قوة الا بالله۔

تمہارے اوپر بیٹے کا یہ حق ہے تم یہ جان لو کہ وہ تمہارا ہی ہے دنیا میں تمہیں سے وابستہ ہے اور اس کا خیر وشر بھی تمہاری ہی طرف منسوب ہوتا ہے اور یہ ذمہ داری تمہاری ہے کہ اسے ادب سکھاؤ، اسکے پروردگار کی طرف اس کی راہنمائی کرو اور اسکی اطاعت میں اسکی مدد کرو اگر تم اس ذمہ داری کو پورا کرو گے تو ثواب پاؤ گے اور اگر اس کی انجام دہی میں کوتاہی کرو گے تو سزا پاؤ گے۔ پس اس کے لئے اس طرح نیک عمل کرو کہ اس کا حسن و جمال دنیا میں آشکار ہو جائے اور اس کی جو بہترین سرپرستی تم نے کی ہے اور جو نتیجہ تم نے حاصل کیا ہے وہ خدا کی بارگاہ میں تمہارے اور اس کے درمیان ایک عذر ہو جائے۔

امام زین العابدینؑ نے اولاد کے حقوق سے متعلق اس حصہ میں جو نکات بیان فرمائے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ باپ کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اولاد اسی کی ہے اور دنیا و آخرت میں اس کا خیر و شر بھی اسی سے منسوب ہوتا ہے۔

۲۔ اس کی تعلیم تربیت اور خدا کی طرف اس کی راہنمائی کرنے کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔

۳۔ اولاد کے عمل کے آثار سے غفلت نہیں برتنا چاہئے کیونکہ اس کی نیکی کا ثواب اور اس کی بدکاری کا عذاب ملے گا۔

۴۔ اس کے کمال و ترقی کے لئے اتنی کوشش کرنا چاہئے کہ جس سے خدا کی بارگاہ میں بیٹے کے

سلسلہ میں عذر قابل قبول ہو جائے۔

امام زین العابدینؑ نے پہلے ماں باپ کے حقوق بیان فرمائے اور والدین کے سلسلہ میں جو اوالد کا فریضہ ہے اسے واضح کیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک کے دوسرے پر برابر کے کیا حقوق ہیں۔ والدین پر اولاد کے جو حقوق ہیں انہیں مذکورہ حصہ میں بیان کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بچے کی شخصیت کی بنیاد اسی وقت سے پڑتی ہے جب مرد و عورت خلقت کی سنت کے مطابق شادی کرتے ہیں اور یہ بات وہ جانتے ہیں کہ ان کے وجود کے درخت کا پھل وہ اولاد ہیں جو پیدا ہونگی اور معاشرہ کا حصہ بنیں گی۔ اولاد کی شخصیت کا ایک رخ وہ اخلاق و عادات ہیں جو ماں باپ سے میراث کے طور پر اولاد میں منتقل ہوتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اولاد ماں باپ کے اخلاق و افکار کا آئینہ ہیں، یہ وہ موروثی صفات ہیں جو قانون تخلیق کے مطابق بعد والی نسل کو پہلی نسل سے میراث میں ملتے ہیں، یہ قانون انسانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ نباتات وحیوانات میں بھی جاری ہے، یہ ایک وسیع موضوع ہے جس کے لئے مفصل بحث درکار ہے اس کتاب میں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

جب بچہ خدا کے حکم سے مادی دنیا میں آتا ہے اسی وقت دین اسلام والدین کے دوش پر بڑی ذمہ داریاں عائد کر دیتا ہے پہلے مرحلہ میں والدین کو چاہئے کہ ان ذمہ داریوں کو پہچانیں اور دوسرے مرحلہ میں ان کی انجام دہی کے لیے خدا سے توفیق طلب کریں اب ہم اختصار کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہیں۔

کامیابی وسعادت کے حصول کے لئے والدین کو دو اصل کی طرف توجہ کرنا چاہئے: ۱۔ مفید استعداد اور صلاحیتوں کو زندہ کریں ۲۔ مضر اور نقصان دہ خواہشات اور رجحانات کو ختم کریں شائستہ اور لائق مربی وہ ہے کہ جو تدریجی طور پر بچے کی اندرونی استعدادوں کو علمی وعملی نگہداشتوں کے سہارے پروان چڑھائے اور اس کو عدم سے وجود میں لائے اور والدین سے وراثت میں ملنے والی نامطلوب صفات کا نشان تک مٹادے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

بیٹے کے لئے باپ پر تین چیزیں واجب ہیں اسے اس کی والدہ کے سپرد کرے اچھا نام رکھے اور اس کی تربیت میں کوشاں رہے۔

امام زین العابدینؑ نے صحیفۂ سجادیہ میں بچوں سے متعلق دعا میں فرمایا ہے:

اور اے اللہ! ان کی تربیت و تادیب میں اور ان کو نیک بنانے میں میری مدد فرما۔

ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد کی پرورش و تربیت بہت مشکل کام ہے اور اس کی انجام دہی کے لئے خدا ہی سے توفیق مانگنا چاہئے۔

اولاد کے حقوق

جس دن بچہ پیدا ہوتا ہے اسی دن سے والدین پر اس کے حقوق عائد ہو جاتے ہیں پہلا موضوع اس کا نام رکھنا ہے نام رکھنے کے بارے میں احادیث میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے ان احادیث میں سے بعض یہ ہیں:

قال النبی : من حق الولد علی الوالد ان یحسن اسمه و یحسن ادبه [۱]

رسولؐ نے فرمایا: اولاد کا ماں باپ پر ایک حق یہ بھی ہے کہ وہ ان کا اچھا نام رکھیں اور ان کی اچھی تربیت کریں۔

نبیؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: اپنے بچوں کے نام انبیاء کے نام پر رکھو اور بہترین نام عبداللہ و عبدالرحمٰن ہے۔

رسولؐ نے فرمایا: والد پر، اولاد کے تین حق ہیں، ان کا اچھا نام رکھے ان کو لکھنا سکھائے اور جب بالغ ہو جائیں تو انکی شادی کرے۔

اس حدیث میں کتابت سکھانے اور شادی کرنے کے علاوہ ان کا اچھا نام رکھنے کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ اولاد کے حقوق کے بارے میں نہج البلاغہ کے کلمات حکمت میں حضرت علیؑ اس طرح فرماتے ہیں:

---

[۱] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۶۱۸

باپ پر بیٹے کا یہ حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو اچھا ادب سکھائے اور اس کو قرآن کی تعلیم دے۔

اس حدیث میں بھی نام کے انتخاب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

رسولؐ نے برے ناموں کو بدلا

رسولؐ نے لوگوں اور جگہوں کے برے ناموں کو بدلا اور ان کے اچھے نام رکھے اس سلسلہ میں درج ذیل نمونے ملاحظہ فرمائیں:

عن جعفر بن محمد عن ابيه : ان رسول الله كان يغير الاسماء القبيحة في الرجال و البلدان.[1]

امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد سے اور انہوں نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ رسولؐ لوگوں اور شہروں کے برے ناموں کو بدل دیتے تھے۔

عن ابن عمر ان ابنة لعمر كانت يقال لها عاصية ، فسماها رسول الله صلى الله عليه وآله جميلة.[2]

عمر کی ایک لڑکی تھی جس کا نام عاصیہ، یعنی گناہگار، تھا رسولؐ نے اس کا نام بدل کر جمیلہ رکھدیا تھا۔

عن ابى رافع ان زينب بنت ام سلمه كان اسمها برة ، فقيل : تزكى نفسها فسماها رسول صلى الله عليه وآله زينب.[3]

ابورافع سے روایت ہے کہ، زینب بنت ام سلمہ کا نام برہ تھا یعنی نیک منش جس سے تکبر و غرور اور خود پسندی کی بو آتی تھی، بعض لوگ اس کے بارے میں یہ کہتے تھے: اس نام کے ذریعہ وہ اپنی پاکیزگی کا اظہار کرنا چاہتی ہے رسولؐ نے اس کو بے حرمتی اور تحقیر سے بچانے کے لئے اس کا نام زینب رکھدیا۔

عن احمد بن هيثم عن الرضاؑ:قال قلت له : لم يسمى العرب اولادهم

۱۔ کودک (گفتار فلسفی ج۲ ص۲۲۸؛ بہ نقل از قرب الاسناد ص۴۵

۲۔ ایضا ۳۔ ایضا؛ بہ نقل از صحیح مسلم ج۶ ص۱۷۳

بکلب و فهد و نمر واشباه ذلك ؟ قال :كانت العرب اصحاب حرب وكانت تهول علی العدو باسمآء اولادهم۔[1]

احمد بن ہیثم سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام رضا سے دریافت کیا: عرب اپنے بچوں کے نام کتوں، چیتوں وغیرہ کے نام پر کیوں رکھتے تھے؟ آپ نے فرمایا: عرب جنگجو اور لڑاکو تھے اس لئے اپنی اولاد کے یہ نام رکھتے تھے تاکہ جب ان کو آواز دیں تو دشمن کے دل میں خوف ہراس پیدا ہو۔

برا نام حقارت و سرزنش کا سبب

خانہ بدوش عربوں کے ایک رئیس و سردار کا نام "جاریہ" تھا جاریہ کے بارے میں صاحب اقرب الموارد لکھتے ہیں کہ جاریہ افعی کی جنس میں سے ایک سانپ ہے اور جاریہ ایک طاقتور صریح اللہجہ مرد تھا۔ وہ اور اس کا خاندان معاویہ سے ناراض تھا اور دل میں اس کی دشمنی رکھتا تھا اس بات کو معاویہ بھی تاڑ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ برسر عام اسکی توہین کرے اور اس کے نام کا مذاق اڑائے۔

اتفاقاً ایک دن جاریہ معاویہ کے روبرو ہوا معاویہ نے اس سے کہا: تم اور تمہارا قبیلہ تمہاری قوم والوں کے نزدیک کتنا پست ہے کہ انہوں نے تمہارا نام سانپ رکھا ہے، جاریہ نے برجستہ جواب دیا: تم اور تمہارا خاندان تمہاری قوم والوں کی نظر میں کتنا پست و حقیر ہے کہ انہوں نے تمہارا نام کتیا رکھا۔

اس بات پر معاویہ کو بہت غصہ آیا اور کہنے لگا: او بے ماں کے بچے چپ ہو جا۔ انہوں نے جواب دیا: میری ماں ہے خدا کی قسم جن دلوں میں تمہاری دشمنی ہے وہ ہمارے سینوں میں ہیں، معاویہ نے کھسیا کر کہا: خدا معاشرہ میں تم جیسے لوگوں کی کثرت نہ کرے۔[2]

دوسرا نمونہ شریک بن اعور ہے یہ بھی اپنی قوم کا سردار، معاویہ کا ہم عصر، کریہ المنظر تھا اور اس کا نام شریک تھا جو کہ انسان کے لئے بہت اچھا نام نہیں ہے اور اس کے باپ کا نام اعور تھا اور اعور اس شخص کو کہتے ہیں جس کی آنکھ میں عیب ہوتا ہے۔

جس زمانہ میں معاویہ کا عروج تھا شریک بن اعور معاویہ کے دربار میں پہنچا معاویہ نے کہا:

---

[1] حمان: بہ نقل از وسائل الشیعہ ج ۵ ص ۱۱۵ [2] کودک گفتار فلسفی ج ۲ ص ۲۲۹ اس میں المستطرف ج ۱ ص ۵۸ سے منقول ہے

تمہارا نام شریک ہے اور خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔تم اعور کے بیٹے ہو لیکن اعور یعنی آنکھ کے عیب سے محفوظ ہو تم بدشکل ہو اور خوبصورت بدصورت سے اچھا ہوتا ہے پھر تمہارے خاندان والوں نے تمہیں اپنا سردار و رئیس کیسے بنالیا؟!

شریک نے جواب دیا خدا کی قسم تم معاویہ ہو اور معاویہ اس کتے کو کہتے ہیں عوعو کرتا ہے، تم نے عوعو کیا تو لوگوں نے تمہارا نام معاویہ رکھدیا، تم حرب کے بیٹے ہو اور صلح وسلامتی حرب، یعنی جنگ، سے بہتر ہے، تم صحرہ، پتھر، کے بیٹے اور نرم زمین سنگلاخ سے بہتر ہوتی ہے پھر تم امیر المومنین کیسے بن گئے؟ اس کی ان باتوں نے معاویہ کو پانی پانی کر دیا تو معاویہ نے کہا: تم میرے دربار سے ابھی چلے جاؤ۔ [1]

جس طرح ٹیڑھا کبڑا بدن، ناقص اعضا اور کریہہ صورت باعث اہانت وحقارت ہوتی ہے اسی طرح برا نام ولقب بھی باعث حقارت واہانت ہوتا ہے لہذا اسلام نے تاکید کی کہ اپنے بچوں کے اچھے نام رکھو کہ ان کی شخصیتوں پر ناموں کا اچھا اثر ہوگا اور یہ نام انہیں اہانت وحقارت کے احساس سے محفوظ رکھے گا۔

والدین کے دوسرے فرض کی طرف امام زین العابدینؑ نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے:

وانك مسئول عما وليته من حسن الادب والد لالة علىٰ ربه باپ بچے کی اچھی تربیت اور اسے خدا سے آشنا کرنے کا ذمہ دار ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ روایات میں بچوں کی اچھی تربیت کرنے کے بارے میں کیا احکام وارد ہوئے ہیں۔

بچے کی تربیت میں محبت کا اثر

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس طرح اسے بدن وجسم کے لئے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اسے روح اور نفسیات کے لیے بھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے، جسم کو ماں کے دودھ اور خدا کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں سے غذا ملتی ہے جو اس کے جسم کے مطابق ہیں لیکن روحی غذا ضروری تعلیم اور اس کی صحیح دیکھ بھال ہے کہ اس فریضہ کو اسکے والدین پورا کرتے ہیں، بچہ کو غذا بھی چاہئے اور محبت بھی، محبت اس

---

[1] ثمرات الاوراق ص ۵۹

کی روح کی غذا ہے۔

رسولؐ فرماتے ہیں:

احبـو االـصبيـان و رحـمـوهم فاذا دعوتموهم ففوالهم فانهم لا يرون الا انكم ترزقونهم۔ [1]

بچوں سے محبت کرو اور ان سے پیار و الفت کرو اور اگر ان سے کوئی وعدہ کرو تو اسے پورا کرو کیونکہ بچے یہ سمجھتے ہیں کہ تم ہی ان کے رازق ہو۔

اس حدیث میں تربیت کے دو اہم موضوعات کی طرف اشارہ ہوا ہے: ۱۔ بچوں سے محبت کرنا ۲۔ ان سے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرنا تاکہ ان کے اندر بچپنے ہی سے وعدہ خلافی اور پیمان شکنی کی فکر پیدا نہ ہو۔

ان پر محبت ظاہر کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب تک وہ بچے ہیں ان کا منھ چومو! انہیں پیار کرو۔ رسولؐ فرماتے ہیں:

قبلـوا اولا دكـم فـان لـكم لكل قبلة درجة فى الجنة ما بين كل درجتين خمسمأة عام۔ [2]

اپنے بچوں کا بوسہ لو کیونکہ ہر بوسہ کے عوض خداوند عالم تمہارے لئے ایک درجہ قرار دیتا ہے۔ اور ہر درجے کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔

اس سے متعلق حضرت علیؑ بن ابی طالب فرماتے ہیں:

قبـلة الـولـد رحـمة و قبـلـه المراة شهوة ،وقبلة الوالدين عبادة ، و قبلة الرجل اخاه دين۔ [3]

بچہ کا بوسہ لینا رحمت ہے اور عورت کا بوسہ لینا شہوت ہے۔ ماں باپ کو چومنا عبادت ہے اور اپنے بھائی کو چومنا دین ہے۔

غیر والدین کے لئے بوسہ لے کر اظہار محبت کرنے کا ایک مخصوص زمانہ ہوتا ہے، اس زمانہ

۱۔ مکارم الاخلاق ص۲۱۹ ۲۔ عمان ص۲۲۰ ۳۔ ایضا

کے ختم ہوتے ہی اس سے بوسہ لیکر اظہار محبت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

اذا بلغت الجارية ست سنين فلا تقبلها، والغلام لا تقبله المراة اذا جاوز سبع سنين۔[1]

جب لڑکی چھ سال کی ہو جائے تو مرد کو اس کا منہ نہیں چومنا چاہئے

اور جب لڑکا سات سال کا ہو جائے تو عورت کو اس کا منہ نہیں چومنا چاہئے۔

رسولؐ، حسنؑ و حسینؑ سے محبت رکھتے تھے اور ان کا بوسہ لیتے تھے، ایک روز اقرع بن حابس رسولؐ کی خدمت میں حاضر تھا، آنحضرتؐ اپنے نواسوں کا بوسہ لے رہے تھے، اس نے کہا: میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے ان میں سے کبھی کسی کا منہ نہیں چوما ہے آپ نے فرمایا: اگر خدا نے تمہارے دل سے محبت کو چھین لیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔

اس گفتگو کے ذریعہ رسولؐ یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد سے اظہار محبت نہیں کرتا ہے تو وہ سنگدل ہے۔

محبت میں افراط

اسلام جہاں والدین کے اوپر یہ فرض کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں سے محبت کریں وہاں انہیں محبت میں افراط کرنے سے بھی منع کرتا ہے اور ان کی زیادہ محبت کے نقصان کو بھی بیان کرتا ہے، امام محمد باقرؑ: فرماتے ہیں:

بدترین والدین وہ ہیں جو اپنی اولاد کے ساتھ نیکی و محبت کرنے میں افراط سے کام لیتے ہیں

اور بدترین اولاد وہ ہیں جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کی وجہ سے باپ کو ناراض کرتے ہیں۔

اولاد سے زیادہ محبت کی وجہ سے جو بدبختی و ناکامی ہوتی ہے اس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہوا ہے۔ بچہ سے زیادہ کرنا اس کو خود پسندی میں مبتلا کر دیتا ہے اور اسے خود رائے بنا دیتا ہے حضرت علیؑ فرماتے ہیں: شر الامور الرضا عن النفس[2] خود پسندی اور خود سے راضی ہونا

---

[1] مکارم الاخلاق ص ۲۲۳۔ [2] شرح غرر الحکم ج ۴ ص ۱۷۳

بدترین حالت ہے۔

لڑکیاں بہترین اولاد ہیں

خداوند عالم ماں، باپ کو جو اولاد عطا کرتا ہے انہیں ان کی قدر کرنا چاہئے اور انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ان کے پاس خدا کی امانت ہے اور ان کی تربیت کے لئے کوشش کرنا چاہئے اور ان سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا چاہئے اولیائے اسلام لڑکیوں سے زیادہ محبت کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اور تمام ائمہ علیہم السلام کی حدیث میں لڑکیوں کے بارے میں زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

عن حذیفه الیمانی قال : قال رسولؐ خیر اولادکم البنات [1]

حذیجہ یمانی سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: لڑکیاں تمہاری بہترین اولاد ہیں:

و عنه قال البنات حسنات والبنون نعمة ، فالحسنات یثاب علیها والنعمة یسال عنها [2]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: لڑکیاں حسنات ونیکیاں ہیں اور لڑکے نعمت ہیں، نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ اور نعمت کے بارے میں باز پرس کی جاتی ہے۔

و بشر النبی بابنة فنظرفی وجوه اصحابه فرای الکراهیة فیهم . فقال : مالکم ؟ ریحانة اشمها ورزقها علی الله۔

رسول کو یہ بشارت دی گئی کہ آپ کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے، یہ خبر سن کر اصحاب کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔

آپ نے فرمایا: تمہیں کیا ہوگیا؟ لڑکی ایک پھول ہے جس کو ہم سونگھتے ہیں اور اس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے۔

قال رسول اللّه نعم الولد البنات المخدرات ،من کانت عنده واحدة جعلها الله سترا له من النار ومن کانت عنده اثنتان ادخله الله بهما الجنة وان کن

---

[1] مکارم الاخلاق ص ۲۱۹   [2] ایضاً ص ۲۲۰

ثلاثا او مثلهن من الاخوات وضع عنه الجهاد و الصدقة۔

بہترین اولاد وہ لڑکیاں جو پردہ کرتی ہیں، جس کے یہاں ایک لڑکی ہوتی ہے خدا اسے اس کے ماں باپ کے لئے جہنم سے بچنے کا ذریعہ و پردہ بنا دیتا ہے اور جس کے یہاں دو لڑکیاں ہوتی ہیں، ان لڑکیوں کے ذریعہ خدا اس کو جنت میں داخل کرتا ہے اور جس کے یہاں تین لڑکیاں یا بہنیں ہوتی ہیں اس سے خدا صدقہ و جہاد کا حکم اٹھا لیتا ہے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جو شخص بازار جائے اور اپنے عیال کے لئے کوئی تحفہ خریدے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو محتاج لوگوں کو صدقہ دیتا ہے اور دیکھو بیٹیوں کو بیٹوں پر مقدم کرنا چاہئے کیونکہ جس نے بیٹی کو خوش کیا گویا اس نے حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے کسی غلام کو آزاد کیا۔[1]

بچوں کی تربیت اس طرح کرو کہ جس سے تمہاری عزت ہو

بچوں کے حق کے سلسلہ میں امام زین العابدینؑ اس طرح فرماتے ہیں: **فاعمل فی امره عمل المتزین بحسن اثره فی عاجل الدنيا،** اپنے بچہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو کہ تمہاری تربیت کی وجہ سے دنیا میں اس کا حسن دوبالا ہو جائے اور اس کو اس طرح پروان چڑھاؤ کہ وہ اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں عزت و سربلندی کی زندگی بسر کرے اور تمہارے لئے بھی باعث فخر ہو۔

اس بات کو ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اولاد سے زیادہ محبت کرنا اس کی خود پسندی کا باعث ہوتا ہے اور زیادہ محبت کا ایک ناقابل تلافی نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچہ کے اندر کبھی خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکے گی بچہ کے اندر خود اعتمادی اور مستقل مزاجی کا احساس پیدا کریں تاکہ وہ مشکلوں کا مقابلہ کر سکے۔ یہ چیز ہمیں لقمان کی نصیحتوں میں نظر آتی ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

عن الصادقؑ قال قال لقمان يا بنى ان تادبت صغيرا انتفعت به كبيرا ومن عنى بالادب اهتم به و من اهتم به تكلف علمه و من تكلف علمه اشتد له طلبه

---

[1] مستدرک الوسائل ج۲ ص۶۱۵

و من اشتد له طلبه ادرک به منفعته۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں: لقمان نے کہا: بیٹے! اگر تم نے بچپنے میں ادب سیکھ لیا تو اس سے بزرگی میں استفادہ کرو گے اور جو ادب سیکھنا چاہتا ہے وہ اس سلسلہ میں جانفشانی کرتا ہے اور جو ادب سیکھنے کے لئے ہمت و جانفشانی کرتا ہے وہ تربیت سے متعلق علوم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جو طلب علم کے لئے سنجیدگی سے کوشش کرتا ہے وہ اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے اور اس کے فوائد اسی کو نصیب ہوتے ہیں۔

بنی الزم نفسك التؤده فی امورك و صبر علی مؤنات الاخوان نفسكَ فان اردت ان تجمع عز الدنیا فاقطع طمعك مما فی ایدی الناس فانما بلغ الانبیاء والصدیقون ما بلغوا بقطع طمعهم۔[1]

پیارے بیٹے! ہمیشہ اپنی نجی ذمہ داریوں اور ذاتی کاموں کی انجام دہی کو اپنے اوپر لازم کر لو اور جو مصائب و شدائد لوگوں کی طرف سے تمہارے اوپر پڑتے ہیں ان کو برداشت کرنے کے لئے خود کو آمادہ رکھو اگر تم دنیا کی عظیم عزت و سرفرازی حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان چیز کی امید نہ رکھو جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ انبیاء و صدیقین جس بلندی و عظمت پر فائز ہوئے ہیں وہ لوگوں سے امید قطع کرنے ہی کے باعث ہوئے ہیں۔

جناب لقمان نے اپنے فرزند کو جو وصیت کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے اندر روح اعتماد کی پرورش کرو اور جو چیز لوگوں کے پاس ہے اس کی طمع نہ کرو ہر باپ کو یہی نصیحت کرنا چاہئے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی ہے۔

---

[1] کودک (گفتار فلسفی) ج ۲ ص ۲۹۳۔۲۹۴

بھائی کا حق

اما حق اخیك فتعلم انه یدك التی تبسطها و ظهرك الذی تلتجیء الیه و عزك الذی تعتمد علیه و قوتك التی تصول بها، فلا تتخذه سلاحا علی معصیة الله ولا عدة للظالم بحق الله ، ولا تدع نصرته علی نفسه و معونته علی عدوه والحول بینه و بین شیاطینه و تادیة النصیحة الیه و الاقبال علیه فی الله ، فان انقاد لربّه و احسن الاجابة له والا فلیکن الله آثر عندك واکرم علیك منه۔

تمہارے بھائی کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ تمہارا ہاتھ ہے اور تمہارے لئے پشت پناہ ہے کہ جہاں تم پناہ گزیں ہوتے ہو وہ تمہاری عزت ہے کہ جس پر تم اعتماد کرتے ہو اور وہ تمہاری قوت ہے کہ جس کے ذریعہ تم حملہ کرتے ہو پس اسے خدا کی معصیت و نافرمانی کا ذریعہ و حربہ نہ بناؤ اور اس کے وسیلہ سے خدا کی مخلوق پر ظلم نہ کرو تم اس کے حق میں اس کی مدد کرو اور اس کے دشمن کے خلاف اسکی نصرت کرو اسکے اور شیطان کے درمیان حائل ہو جاؤ اور اسے نصیحت کرنے میں پورا حق ادا کرو اور اسے خدا کی طرف بلاؤ پھر اگر وہ اپنے پروردگار کا مطیع ہو جائے اور اس کے حکم کو تسلیم کرے تو فبہا، ورنہ تمہارے نزدیک خدا کو مقدم ہونا چاہئے اور اسے تمہارے لئے عظیم ہونا چاہئے۔

امام زین العابدینؑ نے بھائی کے حق کے سلسلہ میں تین چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

۱۔ بھائی ایک بازو ہے اور پشت پناہ ہے لہذا اسے گناہ و معصیت کا آلۂ کار نہ بناؤ۔

۲۔ دشمن کے خلاف اسکی مدد کرو

۳۔ اسے شیطان کے تسلط سے نجات دلاؤ اسے خدا کی طرف بلاؤ اور اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو تم خدا کے حکم کا پاس و لحاظ کرو نہ سرکش بھائی کا۔

اسلام میں اخوت کی قسمیں

اسلام و قرآن کے اہم مسائل میں سے اخوت و برادری بھی ہے، اخوت کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ حقیقی اور سگا بھائی یہ دو انسانوں کا نزدیک ترین رشتہ سمجھا جاتا ہے اور ایک دوسرے سے میراث لینے کا باعث ہوتا ہے اور اسلامی فقہ کی میراث میں یہ دوسرے طبقہ میں ہے ۲۔ برادر ایمانی، حقیقت یہ ہے کہ ایمان واسلام نے سارے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے یہ اسلام ہی ہے جو دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد وحدت کا باعث بن گیا ہے۔

''اخ'' کے معنی لغت میں بھائی اور مصاحب ورفیق کے ہیں اسکی اصل ''اَخَوْ'' ہے ''اخو'' اس شخص کو کہتے ہیں جو ماں، باپ یا ان میں سے کسی ایک میں دوسروں کا شریک ہوتا ہے، مفردات میں دودھ شریک کو بھائی کہا گیا ہے، اب وام کی طرح اخ بھی کثیر الاستعمال ہے مفردات میں اس کے اصلی معنی بیان کرنے کے بعد تحریر کیا ہے: جو بھی کسی دوسرے کے ساتھ قبیلہ، دین، صنعت، معاملے اور مودت ومحبت میں شریک ہوتا ہے اسے اخ کہا جاتا ہے، لفظ اخ قرآن مجید میں حقیقی ومجازی دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔

دائرۃ المعارف میں فرید وجدی تحریر کرتے ہیں: کہتے ہیں: اخوان اخ کی جمع ہے جس کے معنی رفیق وساتھی ہیں یعنی اگر اخ کے معنی حقیقی بھائی ہے تو اس کی جمع اِخوۃ اور اگر اس کے معنی دوست ہیں تو اس کی جمع اخوان ہے لیکن وجدی کی یہ بات صحیح نہیں لگتی کیونکہ قرآن مجید میں اخوانھن استعمال ہوا ہے اور اس سے حقیقی بھائی مراد ہیں قرآن کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِخْوہ، اخوان کے درمیان یہ فرق ہے کہ اخوان حقیقی اور غیر حقیقی دونوں بھائیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اِخوہ صرف حقیقی بھائی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے: سورۂ یوسف میں ارشاد ہے: لا تقصص رؤیاك علی اخوتك اور سورۂ نساء میں ارشاد ہے: فان کان لہ اخوۃ فلامہ السدس مگر دوسری آیت، انما المومنون اخوۃ کی رو سے برادر ایمانی حقیقی بھائی ہیں۔

اسلامی اخوت کی اہمیت

قرآن مجید کہتا ہے: انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون [1]

---

[1] حجرات: ۱۰

مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں لہذا اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادو اللہ سے ڈرو شاید تم پر رحم کیا جائے۔

یہ آیت ایک عمیق و پرمعنی نعرہ کو بیان کررہی ہے اسلام نے مسلمانوں کے درمیان رشتہ برقرار کرنے پر اتنا زور دیا ہے کہ انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا حقیقت یہ ہے کہ اسلام سارے مسلمانوں کو ایک خاندان قرار دیتا ہے اور اس چیز کو حج کے عبادی وسیاسی مراسم میں دیکھا جا سکتا ہے سبھی ایک کو دوسرے کو بھائی سمجھتے ہیں اگر چہ کوئی مغرب سے اور کوئی مشرق سے آتا ہے یہ تھا قرآن کا بیان اب رسولؐ کے کلام پر توجہ فرمائیں فرماتے ہیں:

المسلم اخوالمسلم لا یظلمه ولا یخذله ولا یسلمه [1]

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے اور نہ اسے حوادث کے حوالے کرتا ہے۔

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں:

مثل الاخوین مثل الیدین ، تغسیل احداهما الاخری [2]

دو دینی بھائیوں کی مثال دونوں ہاتھوں کی سی ہے کہ ایک دوسرے کو دھوتا ہے۔

رسول نے برادران اسلام کو ایک پیکر کے دو ہاتھوں کی مانند فرض کیا ہے یہ بہترین مثال ہے کہ سارے مسلمان ایک پیکر اور اس کے افراد اس پیکر کے ہاتھ ہیں۔

مومن، مومن کا بھائی

امام صادقؑ اس موضوع کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں:

عن ابی عبدالله : المومن اخوالمومن عینه و دلیله لا یخونه ولا یظلمه ولایغشه ولا یعده عدة فیخلفه [3]

مومن مومن کا بھائی ہے وہ اسے آنکھ کی مانند راستہ دکھاتا ہے وہ ہرگز اس سے خیانت نہیں کرتا

---

[1] محجۃ البیضاء ج ۳ ص ۳۳۶ [2] ایضا [3] اصول کافی ج ۲ ص ۱۶۶

ہے اور نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے دھوکا دیتا ہے اور نہ اس سے وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

ابو بصیر کہتے ہیں: میں نے امام صادقؑ سے سنا کہ فرماتے ہیں: مومن، مومن کا بھائی ہے سب ایک بدن کے اعضاء کی مانند ہیں اگر ان میں سے کسی میں درد ہوتا ہے تو سارے اعضاء بے چین ہو جاتے ہیں۔ ان کی روحوں کا سرچشمہ ایک ہے اور مومن کی روح خدا سے ایسے ہی متصل ہے جیسے سورج سے شعاع میں متصل ہوتی ہیں۔[۱]

اخوت بہت بڑی نعمت ہے

قرآن مجید نے سورۂ آل عمران میں اخوت کی نعمت کا ذکر کیا ہے: ارشاد ہے:

واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاو لا تفرقوا وانکروا نعمت اللّٰہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً[۲]

تم سب اللہ کی رسی (قرآن و اہل بیت کے دامن) کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ اندازی سے پرہیز کرو اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس وقت خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی تھی پس اس کی نعمت کے سبب تم بھائی بھائی بن گئے۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ عرب کے دو بڑے قبیلے اوس و خزرج کے درمیان بہت پرانی دشمنی تھی رسولؐ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ان کے درمیان صلح کرا دی تھی اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کے درمیان کبھی کبھی ٹھن جاتی تھی اور رسولؐ ان میں جھگڑا نہیں ہونے دیتے تھے۔

رسولؐ نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اگر کسی کو کسی سے محبت ہے تو اسے چاہیے کہ اس سے محبوب کو مطلع کرے کیونکہ اس سے محبت و اخوت میں دوام و استحکام پیدا ہوتا ہے۔ قال: **احب احدکم اخاہ فلیخبرہ**[۳]

۱۔ اصول کافی ج ۲ ص ۱۶۶ ۲۔ آل عمران: ۱۰۳ ۳۔ محجۃ البیضاء ج ۳ ص ۳۳۱

جب تم میں سے کوئی کسی مسلمان سے محبت کرے تو اسے چاہئے کہ وہ اس محبت سے اسے مطلع کرے۔

مومن سے ملاقات کرنے کا ثواب

کافی میں ایک باب "باب زیارۃ الاخوان" ہے اس باب میں مومن سے ملاقات کرنے کے ثواب سے متعلق بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

امام صادقؑ فرماتے ہیں: جو شخص کسی مومن سے خدا کے واسطے ملاقات کرتا ہے خدا اس سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندہ سے ملاقات کی ہے تمہارا اجر و ثواب میرے اوپر ہے اور تمہارے اس عمل کا ثواب میں جنت کے علاوہ پسند نہیں کرتا ہوں۔ [1]

ایک روایت امام باقرؑ سے منقول ہے:

ابو حمزہ نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: جب مسلمان اپنے بھائی سے ملاقات کے لئے اپنے گھر سے نکلتا ہے اور اس ملاقات سے اس کا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے تو خداوند عالم اس پر ستر ہزار فرشتوں کو مقرر کر دیتا ہے جو اسکے پیچھے پیچھے ندا دیتے ہوئے چلتے ہیں تم خوش نصیب ہو جنت مبارک ہو یہاں تک کہ وہ اپنے گھر لوٹ آتا ہے اسلام ایسے ہی حکم دیتا ہے کہ جن سے مسلمانوں کے اتحاد ہم آہنگی کی حکایت ہوتی ہے اور اسلام انہیں دستور کے زیر سایہ مومنوں کی زندگی کو خوشگوار بناتا ہے۔

برادران اوران کے فرائض حضرت علیؑ کی نظر میں:

حضرت علیؑ فرماتے ہیں، بھائی دو قسم کے ہوتے ہیں معتمد اور قابل بھروسہ بھائی دوسرے ظاہری اور دکھاوے کے بھائی، معتمد اور بھروسے کے قابل بھائی انسان کے دست و بازو اور اس کے وبال و پر ہوتے ہیں اگر تمھیں ایسا بھائی مل جائے تو اس پر پیسہ خرچ کرو اور ہاتھ سے اسکی مدد کرو اور جس سے اس

---

[1] ایضا: ص ۱۷۷

کی دوستی ہو تم بھی اس سے دوستی کرو اور جس سے اسکی دشمنی ہو تم بھی اس کے دشمن بن جاؤ اس کے راز کو محفوظ رکھو اور اسکی خامیوں کو چھپاؤ اور اس کی اچھائی کو ظاہر کرو جان لو کہ ایسا بھائی ہیرے سے بھی زیادہ کمیاب ہے۔

رہے ظاہری اور دکھاوے کے بھائی تو ان سے فائدہ اٹھاؤ، ان سے صاحب سلامت رکھو اور تعلقات قطع نہ کرو لیکن ان کے ضمیر سے اس زیادہ کی توقع نہ رکھو جس طرح وہ خندہ پیشانی اور شیریں بیانی سے تمہارے ساتھ پیش آئیں اسی طرح تم ان کے ساتھ پیش آؤ۔[1]

اس حدیث میں حضرت علیؑ نے یہ فرمایا ہے کہ سچے دوستوں کے لئے جان و مال بھی قربان کرو ان کی مدد کرو اور ان کے ساتھ احسان و نیکی کرو اور ظاہری دوستوں سے بظاہر ٹھیک طریقہ سے ملو کہ وہ بھی انسان کی روزمرہ کی زندگی میں کام آتے ہیں۔

بھائیوں کے ساتھ انصاف سے کام لو

قال علی علیہ السلام : مع الانصاف تدوم الاخوۃ [2]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: انصاف اور منصفانہ برتاؤ سے برادرانہ روابط میں استحکام و دوام پیدا ہوتا ہے:

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سات سال کے ہو گئے تو آپ نے اپنی رضاعی ماں حلیمہ سے فرمایا: میرے بھائی کہاں ہیں؟

انہوں نے جواب دیا: بیٹے وہ ان بکریوں کو چراگاہ لے گئے ہیں جو خدا نے تمہارے طفیل میں ہمیں عطا کی ہیں۔ آپ نے فرمایا: اماں آپ نے میرے حق میں انصاف نہیں کیا حلیمہ نے کہا: بیٹے کیسے؟ فرمایا: میں سایہ میں رہوں اور میرے بھائی شدید دھوپ میں اور پھر میں ان کا دودھ بھی نوش کروں۔

حضرت رسولؐ خدا فرماتے ہیں:

سید الاعمال ثلاثۃ: انصاف النفس من نفسک، ومواساۃُ الاخ فی اللّٰہ،

---

[1] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۶۱ [2] ایضاً : ص ۳۰۸

وذكرك الله تعالى فى كل حال۔ [۱]

بڑے اعمال تین ہیں: اپنے نفس کے ساتھ انصاف کرنا اور لوجہ اللہ بھائی کی مدد کرنا اور ہر حال میں خدا کو یاد کرنا۔

بھائی امام صادقؑ کی نظر میں

الاخوان ثلاثة: فواحد كالغذاء الذى يحتاج اليه كلّ وقت فهو العاقل، والثانى فى معنى الدّاء وهو الاحمق، والثالث فى معنى الدّواء فهو اللّبيب۔ [۲]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: بھائی تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو غذا کی مانند ہیں کہ جن کی انسان کو ہر وقت ضرورت ہوتی ہے یہ عقل مند ہیں، دوسرے مرض کے مثل ہیں یہ بیوقوف واحمق لوگ ہیں تیسرے دوا کی مانند ہیں، یہ نہایت ہی ذہین وزیرک افراد ہیں۔

رسول کی نظر میں بھائی کے تیس حقوق

قال رسول الله للمسلم على اخيه ثلاثون حقا [۳]

رسول فرماتے ہیں: مسلمان کے اپنے بھائی پر تیس حقوق ہیں کہ جن سے وہ دو ہی طریقوں سے بری الذمہ ہوسکتا ہے یا تو ان حقوق کو ادا کرے یا وہ اسے معاف کردے۔

۱۔ اس کی لغزشوں کو معاف کردے ۲۔ پریشانی کے زمانہ میں اس پر مہربان رہے ۳۔ اس کے راز واسرار کو چھپائے ۴۔ اسکی کوتاہیوں کی تلافی کرے ۵۔ اس کے عذر کو قبول کرے ۶۔ اسے برا کہنے والوں کی تردید کرے ۷۔ ہمیشہ اس کا خیر خواہ رہے ۸۔ اس کی دوستی کی حفاظت کرے ۹۔ اس سے کئے گئے عہد کا لحاظ رکھے ۱۰۔ مریض ہو تو اس کی عیادت کرے ۱۱۔ مرجائے تو اس کی تشییع جنازہ میں شریک ہو ۱۲۔ اس کی دعوت کو قبول کرے ۱۳۔ اس کے تحفہ کو قبول کرے ۱۴۔ اس کی عطا کی اسے جزا دے ۱۵۔ اسکی نعمت کا شکرادا کرے ۱۶۔ اس کی مدد کرنے کے لئے کوشش کرے ۱۷۔ اس کے ناموس کی

---

[۱] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۳۰۸ [۲] تحف العقول ص ۲۳۹ [۳] بحار الانوار ج ۷۴ ص ۲۳۴

حفاظت کرے ۱۸۔اس کی حاجت کو پورا کرے ۱۹۔اسکی خواہش کے لئے سفارش کرے ۲۰۔اگر اسے چھینک آئے تو یرحمک اللہ کہے ۲۱۔اسکی گمشدہ چیز کی طرف اس کی راہنمائی کرے ۲۲۔اس کے سلام کا جواب دے ۲۳۔اس کی بات کو صحیح سمجھے ۲۴۔اس کے انعام کی تعریف کرے اور اسے اچھا سمجھے ۲۵۔اس کی قسم کی تصدیق کرے ۲۶۔اس کے دوست کو دوست سمجھے ۲۷۔اس سے دشمنی نہ کرے ۲۸۔اس کی مدد کرے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ظلم کے وقت اس کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے باز رکھے اور مظلومی کی حالت میں اسکی مدد یہ ہے کہ ظالم سے اس کا حق لینے میں اس کی کمک کرے ۲۹۔مشکلوں اور حوادث میں اسے تنہا نہ چھوڑے ۳۰۔جو اچھی چیز اپنے لئے پسند کرے وہی اس کے لئے پسند کرے اور جس برائی کو اپنے لئے پسند نہ کرے اسے اس کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

آزاد کرنے والے کا حق

اما حق المنعم عليك بالولاء فان تعلم انه انفق فيك ماله واخرجك من ذُل الرق ووحشته الى عز الحرية وانسها واطلقك من اسر الملكة وفك عنك حلق العبودية واوجدك رائحة العز، واخرجك من سجن القهر ودفع عنك العسر وبسط لك لسان الانصاف واباحك الدنيا كلها فملكك نفسك وحل اسرك، وفرغك لعبادة ربك واحتمل بذلك التقصير في ماله، فتعلم انه اولى الخلق بك بعد اولى رحمك في حياتك وموتك واحق الخلق بنصرك معونتك ومكانفتك في ذات الله فلا توثر عليه نفسك ماالحتاج اليك۔

لیکن جس مولا نے تمہیں نعمت سے نوازا ہے اور تمہیں آزاد کیا ہے اس کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ تم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے تمہیں آزادی دلانے کے لئے اپنا مال خرچ کیا اور تمہیں غلامی کی ذلت و وحشت سے نکال کر حریت و آزادی کی عزت میں پہنچا دیا، ملکیت کی اسیری سے تمہیں آزاد کیا اور تمہیں غلامی کی زنجیر سے نجات دلائی، تمہارے لئے عزت کی فضا بنائی اور تمہیں قہر کی جیل سے نکالا اور تمہیں سختیوں سے رہائی دلائی اور تمہارے لئے عدل کی زبان کھولی اور ساری دنیا کو تمہارے لئے مباح کر دیا اور تمہیں، تمہارے نفس کا مالک بنا دیا اور تمہیں زنداں سے رہا کرایا اور تمہیں تمہارے پروردگار کی عبادت کے لئے آسودہ خاطر کیا، خود مالی خرچ برداشت کیا جان لو کہ وہ تمہاری حیات و ممات میں تمہارے سارے عزیزوں سے زیادہ تم سے قریب ہے پس وہ راہ خدا میں سب سے زیادہ تمہاری مدد و کمک کا مستحق ہے جب تک اسے ضرورت ہے اسے اپنے اوپر مقدم کرو۔

اس حصہ میں امام زین العابدینؑ آزاد شدہ غلام کو خبر دار کر رہے ہیں کہ جس مولا نے تمہیں دولت و ثروت سے آزاد کیا ہے، غلامی کی وحشت سے آزادی کی عزت میں پہنچایا ہے دوسروں کی عبودیت و بندگی سے رہائی دلائی ہے۔ غیر خدا کی قید سے چھڑا کر خدا کی بندگی و عبودیت کی عزت میں داخل کیا ہے۔

ایسے مولا کا غلام پر کچھ حق ہوتا ہے اور وہ حق یہ ہے کہ اس کی مدد ونصرت کرے اور کبھی اپنے آقا پر سبقت نہ کرے اور ہر جگہ اس کے احترام کو ملحوظ رکھے۔

ہم نے مولا اور غلام کے حق اور تاریخ میں غلاموں پر روا رکھے جانے والے ظلم وستم اور ان کی آزادی کے اسباب، خصوصا ان کی آزادی کے لئے اسلام کی جنگ کو، غلامی کہاں سے چلی ہے کے ذیل میں، بیان کیا ہے ان چیزوں کو یہاں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آزادی فکر

آزادی فکر ہر شخص کا فطری اور اصلی حق ہے کہ وہ آزادانہ طریقہ سے سوچے۔ آزادی فکر یعنی ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ جس چیز کے بارے میں چاہے غور وفکر کرے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے افکار وعقائد پر پابندی لگائے اور ایسے اسباب پیدا کرے کہ جس سے اس کی فکر گھٹ کر رہ جائے اور اس کے صحیح ادراکات کے پنپنے میں مانع ہو جائے۔

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص جسمانی طور پر اپنے مالک کے اختیار میں ہو لیکن اس کی فکر آزاد ہوتی ہے کوئی شخص بھی کسی دوسرے کی فکر کا مالک نہیں ہو سکتا۔ ہاں غلاموں کے لئے آزادی فکر کی فضا تنگ ہو گئی وہ اس طرح کہ ممکن ہے وہ آزادانہ طور پر غور وفکر کرے لیکن کیا وہ اپنے افکار وخیالات کے مطابق عمل بھی کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی لئے امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ اس نے تمہیں دوسروں کی عبودیت سے نجات عطا کی ہے اور تمہیں دوسروں کے قہر وتسلط سے چھڑایا ہے اور زبانِ انصاف کو تمہارے لئے آزاد کیا ہے۔ اس عبارت میں آپ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ غلام آزادی کے بعد آزادی سے غور وفکر کر سکتا ہے اور اپنے افکار وخیالات کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلام کے آزاد ہونے سے اسے آزادی فکر بھی مل جاتی ہے۔

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو آزادی فکر کا تحفہ دیا ہے اور تحقیق ومطالعہ کا راستہ ان کے لئے کھلا رکھا ہے حضرت علیؑ فرماتے ہیں: من استقبل وجه الاراء عرف مواقع الخطاء۔[1]

---

[1] نہج البلاغہ فیض الاسلام کلمہ حکمت: ۱۶۴

جو مختلف قسم کی رایوں کے روبرو ہوتا ہے وہ خطا اور غلطی میں مبتلا ہونے کی جگہوں کو پہچان لیتا ہے اور حق و باطل میں فرق کر لیتا ہے۔ صحیح و غلط جگہوں کو پہچان لیتا ہے۔

نہ یہ کہ اسلام عقائد و افکار پر پابندی نہیں لگاتا ہے بلکہ ہر شخص کی ذمہ داری اور ہر ایک کی قدر و قیمت کا معیار اس کی عقل اور فکر کو قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہے: تفکر ساعة افضل من عبادة سبعين سنة۔ ایک گھنٹہ سوچنا ستر سال کی عبادت سے افضل و بہتر ہے۔

قرآن مجید نے اپنی بہت سی آیتوں میں لوگوں کو آزادی فکر پر ابھارا ہے:

فبشر عباد الذين يستمعون القول فيتبعون احسنه اولئك الذين هديهم الله و اولئك هم اولوا الالباب۔ [1]

میرے ان بندوں کو خوشخبری دیدو جو کان لگا کر باتیں سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین بات کا اتباع کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی صاحبان عقل و خرد ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

هل يستوى الاعمى والبصير افلا تتفكرون [2]

کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہے؟ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟

عقیدہ کی آزادی

قلبی عقائد اور لوگوں کے مذہبی اعتقادات مخصوص اسباب و علل کی وجہ سے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً تعلیم و تربیت کے اسلوب اور بعض دوسرے عوامل و اسباب کا افکار و عقائد کے وجود پذیر ہونے میں گہرا اثر ہوتا ہے اسی طرح عقائد کو بدلنے میں بھی انہیں عوامل اور منطق و استدلال سے مدد لینا چاہئے۔ جبر و زبردستی سے نہیں کرنا چاہیے۔ عقیدہ کی آزادی کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

لا اكراه فى الدين قد تبين الرشد من الغى [3]

دین میں کوئی جبر و زبردستی نہیں ہے کیونکہ کمال و کامیابی اور ہدایت کے راستہ کو گمراہی سے جدا

---

[1] زمر: ۱۸ [2] انعام: ۵۰ [3] بقرہ: ۲۵۶

کر دیا گیا ہے۔

ولـو شـاء ربك لآمن من فی الارض کلهم جمیعا افا نت تکره الناس حتی یکونوا مومنین[۱]

اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر رہنے والے سب لوگ ایمان لے آتے۔

کیا آپ لوگوں پر جبر و زبردستی کریں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

قل الـحق من ربکم فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر انا اعتدنا للکافرین نارا۔ [۲]

کہہ دیجئے کہ یہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے یقیناً ہم نے کافروں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے۔

فذکر انما انت مذکرلست علیهم بمصیطر۔ [۳]

آپ یاد دلا ئیے آپ تو بس یاد، دہانی کرانے والے ہیں آپ کو ان پر زبردستی کرنے کا حق نہیں ہے۔

قد جـائکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسه و من عمی فعلیها وما انا علیکم بحفیظ [۴]

حق یابی کے سلسلہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس دلیلیں آچکی ہیں پھر ان دلیلوں کی روشنی میں جس نے حق کو دیکھ لیا تو اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جس نے اس سے آنکھیں ہی بند کرلیں اس نے اپنا ہی نقصان کیا اور میں تمہارے اوپر نگراں تو ہوں نہیں۔ مذکورہ آیتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے بلکہ ہر شخص عقیدہ کے انتخاب میں آزاد ہے لیکن اسلام عقل و منطق اور علم و تحقیق کا دین ہے اور لوگوں کو اندھی تقلید سے منع کرتا ہے اور خدا کو چھوڑ کر سورج، چاند وغیرہ کی پوجا کرنے کو انسان کی نادانی قرار دیتا ہے اور اسے غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

---

۱ یونس: ۹۹ ۲ کہف: ۲۹ ۳ غاشیہ: ۲۱-۲۲ ۴ انعام ۱۰۶

مالکیت کی آزادی

امام زین العابدینؑ آزاد شدہ غلام سے فرماتے ہیں: جس مولا نے تمہیں آزاد کیا ہے ابـاحك الدنيا كلها اس نے تمہارے لئے ساری دنیا کو مباح کر دیا ہے اور تمہیں فکر و مالکیت کی آزادی دی ہے جو کہ دنیا کے مباح ہونے کا مصداق ہے بنا برایں جو غلام آزاد ہوتا ہے وہ اپنے مال سے فائدہ اٹھانے اور اس کا مالک بننے میں آزاد ہو جاتا ہے۔

فردی مالکیت کا سرچشمہ انسان کی فطرت ہے اور زندگی کی رونق کا باعث ہے۔ اسلام نے بھی اس کو مقدس قرار دیا ہے اور اپنے قانون میں اسکی حمایت کی ہے قرآن مجید فرماتا ہے:

للرجال نصيب مما اكتسبوا وللنساء نصيب مما اكتسبن [1]

جو مرد کماتے ہیں وہ مردوں کا ہے اور جو عورتیں کسب کرتی ہیں وہ ان کا حصہ ہے۔

جب آدمی صحیح راستہ سے کوئی مال حاصل کرتا ہے تو وہ اسی کا ہوتا ہے:

يا ايها الذين آمنوا لا تاكلوا اموالكم بينكم بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منكم [2]

ایمان لانے والو! اپنے درمیان اپنے اموال کو باطل طریقہ سے نہ کھاؤ یا تجارت کے ذریعہ یا ایک دوسرے کی رضامندی سے کھاؤ۔

بنا برایں جو مال تجارت یا حلال کام کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ مباح ہے اور انسان اس کا مالک ہے چنانچہ اگر وہ ایسے مال کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے تو اسلام اسے شہیدوں میں شمار کرتا ہے: من قتل دون ماله شهيد [3]

واضح رہے کہ مالکیت میں آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں سے چاہے ثروت جمع کرے بلکہ قانونی مال وہ ہے جو تجارت، صنعت اور کاشتکاری وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جو مال چوری، خرید و فروخت میں دھوکا دینے، کم تولنے، سود لینے اور غصب کے ذریعہ جو حاصل ہوتا ہے وہ غیر قانونی ہے۔

اسلام ان چیزوں کا شدید مخالف ہے۔ جو مال تم حلال طریقہ سے حاصل کرتے ہو اس کا

---

[1] نساء: ۳۲ [2] نساء: ۲۹ [3] اسلام و حقوق بشر ص ۳۱۶؛ بہ نقل از العدالۃ الاجتماعیۃ ص ۱۰۳

تمہیں اسلامی ٹیکس دینا چاہئے ورنہ وہ اس آیت کا مصداق ہوگا۔

والـذيـن يـكـنـزون الـذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب اليم ، يوم يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جباههم و جنوبهم و ظهورهم هذا ما كنزتم لانفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون ۔ [1]

جو لوگ سونے، چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اس میں سے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے ہیں انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیدیجیے۔ جس دن اس سونے، چاندی کو جہنم کی آگ میں پگھلایا جائیگا اور اس سے ان کی پیشانی، ان کے پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیا جائیگا ۔ اور ان سے عذاب کے فرشتے کہیں گے۔ یہ ہے وہ سونا، چاندی جو تم نے دنیا میں اپنے لئے جمع کیا تھا اب اپنے جمع کئے ہوئے کا مزہ چکھو!

یہ تھے وہ جملے جو فکر، عقیدہ اور مالکیت کی آزادی سے متعلق ہیں، غلام آزاد ہونے سے ان میں بھی آزاد ہو جاتا ہے۔

اس حق کے آخر میں امام زین العابدینؑ آزاد شدہ غلام کے اندر شکر و سپاس گزاری کی حس کو بیدار کرتے ہیں اور اسے خبردار کرتے ہیں کہ مولا کے ساتھ ہمیشہ یہ سلوک کرتے رہنا۔

---

[1] توبہ: ۳۴۔۳۵

آزادشدہ کا حق

اما حق مولاك الجارية عليه نعمتك فان تعلم ان الله جعلك حامية عليه و واقية و ناصرا و معقلا و جعله لك و سيلة و سببا بينك و بينه ، فبالحرى ان يحجبك عن النار فيكون فى ذلك ثواب منه فى الآجل و يحكم لك بميراثه فى العاجل اذا لم يكن له رحم مكافاة لما انفقته من مالك عليه و قمت به من حقه بعد انفاق مالك ، فان لم تخفه خيف عليك ان لا يطيب لك ميراثه و لا قوة الا بالله۔

جو غلام تم نے آزاد کر دیا اس کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ خدا نے تمہیں اس کا حمایت کرنے والا، پشت پناہ اور مددگار بنایا ہے اور اسے تمہارے اور اپنے درمیان وسیلہ قرار دیا ہے سزاوار ہے کہ وہ تمہیں جہنم سے نجات عطا کرے اور اس کا یہ ثواب آخرت میں تمہیں نصیب ہو اور دنیا میں بھی اگر اس کا کوئی وارث نہ ہو تو تمہیں اس کے وارث ہو کیونکہ تم نے اس پر پیسہ خرچ کیا ہے اور اس کو آزاد کیا ہے اور اس کے حق کو قائم کیا ہے اگر تم ان چیزوں کا خیال نہیں رکھو گے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس کی میراث تمہارے لئے پاک نہیں ہوگی۔

کتاب مکارم الاخلاق میں یہ عبارت اس طرح منقول ہے:

واما حق مولاك الذى انعمت عليه فان تعلم ان الله عز و جل جعل عتقك لـه و سيلة اليه و حجابا لك من النّار، و ان ثوابك فى العاجل ميراثه اذا لم يكن له رحم مكافأة بما انفقت من مالك ، و فى الآجل الجنة۔

لیکن تمہارے اوپر تمہارے اس مولا کا حق کہ جس نے تم پر احسان کیا ہے یہ ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کو خدا نے تمہارے آزاد کرنے کو خود تک رسائی کا ذریعہ بنایا ہے اور اسے تمہارے اور آتش جہنم کے درمیان حائل کر دیا ہے۔ جان لو کہ اس نیک عمل کی دنیا میں تو یہ جزا ہے کہ (اگر اس کا کوئی وارث نہیں ہے تو) اس کی میراث تم پاؤ گے کیونکہ تم نے اس پر مال خرچ کیا ہے اور آخرت میں اسکی جزاء جنت ہے۔

حدیث میں لفظ مولا کی تکرار ہوئی ہے یہ ایک اسم ہے جو رب، مالک، سید وسردار، ولی نعمت، معتق (آزاد کرنے والے) ناصر، محب، تابع، ہم سایہ، چچازاد بھائی، حلیف، داماد غلام وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن جس حدیث میں یہ اسم استعمال ہوا ہے اس میں اس کے معنی اس چیز سے سمجھ میں آتے ہیں جس کی طرف یہ مضاف ہوا ہے۔[1]

حقوق کے اس حصہ میں لفظ مولا آزادشدہ غلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ پہلے حق میں امام زین العابدینؑ نے آزاد کرنے والے کے کچھ حقوق بیان فرمائے تھے اور اس میں آزادشدہ کے حقوق بیان کئے ہیں اصل میں آزاد کرنے والے اور آزاد ہونے والے کے ایک دوسرے پر جو حقوق ہوتے ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ممکن ہے آدمی کے اندر اس وقت غرور و تکبر پیدا ہو جائے جس وقت وہ کسی پر احسان کرتا ہے یا کسی کے جرم کو معاف کر دیتا ہے ممکن ہے اس پر احسان جتائے یا اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھے امام زین العابدینؑ آزاد کرنے والے کے غرور و تکبر کو برطرف کرتے ہیں: خبردار تم یہ خیال نہ کرنا کہ اس پر تمہارا ہی حق ہے۔ نہیں بلکہ تمہارے اوپر اس کا بھی حق ہے تمہیں اسکے ادا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

آزادشدہ کے فرائض

دیکھو جب تم نے اسے آزاد کر دیا تو اس کے ذریعہ تم خدا سے قریب ہو گئے اور وہ تمہارے اور جہنم کے بیچ میں رکاوٹ بن گیا اس طرح تم آخرت میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ لیکن دنیا میں اس کا اثر یہ ہے کہ اگر وہ دنیا سے اٹھ جائے اور اس کا کوئی وارث وعزیز نہ ہو تو تم اس کے وارث ہو کیونکہ تم نے اس پر پیسہ خرچ کیا تھا۔ یہ درحقیقت فقہی حق کی طرف اشارہ ہے۔ اگر آزاد کرنے والے نے اسے خدا کی رضا کے لئے آزاد کیا ہے اور آزاد ہونے والے کا کوئی عزیز نہ ہو تو وہ اس کی میراث پائے گا۔

غلام کو آزاد کرنے کی جزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلام کی منطق میں دیکھتے ہیں کہ تمام ثواب واجر آزاد کرنے والے کے لئے بیان ہوا ہے اس میں سے کچھ

[1] نہایہ ابن اثیر ج۵ ص۲۲۸

تو ہم نے غلام والی بحث میں بیان کیا ہے اور بحث کی مناسبت سے چند حدیثیں یہاں قلم بند کرتے ہیں:

آزاد کرنے والے کی منزلت

وسائل الشیعہ کی کتاب عتق کے باب اول کی دوسری حدیث میں ہے:

عن زراره عن ابی جعفر قال، قال رسول الله صلی الله علیه وآله : من اعتق مسلما اعتق الله العزیز الجبار بکل عضو منه عضوا من النار.[1]

زرارہ نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسول کا ارشاد ہے: جو شخص کسی مسلمان کو آزاد کرتا ہے عزیز و جبار خدا آزاد ہونے والے کے عضو کے عوض اس کے عضو کو جہنم سے آزاد کرتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے:

عن ابی عبدالله فی حدیث ان فاطمة بنت اسد قالت لرسول الله صلی الله علیه وآله یوما : انی ارید ان اعتق جاریتی هذه ـ فقال لها : ان فعلت اعتق الله بکل عضو منها عضوا منك من النار [2]

ایک حدیث کے ذیل میں امام صادقؑ فرماتے ہیں: ایک روز فاطمہ بنت اسد نے رسولؐ کی خدمت میں عرض کی: میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں اپنی اس کنیز کو راہ خدا میں آزاد کردوں۔ رسولؐ نے ان سے فرمایا: اگر آپ اس کو آزاد کریں گی تو خداوند عالم اس کے ہر عضو کے عوض آپ کے ہر عضو کو آگ سے آزاد کرے گا۔

شیعوں کے ائمہ اور غلاموں کی آزادی

اسی باب کی ایک اور حدیث میں ہے:

عن ابی عبدالله : ان ابا جعفر مات و ترك ستین مملوکا فاعتق عندموته

---

[1] وسائل الشیعہ ج۱۶ ص ۲ تا ۵ [2] ایضا

ثلثهم۔ [1]

امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ امام باقرؑ کے پاس وقت آخر ساٹھ غلام تھے ان میں سے بیس کو راہ خدا میں آزاد کر دیا تھا۔

رسولؐ اور شیعوں کے ائمہ ہر وقت اور ہر جگہ غلاموں کو آزاد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے تا کہ اس عمل کے دنیوی واخروی ثواب سے اپنے ماننے والوں کو آگاہ کر سکیں۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۶ ص ۲ تا ۵

احسان کرنے والے کا حق

واما حق ذی المعروف علیك فان تشكره و تذكر معروفه و تنشر له المقالة الحسنة و تخلص له الدعاء فيما بينك و بين الله سبحانه ، فانك اذا فعلت ذلك كنت قد شكرته سرا و علانية ، ثم ان امكن مكافأته بالفعل كافأته و الا كنت مرصدا له موطنا نفسك عليها۔

جس نے تم پر احسان کیا ہے اس کا تم پر یہ حق ہے کہ اس کا شکریہ ادا کرو اور اس کا ذکر خیر کرو اور اس کی اچھی باتوں کو پھیلاؤ اور اس کے لئے خلوص کے ساتھ خدا سے دعا کرو کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو گویا تم نے کھلم کھلا اور خفیہ طور پر اس کا شکریہ ادا کیا پھر اگر تمہاری استطاعت میں ہو تو اس کا بدلہ دو ورنہ اس کے انتظار میں رہو اور اس کام کے لئے خود کو تیار رکھو۔

یہ خصوصیت ہر انسان کی فطرت و سرشت میں موجود ہے کہ جہاں تک اس سے ہوتا ہے اپنے محسن کے احسان کے بدلہ چکانا چاہتا ہے اگر بعض لوگ اس کے برخلاف عمل کرتے ہیں تو اس کی وجہ وہ رذالت ہے جو ان کے اندر پیدا ہوگئی ہے ورنہ اخلاق اسلامی سے آراستہ انسان اپنے اندر اس رجحان کی تقویت کرتا ہے کہ اپنے محسن کے احسان کا بدلہ چکانے اور اس انتظار میں رہتا ہے کہ دوسروں کے احسان کی تلافی کرے۔

اس سلسلہ میں امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں:

اول: اس کے کار خیر اور اسکی خدمت کا شکر گزار رہے۔ اس کے احسان کو یاد کرے، دوسرے زبان کے ذریعہ اس کی نیکی کو اجاگر کرے، اس کے حق میں دعا کرے۔ اگر کوئی ان باتوں پر عمل کرتا ہے تو گویا اس نے کھلم کھلا اور خفیہ طور پر اس کا حق ادا کر دیا۔ تیسرے اگر اس کے لئے ممکن ہو تو اس کی نیکیوں اور احسان کا بدلہ چکانے کیلئے خود کو تیار کرے ورنہ یہ ارادہ کرے کہ جیسے ہی حالات سازگار ہونگے میں بلا فاصلہ اس کی تلافی کر دونگا۔

نیکی اور بدی برابر نہیں ہے

قرآن مجید اپنی اخلاقی اور تربیتی تعلیمات کے ذیل میں فرماتا ہے:

ولا تستوی الحسنة ولا السیئة ادفع بالتی هی احسن فاذا الذی بینك و بینه عداوة كانه ولی حمیم۔[1]

نیکی و بدی برابر نہیں ہے اگر تمہارے ساتھ کوئی بدی کرے تو اس کا بدلہ نیکی سے دو کیونکہ تمہارے اس عمل سے وہ شخص بھی تمہارا دوست بن جائیگا جو تمہارا دشمن ہے بلکہ صمیمی دوست بن جائیگا۔

یہ آیت یہ کہتی ہے: نیکی کے بدلے نیکی کرنا تو فطری بات ہے، ایسا ہی ہونا چاہئے خوبی تو یہ ہے کہ انسان اس کے ساتھ بھی نیکی کرے کہ جس نے اس کے ساتھ بدی کی ہے تا کہ اس سے محبت و دوستی پیدا ہو جائے۔ سلام کا جواب اس سے بہتر دو۔

قرآن مجید کہتا ہے: اذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها ان الله كان علی كل شیء حسیبا۔[2]

جب کوئی تمہیں سلام کرے تو تم اس کا جواب اس سے بہتر طریقہ سے دو یا کم از کم اس کا جواب اسی انداز میں دو بیشک خداوند عالم ہر چیز کا حساب رکھتا ہے۔

تحیت، حیات سے مشتق ہے اور دوسرے کو زندگی کی دعا دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے خواہ یہ دعا سلام علیك کی صورت میں ہو یا حیاك الله کی صورت میں ہو اس کا بہترین مصداق سلام کرنا ہے کہ جس سے دو آدمی ایک دوسرے سے اظہار محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے درمیان گفتگو کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔

لیکن بعض روایات اور تفسیروں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عملی طور پر محبت کا اظہار کرنا بھی تحیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

آیت میں وارد لفظ تحیت سے سلام کرنا اور ہر قسم کی نیکی کرنا مراد ہے۔ کتاب مناقب میں ایک حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے:

---

[1] فصلت: ۳۴ [2] نسا: ۸۶

ایک کنیز نے امام حسن کی خدمت میں ایک گلدستہ ہدیہ کیا، آپ نے اس ہدیہ کے عوض اس کو آزاد کر دیا جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے اس کو کیوں آزاد کر دیا؟

فرمایا: اذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها ۔ نیز فرماتے ہیں بہترین تحیت آزاد کرنا ہے مختصر یہ کہ یہ آیت ہر قسم کے اظہار محبت کو شامل ہے خواہ وہ لفظی ہو یا عملی؟[1]

احسان کا بدلہ احسان

قرآن مجید فرماتا ہے: هل جزاء الاحسان الا الحسان [2] کیا احسان کا بدلہ احسان کے علاوہ اور کچھ ہو سکتا ہے اگر چہ اسلامی روایات اور تفسیروں میں لفظ احسان کے معنی توحید و معرفت اور اسلام بیان ہوئے ہیں لیکن یہ اس کا واضح مصداق ہیں ورنہ اس سے ہر لفظی و عملی نیکی مراد ہے چنانچہ امام صادق فرماتے ہیں: آیة فی کتاب اللّٰه مسجلة ۔ قلت : وما هی ؟ قال : قول اللّٰه عز و جل : "هل جزاء الاحسان الا الاحسان "، جرت فی الکافر والمومن والبر و الفاجر ، ومن صنع الیه معروف فعلیه ان یکافیٔ به و لیس المکافاة ان تصنع کما صنع حتی یربیٰ ، فان صنعت کما صنع کان له الفضل بالابتداء ۔ [3]

قرآن مجید میں ایک آیت ہے جس کا مفہوم عام اور کلی ہے۔ راوی کہتا ہے: میں نے عرض کی: وہ کون سی آیت ہے؟

فرمایا: خدا کا یہ قول "هل جزاء الاحسان الا حسان "مومن و کافر اور نیک و بد سب کو شامل ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہی کے ذریعہ دیا جائے۔ جس کے ساتھ نیکی کی جائے اسے اس کا بدلہ دینا چاہئے اور یہ اس کی تلافی نہیں ہے کہ جتنا اس نے احسان کیا تھا اتنا ہی احسان کرے بلکہ اس سے زیادہ احسان کرنا چاہئے، کیونکہ اگر اتنی ہی نیکی کرے گا جتنی اس نے کی تھی تو وہ برتری رکھتا ہے کیونکہ اس نے پہل کی تھی۔

مفردات میں راغب لکھتے ہیں: احسان عدل و انصاف سے بلند ہے کیونکہ عدل یہ ہے کہ

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۴ ص ۴۲ [2] الرحمان ۶۰ [3] تفسیر نور الثقلین ج ۵ ص ۱۹۹

انسان وہی ادا کرے جو اسکے ذمہ ہے اور وہی لے جو اس کا ہے اور احسان یہ ہے کہ اپنے فریضہ سے زیادہ انجام دے اور اپنے حق سے کم لے۔

خدا کے احسان کا بدلہ

سورۂ قصص میں ارشاد ہے: دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے تم اسے فراموش نہ کرو اور جس طرح خدا نے تم پر احسان کیا ہے اسی طرح نیکی کرو۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسان کی آنکھیں ہمیشہ خدا کے احسان پر مرکوز رہتی ہیں اور وہ خدا سے احسان کی دعا کرتا رہتا ہے۔ اس سے نیکی کی توقع رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں پر کیوں احسان نہیں کرتا ہے؟ عفو و درگزر کے بارے میں ایسی ہی آیت سورۂ نور میں ہے: ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم [1]

مومنوں سے درگزر کرو اور ان سے چشم پوشی کرلو کیا تم کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ خدا تمہیں بخش دے۔

اس آیت کے یہ معنی بھی بیان کئے جا سکتے ہیں کہ خداوند عالم انسان کو بڑی عطا سے نوازتا ہے کہ جن کی اس کو اپنی زندگی میں ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ وہ عقل ایسی قوت عطا کرتا ہے جو ایک آدمی کی زندگی چلانے ہی کیلئے نہیں بلکہ ایک ملک کا نظم نسق چلانے کے لئے کافی ہے، علم سے نوازتا ہے کہ جو صرف انسان ہی کو فائدہ نہیں پہنچاتا ہے بلکہ پورے معاشرے کو فائدہ پہنچاتا ہے، مال و دولت عطا کرتا ہے کہ جس سے وہ ایک بڑے اجتماعی منصوبہ کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے اس قسم کی الٰہی عطا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ سب چیزیں آپ ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ ان کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے آپ خدا کے نمائندے ہیں یہ آپ کو خدا نے اس لئے عطا کی ہیں تاکہ آپ کے ہاتھ سے اس کے بندوں تک پہنچائیے۔

---

[1] نور ۲۲

دوسروں سے محبت کرنا

مذکورہ آیات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن اس بات پر کتنا زور دیتا ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ نیکی کریں خاص طور سے ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے پر کہ جنہوں نے ہمارے ساتھ احسان کیا ہے حدیث کی کتابوں میں بھی اس سلسلہ میں کچھ دستورات بیان ہوئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

کافی میں "ولاتحبب الی الناس و التودد الیھم" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا گیا ہے۔ اس کی پہلی حدیث یہ ہے:

عن ابی بصیر عن ابی جعفر علیه السلام قال: ان اعرابیا من بنی تمیم آتی النبی صلی الله علیه وآله فقال له : اوصنی، فکان مما اوصاه : تحبب الی الناس یحبوك . [۱]

ابو بصیر نے حضرت امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: قبیلہ بنی تمیم میں سے ایک دیہاتی رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: مجھے نصیحت و وصیت کیجئے رسولؐ نے اسے جو نصیحت اور وصیت کی تھی ان میں سے یہ بھی ہے کہ لوگوں سے محبت و دوستی کرو وہ بھی تم سے محبت کریں گے۔

سماعہ نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا ایک تہائی عقل ہے۔

رسولؐ فرماتے ہیں: لوگوں سے محبت و دوستی کرنا نصف عقل ہے۔ [۲]

ان حدیثوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے ہمیں دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا چاہئے خصوصاً ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے ہمارے ساتھ نیکی کی ہے۔

رسولؐ فرماتے ہیں: جس شخص کے ساتھ نیکی کی جائے اس کو چاہئے کہ اسکی تلافی کرے اور اگر اس کا بدلہ نہ دے سکے تو کم از کم اسے یاد رکھے کیونکہ اس کو یاد رکھنا ہی اس کا شکر ادا کرنا ہے۔ [۳]

آپؐ ہی کا ارشاد ہے: جو نیکی کا اہل ہے اس کے ساتھ نیکی کرو اور جو اہل نہیں اس کے ساتھ بھی نیکی کرو کیونکہ اگر تم اہل کے ساتھ نیکی کروگے تو وہ اس کا مستحق تھا اور وہ اس کا اہل نہیں ہے تو تم خود

۱۔ اصول کافی ج ۲ ص ۶۴۲۔۶۴۳ ۲۔ ایضاً ص ۶۴۳ ۳۔ ایضاً

اس کے اہل ہو۔[۱]

بحث کے آخر میں ہم لفظ معروف کے معنی بیان کرنا چاہتے ہیں جو کہ امام زین العابدینؑ کے بیان میں استعمال ہوا ہے: حق ذی المعروف" معروف ایک جامع اسم ہے یہ ہر اس فعل کیلئے استعمال ہوتا ہے جس کا حسن عقل وشرع سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو خدا کا مطیع ہو اور واجبات ومستحبات میں لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہو۔

معروف، منکر کی ضد ہے، معروف شرعاً وعقلاً واجب ومستحب افعال سے مخصوص ہے اس میں مباح داخل نہیں ہے۔ کیونکہ مباح میں رجحان نہیں ہوتا ہے اور جس میں رجحان نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ اور معروف خیر ہی خیر ہے چنانچہ ابن عباس سے منقول ہے:

اہل معروف روز قیامت محشر میں آئیں گے تو ان کے معروف کی وجہ سے ان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور ان کے سب حسنات ایسے ہی باقی رہیں گے تو وہ اپنے حسنات ان لوگوں کو دیدیں گے جن کے گناہ حسنات سے زیادہ ہونگے چنانچہ وہ بھی اس کے نتیجہ میں بخش دیئے جائیں گے اسی طرح سب داخل جنت ہونگے، معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا دنیا وآخرت میں سب کو جمع کرتا ہے اور یہ احسان کرنے والے کے حق کو ادا کرنے کا نتیجہ ہے۔

---

[۱] اصول کافی ج ۲ ص ۶۴۳

موذن کا حق

واما حق المؤ ذن ان تعلم انه منكر ك بربك و داعيك الى حظك و افضل اعوانك على قضاء الفريضة التى افترضها الله عليك فتشكره على ذلك شكرك للمحسن اليك وان كنت فى بيتك متهما لذلك لم تكن لله فى امره متهما و علمت انه نعمة من الله عليك لا شك فيها. فاحسن صحبة نعمة الله بحمد الله عليها على كل حال ، ولا قوة الا بالله.

لیکن موذن کا حق تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ تمہیں تمہارے پروردگار کو یاد دلانے والا ہے اور تمہیں تمہارے حصہ کی طرف بلانے والا ہے اور جو فریضہ خدا نے تم پر واجب کیا ہے اس میں وہ تمہارا بہترین مددگار ہے تمہیں اس کی قدر اسی طرح کرنا چاہئے جس طرح تم اپنے محسن کی قدر کرتے ہو اگر تم اپنے گھر میں اس سے بدگمان ہو تو اس کے اس کام میں، بدگمانی نہ کرو جو کہ وہ خدا کے لیے کر رہا ہے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے تمہارے لئے ایک نعمت ہے پس اللہ کی نعمت کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ہر حال میں اس پر خدا کا شکر ادا کرو خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

اس حق کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اس بات کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ اس پر موذن کا حق ہے کیونکہ وہ ایک عظیم کام انجام دیتا ہے:

۱۔ وہ انسان کو اس کے رب کی یاد دلاتا ہے۔

۲۔ وہ اسے اس کے اس حصہ کی طرف بلاتا ہے جو نماز سے نصیب ہوتا ہے۔

۳۔ جو فریضہ خدا نے اس پر واجب کیا ہے اس میں وہ اس کا بہترین مددگار ہے۔

بنابرایں اس کا شکریہ اس طرح ادا کرنا چاہئے جس طرح اپنے محسن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی خدانخواستہ کبھی گھر میں موذن سے خوش نہ ہوا اور اس کو مطعون کرتا ہو تو اذان کے سلسلہ میں، جو کہ امر خدا ہے، اس سے بدظن نہیں ہونا چاہیے اور حسن سلوک یہ ہے کہ ہر حال میں اس کا شکر ادا کرے۔

وہ انسان جس کو رات دن الجھائے رہتے ہیں اور وہ خدا کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو یہ

موذن ہی ہے جو خدا کے منادی کی طرح اسے نماز کے اوقات میں مادی لذتوں میں غرق ہونے سے نجات دیتا ہے وہی ہے جو اپنے روح افزا اور نجات بخش نغمہ سے اس کی دستگیری کرتا ہے اور اسے کمال و سعادت یعنی نماز کی ادائیگی کی طرف لے جاتا ہے۔ فقہ وحدیث کی کتابوں میں موذن کی بڑی عظمت بیان ہوئی ہے اور جتنا اس کا ثواب لکھا ہے اتنا شاید ہی کسی نیکی کا ثواب لکھا گیا ہو اسلامی فقہ میں اس کے لئے کچھ حقوق معین کئے گئے ہیں اب ہم انہیں کی شرح شروع کرتے ہیں:

اذان کے لغوی معنی

لغت میں اذان کے معنی اعلان اور خبردار کرنا۔ سورۂ توبہ میں ہے: و اذان من اللہ و رسوله الی الناس[۱] لوگوں کیلئے یہ خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان و آگاہی ہے۔ اسلام کی اذان کو اس لئے اذان کہا جاتا ہے کہ موذن بلند آواز سے نماز کے وقت ہونے کا اعلان کرتا ہے سورۂ اعراف میں ارشاد ہے: فاذن موذن بینهم[۲] ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا۔ [۳]

تشریع اذان

تشریع اذان اسی سال ہوئی تھی جس سال رسولؐ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی، تشریع اذان کے سلسلہ میں اس کے علاوہ بھی کچھ اقوال ہیں، اذان کی تشریع کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تھی، پھر ان کے لئے اوقات نماز کی شناخت بھی مشکل تھی، انہوں نے آپس میں گفتگو کی کہ اوقات کی شناخت کے لئے کوئی علامت مقرر کی جائے تاکہ سب کو نماز جماعت کا ثواب مل جائے۔

بعض لوگوں نے کہا: ہر نماز کے وقت ناقوس بجادیا جائے، رسولؐ نے ان کی اس بات کو رد کر دیا اور فرمایا: یہ کام نصاریٰ کرتے ہیں۔

دوسرے لوگوں نے کہا: بوق بجایا جائے، آنحضرت نے فرمایا: یہودیوں کا مذہب ہے، کچھ

۱۔ توبہ: ۱ ۲۔ اعراف: ۴۴ ۳۔ قاموس قرآن ج ۱ ص ۵۷

نے کہا: دف بجادیا جائے آپ نے فرمایا: دف روم والے بجاتے ہیں، چندلوگوں نے کہا: آگ روشن کر دی جائے، رسولؐ نے فرمایا: یہ مجوسیوں کا شعار ہے، بعض نے کہا: پرچم بلند کر دیا جائے، رسولؐ خاموش ہو گئے اور کوئی بات طے نہ ہو سکی، رسولؐ حضرت علیؑ کے گھر تشریف فرما تھے کہ جبریل نازل ہوئے اور خدا کی طرف سے مسلمانوں کو اذان کا حکم دیا۔

صدوقؒ نے کتاب "من لا یحضره الفقیه" میں روایت کی ہے:

عن منصور بن حازم عن ابی عبداللّٰه قال لما هبط جبریل علیه السلام بالاذان علی رسول اللّٰه صلی الله علیه و آله وکان رأسه فی حجر علی علیه السلام، فاذن جبرئیل و اقام۔ فلما انتبه رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله قال: یا علی! سمعت؟ قال: نعم یا رسول اللّٰه۔ قال: حفظت؟ قال: نعم۔قال: ادع بلالا فعلمه، فدعا بلالا فعلمه۔ [۱]

منصور بن حازم نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے جب جبریل نازل ہوئے تو اس وقت رسولؐ حضرت علیؑ کے گھر میں ان کے پہلو پر سر رکھے سو رہے تھے، جبریل نے اذان واقامت کہی اس کے بعد رسولؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: اے علیؑ تم نے سنا؟ عرض کی ہاں اے اللہ کے رسولؐ فرمایا: یاد کرلی؟ حضرت علیؑ نے کہا: ہاں فرمایا: یہ اذان بلال کو سکھادو چنانچہ آپ نے بلال کو اذان سکھادی۔

اذان کے فقہی احکام

ہر مرد و عورت کے لئے مستحب ہے کہ وہ نماز پنجگانہ سے پہلے اذان واقامت کہیں۔المحکی عن المشهور۔کما عن جماعة کثیرة استحباب الاذان والاقامة مطلقاً، عن الجمل و شرحه و المقنعة والنهایة و المبسوط و الوسیلة و المهذب و کتاب احکام النساء للمفید انهما واجبان علی الرجال فی الجماعة۔ [۲]

جو مشہور سے حکایت ہوئی ہے (جیسا کہ بہت سے لوگوں سے نقل ہوا ہے کہ) اذان واقامت

۱۔ شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج۲ ص۸۹

۲۔ مستمسک العروۃ ج۵ ص۵۲۶

بطور مطلق مستحب ہے۔ لیکن کتاب جمل اور اسکی شرح، ومقنعہ، نہایہ، مبسوط، وسیلہ، مھذب اور مفید کی کتاب احکام النساء میں لکھا ہے کہ واجب نماز جماعت میں اذان واقامت کہنا مردوں پر واجب ہے۔

فقہا نے بعض جگہوں پر اذان واقامت کو ساقط قرار دیا ہے اور وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ روز جمعہ نماز عصر کی اذان جبکہ وہ ظہر یا نماز جمعہ کے ساتھ پڑھی جائے۔

۲۔ روز عرفہ نماز عصر کی اذان اگر وہ ظہر کے ساتھ پڑھی جائے۔

۳۔ شب عید الضحیٰ میں اس شخص کی نماز عشا کی اذان کہ جو مشعر الحرام میں ہو اور اس کو مغرب کے ساتھ پڑھے۔

۴۔ مستحاضہ کی عصر وعشا کی نماز کی اذان اسے چاہیئے ان نمازوں کو بلا فاصلہ ظہر ومغرب کے بعد بجالائے۔

۵۔ اس شخص کی نماز عصر وعشا کی اذان جو اپنا پیشاب وپخانہ نہ روک سکتا ہو، ان پانچ نمازوں میں اس صورت میں اذان ساقط ہوتی ہے کہ ان نمازوں میں سے کسی بھی نماز کا پہلی نماز سے یا تو بالکل فاصلہ نہ ہو یا معمولی فاصلہ ہو۔[۱]

اذان واقامت کے لئے فقہا نے کچھ شرائط بیان کئے ہیں:

۱۔ ابتدا میں نیت کرے اور آخر تک اس نیت پر ثابت رہے بنا برایں اگر کوئی بغیر نیت کے اذان واقامت دیتا ہے تو صحیح نہیں ہے۔ ۲۔ ایمان، موذن کو مومن ہونا چاہیئے، عمار کی موثق حدیث، جو انہوں نے امام صادقؑ سے نقل کی ہے، اس بات پر دلالت کر رہی ہے لیکن بلوغ کو شرط نہیں جانا ہے خصوصا اس اذان میں جو صرف آگاہ کرنے کے لے دی جاتی ہے ہاں جو اذان آگاہی کے لیے دی جاتی ہے اس کے لئے بعض فقہا نے لکھا ہے کہ موذن کا مرد ہونا شرط ہے۔ مردوں کی اذان واقامت کے لئے بھی شرط ہے کہ موذن مرد ہو۔

۳۔ اذان واقامت میں ترتیب ہو۔

۴۔ اذان واقامت کے جملے پے در پے کہے جائیں۔

---

[۱] عروۃ الوثقیٰ فصل اذان واقامت

۵۔ عربی میں کہی جائے

نماز کے علاوہ فقہانے بعض ایسے مواقع بیان کئے ہیں جہاں اذان دینا مستحب ہے مثلاً:

۱۔ پیدا ہونے والے بچہ کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنا مستحب ہے۔

۲۔ وحشت ناک بیابان میں اس شخص کے لئے اذان دینا مستحب ہے جو دیو، جن اور بھوت پریت سے ڈرتا ہو۔

۳۔ جس شخص نے چالیس دن تک گوشت نہ کھایا ہو اس کے کان میں اذان کہنا۔ [1]

فقہِ شیعہ میں اذان واقامت مستحب موکد ہیں، بعض علما نے نماز جماعت کے لئے اسے مردوں پر واجب جانا ہے، اہل سنت بھی اذان واقامت کو مستحب جانتے ہیں، مالک، ابوحنیفہ اور شافعی کہتے ہیں: سفر وحضر میں ہر نماز کے لئے خواہ باجماعت ہو یا فرادیٰ اذان واقامت مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں: اذان واقامت واجب کفائی ہے اسی طرح مالک وابوحنیفہ کے اصحاب نے بھی اذان واقامت کو واجب کفائی جانا ہے۔ [2]

اذان کے الفاظ میں اختلاف

شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ "حی علی الفلاح" کے بعد دوبار "حی علی خیر العمل" کہا جائے لیکن اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ "حی علی الفلاح" کے بعد دوبار "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہا جائے یہ اختلاف کہاں سے ہوا؟ شیعہ کہتے ہیں کہ رسولؐ کے زمانہ میں "حی علی خیر العمل" کہا جاتا تھا خود رسولؐ بھی اذان میں "حی علی خیر العمل" کہتے تھے اور آپ کے بعد آپ کے اہل بیت اور ائمہ معصومینؑ بھی "حی علیٰ خیر العمل" کہتے رہے۔ حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

سمعت رسول اللّٰہ یقول : ان خیر اعمالکم الصلوٰۃ : وامر بلالا ان یؤذن "حی علی خیر العمل"۔

---

[1] عروۃ الوثقیٰ فصل اذان واقامت

[2] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۲ ص ۹۰

میں نے رسولؐ سے سنا کہ فرماتے ہیں نماز تمہارا بہترین عمل ہے اور بلال کو حکم دیا کہ اذان میں حی علی خیر العمل کہے۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ جملہ رسولؐ کے زمانہ میں اذان کا جز تھا اور آنحضرت بھی حی علی خیر العمل کہتے تھے لیکن عمر بن خطاب نے یہ حکم دیا کہ اس کی بجائے "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہا جائے۔ سعد الدین تفتازانی نے شرح العقد کے حاشیہ پر عمر سے روایت کی ہے: انہ کان یقول ثلاث کُنَّ علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ انا احرمھن و انھیٰ عنھن، متعۃ الحج، و متعۃ النکاح، وحی علی خیر العمل۔

عمر بن خطاب نے کہا: عہد رسولؐ میں تین چیزیں رائج تھیں میں انہیں حرام قرار دیتا ہوں اور ان سے منع کرتا ہوں، ایک حج تمتع، دوسرے متعہ اور تیسرے حی علیٰ خیر العمل۔

علامہ قوشجی نے شرح تجرید میں بحث امامت کے آخر میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے اس میں اس جملہ "اعاقب علیھن" کا اضافہ کیا ہے یعنی اگر کوئی ان تینوں باتوں پر عمل کرے گا تو میں اسے سزا دوں گا ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ عمر کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیں؟ کیا وہ خود کو مشرع سمجھتے تھے کہ حکم خدا میں جس طرح چاہے رد و بدل کریں؟ اس کا جواب تو انہیں لوگوں کے پاس ہے جو ان کے معتقد ہیں۔

اذان کے کلمات

وسائل الشیعہ میں منقول بہت سی حدیثوں کے مطابق اذان میں چار مرتبہ اللہ اکبر، دو مرتبہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ، دو مرتبہ اشھد ان محمدا رسول اللہ، دو مرتبہ حی علی الصلوٰہ، دو مرتبہ حی علی الفلاح، دو مرتبہ حی علی خیر العمل، دو مرتبہ اللہ اکبر، دو مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہا جاتا ہے۔ اشھد ان علیا حجۃ اللہ و وصی رسول اللہ و خلیفتہ بلا فصل اذان کا جز نہیں ہے لیکن مستحب ہے کہ ذکر و ایمان کے لئے کہا جائے۔

فلسفۂ اذان امام رضا کی نظر میں

صدوقؒ نے امام رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

انما امر الناس بالاذان لعلل کثیرۃ ...منها تذکیر للساهی و...

بہت سی وجوہ کی بنا پر لوگوں کو اذان کا حکم دیا گیا ہے، ان میں سے ایک اس شخص خبردار کرنا ہے جو نماز کو بھول گیا ہے۔ غافلوں کو آگاہ کرنا اور جو شخص نماز کے وقت کو نہیں جانتا ہے اسے یہ بتانا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ موذن اپنی اذان کے ذریعہ لوگوں کو خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہے اور نماز کی رغبت دلاتا ہے، وہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے، اپنے ایمان و اسلام کا اظہار کرتا ہے۔ اور بھولے ہوئے لوگوں کو یاد دلاتا ہے۔

موذن کو اس لئے موذن کہتے ہیں کہ وہ نماز کا اعلان کرتا ہے۔ شروع میں تکبیر کہتا ہے اور آخر میں تہلیل کرتا ہے یعنی لا الہ الا اللّٰہ کہتا ہے۔ چونکہ خدا کہتا ہے کہ ہر کام سے پہلے اس کا نام لیا جائے لہذا اذان کے آغاز اور اس کے اختتام پر اللہ کا نام ہے، دو مرتبہ اس لئے کہا جاتا ہے تا کہ سامعین پر اس کا اثر ہو اگر پہلی مرتبہ سننے سے کوئی اثر نہ ہوا ہو تو دوسری مرتبہ سن کر ہوش میں آجائیں، اور چونکہ شہادتین ایمان کی بنیاد ہیں اس لئے دو مرتبہ کہا جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہر حق کے لئے دو گواہ قرار دیئے گئے ہیں، جب بندہ خدا کی وحدانیت کا اقرار کر چکا اور رسولؐ کی رسالت کی گواہی دے چکا تو گویا اس نے تمام ارکان ایمان کا اقرار کر لیا کیونکہ ایمان کی بنیاد خدا اور رسولؐ کا اقرار کرتا ہے۔ شہادتین کے بعد نماز کی طرف بلایا جاتا ہے کہ دراصل اذان اسی کے لئے ہے، اذان کے درمیان یہ آواز نماز کی طرف ایک دعوت ہے، فلاح و کامیابی اور بہترین عمل "حی علی خیر العمل" اور نام خدا پر اذان ختم ہے جیسا کہ آغاز بھی خدا کے نام سے ہوتا ہے۔ [1]

ثواب اذان

عن معاویہ بن وھب عن ابی عبداللہ قال قال رسول اللہ :من اذن فی

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۴ ص ۶۴۶

مصر من امصار المسلمین سنة وجبت له الجنة۔ [۱]

معاویہ بن وہب نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: رسولؐ فرماتے تھے: جو شخص مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر میں ایک سال تک اذان دیتا ہے اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔

عن سلیمان بن جعفر عن ابیه قال: دخل رجل من اهل الشام علی ابی عبدالله علیه السلام فقال له: ان اول من سبق الی الجنة بلال، قال: ولم؟ قال: لانه اول من اذن۔ [۲]

سلیمان بن جعفر نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ایک شامی امام صادق کی خدمت میں حاضر ہوا امام صادقؑ نے اس سے فرمایا: سب سے پہلے بلال جنت میں جائیں گے اس نے عرض کی کیوں؟ فرمایا: اسلئے کہ انہوں نے سب سے پہلے اذان دی ہے۔

جابر جعفی نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے:

قال رسول الله المؤذن المحتسب کالشاهر سیفه فی سبیل الله، القاتل بین الصفین۔ [۳]

رسولؐ نے فرمایا: اذان دینے والا اس شخص کی مانند ہے جو راہ خدا میں اپنی تلوار کھینچ کر دو صفوں کے درمیان قتال کرتا ہے۔

قال علی یحشر المؤذن یوم القیامة طوال الاعناق۔ [۴]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: اذان دینے والے سربلندی کے ساتھ محشور ہونگے۔

صدوق نے اپنی سند سے حدیث مناہی میں جعفر بن محمد سے اور انہوں نے اپنے آباء سے روایت کی ہے: قال رسول الله: من اذن محتسبا یرید بذلك وجه الله تعالی اعطاه الله ثواب اربعین الف شهید و اربعین الف صدیق، و یدخل فی شفاعته اربعون الف مسیء من امتی الی الجنة، الا وان المؤذن اذا قال: اشهد ان لا اله الا الله،

---

[۱] ایضا ۶۱۳ تا ۶۱۶ [۲] وسائل الشیعہ ج ۴ ص ۶۴۲ [۳] ایضا [۴] ایضا ۶۱۳ تا ۶۱۶

صلی علیہ سبعون الف ملك و استغفروا له و كان يوم القيمة فی ظل العرش حتی يفرغ الله من حساب الخلائق ، و يكتب ثواب قوله : اشهد ان محمدا رسول الله، اربعون الف ملك [1]

رسول اللہ نے فرمایا: جس شخص نے خدا کی رضا کے لئے اذان دی خدا اسے چالیس ہزار شہیدوں اور چالیس ہزار صدیقوں کا اجر عطا کرے گا اور اسکی شفاعت سے میری امت کے چالیس ہزار گناہگار جنت میں جائیں گے، جان لو کہ جب موذن خدا کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے تو اس وقت اس پر ستر ہزار فرشتے درود بھیجتے ہیں اور اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ اور روز قیامت وہ خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا یہاں تک کہ پروردگار خلائق کے حساب سے فارغ ہوگا اور رسول کی رسالت کی گواہی دینے کے ثواب کو چالیس ہزار فرشتے لکھتے ہیں۔

---

[1] امالی

امام جماعت کا حق

واما حق امامك في صلوتك فان تعلم انه قد تقلد السفارة فيما بينك و بين الله و الوفادة الى ربك و تكلّم عنك ولم تتكلم عنه و دعا لك و لم تدع له و طلب فيك ولم تطلب فيه و كفاك هم المقام بين يدى الله و المسألة له فيك ولم تكفهِ ذلك ، فان كان في شيء من ذلك تقصير كان به دونك وان كان آثما لم تكن شريكه فيه ولم يكن له عليك فضل ، فوقى نفسك بنفسه ووقى صلاتك بصلاته فتشكر له على ذلك ، ولا حول ولا قوة الا بالله۔

لیکن پیش نماز کا تم پر یہ حق ہے کہ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے تمہارے اور خدا کے درمیان رابطہ کی اور تمہیں تمہارے پروردگار کی طرف لے جانے کی ذمہ داری قبول کی ہے اس موقعہ پر وہ تمہاری ترجمانی کرتا ہے اسکی طرف سے تم کچھ بھی نہیں کہتے ہو، وہ تمہارے لئے دعا کرتا ہے تم اس کے لئے دعا نہیں کرتے ہو وہ تمہارے لئے طلب کرتا ہے، تم اس کے لئے طلب نہیں کرتے اس نے خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہونے اور تمہارے لئے اس سے سوال کرنے کو اپنے ذمہ لیا ہے جبکہ تم نے اس کی طرف سے کوئی چیز اپنے ذمہ نہیں لی ہے اگر اس کام میں کوئی نقص ہوگا تو اس کا خمیازہ اسی کو بھگتنا پڑے گا نہ کہ تم کو اگر وہ گناہ کریگا تو اس کے گناہ میں تم اس کے شریک نہیں ہو اور اسے تم پر برتری نہیں ہے وہ تمہاری سپر بن گیا ہے اور اپنی نماز کو اس نے تمہاری نماز کی سپر بنا دیا ہے۔ لہذا اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ خدا کی قوت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

آپ کے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ماموم کو یہ معلوم ہونا چاہئے: امام جماعت اس کے اور خدا کے درمیان واسطہ ہے اس کی طرف سے ایک ترجمان ہے، وہ اس کی طرف سے دعا کرتا ہے، اس کی طرف سے سوال کرتا ہے وہ تضرع و زاری اور خوف کو برداشت کرتا ہے اگر عمل کی انجام دہی اور اس کی کیفیت میں کوئی کوتاہی اور نقص وارد ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار امام جماعت ہے۔ اس کے گناہ میں تم شریک نہیں ہو اور اس پر تمہیں کوئی فضیلت و برتری نہیں ہے بلکہ تمہاری اور تمہاری نماز کی حفاظت اس کے

ذمہ ہے۔

اس بیان میں اصل موضوع بحث نماز نہیں ہے بلکہ پیش نماز ہے۔ امام جماعت جو کہ محراب میں کھڑا ہے اس کی مثال سپہ سالار کی سی ہے اس نے ماموین کو شیطان سے جنگ کرنے کے لئے تیار کر رکھا ہے اور تمام ماموین کی توجہ کو خدا کی طرف مبذول کر دیا ہے اور دلوں کے کارواں کو خدا کی طرف بڑھا دیا ہے اور ان کی زبان سے فروتنی اور انکساری کا اظہار کرا دیا ہے اور اس نے نماز جماعت کے ذریعہ فقیر و نادار رئیس و غریب، زمیں دار و رعیت، کالے، گورے اور عالم و جاہل سب کو برابر کر دیا ہے اور فخر و امتیاز کے راستوں کو بند کر دیا ہے۔

نماز جماعت کا فلسفہ

خدا وند عالم نے بعض عبادتوں کو اجتماعی صورت میں ایک خاص جگہ اور خاص زمانہ میں بجالانے کا حکم دیا ہے تا کہ مومنوں کو اس کی عبادت کی بجا آوری سے نفع و فائدہ حاصل ہو اور وہ کمال کے راستہ کو طے کریں، نماز جماعت کے فوائد درج ذیل ہیں:

۱۔ ان لوگوں کے دلوں میں خدا کی عظمت و جلال، جلوہ گر ہو جاتا ہے کہ جو نماز جماعت کی صورت میں ایک مرتبہ رکوع میں جاتے ہیں، ایک ساتھ سجدہ میں سر رکھتے ہیں اور ایک ساتھ تشہد کیلئے بیٹھتے ہیں۔

۲۔ نماز جماعت سے مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی جلوہ نمائی ہوتی ہے۔

۳۔ امام جماعت کی اقتداء کرنے سے، دوسرے امور میں نظم و نسق اور میانہ روی کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔

۴۔ نماز جماعت کے ذریعہ اجتماعی روابط بڑھتے ہیں اور برادری و اخوت پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ نماز جماعت پڑھنے سے نمازیوں میں ایک دوسرے پر ہر معاملہ میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ نمازوں کو اول وقت جماعت سے پڑھنا چاہئے کیونکہ یہ خدا کے تقرب اور دعاؤں کی مقبولیت کے لئے بہترین وقت ہے۔

۷۔نماز، خصوصاً جماعت کے ساتھ، انسان عالم مادہ اور دنیوی جنجال سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور معنویت کے دریا میں اتر جاتا ہے۔ تکبیرۃ الاحرام کے ساتھ وہ ساری چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے سامنے صرف خدا ہوتا ہے اور بس نماز جماعت سے مسجدیں اور عبادت گاہیں آباد ہوتی ہیں، ظاہری اعتبار سے بھی اور واقعی لحاظ سے بھی۔

۹۔نمازیوں کو ایک دوسرے کے حالات سے اور جماعت کے ذریعہ ان کے درمیان محکم رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔

۱۰۔معاشرہ کے مختلف طبقوں، نادار و مالدار، کالے، گورے، غلام، آقا اور عالم و جاہل کا ایک صف میں جمع ہونا۔ نماز جماعت طبقاتی امتیاز، اونچ، نیچ کے فرق کو ختم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، نماز جماعت میں شریک ہونے کے سبب سے طبقاتی فرق کم ہوتا چلا جائیگا۔ یہ چیزیں ان حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں جن میں لوگوں کو نماز جماعت میں شرکت کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

اب ہم نماز جماعت کے ثواب سے متعلق حدیثیں سپرد قلم کرتے ہیں۔

نماز جماعت کی اہمیت اس کے آشکار ہونے میں ہے

و فی العلل و العیون الاخبار عن الفضل بن شاذان، عن الرضا علیہ السلام قال: انما جعلت الجماعة لئلا یکون الاخلاص و التوحید والاسلام والعبادة للّٰه الا ظاهرا مکشوفا مشهورا لان فی اظهاره حجة علی اهل الشرق والغرب للّٰه وحده ولیکون المنافق والمستخف مؤدیا لما اقر به، یظهر الاسلام و المراقبة، و لیکون شهادات الناس بالاسلام بعضهم لبعض جائزة ممکنة، مع ما فیه من المساعدة علی البر والتقوی والزجر عن کثیر من معاصی الله عز و جل۔

علل اور عیون الاخبار میں فضل بن شاذان سے اور انہوں نے امام رضا سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: نماز جماعت کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ توحید و اخلاص اور اسلام و عبادت کھلم کھلا خدا کے لئے ہو کیونکہ ان کے کھلم کھلا ہونے میں خدائے واحد کی مشرق و مغرب والوں پر حجت ہے تاکہ منافق اور

ذلیل سمجھنے والے اس چیز پر عمل کریں جس کا انہوں نے زبان سے اقرار کیا ہے اسلام اور اس کے پابند ہونے کو دنیا پر واضح کریں تا کہ لوگوں کے لئے ان کے مسلمان ہونے کی گواہی دینا آسان ہو جائے، اس کے علاوہ بھی نماز جماعت کے بہت سے فوائد ہیں جیسے نیک کام میں ایک دوسرے کا تعاون کرنا اور خدا کی نافرمانی سے روکنا۔

نماز جماعت کی فضیلت سے متعلق دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے:

عن ابی عبداللہ عن ابیہ ، قال رسول اللہ : من صلی الخمس فی جماعة فظنوا به خیرا [۱]

امام صادقؑ نے اپنے پدر بزرگوار سے روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جو شخص پانچوں نمازوں کو جماعت سے پڑھتا ہے اس کے بارے میں نیک خیال رکھو۔

یہ وہی بات ہے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، نماز جماعت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ نمازی ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں، اس سے پہلے امام رضاؑ کی حدیث میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا: خدا نے نماز جماعت کا حکم اس لئے رکھا ہے تا کہ وہ کھلم کھلا لوگوں کے سامنے ادا کی جائے جس سے مشرق و مغرب والے اپنی آنکھوں سے اس حجت کو دیکھ لیں اس حدیث میں آپ نے تعاون و مدد کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ نماز جماعت کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ میں بدکاریوں اور برائیوں کو نہیں پھیلنے دیتی بلکہ لوگوں کے درمیان فضائل و کمالات کو رواج دیتی ہے۔

میرزا جواد ملکی کی اسرار الصلوۃ سے اقتباس

نماز جماعت کا اصلی فلسفہ خدا کے حکم کے بارے میں مومنوں کے دلوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے اس اتحاد کے بہت سے فائدے ہیں ان میں سے ایک اسلام کی طاقت و قوت بھی ہے۔ اس سے قطع نظر نماز جماعت کا نفوس کی تکمیل اور سیر الی اللہ میں انکا قوی ہونا اور خدائی برکتوں کو اپنی طرف جذب کرنے میں بڑا اثر ہے کیونکہ اگر خدا کی رحمت ان میں سے کسی ایک کے شامل حال ہوگئی، خصوصاً اس وقت جب

---

[۱] ایمان ص ۳۷۱

ان کا اتحاد خدا کی رضا کیلئے ہو، تو وہ رحمت ان سب کے شامل حال ہوگی اگر چہ دوسرے اس کے مستحق بھی نہ ہوں۔ اور دلوں کا آپس میں ملنا ہمارے لئے ایسا ہی ہے جیسے قلیل اور کم پانی دوسرے پانی سے مل جاتا ہے کہ اتصال کے بعد وہ کم نہیں رہتا ہے بلکہ کر ہو جاتا ہے اب وہ قلیل نجاست سے نجس نہیں ہوگا بلکہ اپنی جگہ پاک و طاہر رہے گا۔

مختصر یہ کہ اہم بات دلوں کا متحد ہونا ہے پس اگر کسی کو اس جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی توفیق نصیب ہوگئی کہ جس کے شرکاء کے دل راہ خدا میں متحد ہیں تو اسے اس ثواب کی امید رکھنا چاہئے جو نماز جماعت کے بارے میں احادیث میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی اس نماز جماعت میں شریک ہوتا ہے کہ جس کے شرکاء کے دلوں میں ایک دوسرے سے کینہ و حسد اور دشمنی ہے اور پھر یہ توقع رکھے کہ خدا اس کو وہی ثواب عطا کرے گا جو کہ احادیث میں نماز جماعت کا بیان ہوا ہے تو وہ خود فریبی میں مبتلا ہے۔

جس پیش نماز نے اپنے دل کو پاک اور اپنے نفس کو مہذب و پاکیزہ بنالیا ہے تو اس سے لامحالہ ہر شخص محبت کرے گا۔ اور وہ بھی مومنین سے اس خدائی کی محبت کے تحت محبت کرے گا جس نے ان کے دلوں کو متحد کر رکھا ہے، وہ ان سے اس سے زیادہ محبت کرے گا کہ جتنی وہ اس سے کرتے ہیں، نتیجہ میں ان کا نماز جماعت میں جمع ہونا خدا کے منشا کے مطابق ہوگا۔ ہاں اگر ایسی جماعت ہو کہ جس کے شرکاء کے بدن تو ایک دوسرے سے متصل ہوں لیکن دلوں میں افتراق ہو اور ایک دوسرے سے بدگمان ہوں اور اس نعمت پر حسد کرتے ہوں کہ جو خدا نے انہیں عطا کی ہے خصوصاً اگر یہ بات امام و ماموم کے درمیان ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسی جماعت میں نور و صفا ہوگا اور خدا کے نزدیک اس جماعت کی قدر و قیمت ہوگی، کیونکہ بہترین عبادت وہ ہے جو دلوں پر مثبت اثر کرے اور انہیں نورانی کردے۔[۱]

نمازِ جماعت کا ثواب

ابو سعید خدری نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: نماز عصر کے بعد جبریل ہزار فرشتوں کے ساتھ نازل ہوئے اور فرمایا: اے محمدؐ خدا آپ پر سلام بھیجتا ہے اور آپ کے لئے دو تحفے بھیجے

۱۔ ترجمہ و شرح رسالۃ الحقوق بکہری ص ۱۵۳ تا ۱۵۵

ہیں جو کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے تھے۔ رسولؐ نے دریافت فرمایا: اے جبریل وہ دو تحفے کیا ہیں؟ پہلا: تین رکعت نماز وتر اور دوسرا پانچ وقت کی نمازوں کو باجماعت پڑھنا۔

رسولؐ نے جبریل سے دریافت کیا: نماز جماعت میں میری امت کے لئے کیا ثواب ہے؟ جبریل نے کہا: اے محمدؐ! جب جماعت میں دو آدمی ہونگے تو ہر رکعت کا ثواب ایک سو پچاس رکعت کے برابر لکھا جائیگا۔ اور اگر تین آدمی ہونگے تو خدا ہر رکعت کا ثواب دو سو پچاس رکعت کے برابر لکھے گا۔ اور اگر جماعت میں چار آدمی ہونگے تو خدا ہر رکعت کے لئے بارہ سو رکعت نماز کا ثواب لکھا جائیگا اور اگر جماعت میں پانچ آدمی ہونگے تو ہر رکعت کے لئے تیرہ سو رکعت کا ثواب لکھا جائیگا اور اگر جماعت میں چھ آدمی ہونگے تو ہر رکعت کے عوض چوبیس سو نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا اور جب جماعت میں سات آدمی ہوتے ہیں تو ہر رکعت کے عوض دو ہزار آٹھ سو نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا اور جب نماز جماعت میں آٹھ آدمی ہوتے ہیں تو ہر رکعت کے عوض نو ہزار چھ سو نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا۔ اور جب جماعت میں نو آدمی ہوتے ہیں تو ہر رکعت کے عوض انیس ہزار نمازوں کا ثواب لکھا جائے گا اور اگر جماعت میں دس سے زیادہ ہو جائیں تو اگر زمین اور آسمان کے سارے دریا روشنائی بن جائیں اور سارے درخت قلم بن جائیں اور جن وانس اور فرشتے لکھیں تو اس کی ایک رکعت کا ثواب نہیں لکھ سکیں گے۔ اے محمدؐ! جو تکبیر، مومن امام جماعت کے ساتھ کہتا ہے وہ اس کے لئے ستر ہزار مستحبی حج وعمرہ سے بہتر ہوتی ہے۔ [1]

دوسری روایت میں ہے:

قلت لا بی عبداللّٰہ علیہ السلام : الرجلان یکونان جماعة ؟ فقال : نعم، ویقوم الرجل عن یمین الامام۔ [2]

میں نے امام صادقؑ سے عرض کی: کیا دو آدمیوں کے ساتھ بھی جماعت ہو جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، دوسرے آدمی کو امام جماعت کے دائیں جانب کھڑا ہونا چاہئے۔

دوسری حدیث جہنی کی ہے کہ وہ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میں صحرا میں زندگی بسر کرتا ہوں۔ اذان کے بعد میں عورتوں، بچوں اور نوکروں کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں کیا یہ نماز

---

[1] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۲ ص ۱۴۴۔۱۴۵ [2] وسائل الشیعہ ج ۴ ص ۶۴۶

جماعت ہے؟ فرمایا: ہاں۔

ان احادیث کے ہوتے ہوئے شیعیان امیر المومنین نماز جماعت کے ثواب کو کیوں چھوڑتے ہیں؟ اگر چھوڑتے ہیں تو کیا یہ بدترین خسارہ و گھاٹا نہیں ہے۔

امام جماعت سے متعلق کچھ داستانیں

قپانچی نے، شرح رسالۃ الحقوق میں، نوادر، ائمۃ الجماعۃ کے عنوان سے کچھ طنز آمیز داستانیں لکھی ہیں۔[۱]

۱۔ ایک دیہاتی پہلی صف میں امام جماعت کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کا نام مجرم تھا امام جماعت نے ''آیۂ'' الم نہلك الاولین کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ہم نے دوسروں کو ان سے ملحق کر دیا، وہ دیہاتی پہلی صف چھوڑ کر تیسری صف میں شامل ہو گیا۔ امام جماعت نے آیۂ ''کذالک نفعل بالمجرمین'' ہم مجرموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔ اس دیہاتی نے کہا: خدا کی قسم اس سے تمہاری مراد میں ہی ہوں، یہ کہہ کر اس نے اپنے جوتے اٹھائے اور مسجد سے نکل گیا۔

۲۔ ابراہیم، موسیٰ اور حاج احمد تین بھائی تھے۔ تینوں نے مل کر ایک مسجد بنائی اور اس میں ایک امام جماعت رکھا، اس کی تنخواہ وغیرہ کا انتظام بھی تینوں ہی کرتے تھے، ایک دن امام جماعت نے یہ آیت پڑھی: ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ صحف ابراھیم و موسیٰ، نماز ختم ہونے کے بعد حاج احمد نے امام جماعت سے کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ یہ مسجد ہم تینوں نے بنائی ہے اور اس کے اخراجات بھی ہم تینوں ہی برداشت کرتے ہیں؟ امام جماعت نے کہا: ہاں مجھے معلوم ہے۔ حاج احمد نے کہا: تو پھر نماز میں تم ان دونوں کو نام لیتے ہو اور میرا نام کیوں بھول جاتے ہو؟!

امام جماعت نے کہا: یہ قرآن ہے اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ حاج احمد نے کہا: یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے ان دونوں سے محبت ہے، اگر آئندہ نماز میں میرا نام نہ لیا تو لاٹھی سے خبر لونگا، دوسری نماز میں امام جماعت نے صحف ابراھیم و موسیٰ و حاج احمد پڑھا۔ نماز کے بعد ماموین نے

---

[۱] شرح رسالۃ الحقوق ص ۱۴۷، ۱۴۸

کہا: آپ نے قرآن میں حاج احمد کا نام کہاں سے بڑھا دیا؟ اس نے کہا: لاٹھی سے بچنے کی خاطر میں نے احمد کے نام کا اضافہ کر دیا۔

۳۔ لکھا ہے کہ ایک امام جماعت نے ایک بالٹی خریدی حالت نماز میں اس کو سامنے رکھنے میں شرم محسوس ہوئی لہذا اس نے اسے پیچھے رکھ دیا رکوع میں گیا تو اسے بالٹی یاد آئی۔ اس نے سوچا کہ شاید چور بالٹی چرا لے گیا۔ اس نے سر اٹھایا، کہنا چاہتا تھا: ربنا لك الحمد ،لیکن اس کی بجائے ربنا لك السطل، کسی ماموم نے کہا: ڈرو نہیں بالٹی تمہارے پیچھے رکھی ہے۔

۴۔ ایک شخص امام جماعت کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا تھا۔ امام جماعت سورۂ حمد بھول گیا۔ اس کے بدن میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ اس نے کہا: اعوذ بالله من الشیطان الرجیم ،ایک آدمی نے کہا: شیطان کی کیا خطا ہے، تم نماز بھول گئے ہو۔

ہمنشیں کا حق

واما حق الجليس فان تلين له كنفك و تطيب له جانبك و تنصفه فى مجاراة اللفظ ولا تغرق فى نزع اللحظ اذا لحظت و تقصد فى اللفظ الى افهامه اذا لفظت و ان كنت الجليس اليه كنت فى القيام عنه بالخيار و ان كان الجالس اليك كان بالخيار ، ولا تقوم الا باذنه ولا قوة الا بالله.

ہمنشین کا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ۔ خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرو اور اسے خوش آمدید کہو۔ اور اس سے گفتگو کے دوران انصاف سے کام لو اس سے یک بیک توجہ نہ ہٹاؤ اور اس سے گفتگو میں تمہارا مقصد اسے سمجھانا ہو، اگر اس ہمنشینی میں تم نے پہل کی ہے اور اس کے ہمنشین بنے ہو تو تمہیں اختیار ہے کہ جس وقت چاہو اٹھو لیکن اگر اس نے تم سے ہمنشینی کا آغاز کیا ہے تو اختیار اس کو ہے مگر یہ کہ تم اس سے اجازت حاصل کرو، خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مکارم الاخلاق میں یہ جملہ بھی ہے:

وتنسى زلاته وتحفظ خيراته و لا تسمعه الا خيرا.

اس کی لغزشوں کو بھلا دو، اس کی نیکیوں کو یاد رکھو اور اسکی نیکی کے علاوہ کوئی بات نہ سنو! بنابرایں ہمنشیں کا حق یہ ہے کہ اس سے نرمی سے ملاقات کی جائے اور گفتگو کے دوران اس کے ساتھ انصاف کیا جائے، گفتگو کا مقصد اسے سمجھانا ہو اور اس کی ہمنشینی کی رعایت کی جائے اگر اس کے پاس جائے تو اس کی اجازت کے بغیر وہاں سے نہ اٹھے اور اگر وہ آئے تو اس کے پاس بیٹھے اور اس کی اجازت کے بغیر اسے چھوڑ کر نہ جائے۔ اس کی لغزش سے چشم پوشی کرے اور اس کے نیک کام کو مد نظر رکھے۔

امام زین العابدینؑ نے اس رسالہ میں حق ہمنشیں، حق صاحب اور حق خلیط کو بیان فرمایا ہے: ممکن ہے تینوں لفظ ایک ہی معنی کے لئے استعمال ہوئے ہوں، لیکن ان میں کچھ فرق بھی ہے، جس کو ہم بیان کریں گے۔

انسان مدنی الطبع ہے

یہاں ہمنشیں سے مراد وہ شخص ہے جو ایک جلسہ میں کسی کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا ہو یا ہمیشہ ایک دوسرے کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہوں بہر حال ہمنشینی کے عنوان کے صادق آنے سے ایک کا دوسرے پر حق ہو جاتا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر ہر انسان کو ہمنشین، رفیق اور دوست کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ایک ساتھ زندگی گزارنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان کو تنہائی میں کوفت ہوتی ہے۔ وہ خود کو بیگانہ محسوس کرتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ اچھے ہمنشیں اور دوست کے ساتھ نشاط ومسرت محسوس کرتا ہے۔

انسان کی شخصیت میں دوست کا کردار

کسی بھی انسان کے دوست کا اس کی شخصیت اور اس کے دنیوی واخروی امور میں بڑا کردار ہوتا ہے۔ وہ اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر منفی یا مثبت اثر ڈالتا ہے یہی وجہ ہے کہ رسولؐ نے ہر آدمی کی شخصیت کا معیار اس کے دوست کی شخصیت کو قرار دیا ہے اور فرمایا: المرء علیٰ دین خلیله و قرینه[۱] ہر شخص اپنے دوست وہمنشیں کے دین پر ہوتا ہے اور جس شخص کا کوئی دوست نہیں ہوتا وہ بڑی مصیبت سے دوچار ہے حضرت علیؑ فرماتے ہیں: من فقد اخافی الله فکانما فقد اشرف اعضائه[۲] جس نے اپنے اس بھائی کو گنوا دیا کہ جس کو وہ خدا کے لئے دوست رکھتا تھا اس نے اپنے بدن کے عظیم عضو کو گنوا دیا ہے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ انسان کی زندگی میں دوست اہم کردار ادا کرتا ہے لہذا دوست وہمنشیں کے انتخاب میں بہت زیادہ غور وفکر سے کام لینا چاہئے تا کہ دوستی میں دوام واستحکام پیدا ہو۔

شائستہ دوست کے انتخاب کا طریقہ

دوست کے انتخاب کے سلسلہ میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

من غضب علیك ثلاث مرات فلم یقل فیك سوء فاتخذه خلیلا[۳]

---

[۱] شافی ج۱ ص۱۹۲ [۲] شرح غررودرر ج۵ ص۴۲۷ [۳] تاریخ یعقوبی ج۲ ص۳۸۳

جو تمہارے اوپر تین بار غضبناک ہو اور اس کے باوجود تمہارے بارے میں کوئی غلط بات نہ کہے تو اسے دوست بنالو۔

پائیدار اور ناپائیدار دوستی

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: **من اتخذ اخاً بعد حسن الاختبار دامت صحبته و تاکدت مودته** ۱

جو شخص صحیح آزمائش و تجربہ کے بعد کسی سے دوستی کرتا ہے اس کی دوستی پائیدار اور اس کی محبت استوار ہوتی ہے۔

قال علیؑ : من اتخذ اخاً من غیر اختبار الجاه الاضطرار الی مرافقة الاشرار ۲

حضرت علیؑ فرماتے ہیں جو شخص آزمائے بغیر کسی سے دوستی کرتا ہے وہ شریر لوگوں کی رفاقت قبول کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

برے لوگوں کی رفاقت کا اثر

حضرت عبدالعظیم حسنی نے امام محمد باقرؑ سے اور انہوں نے اپنے آباءؑ سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا:

مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخیار ۳

شریر لوگوں کی ہمنشینی نیک افراد سے بدظنی کا باعث ہوتی ہے۔

امام صادقؑ اپنے آباءؑ سے روایت کرتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا:

ثلاثة مجالستهم تمیت القلب : مجالسة الانذال والحدیث مع النساء و مجالسة الاغنیاء ۴

---

۱ شرح غرر و درر ج ۵ ص ۳۹۷۔۳۹۸ ۲ بحار الانوار ۷۲ ص ۱۹۱

۳ شرح غرر و درر ج ۵ ص ۳۹۷۔۳۹۸ ۴ ایضا

تین قسم کے لوگوں کی ہمنشینی دل کو مردہ بنادیتی ہیں، پست اور فرومایہ لوگوں کی ہمنشینی، عورتوں سے گفتگو اور مالداروں کی ہمنشینی۔

مذکورہ دو حدیثوں میں جن لوگوں کی ہمنشینی سے اسلئے منع کیا گیا ہے کہ ان کی ہم نشینی دلوں کو مردہ بنادیتی ہے، ان میں سے ایک تکبر کرنے والے مال دار ہیں۔ دوسری حدیث میں امام محمد باقرؑ نے مال دار کی ہمنشینی کے بارے میں یہ فرمایا ہے:

عن ابی جعفر الباقرؑ علیه السلام انه قال لرجل : یا فلان ، لا تجالس الاغنیاء فان العبد یجالسهم وهو یریٰ ان لله علیه نعمة فما یقوم حتی یریٰ ان لیس لله علیه نعمة " [1]

اے شخص ثروت مندوں کی ہمنشینی اختیار نہ کر کیونکہ اس کا غلط اثر جو کسی شخص پر ہوتا ہے یہ ہے کہ وہ جس نعمت کو اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے اسے بھلا دیتا ہے اور اس کی نعمت و ثروت پر نظر جما دیتا ہے۔ اور اپنی نعمت سے غافل ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث میں رسولؐ فرماتے ہیں: مُردوں کی ہمنشینی اختیار نہ کرو عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسولؐ کہ مردہ کون ہے؟ فرمایا: ہر فضول خرچ مالدار جو خدا سے غافل ہے وہ دنیا کی مادی زندگی میں گم ہے، اس کے لئے پیسہ ہی سب کچھ ہے، اس کا دل مردہ ہے اس میں حیات کی رمق نہیں ہے، اسی لئے رسولؐ نے مردہ قرار دیا ہے، ظاہر ہے مُردوں کی ہمنشینی اختیار کرنے سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے اسلئے رسولؐ نے ان کی رفاقت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ صدوقؒ نے اپنی کتاب "صفات الشیعہ" میں امام محمد باقرؑ سے اور آپ نے اپنے آباء سے روایت کی ہے کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا:

مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخیار، و مجالسة الاخیار تلحق الاشرار بالاخیار، و مجالسة الابرار للفجار تلحق الابرار بالفجار، فمن اشتبه علیکم امره ولم تعرفوا دینه فانظروا الی خلطائه فان کانو اهل دین الله فهو علی دین الله. و ان کانو ا علیٰ غیر دین الله فلا حظ له من دین الله ، ان رسول اللهؐ

---

[1] شرح غرر و درر ص ۱۹۴۔۱۹۵

اکن یقول : من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یواخینّ کافراً ولا یخالطنّ فاجرا فمن آخیٰ کافراً او خالط فاجراً کان کافرا فاجرا۔ [1]

شریر لوگوں کی ہمنشینی نیک افراد سے بدظنی کا باعث ہوتی ہے۔ اور نیک لوگوں کی ہمنشینی سے شریر بھی نیکوں سے ملحق ہو جاتے ہیں اور نیکوں کا بدکاروں کے پاس بیٹھنا انہیں بدکاروں سے ملحق کر دیتا ہے۔ پھر جس کا معاملہ تم پر واضح نہ ہو جس کے دین کو تم نہ پہچانتے ہو تو اس کے ساتھی و ہمنشیں کو دیکھو اگر وہ دین خدا کے پابند ہوں تو وہ بھی دین خدا پر ہے اور اگر وہ دین خدا پر نہ ہوں تو اس کو بھی دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، رسولؐ فرماتے تھے: جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ کافر سے دوستی نہیں کرے گا اور نہ کسی بدکار کا ہمنشیں بنے گا، کیونکہ جو کسی کافر سے دوستی کرے اور کسی بدکار کے ساتھ رہے گا وہ بھی کافر و بدکار ہے۔

ان کی ہمنشینی اختیار کرو

امام زین العابدینؑ نے اپنے بچوں سے فرمایا:

عن علی بن الحسینؑ انہ کان یقول لبنیہ : جالسوا اہل الدین والمعرفۃ فان لم تقدروا علیہم فالوحدۃ آنس واسلم ، فان اُبیتم الا مجالسۃ الناس فجالسوا اہل المروات ، فانہم لا یرفثون فی مجالسہم۔

دین و معرفت رکھنے والے لوگوں کی ہمنشینی اختیار کرو اور اگر ایسے افراد نہ ملیں تو تنہا رہ لینا کہ اس طرح محفوظ رہو گے اور اگر لوگوں کے ساتھ نشست و برخاست رکھنے پر مجبور ہو جاؤ تو اہل مروت کی رفاقت اختیار کرنا کہ وہ اپنی بزم میں بدگوئی و فحاشی کو داخل نہیں ہونے دیتے۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں: من جالس اہل الریب فہو مریب [2]

جو شک کرنے والوں کے پاس بیٹھے گا وہ بھی شکی ہو جائے گا۔

---

[1] شرح غرر و درر ج ۵ ص ۱۹۴۔۱۹۵ [2] ایضا ص ۱۹۷

علماء کی ہمنشینی

قال النبی اجلسوا عند کل عالم یدعوکم من خمس الیٰ خمس : من الشك الی الیقین ، ومن الریا الیٰ اخلاص ، ومن الرغبة الی الزهد ، و من الکبر الی التواضع ، و من العداوة الی المحبة [1]

عالم کی ہمنشینی اختیار کرو وہ تمہیں پانچ چیزوں سے ہٹا کر پانچ چیزوں کی طرف بلائے گا:

۱۔ شک سے یقین کی طرف۔

۲۔ ریا سے خلوص کی طرف۔

۳۔ دنیا کی دلچسپی سے زہد اور اس سے بے رغبتی کی طرف۔

۴۔ تکبر سے انکساری کی طرف۔

۵۔ عداوت سے محبت کی طرف۔

اس حدیث سے علما کی ملاقات اور انسان کی روح پر اس کا اثر واضح ہو جاتا ہے کیونکہ رسولؐ نے لوگوں کو علما کے پاس نشست و برخاست کی ترغیب کی ہے۔

عقل مند دوست کا کردار

عن الصادقؑ : الاخوان ثلاثة: فواحد کالغذا الذی یحتاج الیه کل وقت فهو العاقل ، والثانی فی معنی الداء و هو الاحمق ، والثالث فی معنی الدواء فهو اللبیب. [2]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: سچے دوستوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ دوست جو غذا و خوراک کی مانند ہیں کہ ان کی ضرورت زندگی میں ہر وقت ہوتی ہے، یہ عقلمند دوست ہیں۔

۲۔ وہ دوست جو بیماری کی مانند ہیں ان سے نقصان ہی پہنچتا ہے یہ بے وقوف و احمق دوست ہیں۔

---

[1] اثنی عشریہ ص ۲۰۲ [2] تحف العقول ص ۲۳۹

۳۔ وہ دوست جو شفا بخش دوا کی مانند ہیں یہ نہایت ہی عقلمند دوست ہیں۔

معتصم ایک وزیر کا مہمان

فضل بن مروان معتصم کا وزیر تھا، وہ اپنی لیاقت و تجربہ کاری اور ذہانت کی وجہ سے تمام وزیروں پر فوقیت لے گیا تھا۔ خلیفہ کی نگاہ میں اس کی بڑی قدر تھی، فضل نے لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اسکی خلیفہ کی نظر میں بڑی وقعت ہے ایک روز عصرانہ پر خلیفہ کی دعوت کے اہتمام میں، فضل نے اپنے محل میں قیمتی قالین بچھائے رنگ برنگے پھولوں کے گلدستہ سجائے، سونے، چاندی کے برتن فراہم کئے، ایک سے ایک شیریں پھل مہیا کیا: جب خلیفہ اس کے محل میں داخل ہوا تو اس کو بھی رشک ہوا اور وہ یہ بہانہ بنا کر واپس چلا گیا کہ میرے دل میں درد ہو رہا ہے۔

اس حادثہ کے رونما ہونے سے وزیر کی پریشانی بڑھ گئی وہ سمجھ گیا کہ ان چیزوں کا الٹا اثر ہوا ہے وہ اسکی تلافی کی تدبیر کرنے لگا، اس نے یہ صورت حال اپنے صمیمی اور ذہین و ہوشیار دوست ابراہیم موصلی سے بیان کی جو کہ اس دعوت میں مدعو تھا۔ ابراہیم نے لحہ بھر کے لئے غور کیا اور پھر وزیر سے کہا: تم خلیفہ کا ساتھ نہ چھوڑو بلکہ بدرقہ کے بطور ان کے ساتھ جاؤ، دربار میں جاؤ اور میرے خط کا انتظار کرو اور جب میرا خط پہنچے تو اسے خلیفہ کے سامنے پڑھنا۔

وہ اپنے دوست کے مشورہ کے مطابق خلیفہ کے بدرقہ میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد اسے ایک خط دیا گیا، خط میں لکھا تھا: قالین اور آرائش کرنے والے آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں: خلیفہ صاحب کی آمد و تشریف آوری کا پروگرام ختم ہو چکا اب ہم اپنا اپنا سامان لے جائیں؟ معتصم نے معلوم کیا: کیسا خط ہے؟ کیا لکھا ہے؟ وزیر نے خط کا مضمون معتصم کو سنا دیا۔ خلیفہ کی بدگمانی ختم ہو گئی اور اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ یہ سامان تو عاریت تھا! مختصر یہ کہ عقلمند دوست نے اپنے دوست کو مصیبت میں مبتلا ہونے سے بچا لیا۔

اچھے دوست کے صفات

عن الصادقؑ : الصداقة محدودة فمن لم تكن فيه تلك الحدود فلا تنسبه الى شيء من الصداقة : اولها ان يكون سريرته وعلانيته لك واحدة ، والثانية ان يرىٰ زينك زينة و شينك شينه، والثالثة ان لا يغيره عنك مال ولا ولاية ، والرابعة ان لا يمنعك شيئا مما تصل اليه مقدرته ، و الخامسة ان لا يسلمك عند النكبات۔[۱]

امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: دوستی۔ کے کچھ حدود ہیں پس جس میں وہ حدود دو صفات نہ پائے جاتے ہوں اسے دوست نہ سمجھو اور وہ صفات و معیار یہ ہیں: اول یہ کہ تمہارے بارے میں اس کا ظاہر و باطن ایک ہو دوسرے وہ تمہاری زینت کو اپنی زینت اور تمہاری برائی کو اپنی برائی سمجھتا ہو، تیسرے یہ کہ مال دنیا اور اسکی آرائش اسے تمہارے بارے میں منقلب نہ کرے چوتھے یہ کہ جو کچھ اس کے اختیار میں ہے وہ اس سے تمہیں محروم نہ کرے پانچویں یہ کہ وہ تمہیں حوادث کے حوالے نہ کرے، یہ ہیں اچھے رفیق و دوست کے صفات اگر ان صفات کا حامل کوئی انسان مل جائے تو اس سے ضرور دوستی کرنا چاہئے۔

انبیاء، تہی دست یا پاک دل لوگوں کی ہمنشینی

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغدوة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عينك عنهم تريد زينة الحيوة الدنيا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا و اتبع هواه وكان امره فرطا۔[۲]

ان لوگوں کی ہمنشینی اختیار کرو جو صبح اور عصر کے وقت اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اسی کی رضا کے طلبگار ہوتے ہیں اور دنیا کی سج دھج کی بنا پر ان لوگوں سے آنکھیں نہ پھراؤ اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا دیا ہے، جو اپنے نفسوں کی پیروی کرتے ہیں جن کے کام میں شدت پائی جاتی ہے۔

---

[۱] تحف العقول ص ۳۶۶؛ بہ نقل از امالی صدوق ص ۳۹۷ [۲] کہف: ۲۸

اس آیت سے ہم عظیم و شریف لوگوں کے معیار سے واقف ہوتے ہیں۔ اس آیت کی شان نزول یہ بیان ہوئی ہے: کچھ ثروت مند مستکبرین رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سلمان، ابوذر، صہیب اور خباب وغیرہ ایسے مومنوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: اے محمد! آپ صدر مجلس میں تشریف فرما ہیں اور یہ لوگ کہ جن کی بدبو ہمارے مشام میں چڑھی جاتی ہے اور موٹے وسخت لباس پہنے ہوئے ہیں اگر آپ ان کو اپنے پاس سے ہٹا دیں تو ہم آپ کے قریب آجائیں اور آپ کی بزم میں شریک ہوں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: اے رسول ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آنا، آپ تو انہیں کو اپنے پاس بٹھایئے جو صرف خدا کی رضا کے طلبگار ہیں، اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کیجئے کہ جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل بنا رکھا ہے۔ [1]

مذکورہ آیت طبقاتی اور امتیازی فکر کو کچل دیتی ہے اور مالدار و غریب لوگوں کے درمیان ارتباط پیدا کرتی ہے اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ ہوس پرستی اور خدا سے غفلت کے درمیان ایک رابطہ ہے، جو لوگ ہوس پرست ہیں وہ خدا سے غافل ہیں اور جو خدا سے غافل ہیں انہیں اپنے پاس نہ بٹھاؤ بلکہ ان لوگوں کو اپنے پاس بٹھاؤ جو صبح و شام خدا کو پکارتے ہیں۔

جس طرح خدا نے رسولؐ سے فرمایا ہے کہ اپنی بزم میں متقی اور شریف لوگوں کو جگہ دیجئے اور ان کا احترام کیجئے اسی طرح اس بیان میں امام زین العابدینؑ نے ہم نشیں کے حق کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کا احترام کرنا چاہیے اور ان سے ادب کے ساتھ گفتگو کرنا چاہئے اور ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا چاہئے اور رخصت کرتے وقت بھی ان کے احترام کا پورا خیال رکھنا چاہئے۔

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۱۲ ص ۴۱۴

ہمسایہ کا حق

واما حق الجار فحفظهٔ غائبا و کرامته شاهدا و نصرته و معونته فی الحالین جمیعا، لا تتبع له عورة ولا تبحث له عن سوء لتعرفها، فان عرفتها منه عن غیر ارادة منك ولا تكلف كنت لما علمت حصینا و سترا ستیرا، لو بحثت الاسنة عنه ضمیرا لم تتصل الیه لانطوائهِ علیه، لا تستمع علیه من حیث لا یعلم لا تسلمه عند شدیدة ولا تحسده عند نعمة، تقیل عثرته و تغفر زلته ولا تدخر حلمك عنه اذا جهل علیك ولا تخرج ان تكون سلما له، ترد عنه لسان الشتیمة و تبطل فیه کید حامل النصیحة و تعاشره معاشرة کریمة، ولا حول ولا قوة الا باللّٰه۔

ہمسایہ کا حق یہ ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کی عزت وآبرو کی حفاظت کرو اور اس کی موجودگی میں اس کا احترام کرو اور ہر حال میں اسکی مدد و معاونت کرو اس کے راز کی ٹوہ میں نہ رہو اور اسکی کمزوریوں کی تلاش میں نہ رہو پھر اگر نہ چاہتے ہوئے بھی آسانی سے تمہیں اسکی کوئی کمزوری معلوم ہو جائے تو تم اس کے لئے محکم و مضبوط قلعہ اور ایسا ضخیم و دبیز پردہ بن جاؤ کہ اگر اسے نیزوں سے بھی تلاش کیا جائے تو بھی اس کا سراغ نہ ملے کیونکہ وہ پیچیدہ اور مستور ہے۔ اور اس کے خلاف باتوں پر کان نہ دھرو کہ اس کو خبر تک نہ ہو اور اسے سختیوں اور مشکلات میں چھوڑ کر الگ نہ ہو جاؤ اور جب اس کے پاس کوئی نعمت دیکھو تو اس پر حسد نہ کرو۔ اسکی لغزشوں سے درگزر اور اس کے گناہوں سے چشم پوشی کرو اور اگر وہ تمہارے بارے میں جہالت کر بیٹھے تو تم اسے برداشت کرو اور اس کے ساتھ مسالمت و صلح آمیز برتاؤ کرو، اس پر سب وشتم نہ کرو اور اگر کسی ناصح نے اسے دھوکا دیا ہے تو تم اس کا سدباب کرو اس کے ساتھ شریف کی طرح بسر کرو اور جان لو کہ خدا کی قدرت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

جار کے معنی اور اس کا محل استعمال

جار ہمسایہ کو کہتے ہیں، قرآن مجید کے سورۂ نساء میں یہ لفظ نزدیک اور دور کے ہمسایہ کے لئے

استعمال ہوا ہے کیونکہ ایک دوسرے کے پڑوس میں ہیں قرآن مجید میں "قطع متجاورات" یہ ایک دوسرے سے نزدیک ٹکڑے ہیں۔

پھر قرآن مجید میں پناہ لینے کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔

وان احدمن المشرکین استجارك فاجره [1]

اور اگر مشرکوں میں سے کوئی پناہ طلب کرے تو اسے امان دو

اجارہ اور استجارہ جار سے مشتق ہے جو امان و ہمسایہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے گویا ہمسایہ، ہمسایہ کی امان میں ہے۔ راغب لکھتے ہیں: چونکہ ہمسایہ کا حق عقلی اور شرعی لحاظ سے عظیم ہے لہذا جس کا حق عظیم ہے یا جو دوسرے کے حق کو عظیم سمجھتا ہے اسے جار کہتے ہیں: مثلا لا غالب لکم الیوم وانی جار لکم [2] یعنی میں تمہارے لئے پناہ گاہ ہوں اور تمہارے حق کو عظیم سمجھتا ہوں خدا نے نزدیک اور دور کے ہمسایہ کی تصریح کی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں قرآن کیا کہتا ہے۔

قرآن میں ہمسایہ کے حقوق

"واعبدو اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئا و بالوالدین احسانا و بذی القربی والیتامی و المسلکین والجار ذی القربی والجار الجنب و الصاحب بالجنب وابن السبیل و ماملکت ایمانکم" [3]

یہ آیت اسلامی حقوق کو بیان کرتی ہے خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا اسی طرح لوگوں کے ساتھ معاشرت کے آداب کو بیان کرتی ہے، کلی طور پر آیت سے دس احکام سمجھ میں آتے ہیں ان میں سے ایک ہمسایہ بھی ہے۔"والجار ذی القربی" "یعنی قریبی ہمسایہ۔

قریبی ہمسایہ کے کیا معنی ہیں؟

اس سلسلہ میں مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں بعض نے کہا ہے کہ وہ ہمسایہ مراد ہیں جو

[1] توبہ : ٦ [2] انفال : ۴۸ [3] نساء : ۳٦

عزیز و رشتہ دار بھی ہیں لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں کیونکہ اس آیت کے پہلے جملوں میں عزیزوں کے حقوق کی طرف اشارہ ہوا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ ہمسایہ ہیں جن کے مکان نزدیک ہیں نزدیک والے ہمسایوں کے حقوق زیادہ ہیں یا وہ ہمسایہ مراد ہیں جو دین و مذہب کے اعتبار سے انسان سے زیادہ قریب ہیں۔

"والجار الجنب" دور کے ہمسایہ، یہاں غالباً مکان کی دوری مراد ہے کیونکہ حدیث کی رو سے گھر کے چاروں طرف کے چالیس گھروں تک ہمسایہ شمار ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔ لفظ ہمسایہ کا مفہوم محدود ہے جو نزدیک کے ہمسایہ ہی کو سمجھا جاتا ہے لہذا اسلام کی رو سے اس کے مفہوم کی وسعت کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ دور کے ہمسایوں کے ناموں کی تصریح کی جائے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ دور کے ہمسایوں سے غیر مسلم مراد ہوں کیونکہ ہمسایہ کا حق صرف مسلمان ہمسایوں ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ غیر مسلم کو بھی شامل ہے ہاں جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔ [1]

یہ تھا نزدیک و دور کے ہمسایوں کے بارے میں قرآن کا نظریہ، اب ہم اس سلسلہ میں نبیؐ اور ائمہ معصومینؑ سے وارد ہونے والی احادیث کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ہمسایہ کے حقوق حدیث کی روشنی میں

ہمسایہ کے حق، اس کے احترام اور انسان کی زندگی کے امن وامان میں جو ہمسایہ کا کردار ہوتا ہے اس کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں بہت سی حدیثیں بیان ہوئی ہیں:

قال رسولؐ من غلق بابه خوفا من جاره علیٰ اهله وماله فلیس جاره بمومن۔ فقیل له: یا رسول اللّٰه ! فما حق الجار علی الجار ؟ فقال : من ادنی حقوقه علیه ان استقرضه اقرضه ، و ان استعانه اعانه ، وان استعار منه اعاره ، وان احتاج الی رفده رفده ، وان دعا اجابه ، وان مرض عاده و ان مات شیّع

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۳ ص ۳۸۰-۳۸۱

جنازته وإن اصاحيراً فرح به ولم يحسده عليه واصاب مصيبةً حزن لحزنه ، ولا يستطيل عليه ببناء سكنه ، فيؤذيه باشرافه عليه ، و سد منافذ الريح عنه ، وان اهدى الى منزله طرفة اهدى له منها اذا علم انه ليس عنده مثلها او فليسترها عنه ، وعن عياله ان شحت نفسه بها ، ثم قال: اسمعوا ما اقول لكم : لم يؤد حق الجار الا قليل ممن رحمه الله ، ولقد اوصاني الله بالجار حتى ظننت انه سيورثه "[1]

رسولؐ فرماتے ہیں جو شخص اپنے گھر کا دروازہ اس لئے بند کرتا ہے کہ اسے ہمسایہ سے اپنے اہل و مال کا خوف ہوتا ہے تو اس کا ہمسایہ مومن نہیں ہے۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول ہمسایہ کا ہمسایہ پر کیا حق ہے؟ فرمایا: اس پر اس کا معمولی حق یہ ہے کہ اگر وہ قرض مانگے تو اسے قرض دے، اگر مدد طلب کرے تو اس کی مدد کرے اور اگر کوئی چیز عاریۃً طلب کرے تو عاریت دے اور اگر اسے عطا و بخشش کی ضرورت ہو تو اسے عطا و بخشش سے نوازے، اگر وہ دعوت کرے تو اسے قبول کرے اگر وہ مریض ہو تو اسکی عیادت کرے، اگر اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازہ میں شریک ہو اگر اسے کوئی اچھی چیز نصیب ہو تو خوشی منائے اس پر حسد نہ کرے اور اگر اسے کوئی صدمہ پہنچے تو اس پر غم منائے اور اس کے گھر سے اونچا گھر نہ بنائے کہ جس سے اس کے گھر کا حصہ نظر آئے اور اسے تکلیف ہو اور اس کے گھر کی کھڑکیوں کو بند نہ کرے تا کہ اس کے گھر میں صاف ستھری ہوا جائے۔ اگر کوئی چیز خرید کر اپنے گھر ہدیہ کے طور پر لے جائے تو اس میں سے اسے بھی ہدیہ دے بشرطیکہ اسے یہ معلوم ہو کہ اس کے پاس نہیں ہے یا اس چیز کو چھپا کر اپنے گھر لے جائے کہ جس سے ہمسایہ اور اس کے بچے اسے نہ دیکھیں پھر فرمایا: جو میں تم سے بیان کر رہا ہوں اسے خوب اچھی طرح کان کھول کر سن لو، ہمسایہ کا حق وہی معدودے چند افراد ادا کرتے ہیں جن پر خدا نے رحم کیا ہے خدا نے ہمسایہ کے بارے میں مجھے اتنی تاکید فرمائی ہے کہ میں یہ سوچنے لگا: ہمسایہ انسان کے وارثوں میں ہے۔

رسولؐ کے اس جامع بیان میں تین اہم نکات ہے۔ پہلا نکتہ ہمسایہ کی ثروت و عزت کا تحفظ ہے اصولی طور پر ہر انسان کا گھر اس کے لئے امن و چین کا مرکز ہے۔ اگر یہاں یہ بھی بے امان ہو جائے تو

---

[1] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۷۹

یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ محفوظ ترین جگہ سے محروم ہو گیا ہے اور یہ ہر فرد بشر کا حق ہے اس کو برباد نہیں ہونا چاہئے۔

رسولؐ فرماتے ہیں: اگر کسی شخص کا طرز زندگی ایسا ہے کہ جس سے اس کے ہمسایہ کو خطرہ لاحق ہے تو وہ سچے مومنوں کی فہرست سے خارج ہو گیا ہے۔ کسی نے دریافت کیا: ہمسایہ کا ہمسایہ پر کیا حق ہے؟ رسولؐ نے حقوق بیان فرمائیے۔

اس حدیث میں رسولؐ نے دوسرا نکتہ یہ بیان فرمایا ہے کہ اتنا اونچا گھر نہ بناؤ کہ جس سے اس کے گھر کی بے پردگی ہوتی ہو واضح رہے کہ جس زمانہ میں رسولؐ اکرم رسول کی حیثیت سے آئے تھے اس زمانہ میں اونچی اونچی عمارتیں نہیں بنتی تھیں کم از کم حجاز اور مکہ میں ایسے مکانات نہیں تھے۔ لیکن رسولؐ کے دستورات اور ان کا دین ہر جگہ اور ہر زمانہ کے لئے تھا اسی لئے آپ نے فرمایا کہ ہمسایہ کے گھر کو اتنا بلند اور اونچا نہیں ہونا چاہئے جس سے دوسرے کے گھر کا صحن وغیرہ نظر آئے۔ یہ اسلام کے دستورات کی جامعیت کا ایک راز اور دین مبین کی حقانیت کی سند ہے۔

آج کا معاشرہ جن مشکلات سے دوچار ہے ان میں سے ایک رہائش اور زندگی بسر کرنے کے لئے محفوظ جگہ کی تلاش بھی ہے اس مشکل سے ہمارا ملک ہی نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ممالک دوچار ہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لاینحل ہے یا اس کا حل تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ مغربی تہذیب نے کئی کئی منزلہ کالونیاں تعمیر کرائی اس کے برے نتائج بھی بھگتے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں بھی اس کا رواج ہو گیا ہے اور اس کے بھیانک نتائج پر توجہ نہیں ہے۔

حدیث کے آخر میں تیسرا نکتہ یہ بیان ہوا ہے کہ جو چیز اپنے بچوں کے لئے خریدے اگر وہ ہمسایہ کے یہاں نہ ہو تو اس کے لئے بھی خریدے یا اسی میں سے کچھ حصہ اسے دیدے خصوصاً ان چھوٹے بچوں کو دیدے جو وہاں موجود ہوں اور اگر انہیں نہیں دینا چاہتا تو اسے چھپا کر گھر لے جائے کیونکہ رسولؐ نے اس کی تصریح کی ہے۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی مسئلہ ہے جس کی رسولؐ نے ہمسایہ کے حق میں رعایت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

ہمسایہ کو آزردہ کرنا حرام ہے

عن ابی عبداللّٰہ قال ملعون من اذیٰ جارہ ۱

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ملعون ہے وہ شخص جو اپنے ہمسایہ کو ستائے اس کے برخلاف ہمسایہ کو خوش کرنا گناہوں کی بخشش کا سبب ہے:

القطب الراوندی فی لب اللباب عن النبیؐ انہ قال : من مات و لہ جیران ثلاثۃ کلھم راضون عنہ غُفِرَ لہ ۲

قطب راوندیؒ نے لب اللباب میں روایت کی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جو شخص دنیا سے رحلت کرے اور اس سے اس کے تین ہمسائے راضی ہوں تو اسے بخش دیا جائیگا۔

قال من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ ۳

رسولؐ کا ارشاد ہے: جو شخص خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے ہمسایہ کو نہ ستائے۔

قال : حرمۃ الجار علی الجار کحرمۃ امہ ۴

آپ ہی نے فرمایا: ہمسایہ، ہمسایہ کے لئے ایسے محترم ہے جیسے اس کے لئے اس کی ماں محترم ہے۔

ہمسایہ سے شکایت

وعنہ علیہ السلام قال : شکیٰ رجل الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم جارہ فاعرض عنہ ثم عاد فقال رسول اللّٰہ لعلی و سلمان ومقداد اذھبوا و نادوا لعنۃ اللّٰہ والملائکۃ علی من آذی جارہ۔ ۵

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ایک شخص نے رسولؐ سے اپنے ہمسایہ کی شکایت کی رسولؐ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا وہ دوبارہ آپ کے سامنے آگیا۔ رسول نے علیؑ، سلمان

---

۱ مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۷۸۔۷۹ ۲ مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۷۸۔۷۹ ۳ ایضا ۴ ایضا ۵ ایضا

اور مقداد سے فرمایا: جاؤ اور کہہ دو کہ جو شخص اپنے ہمسایہ کو اذیت دیتا ہے اس پر خدا اور فرشتوں کی لعنت ہے۔

ہمسایہ کے ساتھ نیک برتاؤ

قال رسول اللّٰہ البر و حسن الجوار زیادۃ فی الرزق و عمارۃ فی الدیار[۱]

رسولؐ نے فرمایا: ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنا رزق میں اضافہ کا اور شہروں کی آبادی کا سبب ہے۔

فقہ الرضا و احسن مجاورۃ من جاورك فان اللّٰہ تعالیٰ یسئلك عن الجار، وقد روی عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم: ان اللّٰہ تبارك و تعالیٰ اوصانی فی الجار حتی ظننت انہ یرثنی۔ [۲]

فقہ الرضا میں امام رضاؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جو تمہارا ہمسایہ ہو اس کے ساتھ اچھی ہمسائگی کا مظاہرہ کرو کیونکہ خداوند عالم ہمسایہ کے بارے میں تم سے سوال کرے گا۔ رسولؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: خداوند عالم نے ہمسایہ کے بارے میں مجھے اتنی تاکید کی ہے کہ میں یہ سوچنے لگا وہ میری میراث بھی پائیگا۔

ہمسایہ کی خبر رکھو

عن النّبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم قال : لیس بالمومن الذی یشبع و جارہ الی جنبہ جائع۔ [۳]

رسول سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: وہ شخص مومن نہیں ہے جو شکم سیر ہو اور اس کے جوار و پڑوس میں اس کا ہمسایہ بھوکا ہو۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

ما آمن بی من بات شبعانا و جارہ طاوی، ما آمن بی من بات کاسبا و

---

۱ مستدرک الوسائل ج۲ ص۷۸۔۷۹　۲ مستدرک الوسائل ج۲ ص۸۰　۳ ایضا

جارہ عاری۔ ۱

• وہ شخص میرے اوپر ایمان نہیں لایا جو شکم سیری کے ساتھ رات بسر کرے اور اس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور وہ شخص میرے اوپر ایمان نہیں لایا جس نے لباس پہنے ہوئے رات بسر کی ہو اور اس کا ہمسایہ برہنہ ہو۔

حضرت علی بن ابی طالب نے اپنے مقرر کردہ حاکم عثمان بن حنیف کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:

• ابیت مبطانا و حولی بطون غرثیٰ واکباد حریٰ ۲

کیا میں اس حال میں زندگی بسر کروں کہ میرا شکم پر ہو اور میرے اطراف میں بھوکے پیٹ اور پیاسے دل موجود ہوں۔

برا ہمسایہ

عن رسول انہ قال : اعوذ باللّٰہ من جار سوء فی دار اقامۃ تراك عیناہ ویرعاك قلبہ ،ان رآك بخیر سآئہ وان رآك بشر سرہ۔ ۳

رسولؐ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: میں اس برے ہمسایہ سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں کہ جس کے جوار میں گھر ہو، اس کی دونوں آنکھ تمہیں دیکھتی ہیں اور اس کا دل تمہارے چکر میں رہتا ہے اگر تمہیں کوئی نیکی اور فائدہ پہنچتا ہے تو اسے اس سے تکلیف ہوتی ہے اور اگر تمہیں کوئی تکلیف ونقصان پہنچتا ہے تو اسے اس سے مسرت ہوتی ہے۔

خریدنے سے پہلے ہمسایہ کی تحقیق

عن النبی انہ قال :التمسوا لجار قبل شراء الدار والرفیق قبل الطریق۔ ۴

رسول نے فرمایا: گھر خریدنے سے پہلے اپنے ہمسایوں کی تحقیق کرلو اور سفر پر جانے سے قبل کوئی ہم سفر تلاش کرلو۔

---

۱ مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۸۰ ۲ ایضا ۳ ایضا ۴ ایضا

ہمسائگی کی حد

عن ابی عبداللّٰہ قال ، قال امیرالمومنین :حریم المسجد اربعون دارا والجوار اربعون دارا من اربعة جوانبها۔[1]

امام صادق سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: امیرالمومنین کا ارشاد ہے: مسجد کا حریم چالیس گھروں تک اور ہمسایہ کی حد بھی چاروں طرف چالیس گھروں تک ہے۔

ہمسایہ کے حق کے سلسلہ میں امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: تمہارے گھر چاروں طرف چالیس گھروں تک تمہارا ہمسایہ ہے۔ تمہیں ان کے حقوق کا لحاظ رکھنا چاہئے اور ان کے ساتھ صلح وصفائی کی زندگی بسر کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں خدا ہی سے توفیق طلب کرنا چاہئے۔

۱۔ مستدرک الوسائل ج۲ ص۸۰

ساتھی کا حق

واما حق الصاحب فان تصحبه بالفضل ما وجدت اليه سبيلا والا فلا اقلّ من الانصاف ، و ان تكرمه كما يكرمك و تحفظه كما يحفظك ،ولا يسبقك فيما بينك و بينه الى مكرمة ، فان سبقك كافأته ولا تقصّر به عما يستحق من المودة ، تلزم نفسك نصيحته و حياته و معاضدته على طاعة ربه و معونته على نفسه فيما لا يهم به من معصية ربه ثم تكون (عليه) رحمة ولا تكون عليه عذابا ، ولا قوة الا بالله.

لیکن تمہارے رفیق اور ساتھی کا حق یہ ہے کہ جہاں تک تم سے ہو سکے اس کے ساتھ بخشش و فضل کرتے رہو اور اگر یہ نہ کر سکو تو کم از کم اس کے ساتھ انصاف سے کام لو اور جس طرح وہ تمہارا احترام و اکرام کرتا ہے اسی طرح تم بھی اس کا احترام و اکرام کرو، جس طرح وہ تمہاری حفاظت کی کوشش کرتا ہے اسی طرح تم بھی اس کی حفاظت کی کوشش کرو کسی بھی اچھے کام میں اسے تم سے آگے نہیں جانا چاہئے اور اگر وہ تمہارے اوپر سبقت لے گیا تو تم اسکی تلافی کرو اور اسے اتنی محبت دینے میں دریغ نہ کرو کہ جتنی کا وہ مستحق ہے، تم اپنے اوپر یہ لازم کر لو کہ اس کے خیر خواہ محافظ اور اپنے رب کی طاعت میں اس کے مددگار رہو گے اور اس سلسلہ میں اسکی مدد کرو گے کہ وہ اپنے پروردگار کی معصیت کا ارادہ بھی نہیں کرو گے پھر تمہیں اس کے لئے محبت کا سرمایہ ہونا چاہئے نہ کہ عذاب کا، خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

امام زین العابدینؑ کے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ جہاں تک تم سے ہو سکے اس پر فضل و کرم کرتے رہو، کم از کم اس کے ساتھ انصاف کرو۔

۲۔ جس طرح وہ تمہارا احترام کرتا ہے اسی طرح تم بھی اس کا احترام کرو اچھے کام میں تم اس سے پیچھے نہ رہو اور اگر وہ تم سے آگے بڑھ جائے تو اس کا خیال رکھو اور اسکی تلافی کرو۔

۳۔ اس کی دوستی و محبت میں اور اپنے پروردگار کی طاعت میں اس کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کرو۔

۴۔ اسے ہمیشہ گناہوں کے ارتکاب اور خدا کی معصیت کے ارتکاب سے باز رکھو اور اس پر

لطف و رحم کرو، عذاب و سختی نہ کرو۔

صحبت کے معنی رفاقت اور ساتھ رہنا ہیں اور صاحب کے معنی رفیق و ساتھی کے ہیں۔ راغب کہتے ہیں عرف میں اس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو زیادہ ساتھ رہتا ہے۔

یا صاحبی السجن ء ارباب متفرقون خیر ام اللّٰہ الواحد القھار [۱]

یوسف نے کہا: اے میرے قید کے ساتھیوں، متفرق خدا بہتر ہیں یا ایک قہار خدا؟ ما اتخذ اللہ صاحبتہ ولا ولدا [۲] یہاں صاحبہ سے مراد صاحبہ ہی ہے: ما ضل صاحبکم وما غوی [۳] صاحبکم سے رسول مراد ہیں۔ اصحاب اس کی جمع ہے یعنی رفیق اور ساتھی، لفظ اصحاب قرآن میں ۷ بار استعمال ہوا ہے اکثر جنت وجحیم کے ساتھ آیا ہے اصحاب السبت، اصحاب مدین، اصحاب کہف اصحاب الیمین، اصحاب الفیل وغیرہ بھی استعمال ہوا ہے۔ [۴]

مختصر یہ کہ صاحب کے معنی ہیں: دوست، جیسا کہ حضرت یوسف نے اپنے قید کے ساتھیوں کو دوست کہا ہے اور قرآن نے رسولؐ کو لوگوں کا دوست قرار دیا ہے۔ لہذا اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں صاحب یا مصاحب اس شخص کو کہتے ہیں جو انسان کے ہمراہ ہم سفر ہوتا ہے یہ ہمراہی خواہ قلیل مدت کی ہو یا طولانی مدت کی اس مصاحبت و رفاقت سے ایک دوسرے پر کچھ حقوق عائد ہو جاتے ہیں انہیں ادا کرنا ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔

خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ بدلتا ہے

انسان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی عادت اختیار کرتا ہے، وہ دوسروں پر اثر انداز ہوتا ہے اور دوسروں کا اثر قبول کرتا ہے، انسان کی شخصیت سازی کے طریقوں میں سے ایک طریقہ دوسروں کے اخلاق وعادات کا قبول کرنا بھی ہے اسی بنا پر قرآن مجید نے انسانوں کو خبردار کیا ہے اور قیامت کے ایک منظر کو بیان کیا ہے کہ انسان کو وہاں یہ معلوم ہو جائیگا کہ وہ اپنے دھوکے باز اور نادان دوستوں کی بنا پر گمراہ ہوا ہے لہذا وہاں وہ یہ تمنا کرے گا کہ اے کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا۔

---

[۱] یوسف: ۳۹ [۲] جن: ۳۰ [۳] ایضا [۴] قاموس قرآن ج ۴ ص ۱۰۹

لیکن اس کو اس افسوس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، قرآن مجید فرماتا ہے:

ویوم یعض الظالم علی یدیه یقول یا لیتنی اتخذت مع الرسول سبیلا، یا ویلتیٰ لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا - لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جائنی وکان الشیطان للانسان خذولا۔[۱]

جس دن ظالم افسوس کے مارے اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا اے کاش میں نے رسولؐ کے ساتھ راستہ اختیار کیا ہوتا وائے ہو میرے اوپر اے کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا اس نے مجھے حق کے ذکر سے گمراہ کر دیا ہے جبکہ اس کی خبر مجھ تک آئی تھی اور شیطان انسان کو ہمیشہ ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ ان آیتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ قیامت میں انسان پر کیا بیتے گی یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ جس سے انسان اپنے گمراہ دوست کی وجہ سے دوچار ہوگا، یعض، عَض سے مشتق ہے یعنی دانت سے کاٹنا یہ جملہ زیادہ تر ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو زیادہ حسرت وافسوس کی بنا پر بے چین ہوتے ہیں ان آیتوں نے تو قیامت کے حالات کی نقشہ کشی کی ہے لیکن بہت سے لوگ دنیوی زندگی میں بھی دوست کی بنا پر نقصان اٹھاتے ہیں اور عزت گنوا دیتے ہیں۔

احادیث کی روشنی میں نااہل دوست

انسان کو اس قسم کی حسرت ویاس سے بچانے کے لئے احادیث میں بعض لوگوں کی رفاقت و ہمنشینی سے روکا گیا ہے ان احادیث میں سے بعض یہ ہیں:

عن علی علیه السلام : لا تصحب الشریر فان طبعك یسرق من طبعه شرا وانت لا تعلم۔[۲]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: ناہنجار دوست اور برے آدمی کی صحبت اختیار نہ کرو کہ تمہاری طبیعت اس کی طبیعت سے بدی وبرائی کو چرالے گی اور تمہیں اس کی خبر تک نہ ہوگی۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں: مَنْ یَصحَبُ صاحبَ السُّوءِ لا یَسْلِمُ۔[۳]

۱۔ فرقان: ۲۷ تا ۲۹ ۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۲۰ ص ۲۷۲ ۳۔ مستدرک المسائل ج ۲ ص ۶۵

جو شخص برے آدمی کی صحبت اختیار کرتا ہے وہ محفوظ نہیں رہتا ہے۔

آپ ہی کا ارشاد ہے:

من لم يجتنب مصاحبة الاحمق يوشك ان يتخلق باخلاقه۔[1]

جو شخص احمق و بے وقوف کی دوستی و صحبت سے پرہیز نہیں کرتا ہے وہ بھی عنقریب اس کی عادت واخلاق سے متاثر ہو جائے گا۔

ان حدیثوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے اسی طرح انسان دوسروں کے کردار اور ان کے چال چلن کو اختیار کر لیتا ہے۔ اگر مصاحب برے اور بے وقوف و پست لوگ ہیں تو نہ دانستہ طور پر انسان ایسے ہی کام کو پسند کرنے لگتا ہے اور پھر وہ یک بارگی متوجہ ہوتا ہے کہ جن کاموں سے وہ بچنا چاہتا تھا انہیں میں مبتلا ہو گیا ہے۔

اطباء کہتے ہیں: بعض امراض متعدی و سری ہیں چنانچہ اگر ایک صحیح سالم آدمی ایسے مریض کے پاس چلا جائے تو اسے بھی وہ مرض لگ جائے گا حضرت علیؑ کا یہ قول کہ تمہاری طبیعت اسے دوسروں کی طبیعت سے چرالیگی، برے صفات کے سرایت کرنے ہی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اس طرح سرایت کر جاتے ہیں اور جس میں سرایت کرتے ہیں اسے خبر تک نہیں ہوتی ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں: جو شخص غلط اور برے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے وہ ان کی عادت سے محفوظ نہیں رہتا ہے خود بھی ان کے رنگ میں رنگ جاتا ہے یا جو شخص احمق و بیوقوف لوگوں سے پرہیز نہیں کرتا ہے وہ کم عقلی و بیوقوفی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جب اسے اس کی خبر ہوتی ہے تو اس وقت وہ بد کرداری کے غار میں گر چکا ہوتا ہے۔

بیوقوف دوست کی پیروی کا نتیجہ

ایک شخص نے یہ محسوس کیا کہ اسے گھر کے پانی وغیرہ کے لئے گھر میں ایک کنواں کھدوانا چاہئے، اس نے ایک کنواں کھودنے والے کو بلایا اور اس سے کہا: میرے گھر میں ایک کنواں کھودو۔ کنویں کی کھدائی کے نتیجہ میں جو مٹی نکلی اس کا گھر میں ڈھیر لگ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اس کا

[1] عمان ص ۶۴

ایک دوست احمق تھا وہ اس کے پاس گیا اور اس سے مشورہ کیا۔ دوست نے کہا: چاہ کن سے یہ کہو کہ وہ صحن کے دوسری طرف ایک کنواں اور بنائے اور اس مٹی کو اس کنویں میں ڈال دے اس نے اپنے دوست کی بات پر عمل کیا۔ کنواں کھدوایا اور پہلے کنویں کی مٹی اس کنویں میں ڈال دی۔ لیکن اب دوسرے کنویں کی مٹی کا کیا کرے، پھر اپنے دوست کے پاس گیا اور اس سے صورتحال بتائی۔ اس نے کہا: اس کنویں کی مٹی پہلے کنویں مں ڈال دو۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟!

نادان سے مشورہ

ایک گائے نے کچھ کھانے کے لئے کسی ٹھلیا میں سر ڈالا، اتفاق سے اس میں اس کا سر پھنس گیا، گائے کے مالک نے سر نکالنے کے بارے میں بہت دیر تک غور کیا لیکن اس کی عقل نے کام نہ کیا، مجبوراً وہ ایک شخص کے پاس گیا اور اس سے صورت حال بتائی۔ اس نے کہا: جب تک میں خود نہ دیکھونگا اس وقت تک تمہاری مشکل حل نہیں کر سکونگا وہ اسے اپنے گھر لایا۔ اس نے صورت حال دیکھتے ہی فیصلہ سنا دیا کہ گائے کا سر کاٹ دو، گائے کا سر کاٹ دیا گیا لیکن سر اب بھی اس سے باہر نہ نکلا اس نے کہا: اب اس ٹھلیا کو توڑ دو اور گائے کا سر باہر نکال لو، اس بیوقوف کے مشورے سے گائے بھی ہاتھ سے گئی اور ٹھلیا بھی ٹوٹ گئی یہ ہے بیوقوف کی بات ماننے کا نتیجہ۔ [1]

حضرت سلیمان سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

لا تحکموا علی رجل بشیء حتی تنظروا الیٰ من یصاحب ، فانما یعرف الرجل باشکالہ و اقرانہ و ینسب الی اصحابہ واخدانہ۔ [2]

کسی شخص کے بارے میں اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک کہ اس کے دوست کو نہ دیکھ لو کیونکہ ہر شخص اپنے دوستوں، ساتھیوں اور رفیقوں سے پہچانا جاتا ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

لا خیر فی صحبۃ من اجتمع فیہ ست خصال : ان احدثك كذبك وان

---

[1] کشکول طبسی ج۱ ص۱۷۶ [2] سفینۃ البحار ج۲ ص۲۷

حدثته كذبك وان ائتمنته خانك وان ائتمنك اتهمك وان انعمت عليه كفرك وان انعم عليك منّ بنعمته۔ [1]

اس شخص کی رفاقت ومصاحبت میں کوئی بھلائی نہیں ہے کہ جس میں درج ذیل چھ صفات ہوں:

۱۔ اگر وہ تم سے کوئی بات کہتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔

۲۔ اگر تم اس سے کوئی بات کہتے ہو تو تمہیں جھٹلاتا ہے۔

۳۔ اگر تم اسے امانت دار سمجھو گے تو وہ خیانت کرے گا۔

۴۔ اگر وہ تمہارے پاس کوئی امانت رکھے گا تو تمہیں خیانت کار سمجھے گا۔

۵۔ اگر تم اسے کوئی چیز دو گے تو وہ شکریہ ادا نہیں کرے گا ناشکری کرے گا۔

۶۔ اگر وہ تمہیں کچھ دے گا تو احسان جتائے گا۔

ان کی صحبت اختیار نہ کرو

وقال ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین اوصانی ابی، فقال : یا بنی لا تصحبنّ خمسة ولا تحادثهم ولا ترافقهم فی طریق ۔ فقلت : جعلت فداك یا ابة، من هؤلاء الخمسة ؟ قال : لا تصحبنّ فاسقاً فانه یبیعك باكلة فما دونها ۔ فلت : یا ابه وما دونها ؟ قال : یطمع فیها، ثم لا ینالها قال : قلت : یا ابه ومن الثانی ؟ قال : لا تصحبن البخیل فانه یقطع بك فی ماله احوج ما كنت الیه ۔ قال : فقلت : ومن الثالث ؟ قال : لا تصحبن كذابا فانه بمنزلة السراب یبعد منك القریب و یقرب منك البعید ۔ قال : فقلت ومن الرابع ؟ قال: لا تصحبن احمق فانه یرید ان ینفعك فیضرك ۔ قال : قلت : یا ابه ! ومن الخامس ؟ قال : لا تصحبن قاطع رحم فانی وجدته ملعونا فی كتاب الله فی ثلاثة مواضع۔ [2]

حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: مجھے میرے والد نے وصیت کی اور فرمایا: بیٹے پانچ قسم کے

---

[1] اثنا عشریہ ص ۲۳۱ [2] کشف الغمہ ج ۲ ص ۲۳۱

لوگوں کی صحبت اختیار نہ کرنا اور نہ ان سے کوئی بات کہنا اور نہ راستہ میں ان کے ساتھ چلنا۔ میں نے عرض کی: یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: فاسق و بدکار کی صحبت میں نہ رہنا کہ وہ تمہیں پیٹ بھر کھانے کے عوض فروخت کردے گا یا اس سے بھی کم میں، میں نے عرض کی اس سے کم کیا ہے؟ فرمایا: ایک لقمہ کے عوض فروخت کردے گا۔ لیکن اس کی توقع پوری نہیں ہوگی میں نے عرض کی: دوسرے کون لوگ ہیں؟ فرمایا: بخیل و کنجوس کے ساتھ مت رہنا کیونکہ جب تمہیں شدید ضرورت ہوگی تو وہ تمہیں اپنے مال میں سے کچھ بھی نہیں دے گا۔ میں نے کہا تیسرا کون ہے؟ فرمایا: بہت جھوٹے لوگوں کے ساتھ نہ رہنا کیونکہ ان کی مثال سراب کی سی ہے وہ تمہیں راہ اطاعت سے جو کہ نزدیک ہے دور کردیں گے اور نافرمانی کی راہ سے تمہیں قریب کردیں گے جو کہ دور ہے، میں نے عرض کی چوتھی قسم کے کون لوگ ہیں؟ فرمایا: نادان و کم عقل لوگوں کی مصاحبت اختیار نہ کرنا کیونکہ وہ تمہیں فائدہ پہنچانے کی فکر میں نقصان پہنچا دیں گے۔ میں نے کہا: پانچواں طبقہ کون ہے؟ فرمایا: جو لوگ قطع رحم کرتے ہیں ان کی ہمنشینی اختیار نہ کرنا کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ قرآن میں ان کو تین جگہ ملعون قرار دیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ نے اس حدیث میں فاسق و بدکار لوگوں کی رفاقت و مصاحبت سے منع کیا ہے فاسق کے معنی لغت میں حد سے آگے بڑھنے والے کے ہیں، فسق مصدر ہے، یعنی خدا کے حکم پر عمل نہ کرنا، ظلم و جور سے کام لینا، بندہ کا نافرمان ہونا، عیاشی کرنا۔

فاسق و بدکار شخص خدا کی حدود سے نکل جاتا ہے اور وہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کی پروا نہیں کرتا ہے اسی لئے دوست کی بھی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

دوسرا طبقہ کنجوس و بخیل لوگوں کا ہے، بخل کے معنی لغت میں خست، کم خرچ، طمع پرور، مال کا لالچی اور فرومایہ ہیں، کذاب مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت جھوٹ بولنے والا۔[1]

امام زین العابدین فرماتے ہیں: رحم قطع کرنے والے پر قرآن میں تین جگہ لعنت ہوئی ہے وہ تین جگہیں یہ ہیں :

فهل عسيتم ان توليتم ان تفسدوا فى الارض و تقطعوا ارحامكم . اولئك

---

[1] فرہنگ بزرگ جامع نوین (فسق، بخل)

الذین لعنھم اللہ فاصمھم و اعمیٰ ابصارھم۔ [۱]

کیا یہ قریب ہے کہ اگر تم روگرداں ہو جاؤ یا حاکم بن جاؤ تو زمین میں فساد کرو اور قطع رحمی کرو؟

یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور پھر انہیں بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا بنا دیا ہے۔

یہ آیتیں منافقوں کے بارے میں ہیں، خداوند عالم فرماتا ہے: اگر تم مخالفت کرو گے اور خدا کے حکم اور اس کی کتاب کے مطابق عمل نہیں کرو گے تو زمین پر فساد کرو گے اور قطع رحمی کرو گے۔ یہ ترجمہ اس صورت میں ہے کہ جب "تو لیتم" کو "تولیٰ" سے فرض کریں کہ اس کے معنی روگردانی کرنا ہیں۔

لیکن اگر اس کو ہم ولایت سے فرض کریں کہ جس کے معنی حکومت ہیں جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے۔ تو یہ ترجمہ ہوگا۔ اگر زمام حکومت تمہارے ہاتھوں میں آجائے تو تم تباہی، خونریزی اور قطع رحمی ہی کرو گے۔

۲۔ والذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقھم یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض اولئک لھم اللعنۃ ولھم سوء الدار۔ [۲]

اور جو لوگ خدا کے عہد کو محکم کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس چیز کو وصل کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اس کو توڑ دیتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں لعنت انہیں کے لئے ہے اور ان کے لئے بہت برا ٹھکانہ ہے۔

خداوند عالم نے اس آیت میں دنیا پرستوں کے عقیدتی و عملی مفاسد کو تین جملوں میں بیان کیا ہے: ۱۔ وہ خدا کے عہد، فطری، عقلی اور تشریعی عہد کو توڑ دیتے ہیں۔ ۲۔ قطع روابط کرتے ہیں، خدا سے رشتہ توڑ لیتے ہیں، خدا کے نمائندوں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں، مخلوق اور خود سے منھ موڑ لیتے ہیں۔ ۳۔ روئے زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔

۳۔ الذین ینقضون عھداللہ من بعد میثاقہ و یقطعون ماامر اللہ بہ ان یوصل و یفسدون فی الارض اولئک ھم الخاسرون۔ [۳]

فاسق تو وہی ہیں جو خدا کے عہد کو محکم کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان رشتوں کو توڑ ڈالتے

۱۔ محمد: ۲۲۔۲۳ ۲۔ رعد: ۲۵ ۳۔ بقرہ: ۲۷

ہیں کہ جن کو استوار کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے اور وہ روئے زمین پر فساد پھیلاتے ہیں، یہی گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔

صلہ رحمی کی بہت تاکید گئی ہے رسولؐ فرماتے ہیں:

صلة الرحم تعمر الديار و تزيد في الاعمار وان كان اهلها غير اخيار۔ [۱]

صلہ رحمی شہروں کو آباد کرتی ہے۔ عمر بڑھاتی ہے خواہ صلہ رحم کرنے والے نیک افراد بھی نہ ہوں۔

مصاحبت کے بارے میں امام حسنؑ کا نظریہ

امام حسنؑ جنادہ بن امیہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر تمہارا نفس تم سے سرکشی کرنے اور تم مردوں کی ہمنشینی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاؤ تو ایسے لوگوں کی مصاحبت اختیار کرنا جو تمہارے لئے باعث زینت ہوں اور اگر تم ان کی خدمت میں ہو تو وہ تمہاری حفاظت کریں اور اگر تمہیں ان کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ تمہاری مدد کریں اگر تم ان سے کوئی بات کہو تو وہ تمہاری بات کی تصدیق کریں اگر ان سے تمہاری دوستی ہو تو وہ اسے محکم کریں اور اگر تمہیں ان کے لطف و کرم کی توقع ہو تو وہ تمہاری توقع کو پورا کریں اور اگر تمہاری کوئی بات ان پر آشکار ہو جائے کہ جس سے تمہاری عزت کو خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اس کا سدباب کریں اور اگر تمہاری طرف سے نیکی دیکھیں تو اسے یاد رکھیں، اگر تم ان سے سوال کرو تو عطا کریں اور اگر تم خاموش رہو تو وہ خود سلسلہ کلام شروع کریں اور اگر تم کسی مصیبت میں گھرے ہو تو وہ تمہاری مالی مدد کریں۔ [۲]

علماء اور صاحبان علم کی مصاحبت و ہمنشینی کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں:

لَاتَصْحَبْ اِلَّا عَاقِلاً تَقِيّاً وَلَا تُخَالِطْ اِلَّا عَالِماً زَكِيّاً وَلَا تُودِعْ سِرَّكَ اِلَّا مُؤْمِناً وَفِيّاً۔ [۳]

عقلمند اور پرہیزگار لوگوں ہی کی مصاحبت و ہمنشینی اختیار کرو اور اس عالم کے علاوہ کسی سے نہ گھلو ملو کہ جس نے اپنا تزکیہ کر لیا ہے اور وفادار مومن کے علاوہ کسی کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔

۱۔ تفسیر نمونہ ج ۱۱ ص ۱۰۵ ۲۔ شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۲ ص ۲۱۰ ۳۔ ہمان ص ۲۰۹

وقال واعلمو ان صحبة العالم واتباعه دين يدان به و طاعته مكسبة للحسنات ممحات للسّيئآت و ذخيرة للمومنين و رفعةٌ فى حياتِهم و مَماتهم۔[۱]

فرمایا: یاد رکھو! عالم کی ہمنشینی وصحبت اور ان کی پیروی ایسا عمل ہے جس کی جزادی جائیگی اور عالم کی اطاعت سے نیکیاں ملتی ہیں اور گناہ محو ہوتے ہیں اور مومنوں کے لئے ذخیرہ ہے اور اس سے ان کو زندگی میں بھی بلندی ملتی ہے اور موت میں بھی۔

---

[۱] حمان ص ۲۰۹

شریک کا حق

وَأَمَّا حَقُّ الشريك، فإن غاب كفيتَهُ، وإن حضر ساوَيْتَهُ، ولاتعزِمْ على حُكمك دون حُكمِهِ، ولا تعمل بِرأيِكَ دونَ مُناظرتِهِ، وتحفظُ عليه مالَهُ، تنفي عنهُ خيانَتَهُ فيما عَزَّ أو هانَ، فإنَّهُ بلغنا ((أن يد اللهِ على الشَّريكَينِ مالم يتخاوَنا))، ولاقوةَ إلا باللهِ

شریک کا حق یہ ہے کہ اگر وہ موجود نہ ہو تو تم اس کے امور کو انجام دو اور اگر موجود ہو تو اسے اپنے برابر قرار دو اور اس سے مشورہ کے بغیر کوئی ارادہ و منصوبہ نہ بناؤ اور اس کے لئے اس کے مال کی حفاظت کرو اور اس کے ساتھ کم و زیادہ خیانت نہ کرو کیونکہ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ دو شریکوں کے اوپر اس وقت تک خدا کا ہاتھ ہے جب تک انہوں نے خیانت نہیں کی ہے۔ اور خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

شرک، شرکت اور مشارکت کے معنی شریک ہونا ہیں اور اشراک کے معنی شریک کرنا ہیں، سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہے اُشدد به ازری وَاشركه في امري،[1] فرعون کو تبلیغ کرنے میں موسیٰ کے لیے بھائی کو شریک کرنے کے معنی میں ہے۔

شریک اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کام یا کسی چیز میں دوسرے کا حصہ دار و ساجھے دار ہو، سورہ فرقان میں ارشاد ہے: ولم يكن له شريك في الملك[2] ملک و حکومت میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں ہے۔ یہاں شریک سے مراد، مستقل و مستعار شریک ہے ورنہ کائنات کے نظم و نسق اور اسکی تدبیر کیلیے، خداوند عالم نے بہت سے اسباب و واسطے قرار دئے ہیں، مثلاً فرشتوں کو پیدا کیا ہے۔

"شرک" اسم ہے یعنی عملِ شرک، شرک حصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے چنانچہ آئیہ، ام لهم شِرك في السمٰوات[3] کیا ان کا آسمانوں میں حصہ ہے اور مشرک اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کا شریک قرار دیتا ہے۔[4]

---

[1] سورۂ طٰہٰ: ۳۱-۳۲ [2] فرقان: ۲ [3] فاطر: ۴ [4]: قاموس قرآن ۴۷۰ ص ۴۰

شرکت فقہی نقطۂ نظر سے

لاتنعقدالشركة إلّا في مالَينِ مِثْلَين في جَميع صِفاتِهما ويُخلَطانِ ويأذَنُ كُلُّ واحدٍ من الشريكَيْنِ لِصاحِبِه في التَّصرُّفِ فيه ۱

ان اموال میں شرکت ہوتی ہے جو تمام صفات میں یکساں ہوں اور مخلوط ہو جائیں اور دونوں شرکاء میں سے ہر ایک دوسرے کو تصرف کی اجازت دیدے بعض فقہا نے شرکت میں صیغہ (عربی یا دوسری زبانوں میں) پڑھنے کو بھی شرط جانا ہے۔ جو لوگ عقد شرکت کے ذریعہ باہم شریک ہوتے ہیں ان کو بالغ و عاقل ہونا چاہئے۔ اور اسے قصد و اختیار کے ساتھ شرکت کرنا چاہئے اور وہ اپنے مال میں تصرف کر سکتا ہو پس سفیہ کی شرکت جائز نہیں ہے۔

علامہ حلی، قواعد الاحکام میں تحریر فرماتے ہیں:

شرکت کی چار قسمیں ہیں: شرکت اموال، شرکت ابدان، شرکت مفاوضہ اور شرکت وجوہ، پہلی کے علاوہ اور سب باطل ہیں۔ بنا بر ایں صرف اموال میں شرکت ہو سکتی ہے۔ وہ بھی فقہا کی بیان کی ہوئی شرطوں کے ساتھ ۲

معاملات میں آداب کی رعایت

شریعت اسلامیہ میں تجارت و معاملات کے کچھ احکام و دستورات ہیں کہ جن کی رعایت کی جانی چاہئے تاکہ معاملہ صحیح اور اس سے ملنے والا فائدہ حلال ہو، اسی لئے کتاب "وسائل الشیعہ" میں تجارت کے آداب سے متعلق کچھ ابواب بیان ہوئے ہیں چونکہ شرکت بھی ایک قسم کا معاملہ ہے لیکن اشتراکی صورت میں لہٰذا اس میں ان آداب کی رعایت کرنا چاہئے، اس سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث میں سے ایک درج ذیل ہے:

امام صادقؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: خرید و فروخت کرنے والے کو پانچ احکام کی رعایت کرنا چاہئے۔ ۱۔ اسے سود لینے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ۲۔ معاملہ میں قسم نہیں کھانا

---

۱ الخلاف شیخ طوسی ج ۲ ص ۱۴۸ ۲: قواعد الاحکام ج ۲ ص ۱۳۸

چاہئے۔ ۳۔ فروخت کی جانے والی چیز کو چھپانا نہیں چاہئے۔ ۴۔ بیچتے وقت اس کی تعریف نہیں کرنا چاہئے۔ ۵۔ لیتے وقت اس میں نقص نہیں نکالنا چاہئے۔

دوسری حدیث: ابن طاؤس نے کتاب استخارات میں احمد بن محمد یحییٰ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا۔ ہمارے ایک دوست نے یہ طے کیا کہ وہ تجارت کرے گا سفر تجارت پر جانے سے پہلے اس نے کہا۔ میں امام صادقؑ سے ملاقات کئے بغیر سفر پر نہیں جاؤنگا۔ آپؑ سے مشورہ کرونگا اور دعا کی درخواست کرونگا چنانچہ وہ امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ آپؑ نے فرمایا: تمہارے لئے ضروری ہے کہ سچ بولو، فروخت کی جانے والی چیز کے عیب کو نہ چھپاؤ، جو تم سے خریدے اس کو دھوکا نہ دو کہ غلط قیمت بتا کر فروخت کرنا حلال نہیں ہے اور جو چیز اپنے لئے پسند کرو وہی دوسروں کیلئے بھی پسند کرو، قسم کھانے سے پرہیز کرو کیونکہ جھوٹی قسم کھانا انسان کو جہنم میں پہنچا دیتا ہے اور تاجر گھاٹے میں ہے مگر یہ کہ حق دے اور حق لے پھر جب تم سفر کا قصد کرو تو خدا سے دعا کرو اور اس سے خیر طلب کرو۔ میرے والد نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ رسولؐ اپنے اصحاب سے فرماتے تھے کہ سفر پر جاتے وقت خدا سے خیر طلب کرو کہ قرآن بھی یہی کہتا ہے:[1]

شرکت حدیث کی روشنی میں

قال رسول اللّٰہ اِنّ اللّٰہ تعالیٰ یقول : انا ثالث الشریکین ما لم یخن احدھما صاحبہ، فاذا خانہ خرجت من بینھما۔[2]

رسولؐ فرماتے ہیں: بیشک خداوند عالم کا ارشاد ہے جب تک دو شریکوں میں سے کوئی دوسرے سے خیانت نہیں کرتا ہے اس وقت تک میں بھی ان کا شریک رہتا ہوں لیکن جب ان میں سے کوئی خیانت کرتا ہے تو میں ان سے جدا ہو جاتا ہوں۔

عن الحسین بن مختار قال: قلت لابی عبداللہ: الرّجل یکون لہ الشریکُ فیظھرُ علیہ قد اختانَ شیاً، اَلَہُ اَن یاخُذَ منہ مثلَ الّذی اَخذ من غیر اَن یُبینَ لہُ؟

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۲ ص ۱۸۵ [2] نہج الفصاحہ کلمہ ۷۴۷

فقال شوّه، إنما اشتركا بامانة الله وإنّي لأحبُّ له إن رأى شيئاً من ذلك أن يستُرَ عليه وما أُحِبُّ أن يأخُذَ منه شَيئاً بغير عِلمِهِ۔ ۱

حسین بن مختار سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے ابوعبداللہ امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کی:

ایک شخص کا ایک آدمی شریک ہے، اس پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس کے شریک نے کچھ خیانت کی ہے، کیا وہ بھی اپنے شریک پر واضح کئے بغیر اتنا ہی مال لے سکتا ہے جتنا اس کے شریک نے خیانت کر کے لیا ہے؟ فرمایا: یہ کتنی بری بات ہے! یہ دونوں اسلئے شریک ہوئے تھے تا کہ خدا کی پناہ میں رہیں اور ایک دوسرے کی امانت کا پاس ولحاظ رکھیں، میں تو یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ اگر اس نے اپنے دوست کو خیانت کرتے ہوئے دیکھا ہے تو بھی اس سے چشم پوشی کرے اور مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ وہ اپنے دوست کو اطلاع دئے بغیر کوئی چیز اٹھائے۔

مذکورہ حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دو شریکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خیانت نہیں کرنا چاہئے اور دوسرے کی عدم موجودگی میں مشترک مال میں تصرف نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ فعل شریک کے حق کے منافی ہے۔ امام زین العابدینؑ نے شریک کے حق کے سلسلہ میں چند چیزیں بیان فرمائی ہیں:

۱۔ ایک شریک کو دوسرے شریک کی عدم موجودگی میں مشترک مال میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے امور کو انجام دے۔

۲۔ اس کی موجودگی میں اس کے حق کی رعایت کرے اور مساوات و برابری کو فراموش نہ کرے۔

۳۔ اس کی رائے کے خلاف کوئی منصوبہ نہ بنائیے اور اس کو یہ بات ملحوظ رکھنا چاہئے کہ انہوں نے شروع میں ہی یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ اس مال کو امانت سمجھیں گے۔

۴۔ اس کے مال کا نگہبان رہے اور شریک کے ساتھ کسی قسم کی خیانت نہ کرے اور اسے یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ خدا ان لوگوں پر مہربان ہے جو شریک بننے کا ارادہ کرتے ہیں جب تک کہ وہ خیانت نہ کریں لیکن جب خیانت سرزد ہو جاتی ہے تو وہ ان سے اپنی نظر لطف کو ہٹا لیتا ہے۔

---

۱ وسائل الشیعہ ج ۱۳ ص ۱۷۸

مال کا حق

واَمّـا حقّ المال فان لا تاخذه الّا من حِلّه ولا تُنفقه اِلا فی حِلِّه ولا تُحرِفه عـن مـواضعه ولا تصرِفَهُ عنِ حَقائِقه ولا تجعله اِذا کان من الله اِلا اِلیه وسبباً اِلی اللّـه ولا تـوثِرَ به علی نفسك مَن لعله لا یحمدُكَ وبالْحَریّ اَن لا یحسِنَ خِلافتهُ فی تـرکَتكَ ولا یـعـملَ فیه بطاعةِ ربّكَ فتکون مُعیناً له علی ذلك وبما اَحدث فی مالِكَ أحسـن نَـظَـراً لِـنـفسِـهِ فیعمل بطاعةِ رَبّه فیذهبَ بالغنیمةِ وتَبوءَ بالاثم والحسرةِ والندامةِ مع التبِعةَ، ولا وقوة الا باللهِ

مال کا حق یہ ہے کہ اسے حلال طریقہ ہی سے حاصل کرو اور حلال راہ میں ہی خرچ کرو اور بیجا خرچ نہ کرو، صحیح راستہ سے منتقل کرو اور جو مال تمہارے پاس ہے وہ خدا کا مال ہے اسے راہِ خدا میں ہی خرچ کرو اور اس چیز میں صرف کرو جو خدا تک رسائی کا سبب ہو اور جو تمہارا شکر گزار نہیں ہے اسے اپنے اوپر مقدم نہ کرو، تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس سلسلہ میں طاعت ترک نہ کرو کہ وہ دوسروں کیلئے تمہاری میراث بن جائے اور تم وارث کے معاون قرار پاؤ اور وہ اس کو تم سے بہتر راستہ میں اور طاعت خدا میں خرچ کرے، اسے اس کا فائدہ ہو اور گناہ و افسوس تمہارے حصہ میں آئے، اور خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

امام زین العابدین کے کلام کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ مال کس راہ سے آنا چاہئے اور کہاں خرچ ہونا چاہئے۔

۲۔ مال کا ایک موقع محل ہوتا ہے لہٰذا اسے وہاں سے نہیں ہٹانا چاہئے۔

۳۔ چونکہ خدا کی طرف سے ملتا ہے لہٰذا راہِ خدا میں ہی خرچ ہونا چاہئے۔

۴۔ مال سے صحیح اور عاقلانہ طریقہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ورنہ وارث کے ہاتھ میں جائیگا ممکن ہے وہ اس سے صحیح طور سے استفادہ کرے اور وہ اس مال کی برکت سے دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جائے، اور اس کا ضرر و گناہ کمانے والے کے اوپر ہو آئے۔

مال کے لغوی معنی

انسان جس چیز کا مالک بنتا ہے وہی اس کا مال ہے جیسا کہ قاموس اور اقرب الموارد میں مرقوم ہے: اَلْمَالُ مَا مَلَکْتَهُ مِن کُلِّ شَئٍ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بادیہ نشینوں کے نزدیک چوپائے بھی مال ہیں۔ عربی میں مال مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی: مثلاً هُوَ مَال. ھی مال۔

راغب کہتے ہیں: مال کو اس لئے مال کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ مائل و زائل رہتا ہے۔ (آتا ہے دھن جاتا ہے دھن) ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی لئے اسے عارضی کہتے ہیں۔ اس میں دوام نہیں ہے اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے: اَلْمَالُ قحبة تکونُ یوماً فی بیت عطار و یوماً فی بیت بیطار، [۱] مال کی مثال طوائف کی سی ہے کہ ایک دن عطار کے گھر میں رہتی ہے تو دوسرے دن جراح کی آغوش میں اور قرآن مجید میں بیان ہوا ہے: اَلْمَالُ وَالْبَنُونُ زینة الحیوة الدنیا [۲]

مالکیت کے اقسام

مالکیت کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ حقیقی۔ ۲۔ اعتباری و فرضی، مالکیت حقیقی یہ ہے ایک موجود دوسرے پر تکوینی تسلط رکھتا ہو جیسے علت، معلول پر تسلط رکھتی ہے یا ذہنی صورتوں پر نفس کا تسلط، جب بھی وہ کسی پھول کا تصور کرتا ہے اسی وقت ذہن میں پھول کی تصویر آجاتی ہے اور اگر توجہ ہٹا لیتا ہے تو پھول کی تصویر محو ہو جاتی ہے۔ خداوند عالم اس کائنات کا حقیقی مالک ہے۔

وللہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وکان اللّٰہُ بکل شئی محیطا [۳]

اور جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے وہ سارے کا سارا خدا ہی کا ہے اور خدا ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

مالکیت حقیقی کو مالک سے منتقل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تکوینی چیز قابل نقل و انتقال نہیں ہوتی ہے۔

مالکیت اعتباری یہ ہے کہ ایک موجود کا دوسرے موجود پر اعتباری تسلط ہوتا ہے کہ جس سے وہ اس میں تصرف کر سکتا ہے اور دوسروں کو اس میں تصرف کرنے سے منع کر سکتا ہے جیسے انسان کا اپنے

---

[۱] قاموس قرآن ج ۶ ص ۳۲۱ [۲] کہف: ۴۶ [۳] نساء: ۱۲۶

اموال کا مالک ہونا یہ مالکیت انسانوں کے آپسی روابط سے وجود میں آئی ہے اس کو اس لئے اعتباری کہتے ہیں کہ مالک و ملک کے درمیان کوئی حقیقی اور تکوینی رابطہ نہیں ہوتا ہے لہٰذا اس کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔

انسان محور کائنات

اسلام کے نقطۂ نظر سے انسان تمام موجودات کا محور ہے سبھی اس کے فائدے کیلئے حاضر ہیں قرآن مجید نعمت کو شمار کراتے ہوئے کہتا ہے: سب کچھ انسان کے فائدے کے لئے ہے۔

هو الّذی خلَقَ لکم ما فی الارض جمیعا [1]

خدا وہ ہے جس نے زمین کی ساری چیزوں کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔

الم تَرَوا اَنّ اللّٰہ سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض [2]

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے؟

هو انشاء کم من الارض و استعمرکم فیها [3]

اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا پھر تمہیں اس میں آباد کیا۔

وَاتوهم من مال اللّٰہ الّذی آتاکم [4]

اور انھیں خدا کے اس مال میں سے عطا کرو جو اس نے تمہیں دے رکھا ہے۔

اس آیت کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مال خدا ہی کا ہے، تو اس کی بخشش میں زحمت نہیں ہونا چاہئے۔ مذکورہ آیتوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر چیز انسان کیلئے خلق ہوئی ہے یہاں تک کہ خدا نے مال کو بھی انسان ہی کیلئے بنایا ہے، اقتصادی نظام، اسلامی نظام ہے، یہ اسلام کے کلی نظام کا ایک جز ہے جو کہ انسان کی مادی ضرورتوں، جیسے روٹی، کپڑا، مکان، دفاعی اسباب، تہذیب و حفظان صحت طبی سہولتوں اور بعض نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے بنایا گیا ہے۔

---

[1] بقرہ: ۲۹ [2] لقمان: ۲۰ [3] ہود: ۶۱ [4] نور: ۳۳

دنیا اسلام کی نظر میں

دنیوی زندگی کی حقیقت وہویت کے بارے میں جو آیات وروایات وارد ہوئی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو دنیا کی مذمت کی گئی ہے۔ سورہ محمد کی آیت ۳۶، سورہ انعام کی آیت ۳۲ سورۂ عنکبوت کی آیت ۶۴ اور سورۂ حدید کی آیت ۲۰ میں دنیا کو لہوولعب، کھیل تماشا قرار دیا گیا ہے اسی طرح اس کو متاع قلیل، متاع الغرور، تکاثر اور تفاخر کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے جو کہ دنیا کی پستی کی علامتیں ہیں۔

بعض آیات وآحادیث میں دنیوی زندگی اور اس کے متعلقات کو ایسے عنوانات دیے گئے جو اس کے محبوب ومطلوب ہونے کا پتا دیتے ہیں مثلاً سورۃ توبہ کی آیت ۲۸، سورۃ نحل کی ۱۶، سورۃ نساء کی ۳۷ اور سورۃ نور کی آیت ۲۴ میں فضل اللہ اور سورۃ بقرہ کی آیت ۱۸۰، ۲۵۱، ۲۷۲، سورۃ عادیات کی ۶ اور سورۃ معارج کی آیت ۷۰ میں ''خیر'' اور سورۃ ہود کی آیت ۹، سورۃ اسراء کی ۱۰۰ اور سورۃ کہف کی آیت ۸۲ اور سورۃ اعراف کی آیت ۱۳۰ اور سورۃ توبہ کی آیت ۵۰ میں لفظ حسنہ بیان ہوا ہے اس کے برخلاف بعض آیتوں اور حدیثوں میں بعض حالات میں مادی چیزوں سے محرومی اور خدا کا عذاب بیان ہوا ہے۔

بعض آیتوں اور حدیثوں میں دنیا کی وضاحت ہوئی ہے ان آیتوں میں دنیا کو مطلوب قرار دیا گیا ہے کہ یہ آخرت کا مقدمہ اور آخرت کا دریچہ ہے اگر اسی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تو قابل مذمت ہے مثلاً جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہیں اور انہوں نے دنیوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ہے اور اس سے مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں تو انہوں نے جو اعمال کیے ہیں ان کی سزا کیلئے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ [1]

اس آیت میں آخرت سے بے اعتنائی کی وجہ سے دنیا کی مذمت ہوئی ہے۔

دنیا حدیث کی روشنی میں

حضرت علیؑ فرماتے ہیں ''الدنیا متجرُ اولیاء اللّٰہ'' [2] دنیا اولیاء خدا کی تجارت گاہ

---

[1] یونس: ۷، ۸

[2] نہج البلاغہ صبحی صالح حکمت ۱۳۱

ہے، رسولؐ فرماتے ہیں۔ "الدنیا مزرعة الاخرة" [1] دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ نعم العَونُ الدّنیا علیٰ الاخرة [2] آخرت کیلئے دنیا بہترین مددگار ہے نعم المالُ الصالح للعبد الصالح [3] صالح بندہ کے لئے شائستہ مال کتنا کھپتا ہے۔

ان حدیثوں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا آخرت کا پیش خیمہ ہے، اس کیلئے استعمال ہونے والے لفظ، تجارت گاہ، کھیتی و مزرعہ اور مددگار، ان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر دنیا نہ ہوتو آخرت بھی نہیں ہوگی۔ لیکن انسان کبھی دنیا ہی کو اصل سمجھ لیتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ وہ پیش خیمہ ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو وہ خدا سے اپنا ارام ورفاہ حاصل کرنا فراموش کردیتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلَو بَسَطَ اللّهُ الرّزق لِعِبادہ لَبَغَوا فی الارض [4]

اگر خدا اپنے بندوں کے رزق کو وسیع کردیتا تو وہ ضرور روئے زمین پر فساد پھیلاتے۔

اِنَّ الانسانَ لَیَطغَیٰ اَنْ راٰہُ استغنیٰ [5]

بیشک جب انسان خود کو بے نیاز سمجھتا ہے تو سرکشی کرتا ہے۔

واِذَآ اَنعَمنا علی الانسان اَعرَضَ ونَئآ بِجَانبہ [6]

اور جب ہم انسان کو نعمت دیتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے۔

اسی لئے خدا کے نمائندوں نے بقدر ضرورت رزق کے حصول کی طرف تشویق کی ہے، رسولؐ کا ارشاد ہے:

اَللّٰھُمّ ارْزُق محمّداً و آلَ محمّدٍ وَمَنْ اَحَبَّ محمّداً و آلَ محمدٍ، العَفافَ والکِفافَ [7]

اے اللہ محمد وآل محمد اور ان سے محبت کرنے والے کو پاکیزہ اور بقدر ضرورت رزق عطا فرما۔

نہج البلاغہ میں ہے:

لا تَسئَلُوا فِیھاَ فَوقَ الْکِفاف ولا تطلبوا فیھا اکثر من البلاغ [8]

---

[1] درآمدی بر اقتصادی اسلامی ج۱ ص۴۷ [2] وسائل الشیعہ ج۱۲ ص۱۷ [3] ایضا [4] شوریٰ:۲۷
[5] علق:۶-۷ [6] اسراء:۸۳ [7] بحارالانوار ج ۷۲ ص۵۹ [8] نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ:۴۵

دنیا میں ضرورت سے زیادہ طلب نہ کرو اتنا ہی لو جتنا آگے بھیج سکو۔

ان آیتوں اور حدیثوں سے مال کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کی زندگی میں مال کا اہم کردار ہوتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح اعتقاد کے ساتھ ہو اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے مال کے حصول کیلئے کیا احکام و دستورات مقرر کئے ہیں، امام زین العابدین اسے ایک حق کے عنوان سے دیکھتے ہیں۔

کسب مال

کم و بیش ہر انسان مال سے محبت کرتا ہے لیکن اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ انسان کو مال سے جو محبت ہے وہ فطرتی ہے یا عارضی ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عزیزی اور فطری عمل ہے اور انسان کی فطرت میں اس کا قدرتی اور حیاتی اثر ہے۔

صاحبان علم کہتے ہیں کہ مال سے جو انسان کو لگاؤ ہے وہ کوئی مستقل و طبیعی کشش نہیں ہے، بلکہ یہ خواہش کو پورا کرنے کا وسیلہ ہے تاکہ انسان ثروت کا مالک بن کر اپنی زندگی کی ضرورتوں، مثلاً روٹی، کپڑا اور مکان، جنسی خواہش کی تسکین اور بچوں وغیرہ کی حفاظت کرے۔

جانور بھی بہت سی چیزوں کو اپنی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے جمع کرتے ہیں، جملک کی عمدہ صورت خوراک، ہمدم، آشیانہ اور وطن سے مربوط ہے جانوروں کے اندر ملکیت بنانے کا جو رجحان ہے اس کا سرچشمہ وہ جذبہ طاقت ہے جو بھوک، تناسل اور اپنے بچہ کی حفاظت کے رجحان سے زیادہ شدید و قوی ہے۔

''ولیم جیمز'' نے معاشرہ میں مالکیت کو شخصیت کی وسعت یا ایک قسم کی نفسیاتی ضخامت قرار دیا ہے وہ کہتا ہے۔ ''میں اور انا'' صرف نفسیاتی طاقت و قوت ہی کو شامل نہیں ہے، بلکہ لباس، گھر، سواری، ملک اور بینک کے حساب کو بھی شامل ہے اور یہ تمام چیزیں اس کے اندر عواطف کو ایجاد کرتی ہیں۔ [۱]

اگر چہ مال کا محبوب ہونا فطری نہیں ہے لیکن یہ زندگی چلانے، خواہشوں کو پورا کرنے

---

۱ بزرگ سالان و جوان (گفتار فلسفی) ج ۱ ص ۲۷۲، ۲۷۴، ۲۷۴

اور اقتدار حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے مال انسان کی بہت سی تمناؤں کو پورا کر سکتا ہے اور انسان کی شخصیت کا وقار بڑھا سکتا ہے اس سلسلہ میں قرآن کہتا ہے: اِنَّـهُ لِـحُـبِّ الـخير لشديد[1] انسان مال سے بہت زیادہ محبت رکھتا ہے۔

عن عمرو بن جميع قال : سمعتُ ابا عبدالله يقول: لا خير فيمن لا يحب جمع المال من حلالٍ يكُفُّ به وجهَهُ ويقضي به دينَهُ ويصِلُ بهِ رحِمهُ [2]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: اس شخص میں کوئی خوبی نہیں ہے جو حلال طریقہ سے مال حاصل کرنے کی خواہش نہ رکھتا ہو کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکے، اپنے قرض کو ادا کر سکے اور صلہ رحمی کرے۔

مال حاصل کرنے کا مقصد

كـان صلى الله عليه وآله جالساً مع اصحابه ذات يوم فنظر الى شابٍّ ذي جَلَدٍ وقوةٍ وقد بَكَرَ يسعىٰ، فقالوا: وَيحَ هذا، لو كان شبابه وجَلَدُهُ في سبيل الله! فـقـال : لاتـقـولوا هذا فإنّه ان كا يسعىٰ علىٰ نفسِهِ لِيَكُفَّها عن المَسئلة، ويُغنِيها عن الـنـاسِ فهو فـي سبيل اللّهِ وإن كان يسعىٰ على أبوينِ ضعيفينِ أو ذُرِّيةٍ ضعافٍ لِيُغنِيَهم ويكفيهُم فهو في سبيل الله وإن كان يسعىٰ تفاخراً وتكاثراً فهو في سبيل الشيطانِ۔ [3]

ایک دن رسولؐ اپنے بعض اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک طاقتور چست جوان کو دیکھا جو صبح سے کام و کوشش میں مشغول ہے۔ اصحاب نے کہا، افسوس ہے اس جوان کے اوپر، کاش یہ اپنی جوانی اور اس طاقت کو راہ خدا میں صرف کرتا! رسولؐ نے فرمایا: یہ نہ کہو، کیونکہ اگر وہ اپنی زندگی کے اخراجات پورا کرنے کے لیے کوشش کر رہا ہے تا کہ دوسروں سے بھیک نہ مانگنا پڑے اور وہ لوگوں سے مدد طلب کرنے سے بے نیاز ہو جائے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہے اور اگر وہ اس لئے کوشش و کام میں مشغول ہے

---

[1] عادیات: ۸ [2] وسائل الشیعہ ج ۱۲ ص ۱۹ [3] محجۃ البیضاء ج ۳ ص ۱۴۰

تا کہ اپنے ضعیف ماں، باپ اور اپنے کمسن بچوں کے اخراجات کو پورا کرے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرے تو یہ بھی فی سبیل اللہ ہے اور اگر وہ مال کی کثرت اور اس پر فخر کرنے کیلئے جمع کر رہا ہے تو یہ شیطان کا راستہ ہے۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچنے کیلئے کوشش کرنا بھی عبادت ہے۔ اس قسم کی کمائی کی مذمت نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی روز مرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے کوشش کرے۔ ہمارے معصوم ائمہ کا عمل اس کا ثبوت ہے۔ امام محمد باقرؑ کے بارے میں محمد بن منکدر کی باتیں ملاحظہ ہوں:

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ محمد بن منکدر کہتا ہے: میرا خیال تھا کہ علی بن الحسین (زین العابدینؑ) اپنے سے بہتر اپنا جانشین نہیں بنا سکیں گے یہاں تک کہ ایک دن میری ملاقات ان کے فرزند محمد بن علی سے ہوئی، میں نے سوچا کہ انہیں کچھ نصیحتیں کروں لیکن انہوں نے مجھ ہی کو نصیحت کر دی۔ اس کے ساتھیوں نے معلوم کیا: کس طرح تمہیں نصیحت کی؟ اس نے کہا: ایک دن میں گھر سے نکلا اور گرمی کے وقت مدینہ کے اطراف میں نکل گیا۔ دیکھا کہ ایک کھیت میں دو غلاموں کے ساتھ ایک آدمی کام میں مشغول ہے، میں نے اپنے دل میں سوچا سبحان اللہ! یہ قریش کا بوڑھا اس شدید گرمی اور ضعیفی کی عمر میں دنیا کی طمع میں کام کر رہا ہے۔ مجھے چاہئے کہ اسے نصیحت کروں، میں آگے بڑھا، ان کے قریب پہنچا، سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ میں نے عرض کی: خدا آپ کا بھلا کرے! قریش کا بزرگ اس عالم میں دنیا طلبی میں مشغول ہے! اگر اس حال میں ملک الموت قبض روح کیلئے آجائے تو آپ کیا کریں گے؟

فرمایا: اگر ملک الموت آجائے تو وہ مجھے اس حال میں خدا کی عبادت میں پائیگا، میں اپنے اور اپنے اہل وعیال کے اخراجات پورا کرنے کیلئے کام کر رہا ہوں مجھے تمہارے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو اس بات سے ڈرتا ہوں کہ ملک الموت آجائے اور مجھے خدا کی اطاعت میں نہ پائے۔ میں نے عرض کی: خدا آپ پر رحم کرے، آپ صحیح فرماتے ہیں میں نے سوچا تھا کہ آپ کو نصیحت

کروں لیکن آپ نے مجھی کو نصیحت کر دی۔ [1]

ہمارے ائمہ اس لئے محنت و مشقت کرتے تھے تاکہ اپنی زندگی کے اخراجات پورا کریں اور پست فطرت لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اس طرح انہوں نے اپنے ماننے والوں کو یہ سبق بھی دیدیا کہ وہ دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں بلکہ اپنے خون پسینہ کی کمائی سے استفادہ کریں۔

جو لوگ اپنے اہل و عیال کے اخراجات پورا کرنے کی خاطر کام کرتے ہیں وہ دین اسلام کی نگاہ میں ان لوگوں کی مثل ہیں جو محاذ جنگ پر دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں: اپنے بچوں اور بیوی کیلئے کام کرنے والا راہ خدا میں جہاد کرنے والے کی مانند ہے۔

اس کے برخلاف جو شخص اپنے اہل و عیال کو چھوڑ دیتا ہے اور ان کو نان و نفقہ سے محروم کر دیتا ہے اس کے بارے میں رسولؐ فرماتے ہیں: ملعونٌ مَن یضیعُ مَن یعول [2] ملعون ہے اور رحمت خدا سے دور ہے وہ شخص جو ان لوگوں کے حق کو ضائع کر دیتا ہے جو اس پر حق رکھتے ہیں۔

حلال طریقہ سے مال حاصل کرنا

عن ابی جعفر قال: قال رسولُ اللّٰه فی حجة الوداع: ألا إنّ الروح الامین نفث فی روعی أنّه لا تموت نفسٌ حتیٰ تستکمِلَ رِزقُها، فاتقوا اللّٰه وأجْمِلوا فی الطَّلَبِ ولا یحملنّکم استِبطاءُ شیءٍ مِن الرزقِ ان تطلُبوهُ بمَعصیَةِ اللّٰه، فانّ اللّٰه تبارکَ وتعالیٰ قَسَّم الارزاق بینَ خَلقِهِ حلالاً ولم یقسمها حراماً، فَمَنِ اتقیٰ اللّٰه وصبر أتاه اللّٰهُ برزقِهِ مِن حِلّهِ، ومَن هتَکَ حجابَ السّتر وعجّلَ فأخذَهُ مِن غَیر حِلّهِ قُصَّ به مِن رزقِهِ الحلالِ وحوسِبَ علیه یوم القیمه [3]

امام محمد باقرؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے حجۃ الوداع میں فرمایا: دیکھو! جبریل نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ کسی بھی نفس کو اس وقت تک موت نہیں آتی ہے جب تک کہ اس کا رزق پورا نہیں

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۲ ص ۴۳-۴۴ [2] ایضا [3] عمان ص ۲۷

ہوجاتا پس تلاشِ رزق کے سلسلہ میں خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور اختصار سے کام لو اگر تمہارا رزق تھوڑی دیر کے بعد تم تک پہنچے تو اسے تم خدا کی معصیت کے ساتھ حاصل نہ کرنا بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مخلوق کے درمیان حلال طریقہ سے رزق تقسیم کیا ہے لیکن جو شخص پردہ دری کرتا ہے اور حرام طریقہ سے جلد از جلد رزق حاصل کرتا ہے تو اس کی حلال روزی کم ہو جاتی ہے اور روز قیامت اس سے اس کا حساب لیا جائیگا۔

اس حدیث میں صبر کرنا اہم چیز ہے۔ اگر انسان کو اس کی توقع کے مطابق رزق و روزی نہ ملے تو اسے حرام رزق کی طرف ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیئے کہ روز قیامت عادل خدا کی بارگاہ میں اس کا حساب دینا پڑے۔

رزق کی دو قسمیں

امام صادقؑ فرماتے ہیں: رزق کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم اپنے مالک تک پہنچ جاتی ہے خواہ وہ اسے تلاش بھی نہ کرے لیکن دوسری اسے ڈھونڈنے اور تلاش کرنے ہی سے ملتی ہے، جو رزق تقسیم ہو چکا ہے وہ تو انسان تک پہنچ جاتا ہے خواہ وہ اسے تلاش نہ کرے لیکن جو رزق تلاش کرنے ہی سے میسّر ہوتا ہے اس کیلئے انسان کو چاہئے کہ اسے حلال طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرے، اگر اس نے اسے حرام طریقہ سے طلب کیا اور پالیا تو اس کا حساب اس کے رزق میں ہوگا اور روزِ قیامت اسے اس کا حساب دینا ہوگا کہ حرام راستہ سے حاصل کیا ہے۔

مال کے سلسلہ میں امام زین العابدین نے فرمایا ہے کہ اسے حلال طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرو اور حرام راستہ سے پرہیز کرو، مذکورہ حدیثیں امام زین العابدینؑ کے بیان کی تکمیل کرتی ہیں۔ آخر میں مال کے حق کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: ممکن ہے مال وارث کے ہاتھ میں پہنچ جائے اور وہ اس کو صحیح راہ میں خرچ کرے اور روز قیامت اس کا نتیجہ بھی حاصل کرے، اس سلسلہ میں امیر المومنین فرماتے ہیں:

روز قیامت سب سے زیادہ حسرت اس شخص کو ہوگی کہ جس نے خدا کی نافرمانی میں مال جمع کیا ہو اور پھر اس مال کو اس شخص کو میراث میں دے گیا ہو کہ جو اس کو طاعت خدا میں خرچ کرے اور اس

کے نتیجہ میں جنت میں جائے اور پہلا شخص جہنم میں جائے۔

یقیناً یہ بہت بڑی حسرت ہے کہ کسی کا مال دنیا میں دوسرے کے ہاتھ لگ جائے اور وہ دنیا میں بھی اس سے استفادہ کرے اور آخرت میں بھی اور جس نے اس مال کو زحمت و مشقت کے ساتھ حاصل کیا تھا وہ حرام طریقہ سے حاصل کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو۔

قرض خواہ کا حق

اما حق الغريم الطالب لك فان كنت موسراً او فتية و كفيته و أغنَيتَه ولم تَرُدَّهُ وتمطُلُهُ فإنّ رسولَ اللّه قالَ: "مَطلُ الغَنيّ ظُلمٌ" وإن كُنتَ مُعسِراً أرضَيتَهُ بِحُسنِ القَولِ وطلبتَ إليهِ طَلَباً جَميلاً ورَدَدتَهُ عن نفسِكَ رداً لطيفاً ولم تَجمَعْ عليه ذَهابَ مالِهِ وسوءَ مُعامَلَتِه، فإنّ ذلكَ لُؤمٌ ولا قوّةَ إلا باللّهِ

تمہارے قرض خواہ کا حق یہ ہے کہ اگر تمہاری استطاعت میں ہے تو اس کا قرض ادا کر دو اور اس کا کام چلا دو اور اسے بے نیاز کر دو، ٹال مٹول کر کے اسے پریشان نہ کرو کہ رسولؐ نے فرمایا ہے: ثروت مند کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اور اگر تم تنگ دست ہو تو اس سے نرم لہجہ میں بات کرو، مہلت طلب کرو اور سلیقہ سے واپس کر دو کہ تم نے اس کا مال لے رکھا ہے اس سے بدسلوکی نہ کرو کیونکہ یہ پست اور گری ہوئی بات ہے، خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

غریم کے معنی لغت میں، قرض خواہ، دشمن، حریف اور رقیب ہیں، مَطل تاخیر کرنا کسی حق کی ادائگی میں کوتاہی کرنا، وقت میں تاخیر کرنا ہیں، موسر، جو ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، اس کے مقابلہ میں "معسر" ہے جو قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے۔

امام زین العابدینؑ نے رسالۃ الحقوق کے اس حصہ میں قرض خواہ کے حق کو خلاصہ کے طور پر بیان فرمایا ہے:

۱۔ اگر مقروض اپنا قرض ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے تو اسے ادا کر دینا چاہئے قرض چکانے میں تاخیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ قرض خواہ سے خوش خلقی کے ساتھ پیش آئے اور اس سے اس طرح گفتگو کرے کہ اسے تکلیف نہ ہو، اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو اپنی پستی کا ثبوت فراہم کرے گا کیونکہ اس نے مد مقابل کا مال بھی لے لیا اور اس سے دست گریباں بھی ہو رہا ہے۔ ظاہر ہ کہ ایسا شخص سرزنش کا مستحق ہے۔

انسان کی زندگی کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ نشیب و فراز سے بھری ہوئی ہے اسکی کوئی

ایک ڈگر نہیں ہے۔ کبھی مالداری و ثروت مندی ہے کبھی مفلسی و ناداری ہے، انسان کو دونوں صورتوں میں اپنے قوی ارادہ کی حفاظت کرنا چاہئے۔ مالدار ہونے کی صورت میں سرکشی نہیں کرنا چاہئے اور غربت و مفلسی کے زمانہ میں اپنا بھرم نہیں کھونا چاہئے۔ دین اسلام میں جو دلچسپ اور قیمتی مسائل بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک قرض دینا اور لوگوں کی مدد کرنا اور استطاعت نہ رکھنے والے لوگوں کو مہلت دینا بھی ہے۔ قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں اس مسئلہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے ان میں سے بعض آیتیں درج ذیل ہیں۔

قرض حسنہ قرآن کی روشنی میں

سورۃ تغابن میں مال سے متعلق گفتگو کے بعد اموال کو فتنہ قرار دیا ہے ارشاد ہے:

ان تقرضوا اللّٰه قرضاً حسنا یضاعفه لکم ویغفر لکم واللّٰه شَکورٌ حلیمٌ [1]

اگر تم خدا کو قرض حسنہ دو گے تو وہ اسے تمہارے لئے دوگنا کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا، بیشک خدا قدرداں اور حلیم ہے۔

قرض کے معنی کسی چیز کو قطع کرنا ہیں اور جب "حسن" کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس کے معنی مال کو خود سے جدا کر کے نیک کام میں خرچ کرنے کے ہوتے ہیں۔ "یغفر لکم" اس بات کی دلیل ہے کہ انفاق و خرچ گناہوں کی بخشش کا سبب ہوتا ہے اور لفظ شکور اس بات کی دلیل ہے کہ خدا عظیم جزاء کے ذریعہ اپنے بندوں کی قدر کرتا ہے یا ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

سورۃ حدید میں ارشاد ہے:

من الذّی یقرض اللّٰه قرضاً حَسَناً فَیُضاعِفَهُ لَهُ ولَهُ أجرٌ کریمٌ [2]

کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے تا کہ خدا اس کو کئی گنا کر دے اور اس کو اجر کریم عطا کرے۔

اسی سورہ میں ارشاد ہے:

إنّ المصدقین و المصدقات واقرَضوا اللّٰهَ قَرضاً حَسَناً یُضاعَفُ لَهُم ولَهُم

---

[1] تغابن: ۱۷ [2] حدید: ۱۱

أجرٌ كريمٌ [1]

بیشک انفاق کرنے والے مرد اور عورتیں خدا کو قرض حسنہ دیتے ہیں جوان کیلئے کئی گنا ہو جاتا ہے اور ان کے لئے بڑا اجر ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خداوند عالم کو "قرض حسنہ" دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بندوں کو قرض دیں کیونکہ خدا قرض سے بے نیاز ہے یہ مومن بندے ہیں جن کو قرض کی ضرورت ہوتی ہے لیکن آیتوں کے سیاق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تمام آیتوں میں قرض الحسنہ سے مراد راہ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ اگرچہ خدا کے بندوں کو قرض دینا بہت عظیم عمل ہے۔ فاضل مقداد نے بھی "کنز العرفان" میں یہی معنی بیان کئے ہیں ہر چند تمام صالح اعمال سے اس کی تفسیر کی جا سکتی ہے۔

سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

من ذالذی یقرض اللّه قرضاً حسناً فیضاعفه له أضعافاً كثيرةً واللّه يَقْبِضُ ويبسُطُ وإلَيْهِ تُرجعونَ [2]

کون ہے جو خدا کو قرض حسنہ دے تا کہ خدا اس کو اس کے لئے کئی گنا کر دے بیشک خدا رزق و روزی کو محدود و تنگ اور کشادہ و فراخ کرتا ہے اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

یہ تھیں قرض الحسنہ کی اہمیت سے متعلق چند آیتیں جو ہم نے بطور نمونہ پیش کی ہیں۔ ورنہ اس موضوع پر بہت سی آیتیں دلالت کر رہی ہیں۔

سودخوری قرآن کی نظر میں

اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے قرض الحسنہ اور کلی طور پر صدقات و انفاق، کہ جن سے ضرورت مندوں کی مدد کی جاتی ہے قرض دینے والا صرف خدا کی رضا کیلئے قرض دیتا ہے، اس کا اجر و ثواب احادیث میں بیان ہوا ہے اس کے برخلاف سودخوری ہے اس کا حکم اور معاشرہ مرتب ہونے والے اس کے منفی اثرات بھی قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے:

---

۱ حدید: ۱۸ ۲ بقرہ: ۲۴۵

یا ایھاالذین اٰمنوا اتقو اللّٰہ وزروا ما بقی مِنَ الرّبا اِن کنتم مومنینَ۔ فاِن لم تَفعلوا فَأذنوا بِحَربٍ مِنَ اللّٰہِ ورَسولِہِ فاِن تُبتم فَلکم رُؤسُ أموالِکم لا تَظلِمون ولا تُظلمون [۱]

ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو! اور سود میں سے جو باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔ اگر تم مومن ہو اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو جان لو کہ تم خدا اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرو گے۔ پھر اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہارا سرمایہ تمہارے ہی پاس رہے گا۔ (یعنی اصلی پونجی تمہارے ہی پاس رہے گی نہ کہ اس کا سود) تم ظلم نہ کرو تمہارے اوپر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا۔

پہلی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ سودخوری روحِ ایمانی سے میل نہیں کھاتی ہے اور دوسری آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ مسلسل سود کھانا خدا اور اس کے رسولؐ سے جنگ کا اعلان کرنا ہے اگر وہ توبہ کر لیں اور پشیمان ہو جائیں تو ان کے لئے عدل سے کام لیا جائے گا یعنی ان کی اصلی پونجی سود کے بغیر واپس کردی جائے گی۔ اس صورت میں وہ نہ ظالم ہونگے اور نہ مظلوم۔

اس سورے کی دوسری آیتوں میں اس طرح ارشاد ہے:

الذین یاکلون الربا لا یقومون الاّ کما یقومُ الذی یتخبّطُہُ الشیطانُ مِن المسّ ذلک بأنھم قالوا اِنّماالبَیعُ مِثْلَ الرّبا واحلّ اللّٰہُ البَیعَ وحرّم الرّبا۔یَمحقُ اللّٰہُ الرّباویربی الصدقاتِ واللّٰہ لا یُحِبُّ کلّ کفّار أثیمٍ [۲]

جولوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اس شخص کی مانند کھڑے ہونگے کہ جو شیطان کے چھونے کی وجہ سے پاگل ہو گیا ہے اور اپنا تعادل برقرار نہیں رکھ سکتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں: تجارت بھی تو سود ہی جیسی ہے، جبکہ خدا نے بیع (تجارت) کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔۔۔۔۔خدا سود کو نابود کرتا ہے اور صدقات میں اضافہ کرتا ہے اور خدا کسی بھی ناشکرے گناہگار انسان کو دوست نہیں رکھتا۔

''خبط'' کے معنی لغت میں، راستہ چلنے یا اٹھنے میں بدن کے تعادل کا برقرار نہ رہنا ہیں۔ اس

---

[۱] بقرہ: ۲۷۸۔۲۷۹ [۲] بقرہ: ۲۷۴۔۲۷۵

آیت میں سود خور کو دیوانہ و پاگل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیا اس کا مطلب سود خور لوگوں کا دنیا میں سماجی و اجتماعی سلوک ہے؟ کہ وہ پاگلوں جیسا کام کرتے ہیں، کیونکہ ان کے اندر صحیح و اجتماعی فکر نہیں ہے مثلاً ان میں تعاون، ہمدردی، انسانی محبت نہیں ہے۔

یا قیام کرنے اور کھڑا ہونے سے مراد قیامت میں اٹھنا ہے کہ وہاں وہ دیوانوں اور پاگلوں کی طرح محشور ہونگے؟ اکثر مفسرین نے دوسرے احتمال کو قبول کیا ہے کیونکہ قیامت میں انسان کے اعمال مجسم ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ دونوں معنی مراد ہوں۔ امام صادقؑ نے فرمایا ہے:

اٰكِلُ الرّبا لا يخرج من الدنيا حتىٰ يتخبّطه الشيطان [1]

سود خور دنیا سے نہیں اٹھے گا مگر اس سے پہلے ایک قسم کے جنون میں مبتلا ہو جائیگا۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ اس جنون و پاگل پن کا سبب شیطان ہے؟ جبکہ یہ بات واضح ہے کہ جنون و دیوانگی ایک نفسیاتی بیماری ہے اور اس کے اسباب بھی معلوم ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مَسّ شیطان کے کنائی معنی نفسیاتی بیماری ہے اور یہ عرب میں بولا جاتا تھا اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ شیطان کی پیروی کرنے والے پر اس نے اثر کیا ہو اور اس کا طبیعی اثر زائل ہو گیا ہو اور اس سے منطقی فکر کی صلاحیت سلب ہو گئی ہو بہر صورت اس آیت میں سود کھانے والوں کی دینوی اور اخروی حاجت بیان ہوئی ہے۔

سود کھانے والوں کی منطق

سود کھانے والے کہتے ہیں: تجارت بھی سود ہی کی مانند ہے، اس میں کیا فرق ہے؟ یہ بھی معاملہ ہے اور وہ بھی!! قرآن ان کا جواب دیتا ہے، خدا نے تجارت اور خرید و فروخت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام گردانا ہے اور ان دونوں میں واضح فرق ہے کیونکہ خرید و فروخت، تجارت، میں طرفین کو فائدہ بھی ہو سکتا ہے اور نقصان بھی لیکن سود والے معاملہ میں سود لینے والے کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ تجارت میں خرید و فروخت پیداوار اور استعمال کی راہ پر چلتے ہیں جبکہ سود خور ایسا کوئی کام انجام نہیں دیتا ہے اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ سود خوری کے عام ہونے کی صورت میں اصلی پونجی و سرمایہ کو خطرہ لاحق

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۲۷۲ بہ نقل از تفسیر نور الثقلین، ج ۱ ص ۲۹۱

ہو جائیگا اور اقتصادی نظام متزلزل ہو جائیگا۔ جبکہ صحیح تجارت مال وثروت کا محفوظ محور ہے۔ اور سود میں دوسرا نقصان یہ ہو سکتا ہے کہ سود خوری طبقاتی دشمنیوں اور جنگوں کا سبب بن جائے گی حالانکہ صحیح تجارت میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔

سورۃ آل عمران کی آیت ۱۳۰ اور سورۃ نساء کی آیت ۱۵۹ میں بھی سود کا بیان ہے۔ صدقات، انفاق اور قرض الحسنہ کی اسلام نے اس لئے تشویق و ترغیب کی ہے تا کہ طبقاتی کشمکش کا سد باب ہو جائے۔

مقروض لوگوں کو مہلت دینا

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: اگر مقروض استطاعت رکھتا ہے تو اسے اپنا قرض ادا کر دینا چاہئے اور اگر وہ قرض چکانے پر قادر نہیں ہے، تو قرض خواہ کو چاہئے کہ وہ اسے اتنی مہلت دے کہ وہ اپنا قرض چکانے کے قابل ہو جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے:

وإن كان ذو عُسرةٍ فنظرةٌ الىٰ مَيسَرَةٍ وإن تَصَدّقوا خيرٌ لكم إن كنتم تعلمونَ [1]

اگر مقروض، قرض چکانے پر قادر نہ ہو تو اسے مہلت دو (یہاں تک کہ وہ قرض ادا کرنے پر قادر ہو جائے) یا اس کے قرض کو معاف کر دو کہ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

قرض الحسنہ اور سود کے حرام ہونے سے متعلق ہم پہلے بھی کچھ آیات واحادیث بیان کر چکے ہیں۔ اس آیت میں قرض خواہ کا سود کے بغیر اپنا اصلی سرمایہ لینے کے بعد ایک حق یہ بیان ہوا ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض چکانے سے عاجز ہو تو نہ صرف یہ کہ تم جاہلیت کی رسم پر سود پر سود چلاؤ اور اس پر اور زیادہ بوجھ بڑھاؤ بلکہ اصل قرض کو ادا کرنے کیلئے اس کو مہلت دو تا کہ وہ مستطیع ہونے کی صورت میں قرض ادا کر سکے۔ اسلامی قوانین میں جو کہ اس آیت کے مفہوم کو روشن کرتے ہیں۔ اس بات کی تصریح ہوئی ہے کہ مقروض سے کسی بھی صورت میں قرض کے عوض گھر اور ضروریات زندگی کو قرق نہیں کیا جا سکتا ہاں!

---

[1] بقرہ: ۲۸۰

قرض خواہ ان میں سے اضافی چیزوں کو اپنے حق کے عوض لے سکتا ہے۔ یہ پسماندہ طبقات کے حقوق کی حمایت ہے۔

اس آیت کے دوسرے ٹکڑے میں اس سے عظیم مرحلہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ اگر مقروض حقیقت میں اپنے حقوق کی ادائیگی سے عاجز ہو تو بہتر یہ ہے کہ قرض خواہ ایک انسانی قدم اٹھائے اور قرض کو معاف کر دے کہ یہ اس کے لئے بہتر ہے اور جو بھی اس کام کے فوائد کو جانتا ہے وہ اس حقیقت کی تصدیق کریگا۔ اگر ہم اس آیت کا موازنہ امام زین العابدینؑ کے اس قول "تم نے اس کا مال لیا ہے اس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش نہ آؤ کیونکہ یہ انسانیت سے گری ہوئی بات ہے" سے کریں تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے اور اس کے اتباع میں ائمہ نے مسلمانوں کیلئے کتنے دلچسپ اور اہم مسائل بیان فرمائے ہیں۔ اور ان کے لئے قرض خواہ اور مقروض کے حقوق کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے۔

اس حق کے آخر میں ہم "باب فی انظار المعسر" کی طرف اشارہ کرتے ہیں: مرحوم فیض نے کتاب شافی، کی دوسری جلد میں لکھا ہے: اس بات میں اس شخص کا ثواب بیان ہوا ہے کہ جو اس مقروض کو مہلت دیتا ہے جو قرض ادا کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

عن الصادقؑ من اراد ان یظلّه اللّٰه یوم لا ظِلَّ اِلّا ظِلُّهٗ۔ قالها ثلاثاً وهابَهُ النّاسُ اَن یَسْئَلوهُ فقالَ: فَلْیَنظِرْ مُعسِراً اَو یَدَعَ لَهٗ مِن حقّه [1]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا اس روز اسے سایہ میں رکھے کہ جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا (اسی جملہ کی تین بار تکرار فرمائی لوگ اس کے حق کے بارے میں سوال کرنے کیلئے بے تاب تھے) آپؑ نے فرمایا: اس شخص کو ادا کرنے کی مہلت دینے والا کہ جو مقروض ہو اور قرض ادا کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو یا اس کا قرض معاف کر دے اس عمل کے نتیجہ میں وہ روز قیامت حضرت حق کے زیر سایہ ہوگا۔

وعنهٗ قال: صَعِدَ رسول اللّٰهؐ المنبر ذات یوم فحمد اللّٰه واثنیٰ علیه وصلّیٰ علی أنبیائهِ، ثُم قالَ: أیّهاالناسُ لِیَبلغِ الشاهدُ الغائِبَ منکم. ألا وَمَن أنظرَ

---

[1] شافی ج ۲ ص ۱۱۰

مُعسِراً کـان له علی اللهِ فی کُلِ یومٍ ثوابُ صدقة بِمِثلِ مالِهِ حتیٰ یستوفیهِ. ثم قال أبـو عبـدالله: قال الله تعالیٰ: "وإن کان ذو عُسرةٍ فنظِرةٌ إلیٰ مَیسَرةٍ و أن تصدقوا خیرٌ لکیم إن کنتم تعلمون" إنّه مُعسِرٌ فتصدقوا علیه بما لکم علیه فهو خیرٌ لکم [1]

امام صادقؑ سے مروی ہے کہ ایک روز رسولؐ منبر پر تشریف لے گئے خدا کی حمد وثنا کی اور انبیاء پر درود وسلام بھیجا پھر فرمایا: جو لوگ میرے سامنے موجود ہیں وہ ان لوگوں تک میری بات پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں جان لو کہ جس شخص نے اس مقروض کو مہلت دی جو قرض ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے اس کا خدا پر یہ حق ہے کہ اسے قرض کی ادائیگی تک ہر روز اس مال کے برابر صدقہ کا ثواب دے۔ پھر امام صادقؑ نے اس آیت کی تلاوت کی: وإن کـان ذو عُسـرةٍ فـنـظِـرةٌ إلیٰ مَیسَرةٍ و أن تـصدقـوا خیرٌ لـکیم إن کنتم تعلمون" إنّه مُعسِرٌ فتصدقوا علیه بما لکم علیه فهو خیرٌ لکم [2]

اگر تنگ دست ہے تو اسے مہلت دو یہاں تک کہ وہ قرض ادا کرنے کے قابل ہو جائے اور اگر قرض معاف کردو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ وہ تنگ دست ہے اپنا مال اسے صدقہ میں دیدو اس میں تمہارا فائدہ ہے۔

عن النبیؐ کما لا یَحِلُّ لغریمکَ أن یمطُلکَ وهو موسِرٌ فکذلکَ لا یحلُّ لک أن تعسرهُ اذا عَلِمتَ اَنهُ مُعسِرٌ [3]

رسولؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: جس طرح تمہارے مقروض کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ استطاعت رکھتے ہوئے قرض چکانے میں ٹال مٹول کرے اسی طرح تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم اس کو نادار سمجھتے ہوئے اس سے قرض کا مطالبہ کرو۔

قیـل لـلصادق علیه السلام: ان لِعبد الرحمٰن بن سیابه دیناً علی رجل قـد مـات وکـلمناهُ أن یحَلّلَهُ فَابیٰ فقال: وَیحَه! اما یعلمُ اَنّ لَهُ بِکلِ دِرهمٍ عشرةً إذا حلّله فانّما هو درهمٌ بدرهمٍ. [4]

---

[1] عمان۔ [2] ایضا [3] ایضا [4] ایضا

امام صادقؑ سے عرض کیا گیا کہ عبدالرحمن بن سیابہ کا ایک شخص پر کچھ قرض تھا وہ مر گیا، ہم نے ابن سیابہ سے درخواست کی کہ وہ اس قرض کو معاف کر دیں لیکن انہوں نے معاف نہیں کیا۔ امامؑ نے فرمایا: وائے ہو اس پر کیا اسے یہ خبر نہیں ہے کہ اگر وہ معاف کر دے گا تو اسے ہر درہم کے عوض دس درہم ملیں گے اور اگر معاف نہیں کرے گا تو ایک درہم کے بدلے ایک ہی درہم ملے گا۔

معاشر کا حق

وأمّا حقُّ الخليطِ فأنْ لا تغرّهُ ولا تغشّهُ ولا تكذِبَهُ ولا تخدعَهُ ولا تعمَلَ فى انتِقاضِهِ عَمَلَ العَدوّ الذى لا يبقىٰ على صاحبه وان اطمأن اليك استقصيتَ له على نفسِكَ و عَلِمتَ أن غبن المسترسِل رِباً، ولا قوةَ إلا باللهِ

تمہارے اوپر معاشر کا حق یہ ہے کہ اسے فریب نہ دو، اس سے دغا نہ کرو، اس سے جھوٹ نہ بولو، اس کو غافل نہ کرو اور اس کے ساتھ دشمن جیسا سلوک نہ کرو کہ جو مد مقابل کا کوئی پاس ولحاظ نہیں کرتا ہے اگر وہ تم پر اعتماد کرتا ہے تو جہاں تک ہو سکے اس کیلئے کوشش کرو اور یہ بات تم جانتے ہو کہ اعتماد کرنے والے کو دھوکا دینا سود کی مانند ہے اور خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

خلیط، اس شخص کو کہتے ہیں جس کی زندگی کسی بھی عنوان سے دوسرے سے گھلی ملی ہو، جیسے شریک، ساتھ کام کرنے والا ہم سبق۔ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: جو شخص تم سے گھل مل گیا ہے اس کا تمہارے اوپر ایک حق ہے اور وہ یہ کہ اسے فریب نہ دو اور اس سے دغا نہ کرو اس کے ساتھ دشمن جیسا سلوک نہ کرو اور جب اس نے تم پر اعتماد کر لیا ہے تو اسے نقصان نہ پہنچاؤ۔

مصاحب ورفیق کے سلسلہ میں ہم اس سے قبل بہت سی آیات وروایات نقل کر چکے ہیں کہ جن کا معاشر کے حق سے کوئی ربط نہیں ہے لہٰذا یہاں ان کی تکرار نہیں کریں گے لیکن جو احادیث خلیط و معاشر سے متعلق ہیں ان کو نذر ناظرین کریں گے۔

معاشرآ احادیث کی روشنی میں

عن الصادقؑ قال، قال رسول صلى الله عليه وآله: أسعد الناسِ مَن خالَطَ كِرامَ الناسِ [1]

امام صادقؑ سے منقول ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: سب سے زیادہ سعادت مند وہ انسان ہے جو شریف اور بزرگ لوگوں کے ساتھ معاشرت کرے۔ اس حدیث میں انسان کی سعادت کا ایک سبب یہ

[1] بحارالانوار ج ۷۴ ص ۱۸۵

بیان ہوا ہے کہ انسان بزرگ و شریف لوگوں سے دوستی رکھتا ہو۔

آپ کا ارشاد ہے:

قال رسولؐ اللہ سائلوا العُلماۃ وخالطوا الحکماۃ وجالسوا الفقراءَ [۱]

علماء سے دریافت کرو حکماء سے گھل مل جاؤ اور فقیروں کے ساتھ نشست و برخاست کرو۔ اس حدیث میں رسولؐ نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ لوگوں کو حکماء سے رابطہ نہیں توڑنا چاہیے۔

اچھے دوست کے صفات

رسولؐ نے فرمایا:

من اراد اللّٰہ بہ خیراً رزقہ خلیلا صالحاً اِن نَسِیَ ذَکَرہُ واِن ذَکَرَ أعانہُ [۲]

جس شخص کو خدا خیر دینا چاہتا ہے اسے نیک و صالح دوست عطا کرتا ہے اگر یہ اسے فراموش کر دیتا ہے تو وہ اسے یاد کرتا ہے اور اگر یہ اس کو یاد کرتا ہے تو وہ اس کی مدد کرتا ہے۔

انسان کو ایسے دوست کا انتخاب کرنا چاہئے جو سلیم و کامل عقل رکھتا ہو اور تجربہ کار ہو یہ بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نادان و کم عقل دوستوں سے کنارہ کشی کرنا چاہئے۔ اسے دیندار، نیک منش، خوش خلق اور مہذب ہونا چاہئے کہ بد اخلاق دوست اسے شرارت و بدی کے میدان میں کھینچ لے جائیگا۔ وہ خود دوستی کرنے کا رجحان رکھتا ہو اور دوست سے دو، روئی سے نہ ملتا ہو۔

امام زین العابدینؑ نے انسان کو دوست کے ساتھ مکر و حیلہ کرنے سے منع کیا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اصول کافی میں "المکر والغدر والخدیعہ" کے عنوان سے ایک باب قائم ہوا ہے۔ اس کی پہلی حدیث یہ ہے۔

قال امیر المومنینؑ لو لا ان المکر والخُدیُعَةَ فی النارِ لَکُنتُ أمکَرَ النّاس [۳]

اگر یہ نہ ہوتا کہ مکار اور دھوکا باز جہنم میں جائیں گے تو اس سلسلہ میں میں سب سے آگے ہوتا۔

---

[۱] عمان ص ۱۸۸ [۲] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۲ ص ۲۸۹ [۳] اصول کافی ج ۲ ص ۳۳۴

لیکن مکار ہرگز عقلمند نہیں ہے، مکر و خدعہ اس فعل کو کہتے ہیں کہ جس کا فاعل باطن میں اس کے ظاہر کے خلاف قصد و ارادہ کرے۔ اس باب کی تیسری روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے:

عن ابی عبد اللّٰہ قال، قال رسول اللّٰہؐ لَیسَ مِنّا مَن ماکَرَ مُسلِماً [۱]

امام صادق سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: جس شخص نے کسی مسلمان سے مکر کیا اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ جھوٹے کا بھائی بننے سے بچے کیونکہ جو جھوٹ میں مشہور ہو جاتا ہے اگر وہ سچ بھی بولتا ہے تو بھی اس کو جھٹلایا جاتا ہے۔ دوست خداوند عالم کی عظیم نعمت ہے انسان پر اس کا حق ہے مکر و فریب کے ذریعہ اس کے حق کو پامال نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہر دوست کو چاہئے کہ وہ اپنے دوست کا حق ادا کرے۔

[۱] ایمان ص ۳۳۷

مدعی اور مدعا علیہ کا حق

واماّ حق الخصم المدّعی علیك فانّ کان ما یدّعی علیك حقاً لم تنفسِخْ فی حُجتِهِ ولم تعمل فی ابطالِ دَعوتِهِ وکُنت خصَم نفسِكَ له والحاکمَ علیها والشاهدَ لهُ بِحقه دونَ شهادةِ الشهودِ فإنّ ذلك حقُ اللّهِ علَیك، وإن کان ما یَدّعیهِ باطلاً رفِقْتَ بِه ورَوّعْتَهُ وناشَدتهُ بدینه وکَسَرتَ حِدّتَهُ عنكَ بِذکرِاللّه واُلقیتَ حَشوَ الکلام ولَغطَهُ الذّی لا یُردُّعنكَ عادیة عَدوّك، بل تَبوءُ بإثمه وبِهِ یَشحذُ علَیكَ سَیف عَداوتِهِ لِانّ لَفْظَةَ السّوءِ تبعَثُ الشّرّ، والخیرُ مقمعةٌ للشّرّ، ولا قوةَ إلا باللّهِ

جس شخص نے تم پر دعویٰ کیا ہے اس کا تم پر یہ حق ہے کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچا ہے تو اس کی دلیل کو باطل نہ قرار دو اور اس کے دعوے پر خط تنسیخ نہ کھینچو بلکہ اس موقع پر تم اپنے مخالف بن جاؤ اور اس کے حق میں اپنے خلاف فیصلہ کرو اور گواہوں کی گواہی کے بغیر اس کے حق کے گواہ بن جاؤ کیونکہ یہ تمہارے اوپر خدا کا حق ہے اور اگر اس نے تمہارے اوپر جھوٹا دعویٰ کیا ہے تو اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ، اس کو ڈراؤ، اسے اس کے دین کی قسم دو اور خدا کو یاد دلا کر اس کی شدت وتندی کو گھٹاؤ، اس کے ساتھ سخت کلامی سے پیش نہ آؤ کیونکہ یہ کام دشمن کے ظلم کو تم سے نہیں ہٹا سکتا، بلکہ اس سے تم گناہ کے مرتکب ہوگے اور اس کے باعث دشمن کی تلوار تمہارے لئے اور زیادہ تیز ہو جائے گی کیونکہ بری بات شر انگیز ہوتی ہے جبکہ نیک اور اچھی بات برائی کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اور خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ جس شخص نے تمہارے اوپر دعویٰ کیا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہے یا وہ اپنے دعوے میں سچا ہے اور حق اس کے ساتھ ہے تو اس صورت میں تم پر اس کا حق یہ ہے کہ اس کی بات مان لو اور اپنے خلاف اقدام کرو کیونکہ یہ خدا کا حق ہے اور اگر اس کا دعویٰ باطل ہے تو اس کا حق یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرو اور اس کی حدّت وسختی کو کم کرو تلخ لہجہ میں گفتگو کر کے اس کی شدت میں اضافہ نہ کرو کہ نتیجہ میں اس کی تلوار کی دھار تمہارے خلاف اور زیادہ تیز ہو جائیگی بلکہ صبر وتحمل کے ساتھ اس سے بات کر کے اس کی غلط فہمی دور کرو۔

امّا حق الخصم المدعى عليه فان كان ما تدعيه حقاً أجملتَ في مقاولَتِه بمخرجِ الدعوىٰ، فاِنَّ للدَّعوىٰ غِلظَةً في سمعِ المدَّعى عليه وقصدتَ قصد حُجتِك بالرِّفقِ و أمهلِ المهلَةِ و أبيَنِ البيانِ و ألطفِ اللُّطف ولم تتشاغلُ عن حجّتِك بمنازعتِهِ بالقيل و القال فتذهبَ عنك حُجّتك و لا يكون لك في ذلكَ دركٌ، و لا قوةَ إلا باللّٰهِ

لیکن جس پر تم نے دعویٰ کیا ہے اس کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ اگر تم اس دعوے میں حق بجانب ہوتو اس سے حق لینے کیلئے تحمل وصبر سے کام لو کیونکہ مدعا علیہ کیلئے دعویٰ شدید جھٹکا ہے اسے آرام کے ساتھ اپنی دلیل سمجھاؤ اسے مہلت دو اور واضح وروشن بیان کے ذریعہ اس سے پوری مہربانی کے ساتھ پیش آؤ اور اس کے ساتھ قیل وقال سے جو جھگڑا ہو جاتا ہے اس کے سبب اپنی دلیل سے دست کشی اختیار نہ کرو کہ تمہارے ہاتھ سے دلیل نکل جائے، اور پھر تم اس کی تلافی نہ کرسکو، خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر حق تمہارے ساتھ ہے تو اطمینان وسکون کے ساتھ اپنا استدلال پیش کرو اور صبر وتحمل کے ساتھ اپنے دعوے کو ثابت کرو، کچھ اس طرح استدلال کرو کہ جس سے دعویٰ باطل نہ ہو اور تمہارا حق تلف نہ ہو۔

اختلاف کا سبب

انسانوں کی ایک اہم آرزو یہ ہے کہ وہ اس دنیا کی مختصر زندگی کو آرام وچین سے بسر کریں، ان کے حق پر کوئی بھی حملہ نہ کرے اور ان کی زندگی میں عشق ومحبت کی حکمرانی ہو نزاع وتکرار اور لڑائی جھگڑے کا گزر تک نہ ہو لیکن دوسری طرف سارے انسانوں کو حرص وطمع، خود پسندی، اور تکبر نے گھیر رکھا ہے، انہیں باتوں کی وجہ سے وہ اپنے حق پر قناعت نہیں کرتے اور دوسروں کے حق کو چھیننا چاہتے ہیں۔ یہیں سے ان کے درمیان جنگ وجدال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ فطری بات ہے کہ جس جگہ زیادہ انسان رہتے ہیں وہاں ان کے درمیان نزاع وجھگڑا بھی زیادہ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس نزاع میں فریقین

حق پر نہیں ہو سکتے یقیناً ایک فریق زیادتی پر ہوتا ہے۔ یہاں سے انسانی معاشرہ کو قاضی اور ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے اختلاف کو ختم کر کے حق، حقدار تک پہنچا دے، یہ بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ معاشرۂ انسانی میں انبیاء کی بعثت کا ایک مقصد ان کے اختلافات کو برطرف کرنا تھا۔

اسلام اختلافات کو رفع کرنے کی دعوت دیتا ہے

پہلے مرحلہ میں اسلام لوگوں کو ایک دوسرے سے محبت و مودت کرنے کی دعوت دیتا ہے اس سے بڑھکر وہ انہیں درگزر کرنے اور ایثار سے کام لینے کی تشویق کرتا ہے۔ انہیں نصیحت کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اختلافات پیدا نہ ہونے دیں، مہاجرین و انصار کے بعد پیدا ہونے والے تابعین کے بارے میں خدا فرماتا ہے:

والذین جاؤ من بعدهم یقولون ربّنا اغفرلنا ولاخواننا الّذین سَبقون بالایمانِ ولا تجعل فی قلوبنا غِلاً لِلذینَ آمنوا رَبنا اِنّك رؤفٌ رحیمٌ[1]

جو ان لوگوں کے بعد آئے ہیں وہ کہتے ہیں ہمارے پروردگار ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم پر سبقت کی ہے۔ اور ہمارے دلوں میں مومنوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ ہونے دے، ہمارے رب! تو مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

ان کے لئے یہ تین اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ ۱۔ ان کو اپنی اصلاح، بخشش اور توبہ کی فکر تھی۔ ۲۔ اپنے سے پہلے لوگوں کو مومن بھائی سمجھتے تھے کہ جو ہر لحاظ سے قابل احترام ہیں۔ ۳۔ وہ اپنے دل سے کینہ و حسد کو باہر رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا تعلق دنیوی زندگی سے ہے آخرت کی ابدی زندگی کے بارے میں سورۃ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ونزعنا ما فی صدورهم من غل تجری من تحتهم الانهارُ وقالوا الحمد لله الّذی هدانا لهذا[2]

ان کے دلوں میں جو کینہ و حسد ہے ہم اسے باہر پھینک دیتے ہیں (تا کہ وہ صدق و صفا کے

---

[1] حشر: ۱۰ [2] اعراف: ۴۳

ساتھ زندگی بسر کریں) اور ان کے محلوں کے نیچے نہریں بہتی ہونگی اور وہ کہتے ہیں ساری تعریف خدا کیلئے ہے کہ جس نے ان نعمتوں کی طرف ہماری راہنمائی کی ہے۔

جس خوشگوار اور صدق وصفا اور خلوص آگیں زندگی کو انسان اس دنیا میں تلاش کرتا ہے اور حاصل نہیں کر پاتا، خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ زندگی ہم تمہیں جنت میں دیں گے۔ اسلام نے پہلے مرحلہ میں اس زندگی کی دعوت دی ہے کہ جس میں دشمنی وحسد نہ ہو اگر ایسا نہیں کریں گے تو انسانوں کے درمیان جنگ وجدال ہوگا اسلام کا ایک دستور اصلاح ذات البین بھی ہے یعنی دو افراد کے درمیان صلح کرانا۔

اختلافات ختم کرانا اور صلح کرانا

کافی میں ایک باب "الاصلاح بین الناس" قائم کیا گیا ہے، اگر دو بھائیوں کے درمیان اختلاف ونزاع ہو جائے تو مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ایک عبادت کے عنوان سے ان میں صلح کرادیں۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

عن جیب الاحول قال: سمعت ابا عبداللّٰہؑ یقول: صدقة یحبُّها اللّٰهُ اِصلاحُ بین الناسِ اِذا تفاسدوا وتقاربُ بینهم اِذا تباعدوا [1]

حبیب احول سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں نے امام صادق کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس صدقہ کو خدا دوست رکھتا ہے وہ لوگوں کے درمیان اس وقت صلح کرانا ہے جب ان میں اختلاف ہو اور جب نزاع کے سبب ان میں دوری ہوگئی ہو اس وقت انھیں ایک دوسرے سے قریب کرنا ہے۔

دوسری حدیث میں امام صادقؑ فرماتے ہیں:

کیونکہ دو افراد کے درمیان صلح کرانا مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ دو دینار صدقہ دوں۔ لیکن اگر فرد ثالث کے ذریعہ ان کا اختلاف رفع نہ ہو اور بات عدالت تک پہنچ جائے تو عدل گستری اور حق کو حقدار تک پہنچانے کے لیے اسلام نے اپنے قضائی دستورات میں بہترین قضائی معیار مقرر کئے ہیں۔

---

[1] اصول کافی ج۲ ص۲۰۹

قاضی کو عادل ترین انسان ہونا چاہیے کہ وہ دونوں کی باتوں کو غیر جانب دارانہ طور پر سنے، دوسرے۔ اپنے فیصلے میں اس کی نظر خدا کی رضا پر مرکوز ہو۔

ہم اپنی اس بحث میں اسلام کے قضائی دستورات کو پیش کریں گے جو مدعی اور مدعا علیہ کے حق سے مناسبت رکھتے ہیں۔

اسلام کے قضائی قوانین

یورپی ممالک میں قضاوت کے سلسلہ میں جو اہم ترین اقدامات کیے گئے ہیں ان کا تعلق درج ذیل تین چیزوں سے ہے۔

الف۔ قاضی تحفظ واستقلال کا حامل ہوتا کہ وہ خیانت کار کو، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو سزا دے سکے۔

ب۔ قاضی کی تنخواہ اتنی ہونا چاہیے کہ جس سے اس کی زندگی کی تمام ضروریات پوری ہو جائیں تا کہ وہ خیانت کرنے والے مالدار کی طمع دلانے میں نہ آئے اور قانون کی رو سے اس کو اس کی خیانت کی سزا دے سکے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کی حکومت نے اس سلسلہ میں بڑا قدم اٹھایا ہے کیونکہ اس نے ججوں کے لیے، حقوق وتنخواہیں معین نہیں کہ ہیں بلکہ حکومت کے دستخط شدہ سادہ چیک ججوں کے پاس موجود رہتے ہیں جتنا جج چاہے نکالے۔

ج۔ عدالت میں جج کی نظر میں سب یکساں ہونگے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہوگی۔

یہ تین چیزیں یورپ کا عظیم شاہکار ہیں لیکن ہم اسلام کے قضائی دستورات میں ان امتیازات کو بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

جج کے اختیارات

دین اسلام نے ججوں کو جتنے اختیارات دیئے ہیں اتنے حکومت کے دوسرے اعضاء کو نہیں

دیئے ہیں ہاں حاکم اور اس کے نائب کی بات ہی دوسری ہے۔ حضرت امیرالمومنینؑ نے دستورالعمل کے عنوان سے مالک اشترا کو اس وقت ایک دستاویز لکھی تھی جب انھیں مصر کا حاکم مقرر کیا تھا، تحریر فرماتے ہیں:

ثم اختر للحكم بين الناس افضلَ رَعيتك فى نفسِكَ... وأعطه من المنزلةِ لَديكَ مالا يطمعُ فى غيرهُ من خاصّتِك لِيأمَنَ بذلك اغتيالَ الرِّجال له عندكَ [1]

پھر لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے اس شخص کا انتخاب کرو جو تمہارے نزدیک عام لوگوں سے افضل وشائستہ ہو، اپنے یہاں اس کو اتنی عزت وعظمت دو کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس کی طمع نہ کر سکے اور اس طرح وہ تمہارے مصاحبوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہے۔ اے مالک قاضی وجج کو اتنی سہولتیں اس لیے دو تا کہ ملک میں اسے آزادی حاصل ہو کہ وہ مجرم کو بغیر کسی خوف وہراس کے عدالت میں کھینچ لائے اور اسے قانون کے کٹہرہ میں کھڑا کر دے خواہ وہ کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو۔

جج مالی لحاظ سے مستغنی ہو

زندگی کے اخراجات کے سلسلہ میں حضرت علیؑ نے انھیں مالی استقلال کا بلند ترین درجہ دیا ہے، اسی دستاویز میں تحریر فرماتے ہیں:

وافسح له فى البذل مايزيل علّته وتقِلُّ معه حاجتهُ إلى الناسِ. [2]

اور اسے اتنی تنخواہ ومعاوضہ دو جو اس کی ضروریات کو پورا کر دے تا کہ انھیں دوسروں کا دست نگر نہ ہونا پڑے اگر وہ دوسروں کے دست نگر ہونگے تو انھیں کوئی بھی طمع دلا سکتا ہے۔ لہذا مالک کو حکم دیتے ہیں کہ انھیں بیت المال سے اتنا دو کہ وہ دوسروں سے بے نیاز ہو جائیں۔

عدالت میں جج کے فرائض

تیسرا موضوع مساوات ہے دین اسلام نے عدالت میں مساوات کے پایوں کو اتنا بلند کیا ہے

[1] نہج البلاغہ (فیض) نامہ ۵۳ [2] ایضا

کہ جن کی بلندیوں تک نہ صرف یہ کہ یورپی ممالک نہیں پہنچ سکتے بلکہ ابھی دسیوں صدیوں تک دنیا عدالت میں ایسی مساوات قائم نہیں کر سکے گی۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے عدالت میں قاضی و جج کے فرائض یہ ہیں:

الف۔ فریقین کو ایک نظر سے دیکھنے کے لیے دین اسلام نے کچھ احکام مقرر کئے ہیں، فریقین کے بیٹھنے کی ایک جگہ ہوگی اور ان دونوں کو اوپر یا نیچے ایک ہی جگہ بیٹھنا ہوگا۔ اگر ایک فریق حکومت کا آدمی ہو اور دوسرا پست رعایا سے تعلق رکھتا ہو تو بھی قاضی کا فرض ہے کہ انھیں ایک جگہ بٹھائے اور عدالت میں انکے درمیان امتیاز نہ برتے، اس دعوے کی دلیل کے لیے درج ذیل داستان ملاحظہ ہو:

ہارون اور جج

لکھا ہے کہ ہارون رشید، بنی عباس کا مقتدر خلیفہ، اعمالِ حج کے انجام دہی کے بعد مدینہ پہنچا۔ اہل مدینہ نے اس سے کہا: ہمارے جج کا انتقال ہو گیا ہے لہذا مدینہ میں کسی پاک دامن جج کا تقرر کر دیجیے انہوں نے اہل مدینہ میں سے دو پاک دامن افراد کی تائید کی۔ ہارون رشید نے یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ علم و شائستگی رکھتا ہے اور منصب قضاوت کو کون اچھی طرح سنبھال سکتا ہے ان میں سے ایک کو طلب کیا۔ ہارون رشید کا وزیر اعظم بھی اس کے پاس کھڑا تھا، ہارون رشید نے اس آدمی سے سوال کیا میرے اور میرے وزیر اعظم کے درمیان ایک ملک کے سلسلہ میں اختلاف ہو گیا، ہارون نے اختلاف کی وجہ بیان کرنے کے بعد اس سے کہا: اس کا فیصلہ کرو، اس شخص نے کچھ غور کرنے کے بعد کہا: اس مقدمہ میں خلیفہ حق بجانب ہیں۔ ہارون رشید نے اسے رخصت کر دیا اور دوسرے آدمی کو طلب کیا اور وہی فرضی جھگڑا اس سے بیان کیا اور کہا: تم اس کا فیصلہ کرو، اس شخص نے کہا: میں فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ قضاوت و فیصلہ کے شرائط موجود نہیں ہیں جھگڑے و مقدمہ کے ایک فریق آپ ہیں کہ مخصوص جگہ تشریف فرما ہیں اور وزیر اعظم جو کہ دوسرا فریق آپ کے سامنے کھڑا ہے جبکہ اسلام کے نقطۂ نظر سے مدعی اور مدعا علیہ کی جائے نشست ایک ہی ہونا چاہیے۔ ہارون رشید کو اس کی یہ بات بہت پسند آئی اور اس کو جج مقرر کر دیا۔

ب۔ فریقین کے درمیان مکمل طور سے مساوات برقرار کرنے کے لیے جج کا فریضہ ہے کہ وہ

ان دونوں کی طرف اشارہ اور نگاہ کرنے میں بھی مساوات کا خیال رکھے اور عدالت میں ایک کی طرف دوسرے سے زیادہ ملتفت نہ ہو یا اس کی طرف ہاتھ سے زیادہ اشارہ نہ کرے۔

ج۔ عدالت کی کرسی پر جج کا فرض ہے کہ فریقین سے برابر گفتگو کرے اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ ایک سے دوسرے سے زیادہ گفتگو کرے۔

د۔ فریقین میں سے ایک کی طرف اتنی ہی دیر ملتفت رہے جتنی دیر دوسرے کی طرف ملتفت تھا، حضرت امیر المومنینؑ نے محمد بن ابی بکر کو تحریر فرمایا:

فاخفض لهم جَنَاحَك الف لهم جانبك، وابسُط لهم وجهك، و آسِ بينهم في اللّحظَةِ و النظرةِ حتى لا يطمعَ العظماءُ في حيفكَ لهم ولايَيْأس الضعفاءُ من عدلك عليهم[1]

ان کے لیے خاکسار بن جاؤ، ان سے کشادہ روئی اور خندہ پیشانی سے پیش آؤ اور سب کو ایک آنکھ سے دیکھو، خواہ گوشۂ چشم سے دیکھو یا بھرپور طریقے سے تاکہ بڑے آدمی تم سے یہ توقع نہ کریں کی چھوٹوں پر ظلم کرو اور ناتواں و پسماندہ لوگ تمہارے عدل سے مایوس نہ ہوں۔

دوسرے والی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

گوشۂ چشم سے دیکھو نظر بھر کر دیکھو ایک آنکھ سے دیکھو اشارہ یا زبان سے سلام کرنے میں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرو تاکہ بڑے آدمیوں کو تمہاری بے جا طرف داری کی امید نہ ہو جائے۔

جج کے فرائض کے سلسلہ میں شہید اول کا نظریہ

ويجب على القاضي التسوية بين الخصمين في الكلام والنظرِ وأنواع الاكرامِ الانصات والانصافِ، وله أن يرفع المُسلم على الكافر في المجلس وأن يُجلِسَ المسلم مع قيامِ الكافرِ، ولا تَجِبُ التسويةَ في الميل القلبي

جج و قاضی پر واجب ہے کہ وہ فریقین سے بات کرنے، دیکھنے، سلام کرنے، بات سننے،

---

[1] عمان، نامہ ۲۷

انصاف کرنے، اور دوسرے احترامات میں یکساں برتاؤ کرے لیکن اگر فریقین میں ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہو تو مسلمان کو بلند جگہ پر بٹھائے یا مسلمان کو بٹھائے اور کافر کو کھڑا رکھے ہاں قاضی پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ قلبی طور سے دونوں کو برابر سمجھے۔ یہ تھا قاضی و جج سے متعلق فقہی حکم لیکن قضاوت و فیصلہ کے وقت:

واذا بَدَرَ احد الخصمين بالدعوىٰ سمع منه، وله ابتدرا راسَمعَ من الذى عن يمينِ صاحبه، واذا سكتا فليقل: ليتكلمِ المدّعى منكما أو تكلما ويَكرَهُ تخصيصَ أحدهما بالخطابِ[1]

اور جب فریقین میں سے ایک پہلے اپنا دعویٰ پیش کر دے تو قاضی اس کی بات سنے گا۔ اور اگر دونوں ایک ساتھ پیش کریں تو قاضی دائیں طرف والے کی بات پہلے سنے گا۔ اور اگر دونوں خاموش ہوں تو قاضی کہے گا کہ جو مدعی ہے وہ مدعا بیان کرے یا یہ کہے گا کہ تم دونوں بات کر سکتے ہو، قاضی کا کسی ایک کو مخاطب قرار دینا مکروہ ہے۔

مذکورہ عبارت شہید اول کتاب لمعہ سے ماخوذ ہے۔

مدعی و مدعا علیہ

مدعی کون ہے اور منکر کون ہے؟ شہید لکھتے ہیں: المدعى هو الّذى يترك لو تَرَكَ۔ والمنكرُ مقابِلُه مدعی وہ ہے کہ اگر وہ اپنا دعویٰ ختم کر دے تو قضیہ ہی ختم ہو جائے اور منکر اس کا مد مقابل ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر وہ چھوڑ دے تو چھوٹ جائے بلکہ وہ مدعی کا جواب دہ ہے۔ مدعا علیہ بھی تین حالتوں سے خالی نہیں ہے:

وجواب المدعى عليه اما اقرارٌ أو سكوتٌ[2]

منکر یا مدعی علیہ یا اس کو قبول کرے یا اسے رد کر دے یا خاموش ہو جائے۔ اور قاضی کے لیے ان تینوں کا حکم ایک ہے۔

---

[1] اللمعة الدمشقية، کتاب القضاء۔ [2] ایضاً

قضاوت کے دو معیار

کتاب وسائل الشیعہ کے ابواب کیفیت حکم واحکام دعویٰ کے تیسرا باب "البیّنة علی المدعی والیمین علی المدعا علیه" کے عنوان سے ہے اس میں اس طرح بیان ہوا ہے:

عن ابی عبدالله علیه السلام قال: قال رسول الله ﷺ البینةُ علی مَنِ ادّعیٰ والیمین علی من ادّعی علیه۔ [1]

امام صادقؑ سے منقول ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: دعویٰ کرنے والے بیّنہ اور دلیل پیش کرنا ہوگی اور منکر کو قسم کھانا پڑے گی۔

عن ابی بصیر عن ابی عبدالله علیه السلام قال: اِنّ الله حکم فی دمائکم بغیر ما حکم به فی اموالکم: حکم فی اموالکم انّ البینة علی المدعی والیمینَ علی المدعی علیه، وحکم فی دمائکم انّ البینة علی مِن ادُعیَ علیه والیمین علی من ادّعیٰ لِئلا یبطلَ دَمُ امرِئٌ مسلمٍ [2]

ابوبصیر نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: بیشک خدا نے تمہارے خون کے بارے میں حکم فرمایا ہے۔ یہ حکم تمہارے اموال کے حکم سے مختلف ہے اموال کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ دعویٰ کرنے والا دلیل وبیّنہ پیش کرے گا اور منکر قسم کھائے گا لیکن تمہارے خون کے بارے میں مدعا علیہ بیّنہ پیش کرے گا اور مدعی قسم کھائے گا تاکہ مسلمان کا خون رائیگاں نہ جائے۔

امام رضاؑ نے ایک سوال کے جواب میں اس کی وجہ اس طرح بیان فرمائی ہے:

عن الرضا فیما کُتِبَ الیه من جواب مسائله فی العلل فیما کُتِب الیه من جواب مسائله فی العلل: العلةُفی انّ البینةَ فی جمیع الحقوق علی المدّعی والیمینَ علی المدّعیٰ علیه ما خلا الدّمَ لَانَّ المدعیٰ علیه جاحدٌ ولا یمکِنُهُ اِقامةُ البینةِ علی الجحودِ لَانهُ مجهولٌ وصارتِ البینه فی الدم علی المدعی علیه والیمین علی المدعی لانه حوطٌ یحتاط به المسلمونَ لئلا یبطلَ دم امرئٌ مسلمٍ ولیکون ذالك

---

[1] ایضاً [2] وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۱۷۰۔۱۷۳

زاجراً و ناهیاً للقاتلِ لِشدةِ اقامة البینة علی الجحودِ علیه لانّ من یشهدُ علی انه لم یفعل قلیلُ [۱]

خون کے علاوہ تمام امور میں دعویٰ کرنے والے پر بیّنہ اور مدعا علیہ کے لیے قسم ہے اس کی علّت یہ ہے کہ منکر اپنے انکار پر بیّنہ قائم کرنے سے قاصر ہے کیونکہ معلوم نہیں ہے لیکن خون میں بیّنہ منکر کے لیے اور قسم دعویٰ کرنے والے کے لیے ہے اس لیے کہ یہ ایک احتیاط ہے جس سے مسلمان کا خون رائیگاں نہیں جائیگا دوسرے یہ بات قاتل کو جھنجھوڑنے والی ہے۔ منکر کے لیے بیّنہ قائم کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ ایسی گواہی دینے والے بہت کم ہیں کہ وہ قاتل نہیں ہے۔

ان روایات سے اسلام میں قضاوت کا معیار معین ہو گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ بیّنہ مدعیٰ کے لیے اور قسم منکر کے لیے ہے ہاں خون میں ایسا نہیں ہے کہ جس کا فلسفہ بیان ہو چکا ہے۔ امام زین العابدین نے رسالۃ الحقوق میں مدعی و مدعا علیہ کے فقہی حکم کے اخلاقی پہلو کو بیان فرمایا ہے۔

امام زین العابدین نے مدعی اور منکر کے اخلاقی پہلو کو بیان فرما دیا ہے اور ان کے لیے حق کو اس طرح روشن فرمایا ہے کہ جس مخالف نے تمہارے اوپر دعویٰ کیا ہے اس کا تم پر حق ہے کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچا ہے تو تم خود اپنے خلاف اور اس کے حق میں گواہی دو اور اس پر ظلم نہ کرو اور اس کا پورا پورا حق ادا کرو اور اگر اس کا دعویٰ صحیح نہیں ہے تو اس سے نرمی سے پیش آؤ اور اس سے سختی سے پیش نہ آؤ اس کے سلسلے میں خدا کو ناراض نہ کرو، اور جس پر تم نے دعویٰ کیا ہے اس کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس سے خوش اسلوبی سے گفتگو کرو اور اس کے حق کا انکار نہ کرو اور اگر اپنے دعوے میں تم سچے نہیں ہو تو خدا سے ڈرو! اور توبہ کرو اور دعوے سے دست کش ہو جاؤ۔

امام زین العابدین نے فریقین کو حقیقت کی طرف دعوت دی ہے اور ان کو ظلم و ستم کرنے سے منع کیا ہے اور انھیں ظالم ججوں کے پاس جانے سے منع فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ اور اسلامی قضا و فیصلہ سے متعلق ہیں اس کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔

۱۔ حمان

مشورہ لینے والے کا حق

وامّا حق المستشیر فان حَضَرَكَ له وجه رأی جهدت له فی النصیحة واشرت علیه بما تعلم انك لو کنت مکانه عملت به ذلك لیکن منك فی رحمةٍ ولین، فانّ اللین یؤنِسُ الوحشة وانّ الغلظ یو حشُ مؤضعَ الانسُ وان لم یحضركَ له رأی وعرفتَ له من تثِقُ برأیهِ و ترضیٰ به نفسِكَ دَللته علیه وارْشَدتهُ الیهِ، فکنت لم تاله خیراً ولم تدّخره نصحاً ولا حول ولاقوة اِلابالله۔

جو تم سے مشورہ لیتا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اگر اس کے کام کے بارے میں تمہارے پاس کوئی رائے ہے تو اس کی نصیحت و خیر خواہی کے لیے کوشش کرو اور تم جو کچھ جانتے ہو وہ اسے سمجھاؤ اور اس سے یہ کہو کہ اگر تم اس کی جگہ ہوتے تو اس پر عمل کرتے یہ اس لیے ہے تاکہ تمہاری طرف سے اس پر مہربانی ہو کیونکہ نرمی و مہربانی وحشت کو ختم کر دیتی ہے سختی وحشت پیدا کرتی ہے اور اگر تم اسے کوئی مشورہ نہیں دے سکتے لیکن تمہاری نظر میں کوئی ایسا آدمی ہو جس پر تمہیں اعتماد ہے اور اس سے مشورہ لینے کو پسند کرتے ہو تو اس کی طرف اس کی راہنمائی کردو اور اسے اس کا پتا بتا دو اس کے بارے میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور اس کو نصیحت کرنے میں دریغ نہ کرو، خدا کی پناہ کے علاوہ کوئی پناہ نہیں اور اس کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ امام زین العابدین یہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی سے مشورہ کرتا ہے اس کا مشیر پر ایک قسم کا حق ہو جاتا ہے اور وہ حق یہ ہے کہ اگر اس سلسلہ میں تمہاری کوئی صحیح رائے ہو تو اس کو پیش کرنے میں دریغ نہ کرو، بلکہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کردو اور اگر اس سلسلہ میں کوئی رائے نہ ہو لیکن ایسے آدمی کو پہچانتے ہو کہ جو مشورہ دے سکتا ہے تو اسے اس کے پاس پہنچادو تاکہ یہ اس کے صحیح مشورہ سے مستفید ہو۔

مشاورت اسلام کی نظر میں

اسلام میں اجتماعی اہم مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ مشورہ ہے یہ کاموں کے استحکام

و پائیداری کا سبب ہوتا ہے۔ مشورہ کے بغیر کوئی بھی کام ناقص ہوتا ہے، فکر و خیال کے لحاظ سے کوئی شخص کتنا ہی قوی ہو لیکن اس کی نظر مسائل کے ایک یا چند پہلوؤں ہی تک پہنچتی ہے اور اس کے دوسرے پہلو اس پر مخفی رہتے ہیں مگر جب وہ مسائل کمیٹی میں پیش ہوتے ہیں اور مختلف عقلیں، تجربہ اور نظریات ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں تو اس کے نقائص کم ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں مشورہ کی اتنی اہمیت ہے کہ اس سے قطع نظر کہ رسولؐ پر وحی نازل ہوتی تھی اور آپؐ کی فکر و نظر بہت قوی تھی اور آپ کو مشورہ کی ضرورت نہیں تھی لیکن ایک طرف مسلمانوں کو مشورہ کی اہمیت سے آگاہ کرنے اور دوسری طرف لوگوں میں غور و فکر کی استعداد بڑھانے کے لیے آپ مسلمانوں کے ان عام امور میں کہ جن میں خدا کے قوانین جاری ہونے کا پہلو تھا، نہ کہ قانون گذاری میں مشورہ لیتے تھے اور صاحبانِ نظر کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔

مشورہ کے نتائج

۱۔ جو لوگ اپنے اہم کام ایک دوسرے کے مشورہ اور اصلاح سے انجام دیتے ہیں ان سے کم لغزش ہوتی ہے اس کے برخلاف خودرائے اور استبداد پسند افراد خود کو دوسروں کی رائے و مشورہ سے بے نیاز سمجھتے ہیں ہر چند وہ بڑے دور اندیش ہوں لیکن یہ ان کی خام خیالی ہے، خودرائی انسان کی شخصیت کو لوگوں کے درمیان میں کچل دیتی ہے، اور اس کی بلند خیالی کو منجمد کر دیتی ہے، اس کی ابھرنے والی صلاحیتوں کو دبا دیتی ہے۔

۲۔ جو شخص کسی کام کی انجام دہی کے لیے دوسروں سے مشورہ کرتا ہے اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو لوگ اس سے کم حسد کرتے ہیں، کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو ہماری وجہ سے کامیابی ملی ہے اور جس کام کو انسان خود انجام دیتا ہے اس پر حسد نہیں کرتا ہے اور اگر اس میں ناکامی ہوتی ہے تو لوگ اسے ملامت نہیں کرتے ہیں کیونکہ کوئی اپنے کام کے نتیجہ پر اعتراض نہیں کرتا ہے بلکہ اس کی شکست و ناکامی پر لوگوں کو افسوس ہوگا۔

۳۔ مشورہ کا ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنے بارے میں یہ سمجھ لیتا ہے کہ کس کو اس سے محبت

ہے اور کس کو عداوت ہے اور اس سے اس کی کامیابی کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ شاید رسول بھی انھیں وجوہ کی بنا پر مشورہ لیتے تھے۔

مشورہ قرآن کی نظر میں

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظًا غليظ القلب لانفضوا من حولك فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم فى الامر فاذا عزمت فتوكل على الله ان الله يحب المتوكلين [۱]

خدا کے فضل سے آپؐ ان کے لیے نرم ہیں اگر تند مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے بنا بریں انھیں معاف کر دو اور ان کے لیے استغفار کرو لیکن جب ارادہ کر چکو تو پھر خدا پر بھروسہ کرو بیشک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

''فظ'' لغت میں اس شخص کے لیے استعمال ہوا ہے جو سخت و تند لہجہ میں بات کہتا ہے اور غلیظ القلب اس شخص کو کہتے ہیں جو سنگدل اور سخت ہوتا ہے اگر چہ یہ دونوں لفظ سختی و شدت کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ایک لہجہ میں سختی کے معنی میں زیادہ استعمال ہوتا ہے جبکہ دوسرا عمل میں سختی و شدت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے [۲]

رسولؐ پر یہ آیت جنگ احد میں نازل ہوئی تھی۔ یہ اس صفت کی عکاسی کرتی ہے جو قیامت کے لیے ضروری ہے اور وہ ہے ان لوگوں کو معاف کر دینا جنھوں نے روگردانی کی ہے اور بعد میں پشیمان ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ اگر رہبر و قائد تند مزاج ہو، درگذر نہ کرتا ہو تو اس کا منصوبہ عنقریب ناکام ہو جائیگا اور لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور وہ قیادت کے فرائض کو انجام نہیں دے سکے گا۔

اس آیت میں رسولؐ کو خدا کی طرف سے یہ ذمہ داری ملی ہے کہ ان سے مشورہ کیجیے "وشاورهم فى الامر" اگرچہ لفظ امر کے بہت وسیع معنی ہیں۔ تمام کاموں کو شامل ہیں لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ رسولؐ احکام خدا کے بارے میں کسی سے مشورہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان میں وحی کے تابع تھے۔ ہاں

۱۔ آل عمران: ۱۵۹ ۲۔ تفسیر نمونہ ج ۲ ص ۱۶۱

اس سلسلہ میں مشورہ کرتے تھے کہ خدا کے احکام کو کیسے نافذ کیا جائے۔ بعبارت دیگر قانون سازی میں رسولؐ کبھی کسی سے مشورہ نہیں کرتے تھے قانون کے اجزا کے طریقہ کار کے بارے میں مشورہ فرماتے تھے۔ مثلاً جنگ بدر میں لشکر اسلام رسولؐ کے فرمان کے مطابق ایک جگہ پڑاؤ ڈالنا چاہتا تھا کہ آپ کے ایک صحابی حباب بن مُنذر نے کہا: لشکر کے پڑاؤ ڈالنے کے لیے یہ جگہ آپ نے خدا کے فرمان کے تحت معیّن کی ہے یا اپنی صوابدید سے اس کا انتخاب کیا ہے؟ رسولؐ نے فرمایا اس انتخاب میں خدا کا کوئی خاص فرمان نہیں ہے۔ اس صحابی نے عرض کی: یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ رسولؐ نے بھی ان کی رائے کی تائید کی۔

دوسری آیت سورہ شوریٰ کی ہے:

والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوۃ وامرھم شوریٰ بینھم وممّا رزقناھم ینفقون [1]

اور جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کر لیا ہے اور نماز قائم کی ہے اور ان کا کام آپس کے مشورہ سے انجام پذیر ہوتا ہے اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ انفاق کرتے ہیں۔

لفظ شوریٰ اگر مصدر ہے اور مشاورت کے معنی میں ہے تو مذکورہ آیت میں لفظ ''ذو'' مقدر ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔ یا اس کو مبالغہ پر حمل کریں گے اور یہ تاکید ہوگا کیونکہ صفت کی جگہ مصدر کا ذکر کرنا انھیں معنی کو بیان کرتا ہے۔ لیکن اگر شوریٰ کے معنی وہ ہیں کہ جس کے بارے میں مشورہ کیا جاتا ہے جیسا کہ راغب نے لکھا ہے: "الامر الذی یتشاور فیہ" تو پھر مصدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس آیت میں خدا کی دعوت قبول کرنے اور نماز قائم کرنے کے بعد اجتماعی مسئلہ مشورہ بیان ہوا ہے کہ اس کے بغیر تمام کام ناقص ہیں۔ اسی آیت کی وجہ سے اس سورہ کو شوریٰ کہا جاتا ہے۔

مشاورت حدیث کی روشنی میں

مشورہ کے بارے میں ائمہ معصومین سے وارد ہونے والی روایات بہت ہیں اصل مشورہ کے

---

[1] شوریٰ : ۳۸

بارے میں رسولؐ کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ما شقی عبد قط بمشورة ولا سعد باستغناء رای[1]

مشورہ سے کوئی شخص بدبخت نہیں ہوا اور خود رائی سے کوئی خوشبخت نہیں ہوا۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

من استبد برائه هلك ومن شاور الرجال شاركها فی عقولهم[2]

جو شخص خود رائے ہوتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور جو بزرگوں سے مشورہ کرتا ہے وہ ان کی عقلوں میں شریک ہو جاتا ہے۔

اس روایت میں بھی رسولؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اذا كان اُمرائكم خياركم واغنياء كم واغنيائكم سمحائكم وامركم شورىٰ بينكم فظهرُ الارضِ خيرٌ لكم من بطنها، واذا كان اُمرائكم شِراركم واغنيائكم بُخلائكم ولم يكن أمركم شورىٰ بينكم فبطنُ الارضِ خيرٌ لكم من ظهرها[3]

جب تمہارے زمام دار و حاکم نیک و شریف اور تمہارے مال دار سخی افراد ہوں اور تمہارے کام مشورہ سے انجام پذیر ہوتے ہوں تو اس وقت روئے زمین تمہارے لئے زیرِ زمین سے بہتر ہے (یعنی تمہارا زندہ رہنا مناسب ہے) لیکن اگر تمہارے حاکم بدکار اور تمہارے مالدار افراد بخیل ہوں اور اپنے کاموں میں مشورہ کرنے سے پرہیز کرتے ہو اس صورت میں تمہارا مر جانا بہتر ہے۔

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا:

يا هشام، مجالسة اهل الدين شرف الدنيا والآخرةِ ومشاورةُ العاقل النّاصح يُمنٌ وبركةٌ ورُشدٌ وتوفيق من الله فإذا أشار عليكَ العاقل الناصح فإياكَ والخلافَ فإنَّ فی ذلك العطبُ[4]

اے ہشام دین داروں کی ہمنشینی دنیا و آخرت کا شرف ہے اور خیر خواہ آدمی سے مشورہ کرنا

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۲۰ ص ۴۶۱ [2] نہج البلاغہ (صبحی صالح) حکمت ۱۶۱

[3] تفسیر نمونہ ج ۳ ص ۱۴۵ [4] تحف العقول ص ۲۹۳

باعث خوش بختی اور رشد و برکت اور خدا کی توفیق کا سبب ہے پس جب تم خیر خواہ عاقل سے مشورہ کرو تو پھر اس کی مخالفت نہ کرو ورنہ زحمت میں مبتلا ہو گے۔

مشورہ کس سے کریں؟

کتاب وسائل الشیعہ کے ابواب احکام العشرہ کے اکیسویں بائیسویں باب میں یہ بیان ہوا ہے کہ ہم کس سے مشورہ کریں؟ اس سلسلہ کی چند روایتیں درج ذیل ہیں:

عن جعفر بن محمد عن ابیہؑ قال: قیل یا رسول اللّٰہ، ما الحزمُ؟ قال مشاورۃُ ذوی الرائی و اتباعُھم[1]

امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسولؐ سے دریافت کیا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! حزم کیا ہے؟ فرمایا: صاحبان رائے سے مشورہ کرنا اور اُن کی پیروی کرنا۔

عن ابی عبداللّٰہ، قال فیما اوصی بہ رسول اللّٰہ علیاً قال لا مظاھرۃ أوثق من المشاورۃِ ولا عقل کالتّدبیر[2]

امام صادقؑ فرماتے ہیں: رسولؐ نے حضرت علیؑ کو جو وصیتیں کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مشورہ سے زیادہ قابل اعتماد کوئی پشت پناہ نہیں ہے اور امور کے بارے میں تأمل کرنے جیسا کوئی غور و فکر نہیں ہے۔

امام باقرؑ فرماتے ہیں: توریت میں چار سطریں مرقوم ہیں ان میں سے پہلی یہ ہے:

من لا یَستَشرِمُ یندم[3] جو مشورہ نہیں کرے گا وہ پشیمان ہوگا۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: لا ظھیر کالمشاورۃ[4] مشورہ جیسا کوئی پشت پناہ نہیں ہے۔

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں: اِستَشِرْ فی امرِکَ الّذین یخشون ربھم[5]

اپنے امور میں ان لوگوں سے مشورہ کرنا جو خدا سے ڈرتے ہیں۔

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: اِستَشِرِ العاقل من الرجال فانہ لا یامر الا بخیر و ایاک

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۸ ص ۴۲۴۔۴۲۷ [2] ایضا [3] ایضا [4] ایضا [5] ایضا

والخلاف فان مخالفة الورع العاقل مفسدة فی الدین والدنیا [1]

مردوں میں سے صاحب عقل سے مشورہ کرو کہ وہ تمہیں نیک مشورہ دے گا خبردار صاحب ورع عقلمند کی بات کی مخالفت نہ کرنا کیونکہ صاحب ورع عاقل کی مخالفت کرنے سے انسان کا دین بھی برباد ہو جاتا اور دنیا بھی۔

امام صادقؑ ہی فرماتے ہیں: ان المشورة لا تکون الاّ بحدودها و الاّ کانت مضرتها علی المستشیر اکثر من منفعتها له :فاولها ان یکون الذی تشاره عاقلاً ، والثانیة ان یکون حراً متدیناً، والثالثة ان یکون صدیقاً مؤاخیاً، والرابعة ان تطلعه علی سرّك فیکون علمه به کعلمك بنفسك.

مشورہ کے کچھ حدود ہوتے ہیں انہیں کے مطابق مشورہ کرنا چاہئے ورنہ مشورہ لینے والے کو اس کے فائدے سے زیادہ نقصان ہوگا۔ ۱۔صاحب عقل ہو ۲۔آزاد دین دار ہو۔ ۳۔دوست اور بھائی ہو۔ ۴۔اسے ایسا ہونا چاہئے کہ اگر اسے تم اپنا راز بتادو تو وہ اسے اسی طرح چھپائے جس طرح تم چھپاتے ہو۔

اِن سے مشورہ نہ کرو

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر ایک سے مشورہ نہیں لیا جاسکتا۔ یہ بات تو ہمیں پہلے ہی معلوم ہو چکی ہے کہ صحیح و استوار رائے کے حامل کون لوگ ہیں، انہیں سے مشورہ کرنا چاہئے، خدا سے ڈرنے والے عقلمند، امانت دار اور سچے انسان سے مشورہ کرنا چاہئے کہ یہ خیر خواہ انسان ہیں۔ لیکن بعض افراد سے مشورہ کرنا بدبختی و ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ نے ان لوگوں کی نشاندھی فرمائی ہے جن سے مشورہ نہیں کرنا چاہئے یہ بات آپؑ نے مالک اشتر کو لکھے گئے مکتوب میں تحریر فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ لاتدخلن فی مشورتکم بخیلا یعدل بك عن الفضل و یعدك الفقر۔

خبردار بخیل و کنجوسوں سے مشورہ نہ کرنا کہ وہ تمہیں سخاوت سے روک دیں گے اور ناداری سے

ڈرائیں گے۔

۲۔ولاجباناًیضعفك عن الامور

اور نہ بزدل افراد سے مشورہ کرنا کہ وہ تمہیں اہم کام سے باز رکھیں گے۔

۳۔ولاحریصاً یزین لك الشرة بالجور [1]

اور نہ حریص سے مشورہ کرنا کہ وہ مال جمع کرنے یا منصب پانے کیلئے، تمہاری نظر میں ظلم کو اچھا بنادے گا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ مشورہ، انسان کو صحیح راستہ دکھانا اور اس منزل تک پہنچنے میں اس کی مدد کرنا ہے بخل و بزدلی اور حرص ایسے پست صفات کے حامل افراد سے کبھی بھی مشورہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ نہ صرف یہ کہ مشورہ لینے والے کی کوئی مدد نہیں کریں گے بلکہ اسے معرضِ ہلاکت و نابودی سے قریب کردیں گے۔ اس حق کے سلسلہ میں امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: مشورہ لینے والے کا تم پر یہ حق ہے کہ اسے صحیح رائے دو اور اگر صحیح رائے نہیں رکھتے تو اسے کسی صاحب رائے کا پتا بتادو کیونکہ مشورہ کا مقصد حقیقت تک پہنچنا ہے۔

چونکہ یہ بحث مشورہ اور مشاورے سے متعلق ہے لہٰذا آخر میں ہم اس چھ رکنی کمیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو صدرِ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کے لئے بنی تھی۔

صدرِ اسلام میں چھ رکنی کمیٹی

اہل سنت کے تمام مفسرین اور صاحبانِ علم جب سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ پر پہنچتے ہیں تو اس کی ایسی تفسیر کرتے ہیں کہ جس سے یہ آیت چھ رکنی کمیٹی پر منطبق ہوجائے۔ یہاں پر یہ بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حق اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور درج ذیل دلیلوں کی رو سے یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

۱۔ جانشین رسولؐ اور امام کا انتخاب خدا کی طرف سے ہوگا جیسا کہ کلام کی کتابوں میں اسکی وضاحت کردی گئی ہے۔ کیونکہ امام کو بھی نبی کی طرح عصمت وعلم ایسے صفات کا حامل ہونا چاہئے اور اس

---

[1] نہج البلاغہ (فیض) نامہ ۵۳

کے علم وعصمت کی خبر خدا ہی کو ہے۔ جس طرح مشورہ سے کسی نبی کا انتخاب نہیں کیا جاسکتا اسی طرح امام کا انتخاب بھی مشورہ سے نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ چھ رکنی کمیٹی، مشورہ کے معیار پر کسی طرح بھی پوری نہیں اترتی۔ کیونکہ مشورہ سے مراد اگر تمام مسلمانوں کا مشورہ ہے تو چھ رکنی کمیٹی ہی کو کیوں مخصوص کیا گیا؟ اور اگر امت کے مفکرین اور صاحبان حل وعقد سے مشورہ مراد ہے تو مفکرین چھ افراد ہی نہیں تھے بلکہ وہ مسلمان، جو رسولؐ کے مشیر تھے، ابوذر، مقداد اور ابن عباس ایسے افراد بھی موجود تھے جن کو اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بنابرین ان چھ افراد کی کمیٹی بنانا ایک سیاسی گروہ بنانا ہے یہ مجلس مشاورت ہی کی مانند ہے۔ اور اگر مشورہ کیلئے صاحب نفوذ افراد کا انتخاب مراد ہے تا کہ دوسرے لوگ ان کی بات مان لیں تو انصار کے رئیس سعد بن عبادہ، ابوذر غفاری، بنی غفار کے رئیس ایسے لوگ موجود تھے اور ان کو اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

۳۔ ہم جانتے ہیں کہ اس مشورہ کیلئے سخت وسنگین شرائط رکھے گئے تھے اور مخالفت کرنے والوں کو موت کی دھمکی دی گئی تھی، حالانکہ اسلام کے مشورتی نظام میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔[1]

شوریٰ کے نام پر انہوں نے اسلام کے نظام کو اس کے حقیقی محور سے ہٹا دیا اور لوگوں کو گمراہی میں ڈھکیل دیا، امام علی نقی نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

جو شخص مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی اور امت کا حق غصب کرنے کیلئے ان سے مشورہ کے بغیر حاکم بن جائے تو اس کو قتل کردو بیشک خدا نے اس کی اجازت دی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۳ ص ۱۴۷۔۱۴۸

مشاور کا حق

واماّ حق المشير عليك فلا تتهمه فيما لا يوافقك عليه من رايه اذا اشارَ عليك فانما هى الآراء و تصرف الناس فيها واختلافهم ، فكن عليه فى رايه بالخيار اذا اتهمت رايه، فاما تهمته فلا يجوز لك اذا كان عندك ممن يستحق المشاورة، ولا تدع شكره على ما بدالك من اشخاص رايه و حسن وجه مشورته، فاذا وافقك حمدت الله و قبلت ذلك من اخيك بالشكروالارصاد بالمكافاة فى مثلها ان فزع اليك، ولاقوة الا بالله۔

لیکن جو تمہارا مشیر ہے اور تمہیں مشورہ دیتا ہے اس کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ اگر اس کی رائے تمہارے موافق نہ ہو تو تم اسے متہم نہ کرو، کیونکہ نظریات اور رایوں کے لحاظ سے لوگ مختلف ہوتے ہیں پھر اگر اس کی رائے میں تمہیں کوئی خرابی نظر آئے تو تمہیں اختیار ہے لیکن اسے متہم کرنا جائز نہیں ہے خصوصاً جب تمہارے نزدیک اس میں مشورت کے شرائط پائے جاتے ہوں۔ اور اگر وہ تمہیں نیک مشورہ دے تو اس کے شکریہ اور خدا کی حمد وثناء کو فراموش نہ کرو اور اس انتظار میں رہو کہ اگر وہ کبھی تم سے مشورہ کرے تو تم اسے اسکی جزاء ایسی ہی دو۔ خدا کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

مشیر کے حق میں امام زین العابدینؑ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اس کا مشورہ تمہارے لحاظ سے صحیح نہیں ہے تو اسے متہم نہ کرو اور اگر اس کا مشورہ تمہارے موافق ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرو۔

مشیر کی امانت وصداقت

مشیر کے صفات کو ہم روایات کی روشنی میں بیان کر چکے ہیں اور مشیر و مستشیر کی وضاحت بھی کر چکے ہیں۔ وسائل الشیعہ کے، ابواب احکام العشرہ میں ایک باب "باب وجوب نصح المستشیر" ہے اس کی پہلی روایت یہ ہے:

عن ابى عبد الله قال: اتى رجل امير المومنين عليه السلام ،فقال له:

جئتك مستشيراً، ان الحسن والحسين و عبدالله بن جعفر خطبوا الى۔ فقال امیرالمومنین علیه السلام: المستشار مؤتمن [1]

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: ایک شخص امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: میں اسلئے حاضر ہوا کہ آپؑ سے حسن وحسین اور عبداللہ بن جعفر کی شادی کے بارے میں مشورہ کروں۔ آپؑ نے فرمایا: جس کو تم مشورہ کے لئے منتخب کرو اسے امین ہونا چاہئے اور اسے وہی بیان کرنا چاہئے جو اس کی نظر میں حق ہو۔ اس کے بعد آپؑ نے اپنا نظریہ بیان کیا۔ آپؑ ہی کا ارشاد ہے:

عن ابی عبدالله علیه السلام قال من الستشار اخاه فلم ينصحهُ محض الرَّأی سلبهُ اللهُ عزّوجلّ رَأيهُ [2]

جس شخص نے اپنے بھائی سے مشورہ کیا اور مشیر نے وہ چیز بیان نہ کی جو اس نے درحقیقت سمجھی تھی تو خداوندعالم اس سے رائے صواب کو چھین لے گا۔

ان دو روایتوں میں دو اہم مطلب بیان ہوئے ہیں، پہلی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے اسے امین ہونا چاہئے اور امین آدمی کبھی خیانت نہیں کرتا ہے۔ لہٰذا مشورہ لینے والے کو بدگمانی کے سبب اس پر تہمت نہیں لگانا چاہئے۔ اسی چیز کو امام زین العابدینؑ نے ایک حق کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ دوسری روایت کا لب لباب یہ ہے: مشیر کو وہی چیز بیان کرنا چاہئے جس کو اپنے اور خدا کے درمیان طے کرتا ہے اور اگر اس کو بیان کرنے میں دریغ کرتا ہے تو خدا اس سے نیک مشورہ اور رائے صواب کی صلاحیت کو سلب کر لے گا۔ کیونکہ اس نے اس نعمت کا شکریہ ادا نہیں کیا ہے۔

ماتحت افراد سے مشورہ کرنا

مشاورت کے بارے میں ایک دلچسپ موضوع یہ ہے کہ انسان اپنے سے کم رتبہ افراد سے بھی مشورہ کرے، ضروری نہیں ہے کہ مشیر بہت بلند مرتبہ ہو، اس موضوع سے متعلق وسائل الشیعہ میں ایک باب اس عنوان باب جواز مشاورة الانسان من دونه سے قائم کیا گیا ہے اس باب کی دوسری

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۸ ص ۴۲۷ [2] ایضاً

حدیث یہ ہے:

عن الفضل بن يسار، قال: استشارني ابو عبدالله عليه السلام مرة في أمرٍ، فقلت: أصلَحَكَ اللهُ مِثلي يُشيرُ على مَثلِكَ؟ قالَ: نعم اذا استَشَرتُكَ [۱]

فضل بن یسار کہتے ہیں: امام صادقؑ نے ایک مرتبہ کسی موضوع کے سلسلہ میں مشورہ فرمایا، میں نے عرض کی: خدا آپ کا بھلا کرے کیا مجھ جیسا آپؑ ایسے عظیم المرتبت کو مشورہ دے سکتا ہے؟! فرمایا: ہاں جب میں تم سے مشورہ کروں (تو کیوں نہیں)

اس باب کی تیسری روایت میں بیان ہوا ہے:

عن الحسن بن جهم قال: كنّا عند ابي الحسن الرضاً فذكر اباهٌ فقال: كان عقله لا توازنُ به العقول، وربما شاور الأسود من سودانهِ فقيل له: تشاورُ مثل هذا؟ فقال إنّ اللّه تبارك وتعالى ربما فتح على لسانه. قال: فكانوا ربما اشاروا عليه بالشيء فيعملُ به من الضيعةِ والبستانِ. [۲]

حسن بن جہم کہتے ہیں: ہم امام رضاؑ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپؑ نے اپنے والد بزرگوار کا ذکر کیا اور فرمایا: آپؑ کی عقل ایسی تھی کہ اس زمانہ کے لوگوں میں سے ایسی کسی کی عقل نہیں تھی پھر بھی آپ کبھی کبھی اپنے کالے غلام سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ آپؑ سے کہا گیا: آپؑ اپنے کالے غلام سے بھی مشورہ کرتے ہیں؟! فرمایا: ہوسکتا ہے خدا اسی کی زبان پر حقیقت کو جاری کردے آپؑ اکثر باغ و بستان کے بارے میں انہیں کے مشورہ پر عمل کرتے تھے۔

مشیر کے بارے میں حضرت علیؑ کا نظریہ

عن امير المومنين عليه السلام انّهُ قال لعبدالله بن عباس وقد اشار عليه في شيءٍ لم يوافق رَأيهُ: عليكَ أن تُشيرَ عليَّ فإذا خالَفتُكَ فأطِعنِي نہج البلاغہ میں سیّد رضی نے حضرت علیؑ سے روایت کی ہے جب عبداللہ بن عباس نے کسی چیز کے بارے میں آپؑ سے مشورہ کیا

---

[۱] محاسن ص ۴۲۸ [۲] محاسن ص ۴۲۸

اوراس کے بارے میں آپ کا مشورہ موافق نہ پایا تو آپ نے فرمایا: تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم مجھ سے مشورہ لو پھر اگر میں تمہاری مخالفت کروں تو تم میری اطاعت کرو۔

یہ جملہ بھی امام زین العابدینؑ کے بیان کے مطابق ہے:

عن علی بن مهزیار قال: کتب الیّ ابو جعفر آن سَل فلاناً ان یشیر علیّ وَ یتخیر لنفسه فهو اعلم بما یجوز فی بلده وکیف یُعامل السلاطین، فاِن المشورةَ مبارکةٌ قال اللّٰه لنبیه فی محکم کتابه: ((وشاورهُم فی الامرِ فاِذا عزمتَ فتوکل علی الله))، فان کان ما یقولُ مِمّا یجوز کتبتُ أصوب رَأیِه، واِن کان غیر ذلك رجَوتُ أن اضعهُ علی الطریقِ الواضح اِن شاءَ اللّٰهُ، ((وشاورهم فی الامر)) قال: یعنی الاستخارة ؎۱

علی بن مہزیار کہتے ہیں: حضرت امام محمد باقرؑ نے مجھے ایک خط لکھا کہ فلاں شخص سے درخواست کرو کہ تمہیں مشورہ دے پھر وہ جو مشورہ دے اس پر عمل کرو کیونکہ وہ اپنے شہر کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور یہ جانتا ہے کہ حکام سے کیسے روابط رکھے جائیں۔ چونکہ مشورہ کرنا اچھی بات ہے لہذا خدا نے قرآن مجید میں اپنے رسولؐ سے فرمایا ہے: بعض امور میں لوگوں سے مشورہ کیجئے اور جب آپؐ ارادہ کر چکے تو خدا پر توکل کیجیے پھر اگر اس کی بات صحیح ہوتی ہے تو میں اس کی صحیح وصائب رائے سے استفادہ کرتا ہوں اور اگر صحیح نہیں ہوتی تو مجھے یہ امید ہوتی ہے کہ میں اسے انشاء اللہ صحیح راستہ پر لگا دونگا۔ ان سے امور کے سلسلہ میں مشورہ کیجئے یعنی اس کے بارے میں طلبِ خیر کیجئے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: مشاورت جیسا کوئی مددگار و پشت پناہ نہیں ہے۔ ؎۲

؎۱ عمان ؎۲ بحار الانوار ج ۷۵ ص ۱۰۴

نصیحت طلب کرنے والے کا حق

اماّ حق المستنصح فاِنّ حقه ان تُؤدّی الیه النصیحَةَ علی الحق الّذی تریٰ له اَنّه یحملُ تخرجَ المخرجَ الّذی یلین علی مسامِعِه وتُکلّمه من الکلامِ بِما یطیقه عقله، فاِنّ لکُلِ عقلٍ طبَقَة من الکلام یعرفُهُ ویجتنِبُهُ، ولیَکن مذهبُكَ الرّحمة، ولاقوّةَ اِلّا باللّٰهِ

جوتم سے نصیحت چاہتا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اسے اتنی نصیحت کرو جتنا اس کا استحقاق ہے اور جتنی کو وہ برداشت کرسکتا ہے اور اس انداز میں نصیحت کرو کہ اس کے کان کو بھلی لگے، اس سے اسکی عقل کے مطابق بات کرو کیونکہ ہر عقل کے لئے ایک مخصوص انداز سخن ہوتا ہے وہ اسی کو سمجھتی ہے اور تمہارا انداز و چلن نرم ہونا چاہئے۔

امام زین العابدین کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ نصیحت طلب کرنے والے کا تم پر یہ حق ہے کہ اسے اس کے ظرف وتحمل کے مطابق نصیحت کرو اور اس سے اس طرح گفتگو کرو کہ جس سے وہ اسے قبول کرے اور نصیحت کرنے میں نرمی ومہربانی کو اپنا معیار بناؤ۔

''نصح'' بروزن فلس، یعنی خالص ہونا یا خالص کرنا، نَصَحُ العسل یعنی اس نے شہد کو صاف اور خالص کیا۔ نہایہ میں ابن اثیر نے لکھا ہے: لغت میں نصح کے معنی خلوص اور نُصح کے معنی اخلاص ہیں۔ قرب الموارد میں تحریر ہے۔ نَصَحَه، نصحاً یعنی اس نے اسے نصیحت کی نصیحت کرنے کو اس لئے نصح کہتے ہیں کہ یہ خلوص نیت اور خیر خواہی کے ساتھ ہوتی ہے۔ [1]

اسلام میں جن موضوعات کو اہمیت دی گئی ہے ان میں سے ایک دوسرے کو نصیحت کرنا بھی ہے۔ قرآن مجید انبیاء کو معاشرہ کا ناصح اور اس کا خیر خواہ قرار دیتا ہے۔ اور سورۃ اعراف میں تبلیغ میں انبیاء کی منطق کو نصیحت وخیر خواہی کی منطق قرار دیتا ہے۔ نمونے کے بطور چند آیتیں ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] قاموس قرآن ج ۷ ص ۷۱

انبیاء معاشرہ کے ناصح

حضرت نوحؑ اپنی قوم سے فرماتے ہیں:

أبلغكم رسالات ربی و انصح لكم واعلمُ من الله ما لا تعلمون ۱

میں تو تمہیں خدا کی رسالت اور اس کا پیغام پہنچا رہا ہوں، اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور خدا کی طرف سے جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

حضرت صالح کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

فتولّیٰ عنهم و قال یا قوم لقد ابلغتكم رسالاتِ ربّی ونصحت لكم ولكن لا تحبونَ الناصحينَ ۲

پس صالح نے ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور فرمایا: میری قوم والو! میں تو تم تک اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور خیر خواہی کی شرط کو پورا کر رہا ہوں لیکن تم ہو کہ خیر خواہ اور نصیحت کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔

حضرت شعیب کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

فتولّیٰ عنهم و قال یا قوم لقد ابلغتكم رسالاتِ ربّی ونصحت لكم فكيف آسی علی قومٍ كافرين ۳

پھر انہوں نے ان سے رخ پھیر لیا اور فرمایا: میری قوم والو! میں تو تم تک اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمہیں نصیحت کر دی ہے (یا تمہاری خیر خواہی کی ہے) لیکن تم لوگ نصیحت کرنے والوں یا خیر خواہوں کو دوست نہیں رکھتے ہو۔

خدا کے تمام انبیاء کا مقصد لوگوں کو نصیحت کرنا اور ان کی خیر خواہی تھی اور انسان فطری طور پر خیر خواہی و نصیحت کو قبول کرتا ہے لیکن جن لوگوں نے توحید کی پاک فطرت کو گنوا دیا ہے وہ خدا کے انبیاء کی نصیحت پر کان نہیں دھرتے تھے اور عذاب میں مبتلا ہوتے تھے۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ شیطان نے بھی نصیحت ہی کے حربہ کو استعمال کیا اور آدم کو بہکا دیا

---

۱ اعراف: ۶۲ ۲ اعراف: ۷۹ ۳ اعراف: ۹۳

چنانچہ سورہ اعراف میں ہے:

وقاسمهما انّی لمن الناصحین [1]

اور اس نے دونوں سے قاسم کھائی کہ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کو گمراہ کرنے کیلئے کبھی شیطان بھی خیر خواہ کے لباس میں آتا ہے جیسا کہ آدم و حوا کے کیلئے کیا ہے۔

جس طرح انبیاء کو قرآن میں انسانوں کا خیر خواہ و ناصح قرار دیا گیا ہے اسی طرح ائمہ کی روایات میں مومنوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور نصیحت کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔

مومنین ایک دوسرے کے خیر خواہ

اصول کافی میں ''نصحة المومن'' کے عنوان سے ایک باب قائم ہوا ہے۔

عن ابی عبد اللّٰہ قال: یجب للمومن علیٰ المومن ان یناصحه [2]

امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: مومن پر واجب ہے کہ دوسرے مومن کو نصیحت کرے۔ علامہ مجلسی نے کتاب ''مرآۃ العقول'' میں تحریر کیا ہے کہ نصیحت سے مراد دینی و دنیوی فوائد کی طرف راہنمائی کرنا۔ اور غافل و جاہل لوگوں کو تنبیہ و تعلیم دینا ہے کہ ضرر و نقصان کو اس سے برطرف کیا جا سکے اور اگر وہ قبول نہ کرے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے طور پر انہیں نصیحت کرے۔

رسولؐ فرماتے ہیں: تم میں سے ہر ایک کو چاہئے کہ اپنے بھائی کو نصیحت کرے اور اس کیلئے ایسے ہی خیر خواہ بنو جیسے اپنے نفس کیلئے خیر و خواہ ہو۔ [3]

اس روایت کا مضمون تمام افراد سے مربوط ہے، مختلف پہلوؤں سے نصیحت کرے۔

نصیحت کرنے والا بہترین شخص

عن ابی عبد اللّٰہ علیہ السلام قال: قال رسول اللّٰہؐ: انّ اعظم النّاس

---

[1] اعراف: ۲۱ [2] اصول کافی ج ۲ ص ۲۰۸ [3] اصول کافی ج ۲ ص ۲۰۸

منزلةً عند الله یومَ القیامةِ امشاھُم فی ارضِهِ بالنّصیحَةِ لِخلقِهِ [1]

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا: خدا کے نزدیک اور روزِ قیامت ان لوگوں کی بڑی منزلت ہوگی جو روئے زمین پر نصیحت کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

اس حدیث میں وارد لفظ "مشی" ممکن ہے اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہو تو اس لحاظ سے یہ معنی ہونگے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کرنے کیلئے قدم اٹھاتے ہیں اور ممکن ہے معاشرہ کے امور کو زیادہ اہمیت دینا مراد ہو۔

عن سفیان ابن عیینة قال: سمعت ابا عبدالله یقول: علیکم بالنصح لله فی خلقه فلن تلقاه بعمل افضل منه [2]

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں: میں نے امام صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا! تمہارے اوپر خدا کیلئے ضروری ہے کہ اس کی مخلوق کو نصیحت کرو تم نصیحت سے بلند عمل ہرگز نہ پاؤ گے۔

ان روایات میں اہم موضوع یہ بیان ہوا ہے کہ راہِ خدا میں خلوص کے ساتھ نصیحت کرو لیکن اگر خدانخواستہ تم نے یہ عمل شیطانی مقاصد یا مادی اغراض کیلئے انجام دیا تو تم کو محرومیت کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔

رسولؐ نے منا کی سرزمین پر جو خطبہ دیا تھا اس میں اس موضوع کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

قال رسول الله ثلاث لا یَغُلُّ علیهن قلب امرء مسلم: اخلاص العمل لله و النصیحة لائمة المسلمین واللزوم لجماعتهم [3]

رسولؐ نے فرمایا: تین چیزوں کے بارے میں مسلمان کے قلب کو خیانت نہیں کرنا چاہئے۔ ۱۔ خدا کیلئے اخلاص عمل میں۔ ۲۔ مسلمانوں کے پیشواؤں کو نصیحت کرنے میں۔ ۳۔ ان کی نماز جمعہ میں شریک ہونے میں۔

اس حدیث میں رسولؐ نے عمل کو خدا کیلئے قرار دیا ہے اور نصیحت کا تعلق معاشرہ کے عام لوگوں ہی سے نہیں ہے بلکہ کبھی معاشرہ کے زمامدار و حکام بھی نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں، یہ موضوع اس سے

---

[1] ایمان [2] ایضا [3] ایضا

پہلے امام وماسوم والی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔

نصیحت کا طریقہ

مذکورہ روایات کے مطالعہ سے ہماری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ خدا کیلئے نصیحت کرنا چاہئے، تاکہ مد مقابل کے دل پر اس کا اثر ہو۔ اسی طرح نصیحت کو مد مقابل کے فہم و شعور کے مطابق ہونا چاہیے ہم ہر شخص کو ہر قسم کی نصیحت نہیں کر سکتے بلکہ ہم کو نصیحت کا معیار اور مقدار معلوم ہونی چاہئے اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ کون سی بات نصیحت ہے اور مد مقابل کو کس انداز سے کی جائے۔

عن السجاد علیه السلام قال: لیس لك ان تتكلم بما شئت لان رسول الله صلی الله علیه وآله قال: رحم الله عبدا قال خیرا فغنم او صمت فسلم[1]

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: تمہیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ جو چاہے کہو اس لئے کہ رسولؐ نے فرمایا ہے: خدا رحم کرے اس بندہ پر جو اچھی بات کہتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے یا خاموش رہتا ہے اور محفوظ رہتا ہے۔

عن علی علیه السلام قال: ایاك و الكلام فیما لا تعرف طریقته ولا تعلم حقیقته فان قولك یدل علی عقلك و عبارتك تنبیء عن معرفتك[2]

حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا: اس چیز کے بارے میں لب کشائی نہ کرو کہ جس کا تمہیں علم نہ ہو اور جس کی حقیقت سے تم واقف نہ ہو کیونکہ تمہاری بات تمہاری عقل پر دلالت کرتی ہے اور تمہاری عبارت تمہاری معرفت و آگاہی کی خبر دیتی ہے۔

نصیحت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سننے والا اس سے نہ اکتائے بلکہ ہمہ تن گوش ہو کر سنے حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

عن علی علیه السلام قال: احسنُ الكلام ما لا تمجه الآذان ولا یتعب فهمه الأفهام.

---

۱ سخن و سخنوری ص ۲۴۳ ۲ شرح غرر و درر ج ۲ ص ۳۲۰

بہترین کلام وہ ہے جو کانوں پر گراں نہ گزرے اور اس کو سمجھنے میں فہم و شعور کو زحمت نہ ہو۔

امام زین العابدینؑ نے اسی چیز کو نصیحت طلب کرنے والے کیلئے ایک حق کے عنوان سے بیان فرمایا ہے: نصیحت اس کے کان کیلئے نرم ہو کہ جس کو وہ آرام سے سن سکے اور اس انداز سے بات کہی جائے کہ جس کو اس کی عقل قبول کرلے۔ رسولؐ فرماتے ہیں: ہم انبیاء اس لئے بھیجے گئے ہیں تاکہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں۔

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: "ولیکن مذهبکم الرحمة" محبت و مہربانی کے ساتھ نصیحت کرو دہشت و دھمکی کے ساتھ نہیں کیونکہ اس سے اس کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اور جس نصیحت کا کوئی اثر نہ ہو وہ بے فائدہ ہے۔ اس بحث کے آخر میں ہم اس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی درخواست منصور دوانیقی نے امام صادقؑ سے کی تھی۔

منصور دوانیقی نے امام صادقؑ کو اپنے دربار میں بلانے اور آپؑ کی آمد کو اپنی حقانیت کی دلیل بنانے کیلئے امام صادقؑ کے پاس یہ پیغام بھیجا: آپ ہمارے دربار میں اس طرح کیوں آمد و رفت نہیں فرماتے جس طرح تمام لوگ ہمارے یہاں آتے جاتے ہیں؟ منصور دوانیقی نے یہ سوچا تھا کہ امام اس کی اس بات سے رعب میں آجائیں گے۔ لیکن امام صادقؑ نے فرمایا:

ما عندنا من الدنیا ما نخافك علیه و لا عندك من الاخرة ما نرجوك له.

منصور! ہمارے پاس دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم تجھ سے ڈریں اور تمہارے پاس آخرت کیلئے کچھ نہیں ہے کہ جس کی امید کریں۔ بتاؤ ہم تمہارے پاس کس لئے آئیں؟

یہ بات منصور کو بہت ناگوار معلوم ہوئی لیکن ازروئے سیاست دوبارہ اس طرح لکھا: آپ نصیحت کرنے کیلئے ہمارے دربار میں تشریف لائیں تاکہ ہم آپ کی نصیحت سے مستفید ہوں۔ امام نے جواب دیا۔

من اراد الدنیا فلا ینصحك و من اراد الآخرة فلا یصحبك [1]

اے منصور جو دنیا اور اس کی نعمتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ تمہیں نصیحت نہیں کرے گا اور جو آخرت کا مشتاق ہے وہ تمہاری صحبت اختیار نہیں کرے گا۔ کیونکہ تمہاری صحبت سے اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

---

[1] شرح غرر و درر ج ۵ ص ۵۱

نصیحت کرنے والے کا حق

اَمّا حق الناصح فان تلین له جناحك ثم تُشْرِئبَّ له قلبك و تفتح له سمعك حتی تفهم عنه نصیحته ، ثم تنظر فیها، فان کان و فق فیها للصواب حمدت الله علی ذلك و قبلت منه و عرفت له نصیحته ، وان لم یکن وفق لها فیها رحمته ولم تتهمه و علمت انه لم یألك نصحا الا انه اخطأ، اِلا ان یکون عندك مستحقا للتُّهمة فلا تعبأ بشیء من امره علی کل حال، ولا قوة الا باللهِ

نصیحت کرنے والے کا حق یہ ہے کہ اس سے نرمی وخاکساری کے ساتھ پیش آؤ قلبی طور پر اس کی طرف جھک جاؤ اور اس کی طرف کان لگاؤ تا کہ اس کی بات کو سمجھ جاؤ، پھر اس کی نصیحت کے بارے میں غور کرو اگر اس کی بات صحیح ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرو اور اس کو قبول کرلو اور اس کی نصیحت کی قدر کرو اور اگر اس کی بات صحیح نہیں ہے تو اس پر مہربان رہو اور اس کو متہم نہ کرو، تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے تمہاری خیر خواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی ۔ ہے ہاں اس سے غلطی ہوئی ہے، اگر وہ تمہارے نزدیک تہمت کا مستحق ہو تو پھر کسی بھی حال میں اس کی کسی بات پر اعتماد نہ کرو، خدا کی عنایت وقدرت کے علاوہ کوئی طاقت وقدرت نہیں ہے۔

امام زین العابدینؑ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو نصیحت کرنے والے کے ساتھ خاکساری سے پیش آنا چاہئے، اس کی نصیحت پر کان دھرنا چاہئے، اس کی نصیحت کے بارے میں غور کرنا چاہئے اگر اس نے صحیح بات کہی ہے تو اس پر خدا کا شکر ادا کرے اور اس کی قدر کرے اور اگر صحیح نہیں کہی ہے تو اسے متہم نہیں کرنا چاہئے، اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا ارادہ نیک تھا لیکن اس سے اشتباہ ہو گیا ہے اور شک واشتباہ پر سزا نہیں دی جاتی۔

نصیحت لینے والے کے حق میں ہم نے ان آیات وروایات کی طرف اشارہ کیا ہے جو امام زین العابدین کے بیان سے ہم آہنگ تھیں۔ اب نصیحت کرنے والے کے حق سے ہم آہنگ امیر المومنین کی احادیث کو غرر الحکم سے نقل کرتے ہیں:

ليكن احبُّ النّاس اليك المشفق الناصح [1]

تمہاری نظر میں اس شخص کو سب سے زیادہ محبوب ہونا چاہئے کہ جو محبت و شفقت کے ساتھ تمہیں نصیحت کرے۔

نیز فرمایا:

مَنْ اعرض عن نصيحة الناصح اُحرق بمكيدة الكاشح [2]

جو شخص نصیحت کرنے والے کی نصیحت سے روگردانی کرتا ہے وہ اس شخص کی آگ میں جلایا جاتا ہے جو دشمنی کو مخفی رکھتا ہے۔ حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

امّا بعد فانّ معصية الناصح الشفيق العالم المجرّب تورث الحسرة و تعقب الندامة [3]

بیشک شفیق و مہربان اور عالم و تجربہ کار نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو نا ماننا حسرت و یاس اور پشیمانی کا سبب ہوتا ہے۔

آپؑ ہی کا ارشاد ہے:

اسمعوا النصيحة ممن اهداها اليكم واعقلوا علىٰ انفسكم [4]

اس شخص کی نصیحت سنو جو تمہارے پاس اس کا ہدیہ لائے اور اس کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لو تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

اَشفَقُ النّاسِ عليكم اعونهم لك علىٰ صلاح نفسك وَانصحهم لك في دينك [5]

تمہارے اوپر سب سے زیادہ مہربان و شفیق آدمی وہ ہے جو تمہارے نفس کے خلاف تمہاری مدد کرے اور تمہارے دین کے بارے میں تمہیں سب سے زیادہ نصیحت کرے۔

---

[1] شرح غرر و درر ج ۵ ص ۵۱ [2] ایضا ص ۴۳۲ [3] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۲ ص ۴۱۲

[4] شرح غرر و درر ج ۲ ص ۲۴۲ [5] ایضا ص ۴۸۷

آپ ہی کا ارشاد ہے:

من اکبر التوفیق الاخز بالنصحه [1]

انسان کیلئے سب سے بڑی توفیق یہ ہے کہ مشفقانہ نصیحت پر عمل کرے اور اسے حفظ کر لے۔

نیز فرماتے ہیں: نا صحك مشفق عليك محسن اليك ناظر.

تمہیں نصیحت کرنے والا تمہارے اوپر مہربان ہے تمہارے اوپر احسان کرنے والا ہے وہ اپنی نظر سے تمہاری زندگی کے انجام کو دیکھتا ہے وہ تمہاری کوتاہیوں کی نشاندہی کرنے والا ہے پس اس کی اطاعت میں تمہاری سعادت پوشیدہ ہے اور اس کی نافرمانی میں تمہاری تباہی ہی نہفتہ ہے۔

لیکن نصیحت کرنے والے کو چاہئے کہ سب کے سامنے نصیحت نہ کرے۔ حضرت علی فرماتے ہیں نصحك بين الملأ تقريع [2] سب کے سامنے تمہارا نصیحت کرنا اس کی نابودی کا باعث ہوگا۔

---

[1] شرح غرر و درر ج ۶ ص ۲۰ [2] شرح غرر و درر ج ۲ ص ۱۷۲

بزرگ کا حق

وَامّا حقّ الکبیر فانّ حقّهٔ توقیر سِنّه واجلال اسلامه۔

بزرگ کا حق یہ ہے کہ تم اس کے سن و عمر کے لحاظ سے اس کا احترام کرو اور اس کے حق کو اہمیت دو اور اگر وہ اسلام میں فضیلت رکھتا ہے تو اس کے اسلام کو بزرگ و عظیم سمجھو اور دشمنی میں اس سے مقابلہ کرنے سے پرہیز کرو اور راستہ میں اس کے آگے آگے چلو اور نہ اس پر سبقت کرو اور اس سے جہالت و نادانی سے پیش نہ آؤ اور اگر وہ تمہارے ساتھ ایسا کرے تو تم برداشت کرو اور اس کے اسلام و بزرگی کی وجہ سے اسکی تعظیم کرو کیونکہ بزرگی و سن درازی بھی اسلام کے برابر ہے۔ خدا کی طاقت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

"کِبَر بروزن عنب" یعنی سن وقد کی بزرگی۔ قال رب انیٰ یکونُ لی غلام و قد بلغنی الکِبرُ [1] اس آیت میں کبر سے ضعیفی اور درازی عمر مراد ہے۔ فجعلهم جزاذاً الاکبیر الّهم [2] اس آیت میں جثہ وجسم کی بزرگی اور اس کا بڑا ہونا مراد ہے۔ رہبر و رئیس کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے: اِنّه لکبیرکم الّذی علّمکم السّحرَ [3]

امام زین العابدین کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بزرگوں اور بوڑھوں کا ان کے اسلام اور ان کی پیرانی سالی۔ کے لحاظ سے احترام کیا جانا چاہئے۔ اور ان کے ساتھ بدتمیزی و تندخوئی سے پیش آنے کی مذمّت فرمائی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن نے کِبَر اور پیری وضعیفی کی کیا تعریف کی ہے:

انسان زندگی کے آغاز اور اس کے انجام میں ضعیف ہوتا ہے

انسان کی زندگی طفلگی کے ضعف سے شروع ہوتی ہے۔ اور بڑھاپے کی کمزوری و ناتوانی پر ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی انسان کی زندگی کے آغاز میں بھی کمزوری وضعف ہے اور اس کے انجام میں بھی۔ ہاں دونوں میں یہ فرق ہے کہ بچے ترقی و بلندی کی طرف بڑھتے ہیں اور طاقت وقوت کی منزل طے کرتے

---

[1] آل عمران: ۴۰ [2] انبیاء: ۵۸ [3] طٰہٰ: ۷۱

ہیں، ہر روز وہ زیادہ قوت سے ہمکنار اور جوانی سے نزدیک ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف ضعیف اور بوڑھے پستی و کمزوری کی طرف جاتے ہیں، انحطاط کی منزل طے کرتے ہیں، مرور ایام کے ساتھ ان کے بدن میں نقاہت و فرسودگی آتی رہتی ہے، ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

اللّٰہ الّذی خلقکم من ضعف ثمّ جَعَلَ من بعدِ ضِعفٍ قوّۃً ثم جعل من بعد قوۃ ضعفاً و شیبۃ۔

خدا وہ ہے کہ جس نے تمہیں اس وقت پیدا کیا جب تم کمزور تھے پھر تمہیں کمزوری وضعف کے بعد قوت و طاقت عطا کر دی اور قوت کے بعد کمزور وضعیف بنا دیا۔

نیز ارشاد ہے:

ومَن نُعمّرُ نُنَکّسۃُ فی الخلق افلا یعقلون[1]

اور جس کو ہم طویل عمر دیتے ہیں اس کو ہم اس کی ساخت میں جھکا دیتے ہیں کیا تم اس سلسلہ میں غور نہیں کرتے؟

پیرو ضعیفی میں آدمی کے بدن کے سارے قویٰ جھک جاتے ہیں اور پستی کی طرف مائل ہوتے ہیں، فہم نافہمی میں، یادداشت، نسیان میں، طاقت کمزوری میں، کمال نقص میں، توانائی ناتوانی میں اور شادابی، پژمردگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ضعیف العمر بڑھاپے میں صرف نئی باتیں حفظ کرنے ہی پر قادر نہیں ہوتے بلکہ گزشتہ زمانہ کی یادداشت کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید فرماتا ہے:

واللّٰہ خلقکم ثم یتوّفکم و منکم مَنْ یُرَدُّ الیٰ ارذل العمر لکیلا یعلم بعدعلم شیئا۔

اور خداوند عالم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں موت دے گا اور تم میں سے بعض کو اتنی عمر دی جاتی ہے کہ اسے پست ترین عمر کی طرف پلٹایا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ زندگی بھر کی فراہم کردہ معلومات کو فراموش کر دیتا ہے۔ اور علم حاصل کرنے کے بعد نادان ہو جاتا ہے۔

جس شخص کی عمر طویل ہوتی ہے اور جو ضعیفی کے کرب ناک زمانہ میں پہنچ جاتا ہے وہ بڑی

---

[1] یٰس، ۶۸

مصیبتوں سے دو چار ہوتا ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کے جسم کے قویٰ سست وکمزور ہو جاتے ہیں، نفسیاتی وروحانی طاقت ساتھ چھوڑ دیتی ہے، انسان کے وجود کی اندرونی وبیرونی طاقت گھٹ جاتی ہے۔

ضعیفی یعنی معاشرہ سے علیحدگی

ضعیف اور بوڑھے لوگوں کے لئے بڑی مشکلوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جبر طبیعی کے سبب معاشرہ کے سرگرم وفعال افراد سے جدا ہو جاتے ہیں، وہ اپنی ضعیفی وکمزوری کی بنا پر معاشرہ کے ہمہمہ کو چھوڑ کر گوشہ نشین ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اپنے خاندان میں اور گھر میں محدود ہو جاتے ہیں۔ اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنے خاندان اور اہل وعیال میں بھی مناسب جگہ نہیں ملتی ہے۔ کبھی بیٹوں اور پوتوں کی بے توجہی کا شکار ہوتے ہیں، کبھی ان کی ڈانٹ پھٹکار سنتا پڑتی ہے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہیں گھر سے نکال دیا جاتا ہے تو حساس وزود رنج بوڑھے اس دنیا کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں۔

نفسیاتی دباؤ موت کا سبب

ڈاکٹر اڈلف، جو کہ امریکہ کے جراحوں کے کالج کا رکن ہے، کہتا ہے: جب میں انٹرن میڈکل میں تھا تو اس وقت ایک مریض ۷۰ سالہ عورت تھی، اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ ریڈیوگرافی کے مطالعہ کے دوران میں اس بات کی طرف متوجہ ہوا کہ اس کی ہڈی ٹھیک کام کر رہی ہے لہٰذا اس بات پر میں نے اس کو مبارک باد دی کہ تم بہت جلد شفایاب ہو رہی ہو، جو وہیل چیر سے بھی نہیں چل سکتی تھی اب وہ بیساکھیوں سے چل سکتی تھی۔

اس کا علاج کرنے والے جراح نے مجھ سے کہا تھا: یہ عورت ۲۴ گھنٹے بعد میڈیکل چھوڑ کر اپنے گھر جا سکتی ہے اور چونکہ اس کا مریض بہت جلد شفایاب ہو گیا تھا اسلئے وہ بہت خوش نظر آتا تھا۔ جس دن اس کے معالج سے میری یہ بات ہوئی تھی اسی روز یعنی اتوار کے دن اس عورت کی بیٹی، اسکی عیادت کیلئے آئی میں نے اس سے کہا: کل تم اپنی ماں کو اپنے گھر لے جا سکتی ہو۔ اب ان کی طبیعت صحیح ہے،

انہوں نے بہت جلدی شفا پالی ہے اب وہ بیساکھیوں کے سہارے چل سکتی ہے۔ لیکن اس نے کوئی اظہار خیال نہیں کیا اور مجھے کچھ نہیں بتایا بلکہ سیدھی اپنی ماں کے پاس گئی تا کہ ان سے تبادلۂ خیال کرے اور ان سے کہا: میری ابا سے گفتگو ہوئی ہے افسوس ہے کہ وہ میڈیکل سے رخصت ہونے کے بعد آپ کو اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتے۔ البتہ یہ امکان تھا کہ وہ اسے اولڈ فلکس ہوم میں پہنچا دیں، میں انٹرن میں تھا کہ مجھے اس عورت کے پاس بلایا گیا، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی چنانچہ ۲۴ گھنٹے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ مگر ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے نہیں بلکہ دل شکنی سے ہوا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی تو جڑ گئی تھی لیکن ٹوٹے ہوئے دل کا کوئی علاج نہ تھا۔[1]

آج کا معاشرہ بوڑھوں کو خاندان کے محبت آگیں مرکز سے جدا کر دیتا ہے اور انہیں اولڈ فلکس ہوم میں پہنچا دیتا ہے اور ان کے درد کا مداوا کرنے کے بجائے ان کے درد کو بڑھا دیتا ہے، ہاں اسلام نے اپنی اپنے تربیتی اور اخلاقی منصوبہ میں اس کو موضوع کو، بڑھاپے کے حق کے عنوان سے بہترین طریقہ سے بیان کیا ہے۔

بزرگوں کا احترام روایات کی روشنی میں

اصول کافی میں کتاب ''العشرة'' میں ایک باب ''وجوب اجلال ذی الشیبة المسلم '' میں قائم ہوا ہے ہم اس باب کی رویات کی طرف اشارہ کرتے ہیں تا کہ یہ روشن ہو جائے کہ اسلام نے اپنے مکتبِ اخلاقی میں بزرگوں کے حق کی رعایت کس طرح کی ہے اور ایسے افراد کے خاندانوں کو ان کے فرائض سے کیسے آشنا کیا ہے

عن عبداللّٰہ بن سنان قال، قال لی ابو عبداللّٰہ علیہ السلام: ان من اجلال الله عز و جل اجلال الشیخ الکبیر۔

عبداللہ بن سنان سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: مجھ سے امام صادقؑ نے فرمایا: سن رسیدہ افراد اور بزرگوں کی تعظیم کرنا خدا کی عظمت و بزرگی کا قرار کرنا ہے۔

---

[1] گفتار فلسفی (بزرگ سال) ج ۲ ص ۳۴۲

دوسری روایت میں امام صادقؑ نے رسولؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

قال رسول اللّٰہ من عرف فضل کبیرٍ لسنّہ من عرف فضل کبیر لسنہ فوقرہ آمنہ اللہ من فزع یوم القیمۃ۔

جو شخص بوڑھے آدمی کی تعظیم کرتا ہے اور اس کی منزلت کو پہچانتا ہے خداوند عالم اسے قیامت کے خوف سے محفوظ رکھے گا۔

اسحٰق بن عمار کہتے ہیں: میں نے سنا کہ ابوالخطاب نے امام صادقؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے:

عن ابی عبداللّٰہ قال:ثلاثۃ لا یجھل حقھم الا منافق معروف بالنفاق : ذو الشیبۃ فی الاسلام، و حامل القرآن والامام الاعدل۔

تین طبقے ایسے ہیں کہ جن کا حق پوشیدہ نہیں رہتا ہے، ان کے حق کو ہر ایک پہچانتا ہے مگر یہ کہ کوئی نفاق میں مشہور ہو گیا ہو۔ ۱۔ وہ بوڑھا جس نے اپنے بال اسلام میں سفید کئے ہوں۔ ۲۔ حامل قرآن۔ ۳۔ عادل امام ور ہبر

دوسری روایت میں ابن سنان کہتے ہیں کہ مجھ سے امام صادقؑ نے فرمایا:

من اجلال اللّٰہ عزّ و جلّ اجلالُ المومن ذی الشیبۃ،ومن اکرم مومنا فبکرامۃ اللّٰہ بدء و من استخف بمومن ذی شیبۃ ارسل اللّٰہ الیہ من یستخف بہ قبل موتہ۔

کسی بوڑھے کا احترام کرنا گویا خدا کا احترام کرنا ہے اور جو کسی مومن کا اکرام وعزت کرتا ہے گویا اس نے خدا کے احترام واکرام سے ابتدا کی ہے اور جس نے سفید بال والے مومن کو سبک سمجھا اس کے پاس خدا ایسے کو بھیجتا ہے جو اس کے مرنے سے پہلے اس کے ساتھ گستاخی کرے گا، یہ عمل اور ردّ عمل ہے۔ حدیث میں قدسی میں خداوند عالم فرماتا ہے:

الشیب نوری وانا استحی ان اعذب نوری بناری۔

سفید بال میرا نور ہے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کہ میں اپنے نور کو اپنی آگ کے ذریعہ عذاب دوں۔

ابن ابی شیبہ سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے کہا:

نهى رسول الله عن نتف الشيب وقال:هو نور المومن۔

رسولؐ نے سفید بال اکھاڑنے اور نوچنے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ مومن کا نور ہے۔

قبیلہ "ھذیل" کا ایک شخص رسولؐ کی خدمت شرفیاب ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسولؐ! میری عمر زیادہ ہوگئی ہے، میری ہڈی کمزور ہوگئی ہے، میری طاقت کم ہوگئی ہے اب میں نماز، روزہ کو کما حقہ کو انجام نہیں دے پاتا ہوں رسولؐ نے فرمایا: اپنی بات کی تکرار کرو کہ تمہارے اطراف کی ہر چیز تمہارے حال پر رحم کھا کر گریہ کر رہی ہے۔ تو پھر خدا کیسے تم پر رحم نہیں کریگا؟! [1]

خداوند عالم نے سحر تک قوم لوط کے شہروں کا تختہ اس لئے نہیں پلٹا تھا کہ جناب لوط نے عذاب میں تاخیر کی دعا کی تھی۔ جبریلؑ نے کہا: خداوند عالم فرماتا ہے ان لوگوں کے درمیان ایک سفید بال و ریش کا بوڑھا آدمی پیٹ کے بل سو رہا ہے اس کی سفید داڑھی کی بنا پر میں نے عذاب میں تاخیر کی ہے تا کہ وہ سیدھا ہو جائے رسولؐ فرماتے ہیں:

إنّ اللّه تعالىٰ ينظر فى وجه الشيخ صباحاً و مساة فيقول: عبدى! كبر سنك، و دق عظمك، و رق جلدك، وقرب اجلك و حان قدومك على فاستحى منى فانا استحيى من شيبتك ان اعذبك فى النار، ثم بكىٰ صلى الله عليه وآله ۔ فقيل له : يا رسول اللّه، ما يبكيك؟ قال: ابكى ممن يستحى الله منه و هو لا يستحيى من الله۔

خداوند عالم صبح و شام بوڑھے کے چہرے کو دیکھتا ہے اور فرماتا ہے: میرے بندے! تیرا سن زیادہ ہو گیا ہے تیری ہڈی کمزور ہو گئی ہے۔ تیرے بدن کی کھال باریک و نازک ہو گئی ہے، تیری اجل قریب آگئی ہے اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم میری طرف آؤ۔ مجھ سے شرم کرو؛ مجھے اس سے شرم آتی ہے کہ میں تمہارے سفید بال و ریش کے باوجود تمہیں آگ میں جلاؤں۔ پھر پیغمبر پر گریہ طاری ہو گیا۔ دریافت کیا کہ گریہ فرمانے کا کیا سبب ہے؟ فرمایا: خدا کو عذاب کرنے میں شرم محسوس ہوتی ہے، بندہ کیسے خدا سے حیا نہیں کرتا ہے؟

---

[1] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۲ ص ۴۳۵ وسفینۃ البحار ج ۱ مادہ

امام صادقؑ فرماتے ہیں:

إنَّ اللّٰہ لیکرم ابناءَ السبعین ،و یستحیی من ابناء الثمانین ، فیامرو بان تکتب لهم الحسنات و تمحیٰ عنهم السیئات.

بیشک خداوند عالم ستر سالہ انسانوں کا احترام کرتا ہے اور اسی ۸۰ سالہ بوڑھوں سے حیا کرتا ہے حکم دیتا ہے کہ ان کی نیکیاں اور حسنات لکھے جائیں اور ان کے گناہوں کو محو کر دیا جائے۔

بزرگوں کا احترام باعث نجات

بزرگوں اور بوڑھوں کے احترام کے سلسلہ میں رسولؐ فرماتے ہیں:

قال رسول اللّٰہ مَن وَقَّرَ ذاشیبۃلشیبتہ امنہ اللہ تعالی من فزع یوم القیامۃ.

جو شخص کسی کو بوڑھے کی اس کی سفید داڑھی کی وجہ سے تعظیم کرتا ہے خداوند عالم اسے روز قیامت کے شیب خوف سے محفوظ رکھے گا۔

امام زین العابدینؑ کے بیان سے متعلق ہم نے کچھ روایات نقل کی ہیں جن سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ممکن ہے کسی معاشرہ میں سن رسیدہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہو جائے اور جدت پسند طبقہ ان کو اپنے خاندان سے جدا کرنے کے علاوہ اس کا کوئی حل تلاش نہ کر سکے اور ان کو اولڈ فلکس ہوم میں داخل کر دے۔ لیکن اسلام سفید داڑھی اور بالوں کو اول تو عظمت و برکت کی علامت سمجھتا ہے دوسرے یہ حکم دیتا ہے کہ ہم سفید ریش والوں کا احترام کریں۔ ان کی عمر کا آفتاب غروب ہوا چاہتا ہے۔ ہمیں ان کے مقابلہ میں نہیں کھڑا ہونا چاہئے اور ان سے ناراض ہو کر ان کو رنجیدہ نہیں کرنا چاہئے اور اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ وہ ضعیف العمری کے سبب تاب ضبط نہیں رکھتے ہیں اب ان میں بھوک، پیاس اور دوسری شکلوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

ان روایات سے دوسری اہم چیز یہ معلوم ہوئی کہ خداوند عالم بوڑھوں کو آگ وجہنم میں جلانے سے حیا کرتا ہے لہٰذا بوڑھوں کو گناہ و نافرمانی سے حیا کرنا چاہئے۔ بعض لوگوں کو گناہ کرنے کی عادت ہوگئی ہے انہیں چاہئے کہ جلد از جلد آبِ توبہ سے غسل کریں اور اپنی مغفرت کا سامان فراہم کریں۔

چھوٹے کا حق

واما حقّ الصغیر فرحمته و تثقیفهٗ و تعلیمه والعفو عنه و الستر علیه والرفق به والمعونة له و الستر علیٰ جرائر حداثته فانه سبب للتوبة والمداراة له . وترک مما حکته فان ذلک ادنیٰ لرشده.

کمسن و بچّہ کا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ محبت سے پیش آؤ اس کی پرورش کرو، اس کو تعلیم دو، اس سے درگزر کرو، اسے لباس پہناؤ، اس کے ساتھ نرم رویہ رکھو، اس کی مدد کرو اور اس کی بچکانہ حرکتوں پر پردہ ڈال دو کیونکہ یہ چیز توبہ کا باعث ہے، اس کی رعایت کرو اور اسے بھڑکاؤ نہیں کیونکہ یہ بات اس کے رشد سے قریب ہے۔

صِغَر (بروزن فرس و عنب) یعنی چھوٹا پن، کبر (بڑے پن) کی ضد ہے ایک چیز کا دوسری سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے، خواہ زمانہ کے اعتبار سے ہو، جیسے کم سن ہونا یا جثہ کے لحاظ سے ہو یا قدر و رتبہ کے اعتبار سے ہو۔[1]

امام زین العابدینؑ کے نقطۂ نظر سے بچّہ کا حق یہ ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں دلچسپی ہو۔ اسے معاف کیا جائے اس کے عیوب کو چھپایا جائے۔ اس کی رعایت کی جائے اور اس کی مدد کی جائے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ حُبِّ ذات بچہ کی تربیت کا بنیادی عنصر ہو، اس چیز کو اگر بچہ کے اندر عاقلانہ طور پر اور صحیح منصوبہ کے تحت سمت دی جائے تو یہ خوش بختی و سعادت کا باعث ہوتی ہے۔ حُبِّ ذات کو قوی کرنے کا ایک طریقہ بچوں کی تعظیم و تکریم ہے، جس بچہ کی اپنے خاندان ہی میں عزت نہ ہو وہ احساس کمتریں کا شکار ہو جاتا ہے، وہ خود کو حقیر و پست سمجھنے لگتا ہے حوصلہ ہار جاتا ہے اور نفسیاتی طور پر ٹوٹ جاتا ہے ایسا بچہ کوئی بھی غلط کام کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے آپؑ اس کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔

بچوں کے بارے میں رسولؐ فرماتے ہیں:

---

[1] قاموس قرآن ج ۴ ص ۱۲۹

اکرمو آؤلادکم واحسنوا آدابکم [1]

اپنے بچوں کا احترام کرو اور اپنا چال چلن صحیح رکھو۔

امام زین العابدینؑ نے اس طرح بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ بچہ کا ایک حق ہے جو بزرگ کی گردن پر ہے اس سلسلہ میں ائمہ کا کردار گواہ ہے۔

بچہ کے اندر محبت پیدا کرنا

عن الحسن بن علی آنّه دعا بنيه و بني اخيه،فقال : انكم صغار قوم و يوشك ان تكونوا كبار قوم آخرين فتعلموا العلم، فمن لم يستطع منكم ان يحفظه فليكتبه وليضعه في بيته۔

ایک روز امام حسنؑ نے اپنے اور اپنے بھائی کے بچوں کو بلایا اور ان سے فرمایا: تم ایک قوم کے چھوٹے ہو اور عنقریب ایک قوم کے بڑے بن جاؤ گے، پس علم حاصل کرو پھر جو تم میں سے اسے یاد نہ رکھ سکے اسے لکھ لینا چاہئے اور اسے گھر میں محفوظ جگہ پر رکھ دینا چاہئے تا کہ وقت ضرورت یہ لکھا ہوا کام آئے۔

اس حدیث میں امام حسنؑ اپنے بچوں اور بھتیجوں کے اندر حصول علم کا جذبہ پیدا کرنے اور انہیں فرحت ونشاط کے ساتھ علم حاصل کرنے کی رغبت دلانے میں ان کے فطری سرمایہ، حُبّ ذات سے استفادہ کر رہے ہیں، نہ انہیں ڈراتے ہیں نہ دھمکاتے ہیں بلکہ آسانی سے یہ سمجھاتے ہیں کہ آج کا پڑھا ہوا کل کی عزت وسرفرازی کا باعث ہے۔

اس حدیث میں جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ آج کی دنیا میں تعلیم کا بہترین نہج ہے۔ ہر خاندان اس طریقہ سے اپنے بچوں کو علم حاصل کرنے پر ابھار سکتا ہے اور ابھی سے انہیں بلند مرتبہ کا امیدوار بنا سکتا ہے بچے خود ہی دلچسپی اور شوق کے ساتھ علم حاصل کریں گے، پڑھنے کیلئے سختی وسزا کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] گفتار فلسفی (کودک) ج ۲ ص ۹۰

بچوں کی تربیت کا طریقہ

بچوں اور بڑوں کی بلندی کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ زندگی میں آزادی ہو۔ سختی واستبداد کے ماحول میں بلندی وسرفرازی کی امید نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس کیلئے پرسکون اور آزاد ماحول کی ضرورت ہے۔ اسی سے استعداد میں نکھار آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تربیتی آئین میں جہاں تک ممکن ہے مربی سختی سے کام نہیں لیتا ہے۔ رسولؐ دنیائے بشر کے مربی ہیں۔ مہربان تھے۔

عن ابن مسعود قال: اتی النبیؐ صلی اللّٰہ علیه وآله رجل یکلمه فارعد، فقال : هون علیك فلست بملك.

ابن مسعود سے روایت ہے کہ ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس پرخوف طاری ہوگیا۔ آپؐ نے فرمایا: ڈرو! نہیں میں بادشاہ نہیں ہوں۔

قال النبیؐ: من کان عنده فلیتصاب له.

رسولؐ نے فرمایا جس شخص کے پاس کوئی بچہ ہواسے چاہئے کہ اس کی پرورش میں وہ بچوں جیسا کردار ادا کرے۔

عن الاصبغ بن نباته قال:قال امیرالمومنین علیه السلام : من کان له ولد صبا.

حضرت علیؑ نے فرمایا: جس کا کوئی بچہ ہواسے چاہئے کہ وہ اس کی تربیت کیلئے بچہ بن جائے۔

قال صلی اللّٰه علیه وآله وسلم رحم اللّٰه عبدا اعان ولده علی برہٖ بالاحسان الیه والتالف له و تعلیمه و تادیبه.

رسولؐ نے فرمایا: خدارحم کرے اس بندہ پر جونیکی اور نیک منشی میں اپنے بچہ کی مدد کرے اور اس پر احسان کرے اور ایک بچہ کی مانند اس بچہ کا رفیق و دوست بن جائے تاکہ اسے علم وادب سے آراستہ کرسکے۔

رسولؐ اور بچوں کا احترام

کان صلی اللّٰہ علیه وآله وسلم یقدم من السفرفیتلقّاه الصبیان فیقف لهم ثم یامر بهم فیرفعون الیه فیرفع منهم بین یدیه ومن خلفه و یامر اصحابه ان یحملوا بعضهم فربما یتافاخر الصبیان بعد ذلك فیقول بعضهم لبعض : حملنی رسول الله صلی لله علیه وآله بین یدیه و حملك انت ورائه ، ویقول بعضهم : امر اصحابه ان یحملوك ورائهم .

ایک مرتبہ رسولؐ سفر سے واپس آرہے تھے، راستہ میں کچھ بچے ملے، آپؐ ان کے احترام کیلئے کھڑے ہوگئے رسولؐ نے فرمایا: بچوں کو لاؤ، بچے لائے گئے تو آپؐ نے کسی کو گود میں لیا اور کسی کو دوش پر سوار کیا اور اپنے اصحاب سے فرمایا: بچوں کو گود میں لو اور ان کو دوش سوار کرو، بچوں کو اس سے بہت مسرت ہوئی۔ خوشی سے اچھلنے لگے۔ اس یادگار موقعہ کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے، اکثر وہ جمع ہوتے اور اس واقعہ کو ایک دوسرے سے بیان کرتے تھے۔ فخر و مباہات کے ساتھ ایک کہتا تھا: رسولؐ نے مجھے گود لیا تھا اور تمہیں دوش پر سوار کیا تھا دوسرا کہتا تھا رسولؐ نے اپنے صحابی کو حکم دیا تھا کہ تمہیں اپنے دوش پر سوار کرے۔

بچوں کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنا

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں کہ بچوں کی خطاؤں کو معاف کردو اور ایسے بن جاؤ گویا انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں، خطاؤں سے چشم پوشی کرنا اخلاقی موضوعات میں سے ایک ہے اور تعلیم و تربیت میں اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔ اور دوسروں کی لغزشوں سے غافل بننا ان کی اصلاح میں مؤثر ہوتا ہے۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں:

عن ابی عبد اللّٰہ قال: صلاح حال التعایش والتعاشر ملأ مکیال ثلثاه فطنته و ثلثه تغافل۔

زندگی کی بھلائی اور لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہنا بھرے ہوئے پیمانہ کی مانند ہے کہ جس کا دو تہائی فہم و آگہی ہے اور ایک تہائی تغافل ہے۔

اولیائے اسلام نے تغافل کی قدر قیمت اور اسکی اہمیت کو بیان کیا ہے:

عن النبیؐ قال: المومن نصفه تغافل.

رسولؐ فرماتے ہیں: تغافل کی دو قسمیں ہیں! مذموم و ممدوح کا نصف تغافل ہے۔جس تغافل کو دینی دستورات میں ممدوح قرار دیا گیا ہے اور اولیائے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جس کی رعایت کرنے کا شوق دلایا ہے اس تغافل کا سرچشمہ عقل اور مصلحت ہے اور تغافل کرنے والا حُسن نیت اور نیک خیال کے ساتھ تغافل کرتا ہے۔

اگر والدین اور تربیت کرنے والے بجا اور صحیح موقعہ پر تغافل کریں تو اس کا نتیجہ مثبت برآمد ہوگا اور تربیت میں اس کا اچھا اثر ہوگا۔ مثلاً ساری دنیا کے بچے کم و بیش چوری کرتے ہیں، بچوں کے اندر تملّک کی فکر بہت جلد بیدار ہو جاتی ہے، وہ بہت سی اشیاء کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں، دوسرے بچوں کے کھلونوں کو بھی اپنا ہی مال سمجھتے ہیں اور انہیں اپنے گھر اٹھا لاتے ہیں کبھی ابّا کی جیب سے پیسہ نکالتے ہیں۔باپ کہتا ہے: میری جیب سے پیسہ نکل گیا، ماں شکوہ آمیز انداز میں کہتی ہے: کیا اس گھر میں کوئی ایسا غلط بھی کرتا ہے۔باپ کہتا ہے: معاف کیجئے گا: ہو سکتا ہے کہیں میری جیب سے نکل گیا ہوگا یا میں نے دوکاندار سے چھ کی بجائے پانچ ہی لئے ہونگے، بچہ بھی یہ باتیں سنتا ہے اور رات میں لیٹ کر سوچتا ہے، یہ میں نے کیا، کیا تھا، بہت اچھا ہوا، کوئی نہیں سمجھا۔سوچتا ہے اب کبھی ایسا کام نہیں کرونگا ایسی جگہ پر اگر چہ بچہ نے غلط کام کیا ہے لیکن اس کی اصلاح کیلئے چشم پوشی کرنا چاہئے۔امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں: بچہ کے اس غلط کام سے چشم پوشی کرنا اس کی اصلاح کا باعث ہوتا ہے۔

سائل کا حق

اماّ حق السائل فاعطاؤه اذاتهيأت صدقةو قدرت على سد حاجته والدعاء له فيما نزل به والمعاونة له على طلبته، وان شككت في صدقه و سبقت اليه التهمة له ولم تعزم علىٰ ذلك لم تامن ان يكون من كيد الشيطان، اراد ان يصدك عن حظك و يحول بينك وبين التقرب الىٰ ربك و تركته بستره و رددته رداً جميلا، وان غلبت نفسك في امره و اعبيته على ما عرض في نفسك منه فان ذلك من عزم الامور [1]

سائل کا حق یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس صدقہ تیار ہے تو اسے دیدو اور اس کی ضرورت کو پورا کر دو اور اس کی ناداری کے برطرف ہونے کی دعا کرو اور اس کی طلب میں اسکی مدد کرو اور اگر تمہیں اس کی صدق بیانی میں شک ہو اور اس سلسلہ میں اس پر پہلے تہمت لگائی جا چکی ہو اور تمہیں اس کا یقین نہ ہو تو اس تہمت کی پروانہ کرو ہوسکتا ہے شیطان تمہیں تمہارے حصہ سے محروم کرنا چاہتا ہو اور وہ تمہارے اور تمہارے رب کے تقرب میں حائل ہونا چاہتا ہو۔ لہٰذا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو اور اسے شائستہ جواب دو اور اس صورت میں بھی اگر اسے کچھ دیدو تو یہ بہت اچھا ہے۔

---

[1] جناب غفاری صاحب کی تصحیح کردہ تحف العقول میں یہ جملہ اس طرح ہے: اذا تيقنت صدقه یعنی اگر تمہیں اس کے صادق ہونے کا یقین ہے۔

مسئول کا حق

واماّ حق المسئول فحقه اِنّ اعطی قبل منه مااعطیٰ بالشکر له والمعرفة لفضله و طلب وجه العذر فی منعه ،واحسن به الظن ، واعلم انه ان منع (فلماله)منع وان لیس التثریب فی ماله وان کان ظالما ، فان الانسان لظلوم کفار۔

جس سے سوال کیا جاتا ہے، جس سے طلب کیا جاتا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اگر اس نے کچھ دیا ہے تو اسے شکریہ کے ساتھ قبول کرلو اور اسکی قدر کرو اور اگر وہ کچھ نہ دے سکے تو اسے معاف کردے اور اس کے بارے میں حسن ظن رکھے اور یہ جان لو کہ اگر منع کیا ہے تو اپنے ہی ضرر میں منع کیا ہے اس میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے خواہ وہ ظالم ہی ہو کیونکہ انسان ظالم ہے اور حق کو چھپانے والا ہے۔

ان دو متقابل حقوق کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر انسان قدرت رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ سائل کو محروم نہ کرے اور یہ دعا کرے کہ خدا اسے فقر و ناداری سے نجات عطا کرے اور اگر سائل کی بات میں شک ہو تو اس شک کی پروا نہ کرے اور یہ تصور کرے کہ شیطان اسے فیض الٰہی سے محروم کرنا چاہتا ہے اور اگر استطاعت نہ رکھتا ہو شائستہ طریقہ سے جواب دیدے۔ جس سے سوال کیا گیا ہے اس کے حق کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اس نے عطا کیا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرے اور اس کی قدر کرے اور اگر نہ دے تو اس کو ملامت نہ کرے کیونکہ انسان کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے۔

بجا اور بے جا سوال

کچھ جاننے کیلئے سوال کرنا اسلام کے نقطۂ نظر سے بطور مطلق ممدوح ہے بلکہ اس کا حکم ہوا ہے۔

چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے: اسئلوا اهلَ الذکر ان کنتم لا تعلمون [1]

اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر (ائمہ معصومین) سے سوال کرو۔

سوال، عالم بننے کیلئے دریچہ ہے لیکن سائل و مسئول کے بارے میں امام زین العابدینؑ نے

---

[1] نحل: ۴۳

جو کچھ فرمایا ہے وہ بطور مطلق نہیں ہے بلکہ مال کی ضرورت کے وقت سوال کرنا ہے اور اس کا تعلق ناداروں اور فقیروں کے سوال سے ہے۔ کیا یہ سوال بھی قابلِ تعریف ہے یا یہ مذموم ہے؟ واضح ہے کہ اس موضوع کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ منفی ہے اور اس قسم کا سوال حرام ہے، مگر یہ کہ شدید حاجت ہو اور نادار کی جان کیلئے خطرہ ہو جائے تو وہ اپنی جان کی حفاظت کیلئے سوال کر سکتا ہے اور جس سے سوال کیا جائے اس کو مثبت جواب دینا چاہئے۔ سورہ معارج میں ارشاد ہے:

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم [1]

اور وہ لوگ کہ جن کے اموال میں سائل ومحروم کا حق ہے۔

بنابرایں سائل کو محروم نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ سوہ ضحیٰ میں ارشاد ہے: واما السائل فلا تنھر [2]

لیکن اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ حق سے کیا مراد ہے، زکوٰۃ، خمس اور تمام شرعی واجب حقوق ہیں یا انہوں نے خود پر واجب ولازم کر لیا ہے کہ اس صورت میں دوسرے غیر واجب حقوق بھی اس میں شامل ہونگے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے یہ صرف پہلی قسم کو شامل ہے اس میں واجب حقوق نہیں آتے کیونکہ واجب حقوق تمام لوگوں کے اموال میں ہوتے ہیں خواہ وہ پرہیزگار ہوں یا ان کے غیر، اگر اس طرح معنی بیان کئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا: نماز گزار اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ راہ خدا میں وہ اپنے اموال میں سے مانگنے والوں اور محروم لوگوں کو دیں گے۔

دوسری آیت لاتنھر نھر سے مشتق ہے یعنی غصہ کی حالت میں دھکا کر بھگانا۔ سائل مراد کون ہے؟ اس کی متعدد تفسیریں ہیں: ۱۔ سائل یعنی علمی واعتقادی مسائل معلوم کرنے والے۔ ۲۔ جو لوگ مادی چیزوں نہیں رکھتے۔ ۳۔ دونوں معنی مراد ہیں۔

روایات میں سوال کی مذمت

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی متواتر روایات میں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے کی

---

[1] معارج: ۲۴۔۲۵ [2] ضحیٰ: ۱۰

مذمت کی گئی ہے کیونکہ لوگوں سے سوال کرنا خدا پر اعتماد نہ ہونے اور سوال کرنے والے کی ذلت کا سبب ہوتا ہے اور مومن چونکہ عزت نفس رکھتا ہے لہٰذا اسے چاہئے کہ سوال کر کے اپنی عزت برباد نہ کرے اور اپنی قدر و قیمت کو نہ گنوائے۔ رسولؐ فرماتے ہیں:

عن ابی عبداللّٰہ قال، قال رسول اللّٰہ، اِنّ اللّٰہ تبارک و تعالیٰ اَحَبَّ شیئا لنفسه و ابغضه لخلقه . ابغض لخلقه المسالة واحب لنفسه ان یسأل و لیس شیء احب الی الله عز و جل من ان یسأل ، فلا یستحی احدکم ان یسال الله من فضله و لو شسع نعله.

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: رسولؐ فرماتے ہیں: بیشک خداوند عالم ایک چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے لیکن اسے بندہ کیلئے پسند نہیں کرتا، خدا اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا بندہ اس سے سوال کرے لیکن اس بات کو نہیں پسند کرتا کہ بندہ اسکی مخلوق سے سوال کرے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ چیز یہ ہے کہ اس سے سوال کیا جائے اور اس سے طلب کیا جائے پس خدا سے سوال کرنے میں تم میں سے کسی کو شرم نہیں کرنا چاہئے خواہ جوتی کے تسمہ ہی کے لئے ہو۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ خدا اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے بندے لوگوں سے مال کا سوال کریں واضح ہے کہ اس شخص کا خدا پر اعتماد نہیں رہتا جو ہمیشہ لوگوں سے مانگتا ہے حالانکہ خدا کے نزدیک بہترین چیز یہ ہے کہ اس سے طلب کیا جائے۔

دوسری روایت میں اس طرح وارد ہوا ہے:

عن الحسین بن ابی العلا قال: قال ابو عبد اللّٰہ علیه السلام: رحم الله عبدا عف و تعفف و کف عن المسألة فانه یتعجل الدنیة فی الدنیا ولا یغنی الناس عنه شیئا.

حسین بن ابو العلاء نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: خدا رحم کرے اس بندہ پر جو عفیف و پاکدامن اور خوددار ہو اور سوال کرنے سے پرہیز کرتا ہو کیونکہ لوگوں سے مانگنا، دنیا میں پستی کا باعث ہوتا ہے بے نیازی کا سبب نہیں ہوتا ہے۔

حرمتِ انسان کا تحفظ

حضرت امیر المومنین نے امام حسنؑ کو جو وصیتیں فرمائی ہیں ان میں سے ایک حرمت و کرامت انسان کے تحفظ کے بارے میں بھی ہے۔

اکرم نفسک عن کل دنیة وان ساقتک الی الرغائب فانک لن تعتاض بما تبذل من نفسک عوضا ولاتکن عبد غیرک وقدجعلک الله حرا۔

اپنے نفس کو ہر پستی سے بلند رکھو خواہ وہ تمہیں پسندیدہ چیزوں ہی کی طرف لے جائے۔ کیونکہ اگر تم میں اپنے نفس کو پستی میں ڈھکیل بھی دو گے تو اس کا عوض نہیں پاؤ گے۔ اور جب خدا نے تمہیں آزاد قرار دیا ہے تو کسی کے غلام نہ بنو۔

اسی وصیت نامہ کا جزیہ بھی ہے:

وان استطعت ان لا یکون بینک وبین الله ذو نعمة فافعل فانک مدرک قسمک وآخذ سهمک و ان الیسیر من الله سبحانه اعظم و اکرم من الکثیر من خلقه وان کان کل منه۔

اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ تمہارے اور خدا کے درمیان کوئی صاحب نعمت واسطہ نہ ہو تو ایسا کر گزرو کیونکہ اپنا حصہ حاصل کر لو گے اور اپنے نصیب ہی کا لو گے کہ خدا کی طرف سے جو ملتا ہے وہ کم بھی اس زیادہ سے محترم ہے جو اس کی مخلوقات میں سے کسی طرف سے ملتا ہے اگر چہ ساری نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ اپنے بچوں سے یہ فرماتے ہیں کہ وہ پستی کو قبول نہ کریں اور جلد ملنے والے فائدہ کے بارے میں نہ سوچیں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائیں، کیونکہ سب کا رازق خدا ہے، اس سلسلہ میں انسان اپنا بھرم نہ کھوئے کیونکہ سوال انسان کی شخصیت کو حقیر بنا دیتا ہے۔

آپؑ ہی کا ارشاد ہے:

السوالُ یُضعّفُ لسان المتکلم ویکسر قلب الشجاع البطل و یوقف الحر العزیز موقف العبد الذلیل و یذهب بهاء الوجه ویمحق الرزق۔

سوال بولنے والے کی زبان کو ناتواں کر دیتا ہے اور شجاع و دلیر کے دل کو توڑ دیتا ہے اور عزت والے آزاد کو ذلیل غلام کی جگہ پہنچا دیتا ہے، اس کے چہرہ کی رونق کو ختم کر دیتا ہے اور رزق کو مسدود کر دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امامؑ نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ اپنے اور خدا کے درمیان کسی صاحب نعمت کو واسطہ قرار نہ دو، تو ایسا کر گزرو اور اس سے حاجت روائی و مشکل کشائی کی درخواست نہ کرو بس خدا پر توکل کرو، یہ کام کرو، کیونکہ تمہارا حصہ تمہیں مل جائیگا، اگر چہ کم ہو لیکن یہ دوسروں کے زیادہ سے بہتر ہے یہ الگ بات ہے کہ صاحبان نعمت کے پاس اپنی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔

سوال کی ذلت سے پرہیز کرو

امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں:

طلب الحوائج الیٰ الناس مذلّة للحیاة و مذهبة للحیاء واستخفاف بالوقار وهو الفقر الحاضر.

لوگوں سے حاجت طلب کرنا زندگی بھر کیلئے ذلت اور حیا کا خاتمہ ہے شخصیت ووقار کو سبک کرنا اور حاضر فقر ہے۔

اسی سے ملتی جلتی حدیث امام صادقؑ کی بھی ہے، فرماتے ہیں:

طلب الحوائج الیٰ الناس استیلاب للعزومذهبة للحیاء ، و الیاس مما فی ایدی الناس عز للمومن فی دینه ، والطمع هو الفقر الحاضر.

لوگوں سے حاجت طلب کرنا عزت کے چھن جانے اور حیا کے ختم ہونے کا باعث ہے اور لوگوں کی چیزوں سے بے نیازی دین میں مومن کی عزت کا سبب ہے اور طمع ایسا فقر ہے جو حاضر و موجود ہے۔

رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

وعنہؑ: من فتح علیٰ نفسه باب مسألةٍ فتح الله عليه سبعين بابا من الفقر لا يسد ادناها شيء۔

جس شخص نے اپنے اوپر لوگوں سے سوال کرنے کا دروازہ کھول لیا خدا اس پر فقر و ناداری کے ستر دروازے کھول دیتا ہے ان میں سے چھوٹے دروازہ کو کوئی چیز بند نہیں کرسکتی۔

رسولؐ نے اس وصیت میں جو حضرت ابوذر کو کی تھی۔ فرمایا ہے:

ومن وصيتهؐ لابی ذر رضوان الله عليه: يا اباذر! اياك والسوال، فانه ذل حاضر و فقر تتعجله و فيه حساب طويل يوم القيامة، يا اباذر! لا تسئل بكفك و ان اتاك شيء فاقبله۔

اے ابوذر! خبردار لوگوں سے سوال نہ کرنا کہ حاضر و موجود ذلت ہے اور ایسا فقر ہے جس کے لئے تم عجلت کرتے ہو اور سوال کرنے میں روزِ قیامت طویل حساب ہے اے ابوذر سوال کیلئے لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا لیکن اگر سوال کے بغیر تمہیں کوئی چیز ملے تو اسے قبول کرلینا۔

حضرت امام رضا فرماتے ہیں:

عن الامام الرضاؑ قال: قال رجل للنبیؐ علمنی عملا لا يحال بينه و بين الجنة۔ قال: لا تغضب، ولا تسأل الناس، وارض للناس ما ترضیٰ لنفسك۔

ایک شخص رسولؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: مجھے ایسا عمل سکھا دیجئے کہ جس سے میں بے روک ٹوک جنت میں چلا جاؤں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: غضب و غصہ نہ کرو لوگوں سے سوال نہ کرو اور لوگوں کیلئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو۔

یہی مفہوم فارسی اور عربی نظم میں بھی بیان ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؑ سے منسوب دیوان میں مرقوم ہے:

كدّ كدّ العبدان	احببت ان تصبح حرا
واقطع الآمال عن مال	بنی آدم طرا

اگر کمال آزادی کے ساتھ صبح میں داخل ہونا چاہتے ہو تو غلام کی مانند کوشش کرو اور لوگوں کے اموال سے اپنی امید منقطع کرلو اور لوگوں کے اموال سے نظر ہٹالو۔

درج ذیل دو شعر امام حسینؑ کی طرف منسوب ہیں:

آغنِ عف المخلوق بالخالق　　تغن عن الکاذب بالصادق

وَاسترزق الرحمة من فضله　　فلیس غیر الله من رازق

خالق سے لو لگا کر خود کو مخلوق سے بے نیاز کرلو اور صادق سے تمسک کر کے جھوٹے سے بے نیاز ہو جاؤ۔ خدا کے فضل و کرم کے رزق و روزی طلب کرو کہ خدا کے علاوہ کوئی رازق نہیں ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

ما اعتاض باذل و جهه لیسواله　عوضا ولو نال الغنی بسوال

واذا النوال مع السول وزنته　رحج السوال و خف کل نوال

جس شخص نے اپنی عزت و آبرو کو سوال سے بدل لیا ہے اس نے کوئی عوض نہیں پایا۔ اگرچہ اس نے سوال کے ذریعہ مال حاصل کرلیا ہو جب وہ ملنے والی بخششوں کو سوال کے ساتھ تولے گا تو اس وقت معلوم ہوگا سوال کا پلہ بخششوں سے بھاری ہے۔

حضرت علیؑ سے منسوب ہے:

لحمل الصّخرمن قلل الجبال　　احب الی من منن الرجال

یقول الناس لی فی الکسب عار　وان العارفی ذل السوال

پہاڑ کی چوٹی سے پتھر اٹھا کر لانا میرے لئے دوسرے کی منت وساجت کرنے سے زیادہ آسان ہے۔ لوگ مجھ سے کہتے ہیں: کمانا ننگ و عار جبکہ مانگنا ننگ و عار ہے۔

حضرت امیر المومنینؑ نے عرفات کی سرزمین پر ایک شخص کو لوگوں سے مانگتے ہوئے دیکھا تو آپؑ نے اسے تازیانہ کے اشارہ سے سمجھایا: افسوس ہے تمہارے حال پر آج بھی تم خدا کے غیر سے سوال کر رہے ہو؟

رسولؐ نے فرمایا:

لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگو، اس وقت ایک شخص رسولؐ سے مدد مانگنے کیلئے آیا تھا۔ رسولؐ نے اس کی تکرار کی من سألنا اعطیناہ ومن استغنیٰ اغناہ اللّٰہ (ومن لم یسألنا فھو احب الینا)

جو ہم سے سوال کرے گا ہم اسے دیں گے لیکن جو بے نیازی کا ثبوت دے گا خدا اسے غنی کر دے گا۔ دوسری روایت میں اس طرح بیان ہوا ہے: جو ہم سے سوال نہیں کریگا وہ ہماری نظر میں معزز و محترم ہے۔

اس نادار نے کوئی سوال نہ کیا اور واپس چلا گیا۔ اس کی بیوی نے کہا: تم نے رسولؐ سے مدد کیوں نہ مانگی؟ اس نے کہا: رسولؐ نے یہ فرمایا تھا وہ آدمی صحرا میں گیا اور لکڑیاں کاٹ کر لایا اسی سے اس کا کاروبار بڑھ گیا ایک دن پھر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ رسولؐ نے فرمایا: میں نے کہا تھا جو شخص لوگوں سے سوال نہیں کرتا ہے خدا اسے بے نیاز کر دیتا ہے۔

جو روایات ہم نے یہاں تک بیان کی ہیں ان کا مفہوم یہ ہے کہ سوال انسان کی عزت و آبرو ختم کر دیتا ہے اس کے نفسیات کو متاثر کرتا ہے۔ اس پر فقر و ناداری کے دروازے کھول دیتا ہے۔ پس جہاں تک ہو سکے انسان دوسروں سے سوال نہ کرے لیکن اگر حقیقت میں محتاج ہو گیا ہو اور سوال کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو تو اسلام کے دستورات میں یہ بیان ہوا ہے کہ ہر کس و ناکس سے سوال نہ کرے بلکہ اس کے اہل سے سوال کرے۔

مسؤل کے خصوصیات

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

فوت الحاجۃ اھون من طلبھا الی غیر اھلھا

حاجت کا پورا نہ ہونا اس سے زیادہ آسان ہے کہ اسے نااہل سے طلب کیا جائے۔

نیز فرماتے ہیں:

ماءُ و جھك جامدٌ یقطرہ السوال فانظر عند من تقطرہ

تمہارے چہرہ کی آب ورونق برقرار ہے اسے سوال بہالیا جائیگا پس یہ دیکھو کہ اسے کس کے سامنے بہار ہے ہو۔

عزت وآبرو کو بچانے کیلئے سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن اگر سوال کرنے پر مجبور ہو جائے تو یہ دیکھ لے کہ کس کے سامنے اپنی آبرو کو پیش کر رہا ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

لاتسئل من تخاف منعه۔

اس شخص سے سوال نہ کرو کہ جس کے بارے میں تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ تمہاری حاجت پوری نہیں کرے گا۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں: **وقال عليه السلام: فوت الحاجة خيرمن طلبها من غير اهلها۔**

حاجت کا پورا نہ ہونا اس سے بہتر ہے کہ اس کو نا اہل سے طلب کیا جائے۔

حضرت امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

وقالؑ: انّما مَثَلُ الحاجة الىٰ مَنْ اصاب ماله حديثا كمثل الدرهم فى فم الافعى انت اليه محوج ، وانت منها على خطر۔

کسی نئے مال دار سے حاجت طلب کرنا ایسا ہی جیسے تم اژدھا کے منہ سے کوئی درہم نکالنا چاہو لیکن اس سے تمہیں خطرہ بھی ہے اپنی حاجتوں کو کریم وسخی اور خوش خلق لوگوں سے بیان کرو، بداخلاق اور لئیم سے بیان نہ کرو۔

اِنّ اعرابياً جاء الىٰ امير المومنين على عليه السلام فقال له : يا امير المومنين : انى ما خوذ بثلاث علل : علة النفس، و علة الفقر ، و علة الجهل تعرض على العالم و علة الفقر تعرض على الكريم ، فقال الاعرابى : يا امير المومنين!انت الكريم، وانت العالم وانت الطبيب فامر امير المومنين بان يعطىٰ له من بيت المال ثلاثه آلاف درهم ، و قال : تنفق الفا بعلة النفس ، ولافا بعلة

الجهل، والفا بعلة الفقر.

ایک عربی امیر المومنین کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کی: یا امیر المومنین! میں تین بیماریوں میں مبتلا ہوں ایک بدن کے درد میں، دوسرے فقر و ناداری میں، تیسرے جہالت و نادانی کے درد میں۔ آپؑ نے جواب دیا: اے عرب بھائی اپنے نفس و بدن کے درد کا طبیب و ڈاکٹر سے علاج کراؤ اور جہالت و نادانی کا علاج عالم سے کراؤ اور فقر و ناداری کا علاج سخی و کریم سے کراؤ۔ سائل نے عرض کی: آپ طبیب بھی ہیں عالم بھی ہیں اور کریم و سخی بھی ہیں آپؑ نے فرمایا: اسے بیت المال سے تین ہزار درھم دیئے جائیں۔ فرمایا: ہزار درھم میں مرض سے شفا پاؤ، ہزار درھم میں علم حاصل کرو اور ہزار درھم سے اپنی ناداری کو برطرف کرو۔

امام حسنؑ سے سوال

ایک سائل امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور زمین پر اپنی حاجت لکھ دی وہ امام حسن کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ لکھ رہا تھا:

لم يبق عندى ما يباع بدرهم　　　يكفيك منظر حالتى عن محبرى

الا بقايا ماء وجه صنته　　　الا يباع وقد وجدتك مشترى

میرے پاس کوئی چیز باقی نہیں ہے کہ جس کو درھم کے عوض فروخت کروں۔ میری حالت زار ہی آپ کے لئے کافی ہے۔ بس ایک میری آبرو ہے جس کو میں نے بچا رکھا ہے وہ نہیں بکی ہے اب میں نے اس کا خریدار آپ کو پایا ہے۔

امام حسنؑ نے اپنے خادم کو آواز دی اور معلوم کیا کہ تمہارے پاس کتنا مال باقی بچا ہے؟ اس نے جواب دیا میرے پاس بارہ ۱۲ ہزار درھم بچے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: یہ درھم اس ضرورت مند کو دیدو۔ مجھے اس سے شرم آتی ہے گویا خادم یہ کہنا چاہتا ہے کہ سارے درھم کیسے دیدوں؟! آپؑ نے فرمایا: اسے دیدو اور خدا کے بارے میں حُسن ظن رکھو جب اس نے درہم لا کر اسے دیدیئے تو امام حسنؑ نے اسے آواز دی

اور فرمایا: معاف کرنا ہمارے پاس اس سے زیادہ نہیں تھا۔ پھر یہ اشعار پڑھے:

عاجلتنا فاتاك وابل بونا　　طلاو لوامهلتنا لم نقصر

فخذ القليل وكن كانك لم تبع　　ما صنته و كاننا لم نشتر

تم عجلت وجلدی میں ہمارے پاس آئے اور تمہیں ہماری تھوڑی ہی بخشش مل سکی اور دوسرے وقت آتے اور ہم کو تھوڑی مہلت دیتے تو ہم کوتاہی نہ کرتے اس عطا کو لے لو گویا تم نے کوئی چیز فروخت نہیں کی ہے اور کوئی معاملہ انجام نہیں دیا ہے ہم نے تیری عزت و آبرو نہیں خریدی ہے۔[1]

انسان جو صدقہ دیتا ہے پہلے وہ خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے، صدقہ کے حق میں ہم نے اس موضوع سے متعلق کچھ روایات نقل کی ہیں۔ لہٰذا سائل پر احسان نہیں رکھنا چاہئے اور اس کی شخصیت کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے مذکورہ روایت کو دیکھئے کہ امام حسنؑ سائل کے ساتھ کس طرح پیش آئے ہیں۔ اولاً: جو کچھ گھر میں تھا وہ سب سائل کو دیدیا ثانیاً: کم عطا پر عذر خواہی کی اور اس طرح اپنے ماننے والوں کو یہ درس دیا۔

امام حسینؑ سے سوال

ابن عساکر نے اپنی تاریخ کبیر میں لکھا ہے: ایک سائل مدینہ کی گلیوں میں گردش کر رہا تھا یہاں تک امام حسینؑ کے دروازہ پر آیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور عرض پرداز ہوا!

لم يخب الان من رجاك ومن　　حركمن خلف بابك الحلقة

انت ذو الجود وانت معدنه　　ابوك قد كان قاتل الفسقة

ابھی تک کوئی بھی سائل آپؑ کی عطا سے مایوس نہیں ہوا، جس نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا یا وہ خالی ہاتھ نہیں پھرا۔ آپؑ صاحب جود و کرم ہیں، آپؑ سخاوت کا سرچشمہ ہیں اور آپؑ کے والد فاسقوں اور بدکاروں کو قتل کرنے والے ہیں۔

اس وقت آپ نماز میں تھے، آپؑ نے نماز کو اختصار کے ساتھ تمام کیا اور اس شخص کے پاس

---

[1] شرح رسالۃ الحقوق قبانچی ج ۲ ص ۵۰۴

آئے اور اس نادار فقیر کا زرد چہرہ دیکھا اور قنبر سے دریافت فرمایا: تمہارے پاس کتنا پیسہ ہے؟ عرض کی وہی دوسو درہم جن کے بارے میں آپ نے یہ فرمایا تھا کہ بچوں کو دیدینا۔ آپؑ نے فرمایا: ان سے زیادہ ضرورت مند آگیا ہے۔ لہٰذا لے آؤ قنبر لائے اور سائل کو دیدیئے اور سائل کے اشعار کے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

خذها فانّي اليك معتزر واعلم بانّي عليك ذو شفقة

اس عطا کو لے لو میں تم سے معذرت خواہ ہوں، جان لو کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تمہارا مہربان ہوں۔ اگر ہمارے ہاتھ موقعہ آگیا تو تمہارے اوپر ہماری عطا کی بارش ہوگی۔ لیکن زمانہ متغیر ہے اور ہمارے پاس (مال) دنیا کم ہے۔

اس اعرابی نے عطا کو لیا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا!

مطهرون نقيات جيوبهم۔ تجرى الصلواة عليهم اينما ذُكروا

وانتم انتم الاعلون عندكم علم الكتاب وما جائت به السور

من لم يكن علويا حين تنسبه فماله فى جميع الناس مفتخر

آپ اہل بیت کو طہارت و پاکی کا لباس وخلعت عطا ہوا ہے جہاں بھی آپ کا نام لیا جاتا ہے وہیں آپ پر درود بھیجا جاتا ہے۔ آپ سر بلند ہیں علم کتاب اور قرآن کے سورے اور خدا کی وحی آپ کے گھر میں اتری ہے۔ نسبت کے وقت جو شخص علوی نہ ہو لوگوں کے درمیان اس کیلئے کوئی فخر نہیں ہے۔

خوش کرنے والے کا حق

واما حق من سرّك الله وعلى يديه فان كان تعمّدها لك حمدت الله اولا ثم شكرته على ذلك بقدره في موضع الجزا وكافاته على فضل الابتداء و ارصدت له المكافاة، وان لم يكن تعمدها حمدت الله و شكرته و علمت انه منه، توحدك بها واحببت هذا اذاكان سببا من اسباب نعم الله عليك و ترجو له بعد ذلك خيراء فان اسباب النعم بركة حيث ماكانت و ان لم يتعمد، ولاقوة الابالله.

جس شخص کے ذریعہ خدا نے تمہیں خوش و مسرور کیا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اگر اس کا ارادہ تمہیں خوش کرنا تھا تو پہلے اس کا شکریہ ادا کرو اور پھر اسے اتنی جزاء دو کہ جتنا اس نے تمہیں خوش کیا ہے اور ہمیشہ اس کے احسان کا بدلہ چکانے کی فکر میں رہو اور اگر اس کا ارادہ تمہیں خوش کرنا نہیں تھا تو خدا کی حمد اور اس کا شکر ادا کرو اور یہ جان لو کہ یہ خوشی اسی کی طرف سے ہے اور چونکہ وہ تمہارے لئے خدا کی نعمتوں کا سبب بنا ہے اس لئے اس سے محبت کرو اور اس کے لئے خیر خواہ رہو۔ کیونکہ نعمتوں کے اسباب بھی نعمت ہیں چاہے کہیں بھی ہوں اور وہ اس کا قصد بھی نہ رکھتا ہو۔

زندگی کے مختلف حالات

جس دنیا میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس دنیا کے حالات مختلف ہیں۔ کبھی انسان کی زندگی رنج و غم اور مشکلات سے لبریز ہو جاتی ہے اور انسان کی کشتئی نجات کشتی شکن موجوں کی لپیٹ میں آجاتی ہیں جو کشتی کو ساحل تک پہنچنے میں مانع ہوتی ہیں۔ اور کبھی انسان کی زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے بھر جاتی ہے اور حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان پھولے نہیں سماتا ہے، اسلام و قرآن کا سعادت بخش دستور ان دونوں مرحلوں میں انسان کو افراط کے راستہ سے ہٹا کر اعتدال و میانہ روی پر لگاتا ہے۔

بہت زیادہ شکلوں میں گھرنے کے بعد بھی انسان کو خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہئے اور نجات کے تمام راستوں کو اپنے لئے بند نہیں سمجھنا چاہئے۔ اسی طرح خوشحالی اور نشاط و عیش کی زندگی میں بھی غافل

نہیں ہونا چاہئے اور خود کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ نتیجہ میں خدا کو فراموش کر دے بلکہ دونوں مرحلوں میں خدا کو یاد رکھنا چاہئے، خوشحالی کے زمانہ میں یہ سوچنا چاہئے کہ ساری نعمتیں خدا کی عطا کی ہوئی ہیں اور اگر لوگ اس کی طرف مائل ہیں تو یہ خیال کرلے کہ یہ خدا کی مرضی ہے اور اگر مشکلات وحوادث میں گھر جائے کہ جو انسان کی زندگی میں تعمیری اثر رکھتے ہیں تو بھی خدا پر نظر رکھنا چاہئے۔ مختصر یہ کہ رنج ومسرت میں افراط وتفریط سے بچنا چاہئے۔ جن چیزوں سے انسان خوش ہوتا ہے وہ ہے مقام ومنصب، مال ودولت اور اقتدار وتمکن اور کبھی دوسروں پر احسان کرنا بھی انسان کی خوشحالی کا سبب بنتا ہے۔ امام زین العابدینؑ نے اس بیان میں خوش کرنے والے کے حق سے متعلق مذکورہ جملے ارشاد فرماتے ہیں۔

مومنوں کو خوش کرنے کا ثواب

کتاب ''اصول کافی'' میں ایک باب ''ادخال السرور علی المومنین '' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں اصل سرور اور دوسروں کو خوش کرنے کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور اس کے ثواب سے متعلق کچھ روایات نقل ہوئی ہیں ہم یہاں ان سب سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

عن ابی حمزہ الشمالی قال: سمعت ابا جعفر علیہ السلام یقول : قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ : من سر مؤمنا فقد سرنی ومن سرنی فقد سر اللہ

ابوحمزہ ثمالی سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام محمد باقرؑ کو فرماتے ہوئے سنا رسولؐ کا ارشاد ہے: جس شخص نے کسی مومن کو خوش کیا، اس نے مجھے خوش کیا اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے خدا کو خوش کیا۔

جو انسان زندگی بھر ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس سے خدا اور رسولؐ کو خوش کیا جا سکے اور اس کے ذریعہ خدا اور رسولؐ کا تقرب وقربت حاصل کی جا سکے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ خدا اور رسولؐ کو خوش کرنے کا ایک طریقہ دوسروں کو خوش کرنا بھی ہے۔ اس کا معاشرہ کے اتحاد پر مثبت اثر ہوگا اور ان کے ذریعہ معاشرہ سے دشمنوں اور کدورتوں کو بھی برطرف کیا جا سکتا ہے۔ دوسری روایت میں

اس طرح نقل ہوا ہے۔

عن جابر عن ابی جعفر قال: تبسم الرّجل فی وجه اخیه حسنة و صرف القذیٰ عنه حسنة وما عبدالله بشیء احب الی الله من ادخال السرور علی المومن۔

جابر نے امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: کسی شخص کا اپنے بھائی کو ہنسانا ایک نیکی ہے اور مسلمان سے کسی نقصان وضرر کو برطرف کرنا ایک نیکی ہے اور جس چیز کے ذریعہ خدا کی عبادت کی جاتی ہے ان میں سے خدا کی نزدیک محبوب ترین چیز مومن بھائی کو خوش کرنا ہے۔

اس حدیث میں مومن کو ہنسانا اور اس سے قذیٰ کو برطرف کرنا بیان ہوا ہے (اور قذیٰ اس چیز کو کہتے ہیں جو آنکھ میں پڑ جاتی ہے) یہ حدیث مومنوں کی ایک دوسرے سے محبت پر دلالت کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ کہ اس حدیث میں مومن کے خوش کرنے کو عبادت شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے: کسی چیز کے ذریعہ خدا کی عبادت نہیں کی گئی کہ جو مومن کو خوش کرنے سے زیادہ خدا کو محبوب ہو۔ بنابرایں جو شخص کسی کو شاد وخوش کرنے کیلئے قدم اٹھاتا ہے درحقیقت وہ بہترین طریقہ سے خدا کی عبادت کرتا ہے۔

اس باب کی تیسری روایت میں امام باقرؑ فرماتے ہیں: حضرت موسیٰ بن عمران نے خدا سے جو مناجات کی تھی اس کے ذیل میں آیا ہے کہ خدا نے فرمایا: اے موسیٰ: میرے ایسے بندے موجود ہیں جن کیلئے میں نے اپنی جنت کو مباح کردیا ہے اور انہیں میں جنت میں حکومت عطا کرونگا۔ موسیٰ نے عرض کی: پروردگار جن لوگوں کا جنت میں یہ رتبہ ہے وہ کون ہیں؟ ارشاد ہوا: جس نے دوسرے مومن کو خوش کیا ہے۔

پھر یہ حدیث بیان کی:

اگر کوئی مومن ایسی جگہ زندگی گزارتا ہو جہاں کا حاکم ظالم وستمگر ہو اور وہ وہاں سے فرار کر کے ایسی جگہ جائے جہاں مشرکین بستے ہیں اور انہیں کی پناہ میں رہے تو خداوند عالم اسکی موت کے وقت اس پر وحی کرتا ہے کہ میرے بندے! اگر میری جنت میں تمہارے لئے جگہ ہوتی تو میں اس میں تمہیں جگہ دیتا لیکن جس نے کسی کو میرا شریک قرار دیا ہے اس کے لئے جنت حرام ہے۔ آگ کو حکم ہوگا اس کو اپنی گرفت میں لے لو لیکن اس کو اذیت نہ دینا اور صبح وشام اس کو اس کا رزق پہنچتا ہے۔ سوال کیا گیا: کہاں سے؟

فرمایا: جہاں سے خدا چاہتا ہے۔ یہ اس شخص سے مربوط ہے جو ظالم کی سرزمین سے نکل کر مشرکوں کی سرزمین پر چلا جائے اور ان کے رنگ میں رنگ جائے۔ یہی مفہوم، مضمون قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰه لا يَغْفِرُ اَنْ يشركَ به وَيَغْفِرُ ما دون ذالك لمن يشاء [۱]

بیشک خدا شرک کے گناہ کو معاف نہیں کرے گا اور جن کا گناہ شرک سے چھوٹا ہوگا ان میں سے جس کو چاہے گا بخش دے گا۔

اس حدیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو لوگ دوسروں کی خوشی و مسرت کے اسباب فراہم کرتے ہیں: وہ بہشت میں جائیں گے اور جنت میں ان کا خاص مرتبہ ہے۔ [۱]

چھٹی حدیث میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

عن ابی عبدالله قال: لایریٰ احدکم اذا ادخل علی مومن سرورا انه علیه ادخله فقط ، بل والله علینا، بل والله علی رسول الله صلی الله علیه وآله

امام صادقؑ فرماتے ہیں: تم میں سے جس شخص نے کسی مومن کو خوش کیا ہے وہ یہ تصور بھی نہ کرے کہ اس نے صرف مومن کو خوش کیا ہے بلکہ خدا کی قسم اس نے ہم کو بھی خوش کیا ہے خدا کی قسم اس نے رسولؐ کو بھی خوش کیا ہے۔

بیشک جب رسولؐ اور ہمارے ائمہ علیہم السلام یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ماننے والے ایک دوسرے سے محبت کر رہے ہیں اور ایک دوسرے پر مہربان ہیں اور ان کے معاشرہ میں محبت وخلوص کی حکمرانی ہے تو اپنے پیروؤں کی خوش حالی سے وہ بھی خوش ہوتے ہیں۔

انسان کی نجات میں سرور کا اثر

سدیر صیرفی نے امام صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: روز قیامت جب مومن کو قبر سے اٹھایا جائیگا تو اس کے سامنے اسی جیسا کہ ایک شخص بن جائیگا اور روز قیامت جتنے خوف و ہراس اس کے سامنے آئیں گے تو وہ شخص اس سے کہے گا کہ ڈرو نہیں، غم زدہ نہ ہو، خدا کی طرف سے ملنے والی مسرت وخوشی پر میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ شخص مستقل طور پر اس کے ساتھ رہے گا یہاں تک کہ حساب کے

لیے بارگاہ خدا میں حاضر ہوگا اس سے آسان حساب لیا جائیگا اور پھر حکم ہوگا کہ جنت میں چلے جاؤ وہ شخص اس مومن کے آگے آگے چلتا رہے گا تو مومن اس سے کہے گا: خدا تم پر رحم کرے جب سے میں قبر سے اٹھا ہوں اسی وقت سے تم میرے ساتھ ہو۔ تم نے مجھے خدا کی رحمت وخوش خبری دی۔ حساب میں میرے ساتھ رہے اسی طرح ہم یہاں تک آگئے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ وہ جواب دے گا میں وہ خوشی ومسرت ہوں جو تم نے دنیا کی زندگی میں مومن کے دل میں داخل کی تھی۔ خدا نے مجھے اسی مسرت وخوشی سے پیدا کیا ہے تا کہ میں تمہیں بشارت وخوشخبری دوں۔[1]

اس حدیث میں اعمال کا مجسم ہونا بیان ہوا ہے کہ ہر عمل مخصوص صورت میں جلوہ گر ہوگا۔ اور وہ دنیا میں مومن کو خوش کرنا انسان کے سامنے حسین وجمیل انسان کی صورت میں جلوہ گر ہو کر اس کے آگے آگے چلے گا اور خوف وہراس کی جگہ پر اس کے ہمت بندھائے گا اور ہمیشہ اسے خدا کے احسان وکرم کی خوشخبری دے گا۔

امام صادقؑ کے ماننے والے محنتی ہیں

کلینی نے محمد بن جمہور سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: انبار کے کسانوں میں سے ایک نجاشی بھی تھا۔ اسے اہواز وفارس کا حاکم مقرر کر دیا گیا تھا۔ نجاشی کا ایک کارندہ امام صادقؑ کے خدمت میں شرفیاب ہوا اور عرض کیا میں نجاشی کے بہت زیادہ ٹیکس کا مقروض ہو گیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آپؑ کا معتقد ہے اگر مناسب سمجھیں تو انھیں ایک خط لکھد یجیے تا کہ وہ میرا خیال رکھیں۔ امام صادقؑ نے اس طرح تحریر فرمایا۔

بسم الله الرحمن الرحيم. سَرّ اَخاكَ يَسُرُّكَ الله۔

اپنے بھائی کو خوش کرو خدا تمہیں خوش کرے گا۔

وہ آدمی امام صادقؑ کا خط لے کر نجاشی کے پاس پہونچا اور تنہائی میں خط اس کے حوالے کیا نجاشی نے امام صادقؑ کا خط دیکھا تو اسے بوسہ دیا اور کہا: تمہاری حاجت کیا ہے؟ میں نے کہا: مجھ سے دس

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۱۸۸

ہزار درہم ٹیکس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ نجاشی نے حکم صادر کیا کہ اس سے ٹیکس نہ لیا جائے۔ پھر معلوم کیا: کیا میں نے تمہیں خوش کر دیا؟ اس نے کہا: ہاں۔ نجاشی نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ اسے ایک سواری، ایک غلام اور ایک کنیز دی جائے۔ پھر معلوم کیا؛ کہ کیا تم خوش ہو گئے؟ اس نے عرض کی: ہاں میں خوش ہوں، پھر حکم دیا کہ جس قالین پر ہم بیٹھے تھے وہ بھی اس کو دے دی جائے۔ میں نے پورا واقعہ امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ بھی خوش ہوئے۔ میں عرض کی: آپ بھی خوش ہوئے ہیں؟ فرمایا: ہاں خدا کی قسم رسولؐ بھی خوش ہوئے ہیں۔[1]

دوسروں کو خوش کرنا ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتا ہے

عن ابی عبدالله قال: من ادخل علی مومن سروراً خلق الله عزوجل من ذلك السرور خلقا فیلقاه عند موته ، فیقول له : ابشر یا ولی الله بکرامة من الله و رضوان ، ثم یزال معه حتی یدخله (یلقاه) فیقول له مثل ذلك ، فاذا بعث یلقاه فیقول له مثل ذلك ، ثم لا یزال معه عند کل هول یبشره و یقول له : من انت فیقول: انا السرور الذی ادخلته علی فلان.

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جس نے کسی مومن کو خوش کیا خداوند عالم اس سرور سے ایک خوش اخلاق آدمی پیدا کر دیتا ہے کہ جو مرتے دم اس کے پاس جاتا ہے اور اسے خدا کی کرامت و رضوان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مستقل طور پر اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے یہاں تک اس کے ساتھ قبر میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اسے وہی بشارت دیتا ہے اور جب قبر سے اٹھایا جاتا ہے تو بھی یہی جملے کہتا ہے اور خوف وہراس کے موقعہ پر اس کی دلجوئی کرتا ہے اور اسے بشارت دیتا ہے۔ جب یہ اس کی طرف سے اتنی محبت و مہربانی دیکھتا ہے تو معلوم کرتا ہے: خدا تم پر رحم کرے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ وہ کہتا ہے: میں وہ وہ سرور ہوں جو تم نے فلاں فلاں مومن کے دل میں پیدا کیا تھا۔

اس باب کی آخری روایت میں ہشام نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے:

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۱۹۱-۱۹۲

عن هشام بن الحكم، عن ابی عبدالله قال: مِن احبّ الاعمال الى الله عز و جل ادخال السرور على المؤمن : اشباع جوعته او تنفيس كربته او قضاء دينه.

ہشام بن الحکم نے امام صادق سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: خدا کے نزدیک محبوب ترین عمل مومن کو خوش کرنا ہے۔ پھر خوش کرنے کے مصادیق کو اس طرح بیان فرماتے ہیں: اگر وہ بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھلایئے اور مشکلات سے نجات دلایئے اور اگر مقروض ہو تو اس کا قرض ادا کرے۔

ان روایات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام ہی دنیا و آخرت کا دین ہے، صرف آخرت ہی کا دین نہیں ہے۔ بہترین معاشرہ وہ ہے کہ جس کے افراد ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے حسد و دشمنی نہیں رکھتے ہیں۔ ان روایات میں ہمارے معصوم ائمہ نے اپنے پیروؤں کو ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی تاکید کی ہے تاکہ ان کے معاشرہ میں مدینہ فاضلہ وجود پذیر ہو جائے۔

اس کا حق جس نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے

واما حق من ساء ك القضا على يديه بقول او فعل،فان كان تعمدها كان العفو اولى بك لما فيه له من القمع و حسن الادب مع كثير امثاله من الخلق ، فان الله يقول : ولمن النتصر بعد ظلمه فاولئك ما عليهم من سبيل ـالى قوله :ـمن عزم الامور وقال عز و جل : وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به و لئن صبرتم لهو خير للصابرين،هذا فى العمد :فان لم يكن عمدالم تظلمه بتعمد الانتصار منه فتكون قد كافاته فى تعمد على خطا، و رفقت به و رددته بالطف ما تقدر عليه ، ولا قوة الا بالله۔

لیکن اس کا حق کہ جس نے قول وفعل سے تمہارے ساتھ برائی کی ہے۔ اگر اس نے جان بوجھکر ایسا کیا ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس سے درگزر کرو تا کہ کدورت کی جڑ کٹ جائے اور خلق خدا میں سے اس جیسے بہت سے لوگوں کے ساتھ شائستہ طریقہ سے پیش آؤ کیونکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: جس نے اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد انتقام لے لیا تو اس پر کوئی الزام نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ نیز ارشاد ہے: یہ کام صحیح ہے پھر فرمایا ہے: اگر سزا دو تو ویسی ہی سزا دو جیسی تمہیں دی گئی تھی لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ صابروں کیلئے بہتر ہے یہ تو عمدی صورت میں ہے۔

لیکن اگر اس نے جان بوجھکر بدی نہ کی ہو تو تم جان بوجھ کر اس پر ظلم نہ کرو اگر تم جان بوجھ کر اس کے ساتھ بدی کرو گے تو خطا کار قرار پاؤ گے۔ جہاں تک ہو سکے اس کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور اس کے ساتھ محبت آمیز سلوک کرو۔

اس حق کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارے ساتھ کسی نے بدتمیزی کی ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا جان بوجھکر کی ہے تو بہتر ہے کہ اسے معاف کر دو بشرطیکہ وہ معافی سے غلط فائدہ نہ اٹھائے۔ لیکن اگر غلطی سے بدتمیزی کی ہے اور تم اسے سزا دینا چاہتے ہو تو یہ غیر عمدی فعل کے مقابلہ میں عمدی ہو گی۔ بہتر ہے کہ لطف و مہربانی کے ساتھ اس کی غلطی کو معاف کر دو۔

عفوودرگزر کی دعوت

ایسے لوگ بہت ہیں کہ جن سے بھول چوک، غلطی و اشتباہ نہ ہوا ہو اور ان سے دوسروں کے حقوق ضائع نہ ہوئے ہوں، اور اگر ہر آدمی یہ طے کر لے کہ اسے جب بھی موقعہ ملے گا اسی وقت اس کا انتقام لے گا تو یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جائیگا اور روز بروز اس میں شدت پیدا ہوتی چلی جائے گی کیونکہ انتقامی حملوں پر کمیت و کیفیت کے لحاظ سے قابو نہیں پایا جا سکتا بلکہ جو حملہ ردعمل کے طور پر ہوتا ہے اس میں زیادہ شدت ہوتی ہے۔ دوسرے بالفرض اگر اس کا اندازہ لگانا ممکن ہو اور اس پر قابو پایا جا سکتا ہو تو پہلے حملہ وظلم کی مقدار، ظالم ومظلوم کے لحاظ سے برابر نہیں ہوگی۔ بنابرایں اگر مد مقابل سے انتقام لینے پر ابھارے گی اور اس طرح انتقام در انتقام کا سلسلہ شروع ہو جائیگا۔ فتنہ وفساد اور انتقام کی آگ کو صرف عفوودرگزر کرنا اور چشم پوشی ہی بجھا سکتی ہے۔ اگر ہم صحیح طریقہ سے تحقیق و تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انتقام لینے میں انتقام لینے والے کیلئے کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی جس کو عقل صحیح قرار دیتی ہو، صرف وقتی طور پر اسے ایک تسکین ہو جاتی ہے اور کبھی ایک خیالی برتری مل جاتی ہے جبکہ عفوودرگزر کرنے میں حقیقی سکون و آرام حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی منابع خصوصاً قرآن میں اس موضوع کی طرف لطیف اشارہ ہوا ہے اور اس کو اسلامی فریضہ قرار دیا ہے۔ ہم اپنی اس بحث کے آغاز میں ان آیات کو بیان کریں گے جن کو امام زین العابدینؑ نے اپنے کلام کے متن میں بیان کیا ہے۔

مومنین سے مدد طلب کرنا

مدد طلب کرنا مومن ہونے کی علامت ہے۔ سورہ شوریٰ میں ارشاد ہے:

والذین اِذا اصابھم البغی ھم ینتصرون [1]

اور وہ لوگ کہ جن پر اگر ظلم ہوتا ہے تو وہ اس کو برداشت نہیں کرتے بلکہ دوسروں سے مدد طلب کرتے ہیں۔ واضح ہے کہ ان لوگوں کو مدد کرنا چاہئے جن سے مدد مانگی جا رہی ہے۔ مظلوم کا یہ فرض ہے کہ وہ ظالم کے مقابلہ میں مقاومت کرے اور دوسرے مومنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اسکی مدد کریں۔ یہ بات

---

[1] شوریٰ: ۳۹

سورہ انفال میں بیان ہوئی ہے:

وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر [۱]

اگر دین کی حفاظت کیلئے تم سے مدد طلب کریں تو تم ان کی مدد کرو۔

یہ مثبت اور تعمیری منصوبہ ظالموں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ مومنین اپنے اہم مذہب پر ہونے والے ظلم و تشدد پر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ سورہ شوریٰ میں پتھر کا جواب پتھر کے بارے میں ارشاد ہے:

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا فمن عفاو اصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین۔ [۲]

بدی کی سزا اسی جیسی ہے پس جو آدمی معاف کر دیتا ہے اور اصلاح کرتا ہے تو اس کا اجر خدا پر ہے اور خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا ہے۔

ظالم کی حرکت کو ظلم ہی کہنا چاہئے۔ جیسا کہ اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ لیکن اس کی سزا سیئہ ہی نہیں ہے۔ اگرچہ مذکورہ آیت میں سیئہ ہی مذکور ہے۔ اس کی وجہ قرینہ مقابلہ ہے یا یہ ظالم کے نقطۂ نگاہ سے ہے یعنی اس کو جو سزا دی جاتی ہے وہ اس کو سیئہ سمجھتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے سزا میں ایذا و آزار ہوتا ہے جو کہ طبیعی طور پر برا ہے اگرچہ قصاص کے وقت ظالم کو سزا دینا صحیح اور مستحسن ہے۔ یہ آیت سورہ بقرہ کی اس آیت کے مشابہ ہے:

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین [۳]

پھر جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور یہ جان لو کہ خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

مدد مانگنا عیب نہیں ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

ولمن انتصر بعد ظلمہ فاولئک ما علیھم من سبیل [۴]

---

[۱] انفال: ۷۲ [۲] سورہ شوریٰ: ۴۰ [۳] بقرہ: ۱۹۴ [۴] شوریٰ: ۴۱

اور جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد مدد طلب کرتا ہے اس کا کوئی جرم نہیں ہے۔

عفوودرگذر کرنا بہترین طریقہ

امام زین العابدینؑ دوسری آیت بیان فرماتے ہیں:

ولمن صبرَ وغَفَرَ إنَّ ذالك لمن عزم الامور

لیکن جو مظلوم صبر کرتے ہیں اور ظلم کرنے والے کو معاف کر دیتے ہیں تو یہ بہترین کام ہے۔

''عزم'' یعنی کسی کام کو انجام دینے کا ارادہ کرنا بلکہ عزم، محکم و پختہ ارادہ کو کہتے ہیں۔ آپؑ نے دوسری آیت سورہ نحل کی بیان کی ہے:

وان عَاقَبتم فعاقِبوا بِمِثل ماعوقبتم به ولئن صَبَرتم لهو خَيرٌ للصابرين[1]

اور اگر تم ان کو سزا ہی دینا چاہتے ہو تو اتنی ہی سزا دو جتنی انہوں نے تم پر زیادتی کی ہے اور اگر صبر کرو تو یہ کام صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ یہ آیت جنگ احد میں نازل ہوئی تھی۔ جب رسولؐ نے اپنے چچا حضرت حمزہ کے بدن کو مثلہ دیکھا تو بہت رنجیدہ اور غم زدہ ہوئے اور فرمایا: اے اللہ! ساری تعریف تیرے ہی لیے ہے اور تجھ ہی سے شکایت کی جا سکتی ہے اور جو میں دیکھ رہا ہوں اس پر تجھ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے پھر فرمایا: اگر میں ان پر غالب آ گیا تو انھیں مثلہ کروں گا، ستر مرتبہ یہی لفظ دہرایا یہاں تک کہ رسولؐ پر یہ آیت نازل ہوئی تو رسول نے فرمایا: میں صبر کرونگا میں صبر کرونگا[2]

عفو اور صفح کا فرق

سورہ نور میں ارشاد ہے:

ولا يأتل اولوالفضل منكم والسعة ان يؤتوا اولى القربىٰ والمساكين

[1] نحل ۱۲۶ [2] تفسیر نمونہ ج ۱۱ ص ۴۵۷

والمهاجرين في سبيل الله وليعفوا وليصفحوا الا تحبون ان يغفر الله لكم والله غفور رحيم [1]

اور تم میں سے جو لوگ مالی لحاظ سے برتری رکھتے ہیں اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ یہ قسم نہ کھائیں کہ اپنے قرابت داروں، مسکینوں اور راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو کچھ نہ دیں گے، انھیں عفو و درگذر کرنا چاہیے۔ کیا تمھیں یہ پسند نہیں ہے کہ خدا تمھیں بخش دے؟ اور خدا غفور رحیم ہے۔ یہ آیت سورہ نور میں واقعہ "افک" کے بعد ہے۔ اس آیت میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ جس طرح تم میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ خدا اس کے گناہ سے درگذر کرے تو اسے اپنے ان حقوق سے چشم پوشی کرنا چاہیے جو ایک دوسرے سے ٹکرانے کے نتیجہ میں حاصل ہوتے ہیں۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ "عفو و صفح" کے لغوی معنی میں فرق یہ ہے۔ راغب کہتے ہیں: صفح، عفو سے بلند مرتبہ رکھتا ہے کیونکہ عفو، ملامت و سرزنش اور قہر وغیرہ کے بغیر ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص معمولی انتقام لینے سے پرہیز کرتا ہے لیکن زبان سے اس کے جرم کو بیان کرتا رہتا ہے درحقیقت اس نے عفو نہیں کیا ہے۔

برائی کا بدلہ اچھائی سے

قرآن مجید میں عفو و درگذر سے اہم و بلند مرحلہ بھی بیان ہوا ہے اور وہ ہے برائی کا بدلہ نیکی و اچھائی کے ساتھ دینا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یہ عمل روح انسانی کی بلند ترین تجلی ہے جس کے لیے روح کی خاص لطافت اور اخلاق کی بالیدگی کی ضرورت ہے اور یہ بہترین سبق ہے جو مجرم کو دیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعہ عداوتوں اور دشمنیوں کو ختم کیا جا سکتا ہے سورہ فصلت میں اس کی بہترین توجیہ بیان ہوئی ہے:

ولا تستوی الحسنة ولا السيئة۔

خوبی و بدی مساوی نہیں ہیں بہترین اور شائستہ طریقہ سے دفاع کیجیے کہ اس سے دشمن بھی تمہارا دوست بن جائیگا اور یہ کام وہی انجام دے سکتا ہے جو صبر و مقاومت کی طاقت و قوت رکھتا ہو اور اس مرتبہ پر وہی پہنچ سکتا ہے جس میں انسانیت کا جوہر ہو۔

---

[1] نور: ۲۲۔

اس آیت میں پہلا معجزہ نما اثر، بہترین طریقہ سے دفاع بیان ہوا ہے، اس کے ذریعہ بڑے بڑے دشمنوں کو دوست بنایا جا سکتا ہے لیکن اس مرتبہ پر وہی فائز ہو سکتا ہے جو ایمان وتقوے اور علمی واخلاقی فضائل سے آراستہ ہو اور خواہشات نفس پر صبر کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور یہ دونوں ناقابل انکار حقیقت ہیں۔

شائستہ طریقہ سے دفاع، دشمنی کو ختم کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مد مقابل یہیں سے انتقام لینے کے درپے ہوتا ہے اور اکثر خود کو انتقام کا مستحق سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف جب ان کی بدی و برائی کا جواب نیکی اور اچھائی سے دیا جاتا ہے تو ان کی سوئی ہوئی وجدانی طاقت بیدار ہو جاتی ہے اور اندر سے وہ خود ان کے مقابلے میں صف آرا ہو جاتی ہے اور اس کا ضمیر خود مد مقابل کی بے گناہی اور اپنی خطا کاری کی گواہی دیتا ہے اور انہیں اپنا راستہ بدلنے پر مجبور کرتا ہے۔

طاقت کے باوجود معاف کرنا

معاف کرنا اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص انتقام لینے کی طاقت وقدرت رکھتا ہو اور وہ اپنے غصہ کو پی جائے اور انتقام نہ لے لیکن جس کے اندر انتقام لینے کی طاقت وقدرت نہ ہو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے فلاں شخص کو معاف کر دیا اس بات کے ثبوت کے لیے دو نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت یوسف کا معاف کرنا

قرآن حضرت یوسف اور ان کے خطا کار بھائیوں کا قصہ بیان کرتا ہے۔ جب وہ تیسری دفعہ مصر گئے اور یوسف کے بھائی ہونے کے لحاظ سے ان کے تعارف کے لئے زمین ہموار ہوگئی تو انہوں نے کہا:

قالوا اِنّکَ لانت یوسف،قال انا یوسف و ھذا اخی قد منّ اللّٰہ علینا انّہ من یتقِ و یصبر فانّ اللّٰہ لا یضیعُ اجر المحسنین [1]

---

[1] یوسف: ۹۰

کیا آپ ہی یوسف ہیں؟ فرمایا: میں ہی یوسف ہوں! اور یہ میرا بھائی ہے خدا نے مجھ پر احسان کیا ہے بیشک جو شخص پرہیز گاری اور صبر سے کام لیتا ہے تو خدا بھی نیکی اور احسان کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

اس وقت یوسف نے انہیں ان کی گزشتہ خطائیں یاد دلائیں اور ان سے پوچھا: اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ انہوں نے کہا یوسف! ہم خطا کار ہیں آپ کو حق ہے کہ ہم کو جو سزا چاہیں دیں لیکن کرم فرمائیں اور ہماری خطاؤں کو معاف کر دیجئے۔ یوسف نے فرمایا:

لا تثریب علیکم الیومَ یَغفِرُ اللّٰہُ لکم وھو ارحم الراحمین [1]

آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے، خدا تمہیں معاف کرے اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

اس قصہ میں حضرت یوسف انتقام لینے پر قدرت رکھتے ہیں لیکن انہیں معاف کر دیتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں معاف کرنا۔

فتح مکہ میں رسولؐ کا معاف کرنا

ہجرت کے آٹھویں سال رسولؐ نے مکہ کا محاصرہ کیا اور شہر میں داخل ہوئے۔ جب مسجد الحرام میں داخل ہوئے حجر اسود کو چوما اور فرمایا: جاء الحق و زھق الباطل اِنَّ الباطلَ کانَ زھوقا حق آ گیا، باطل چلا گیا بیشک باطل برباد ہونے والا ہی تھا۔ اس کے بعد آپؐ نے بتوں کو توڑنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس کے بعد لاالٰہ الاّ اللّٰہ وحدہ وحدہ پڑھا اور مکہ والوں سے فرمایا: ماذا تقولونَ وماذا تَظُنُّونَ تم کیا کہتے ہو اور تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا: ہم نیک بات کہتے ہیں اور نیک امید و توقع رکھتے ہیں! آپؐ ہمارے کریم و بخشنے والے بھائی اور کریم کے فرزند ہیں۔ آج آپؐ فتح یاب ہیں۔

رسولؐ نے فرمایا: آج میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا:

---

[1] یوسف: ۹۲

لا تثریب علیکم الیومَ یَغفِرُ اللّٰہُ لکم وھو ارحم الراحمین آج تمہارے لئے کوئی خوف وخطر نہیں ہے۔ اور سب کو معاف کر دیا اور فرمایا: جاؤ میں نے تم سب کو آزاد کیا۔ رسولؐ اس وقت اقتدار و قدرت کی بلندی پر ہیں اگر چاہیں تو ان سب کو قتل کر سکتے ہیں لیکن صرف انہیں لوگوں سے انتقام لیا کہ جنہوں نے انسانیت سوز مظالم کئے تھے اور باقی لوگوں کو معاف کر دیا۔[۱]

اس سلسلہ میں حضرت علی بن ابی طالب فرماتے ہیں:

عند کمال القدرۃ تظھر فضیلۃ العفو[۲]

اس وقت عفو و بخشش کی فضیلت آشکار ہوتی ہے جب ہر قدرت حاصل ہو۔

یہ بھی مذکورہ مطلب ہی کی طرف ایک اشارہ ہے کہ عفو اس جگہ ہوتا ہے جہاں انتقام لینے پر قدرت ہوتی ہے ورنہ جس میں طاقت نہ ہو وہ معاف نہیں کرے گا تو کیا کرے گا۔ دوسرے جملہ میں فرماتے ہیں:

احسنُ العفو ما کانَ عن قدرۃٍ[۳]

بہترین عفو وہ ہے جو طاقت و قدرت کے ہوتے ہوئے کیا جاتا ہے۔

نہج البلاغہ کے کلمات میں فرماتے ہیں:

اذا قدَرتَ علیٰ عَدُوّکَ فاجعل العفوَ عَنہُ شُکراً للقدرۃ علیہ۔

جب اپنے دشمن پر غالب آجاؤ تو اس غالب آنے کا شکر یہ ہے کہ اس کو معاف کر دو۔

بیشک آزاد منش لوگوں کی بلند حوصلگی اسی کا اقتضا کرتی ہے کہ وہ طاقت و تسلط رکھتے ہوئے بھی انتقام لینے سے گریز کرتے ہیں اور مد مقابل کو معاف کر دیتے ہیں اور اسکے اندر تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں۔

۱۔ تاریخ پیامبر وسلام ص ۳۲۴ ۲۔ شرح غررودرر ج ۴ ص ۳۲۴ ۳۔ ایضاً ج ۲ ص ۴۳۵

ہم مذہب کا حق

وامّا حق اهل ملتك عامة فاضمار السلامة و نشر جناح الرحمة والرفق بمسيئهم و تالفهم واستصلاحهم و شكر محسنهم الى نفسه واليك ، فان احسانه الىٰ نفسه احسانه اليك اذا كف عنك اذاه و كفاك مؤونته و حبس عنك نفسه ،فعمهم جميعا بدعوتك وانصرهم جميعا بنصرتك و انزلتهم جميعا منك منازلهم ، كبيرهم بمنزلة الوالد و صغيرهم بمنزلة الولد واوسطهم بمنزلة الاخ، فمن اتاك تعاهدته بلطف و رحمة ، وصل اخاك بما يجب للاخ علىٰ اخيه۔

عام طور سے تمہارے ہم مذہب کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تہ دل سے ان کی خیریت وسلامتی طلب کرو اور ان کے لئے رحم ومہربانی کے پر پھیلاؤ اور ان کی خاطر تواضع کرو ان سے انس والفت پیدا کرو، ان کی اصلاح کرو اور اس کا شکریہ ادا کرو کہ جس نے اپنے، ان کے اور تمہارے اوپر احسان کیا ہے کیونکہ اس کا اپنے اوپر احسان کرنا ایسا ہی ہے جیسا تمہارے اوپر احسان کیا ہو اس لئے کہ تمہیں اذیت وتکلیف نہیں دی ہے اور اپنے خرچ سے تمہیں بے نیاز رکھا ہے اور اپنے کو تم سے باز رکھا ہے پس تم ان سب کے لئے دعا کرو اور اپنی نصرت سے ان سب کی مدد کرو اور ان میں سے ہر ایک کیلئے ایک مخصوص مقام و مرتبہ قرار دو۔ ان کے بزرگ کو اپنے والد کی جگہ سمجھو اور ان کے بچوں کو اپنی اولاد کے برابر سمجھو اور درمیانی عمر والے کو اپنا بھائی قرار دو اور جو بھی تمہارے پاس آئے ،لطف ومہربانی سے اس کی دل جوئی کرو اور اپنے بھائی کو بھائی کے حق سے مالا مال کردو۔

مِلّت کے لغوی معنی

مَلّت کا لفظ واحد ہے ''ملل'' اس کی جمع ہے جس کے معنی مذہب ،عقیدہ، ایمان، آئین، جماعت، فرقہ لکھے ہیں: فاتّبعوا مِلّةَ ابراهيمَ حنيفاً اس کی اصل ''املَلْتُ الْكتابَ'' ہے اور دین کو اس لئے ملت کہتے ہیں کہ دین خدا کی طرف سے املا ہوا ہے۔[1]

---

[1] قاموس قرآن ج ۶ ص ۲۸۹

ملت دین کے مانند ہے اس شریعت کا نام ہے جس کو خدا نے انبیاء کی زبان سے لوگوں کے لئے بھیجا ہے۔ ملت اور دین میں یہ فرق ہے کہ ملت کی نسبت صرف رسول کی طرف دی جاتی ہے نہ خدا کی طرف نہ امت کی طرف، یہ نہیں کہا جاتا: ملتِ خدا، ملتِ زید ہاں دینِ خدا اور دینِ زید کہا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ دین کی نسبت خدا، نبی اور امت تینوں کی طرف دی جاتی ہے جبکہ ملت کی نسبت صرف دین لانے والے کی طرف دی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں کبھی قوم اور اسکے طریقہ کی طرف بھی اس کی نسبت دی جاتی ہے۔ مثلاً حضرت یوسف کہتے ہیں:

انیّ ترکت ملّتَ قومٍ لا یومنون باللّٰہ واتبعت ملۃ آبائی ابراھیم و اسحق ویعقوب.

میں نے ایسے لوگوں کو چھوڑا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔۔۔ میں نے اپنے اباواجداد ابراہیم واسحٰق اور یعقوب کی ملت (سنت) کا اتباع کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

ما سمعنا بھذا فی الملۃ الاخرۃ ان ھذا الا اختلاق۔

یعنی ہم نے یہ باتیں آخری دین میں نہیں سنی ہیں، یہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں ہے۔

ملت کا اطلاق بت پرستوں کے طریقہ پر بھی ہوا ہے۔

وقد افترینا علیٰ اللّٰہ کذبا ان عدنا فی ملتکم۔

لغوی بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ اس بیان میں امام زین العابدینؑ ہم مذہب وہم مسلک کی وضاحت فرما رہے ہیں بعبارت دیگر ملت اسلام سے بحث ہے۔

اسلام اور معاشرہ کی اہمیت

اسلام کے زاویہ نگاہ سے انسان مدنی الطبع ہے، مل جل کر زندگی گزارنے کا عادی ہے، انسان کے تکامل کو اسلام معاشرہ کے تکامل کے زیر سایہ قرار دیتا ہے یہ مسئلہ قرآن کے خطاب سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے اس سلسلہ کی چند آیتیں ملاحظہ ہوں:

منحرف راستوں سے پرہیز

وَاَنَّ ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعواالسبل فتفرق بکم عن سبیلہ ذلکم وصیکم بہ لعلکم تتقون۔

بیشک یہ میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلو دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ نتیجہ وہ تمہیں حق سے دور کردیں گے یہ وہ چیز ہے جس سے خدا تم کو وصیت کررہا ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

اس آیت میں خدا پوری جماعت سے گفتگو فرما رہا ہے کسی فرد سے نہیں۔

اتحاد و ہم آہنگی کی دعوت

۔ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا بعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداۂ فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔

اور اللہ کی رسّی کو مضبوط طریقہ سے پکڑلو اور تفرقہ اندازی نہ کرو اور تم پر جو خدا کی نعمت ہے اس کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں محبت والفت پیدا کردی اور اس نعمت کی برکت سے تم بھائی بھائی ہوگئے۔

اس آیت میں اتحاد، اخوت و برادری سے بحث ہے، جو کل دشمن تھے آج وہ بھائی بھائی ہیں، اس اتحاد و نظم سے غیر انگشت بدنداں ہیں مثلاً برطانیہ کا مشہور دانشور جان ڈیون پورٹ لکھتا ہے: ایک سادہ عرب محمد نے تفرقہ کا شکار چھوٹے چھوٹے ننگے، بھوکے قبیلوں کو منظم معاشرہ میں تبدیل کردیا اور روئے زمین پر بسنے والی ملتوں کے درمیان ان کا تعارف نئے اخلاق سے آراستہ قوم کے عنوان سے کرایا اور تیس سال سے کم مدت میں قسطنطنیہ کی شہنشاہیت کو مغلوب کیا اور ایران کے بادشاہوں کو شکست دی، شام، بین النہرین اور مصر کو فتح کیا اور بحر اطلس سے لے کر دریائے خزر و جیحون تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ [۱]

ہندوستان کا سیاست مدار آنجہانی نہرو لکھتا ہے: عرب کی سرگزشت وداستان اور یہ کہ وہ یورپ اور افریقہ تک اتنی جلد کیسے پھیل گئے اور عظیم تہذیب کیسے وجود بخشا یہ تاریخ بشری کے عجوبوں میں

---

[۱] عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمد و قرآن، ترجمہ سید غلام رضا سعیدی ص ۷۷

سے ہے۔ جس نئی طاقت وفکر نے عربوں کو بیدار کردیا اور انھیں اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھا دیاوہ اسلام ہی تھا۔ اس مذہب کا آغاز نئے رسول محمدؐ سے ہوا جس نے ۵۷۰ء میں مکہ میں ولادت پائی[1]

یہ تھے اس سلسلہ کے دو نمونے جو ہم نے سپرد قلم کردیئے ہیں اور دوسرے دانشوروں کے اتنے زیادہ اعترافات ہیں کہ ان کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

تفرقہ کی ممانعت

لاتکونوا کالّذین تفرقوا واختلفوامن بعد ما جائهم البینات واولئك لهم عذاب عظیم۔

ان لوگوں کی مانند نہ ہو جاؤ کہ جو متفرق ہوگئے اور اختلاف کرنے لگے جبکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی تھیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے سخت عذاب ہے۔

اس آیت میں اتحاد پر زور دیا گیا ہے اور تفرقہ ونفاق سے بچنے کی تاکید ہوئی ہے، اگلی قوموں، یہود ونصاریٰ کی مانند مسلمانوں کو تفرقہ واختلاف میں نہیں پڑنا چاہیے۔ تفرقہ سے اجتناب کرنے پر قرآن اس لیے زور دیتا ہے کہ اگر ایسا ہوگا تو مسلمانوں کی عظمت وعزت خاک میں مل جائیگی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

اطیعوالله ورسوله ولاتنازعوا فتفشلوا و تذهب ریحکم واصبروا ان الله مع الصابرین۔

اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور جھگڑا ونزاع مت کرو کہ تم سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائیگی۔ صبر سے کام لو بیشک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں رہبر وقائد کے کردار، اس کی اور اس کے حکم کی اطاعت اور نزاع وتفرقہ سے پرہیز کرنے کو بیان کیا ہے کیونکہ نزاع وفساد کے نتیجہ میں تم کمزور ہو جاؤ گے عظمت وعزت چلی جائیگی اس لئے کہ منزل مراد پر کشتیوں کو ہمیشہ باد موافق ہی پہنچاتی ہے اور ہوا ہی سے پرچم لہراتا ہے کہ جس سے

---

[1] نگاہی بہ تاریخ جہان ترجمہ محمود تفضلی ج ۱ص۳۹۰

حکومت کی طاقت وقدرت کا پتہ چلتا ہے۔

اخوت وبرادری مسلمانوں کا شعار ہے

جہاں قرآن نے ہم کو گذشتہ آیات میں جدائی اور کشمکش سے روکا ہے اور اس کے بھیانک نتائج کو ہمارے گوش گزار کیا ہے وہیں مسلمانوں کے معاشرے کو اخوت وبرادری کی بھی دعوت دی ہے ارشاد ہے:

انما المومنون إخوةٌ فاصلحوا بَيْنَ أَخَوَيْكم [1]

مومنین تو بس بھائی بھائی ہیں، اگر ان میں اختلاف ہوجائے تو سارے مومنین کا فریضہ ہے کہ ان میں صلح کرائیں اور انہیں یہ سمجھائیں کہ پورا اسلامی معاشرہ ایک ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان اجتماعی زندگی گذارنے کا عادی ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ معاشرے کے لوگ اپنے نفع کے چکر میں رہتے ہیں، اس سے ٹکراؤ اور نزاع ہوتی ہے، کون سا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے اختلاف سے محفوظ رہیں؟ اسلام کے کتب اخلاقی میں کچھ ایسے دستورات ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو وہ انسان کے محفوظ رہنے کا سبب ہونگے۔ اصول کافی میں دو باب ہیں: باب مدارات اور باب رفق، ان دو ابواب کی چند روایات ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

علی بن ابراہیم نے امام صادقؑ سے اور آپ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ فرمایا: اگر کسی شخص میں تین چیز، ایسا ورع جو اسے خدا کی نافرمانی سے باز رکھے، ایسا اخلاق جس سے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک ومدارات کرے اور ایسا علم وبردباری، نہ ہو جو جاہل کی جہالت کو روک سکے، تو اس کا کوئی عمل کامل نہیں ہوگا۔ [2]

دوسری روایت: محمد بن یحیٰی نے حسین ابن حسن سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام محمد باقرؑ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جبرئیل رسول کی خدمت میں شرفیاب ہوئے اور عرض کی: اے رسولؐ! آپ کا پروردگار آپ پر سلام بھیجتا ہے اور فرماتا ہے: میرے بندوں کی باتوں کو برداشت کیجئے اور رعایت

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۱۱۶ [2] اصول کافی ج ۲ ص ۱۱۶

فرمائیں۔[1]

ابوعلی اشعری نے امام صادق سے روایت کی ہے آپ نے کہا: رسولؐ نے فرمایا: میرے پروردگار نے مجھے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، اچھی معاشرت اوران کی رعایت کرنے کا حکم دیا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے واجبات کا حکم دیا ہے۔[2]

رفق ونرمی اوراس کے آثار

ہم پہلے بیان کر چکے کہ شیخ کلینیؒ نے اپنی کتاب اصول کافی میں ایک باب، رفق کے عنوان سے قائم کیا ہے ہم یہاں اس کی چند روایات تحریر کریں گے اوراس بات کی وضاحت کریں گے کہ رفق کے معنی بھی مدارات کے معنی سے قریب ہیں کیونکہ مدارا کے معنی لوگوں سے حسن سلوک سے پیش آنا اوران کے ساتھ مہربانی ونرمی برتنا اوران کی سخت باتوں کو برداشت کرنا ہیں، لیکن کبھی ان دونوں میں فرق بھی ماننا پڑتا ہے اور وہ اس لحاظ سے مدارا لوگوں کی اذیتوں کو برداشت کرنا ہے جبکہ رفق میں یہ بات نہیں ہے، علامہ مجلسی اپنی کتاب ''مراۃ العقول'' میں تحریر فرماتے ہیں:

رفق، نرمی ومہربانی سے عبارت ہے، یعنی لوگوں کے ساتھ ہر حال میں نرمی سے پیش آئے سختی وغصہ سے نہیں[3] امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ہر چیز کا ایک قفل ہوتا ہے اور ایمان کا قفل رفق ہے۔

اس حدیث میں ایمان کو ایسے قیمتی ونفیس گوہر سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کی حفاظت کرنا چاہیئے اور رفق کو خزانہ وقفل سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو دل میں گوہر کی حفاظت کرتا ہے اور شیطان کو دل میں نہیں جانے دیتا اور شیطان کو انسان کے ایمان کی چوری نہیں کرنے دیتا۔ اگر یہ قفل کھل جائے یا ٹوٹ جائے تو رفق برباد ہو جائیگا اور فتنہ فساد لڑائی جھگڑا شروع ہو جائیگا۔

امام محمد باقرؑ نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اگر رفق کوئی مخلوق ہوتا کہ جس کو دیکھا جا سکتا تو اس سے حسین خدا کی کوئی مخلوق نہ ہوتی[4]

---

[1] ایضاً: [2] مراۃ العقول ج ۸ ص ۲۳۳ [3] اصول کافی ج ۲ ص ۱۱۸ [4] اصول کافی ج ۲ ص ۱۲۰

دوسری روایت میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: خدا مہربان اور صاحب رفق ہے اور صاحب رفق کو دوست رکھتا ہے اور جیسی جزا وہ رفق و نرمی کی دیتا ہے ایسی سختی و شدت کی نہیں دیتا ہے۔ [1]

امام صادق نے رسولؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: رفق و مہربانی میں برکت ہے جبکہ سختی و شدت نحس و شوم ہے۔ [2]

جو روایات باب مدارا و رفق میں بیان ہوئی ہیں ان سے امام زین العابدینؑ کے اس جملہ ''والرفق بمسنهم'' کے معنی واضح ہو جاتے ہیں یعنی جو بڑے ہیں ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور ان کے نیک لوگوں کا شکریہ ادا کرو۔ اور اپنی نصرت سے ان کی مدد کرو اور ان میں سے ہر ایک کو اس کی جگہ رکھو، ان کے بزرگ کو مہربان باپ کی مانند، چھوٹے کو اپنے پیارے بچے کی مثل، اور جوانوں کو اپنے بھائی کی طرح سمجھو اور ان کے جو حقوق تمہارے اوپر ہیں انھیں پورا کرو۔

اس سے قبل آپ بزرگ، کمسن اور بھائی کے حقوق کو شرح وبسط کے ساتھ بیان فرما چکے ہیں۔ اور اس کے آخر میں فرماتے ہیں، اور ان میں سے جو بھی تمہارے پاس آئے اس کے ساتھ نرمی و مہربانی، خندہ پیشانی اور ہشاش بشاش طریقہ سے پیش آؤ اور اپنے بھائی کے ساتھ ایسا سلوک کرو جیسا کہ واجب ہے یہ بھائی کے ان حقوق کی طرف اشارہ ہے جو وہ مسلمان بھائی پر رکھتا ہے۔ اس سے قبل ہم بھائی کے حق میں کچھ روایات بیان کر چکے ہیں مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام زین العابدینؑ ہم مذہب کے حقوق کے بارے میں تاکید فرماتے ہیں کہ ان تمام حقوق کو پورا کیا جائے جو پہلے بیان کیے جا چکے ان حقوق کی ادائیگی میں ہم خدا ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

---

[1] ایضاً اصول کافی ج ۲ ص ۱۱۹ [2] ایضاً

اہل کتاب کا حق

واَمّا حق اهل الذمّه فالحكم فيهم ان تقبل منهم ما قبل اللّٰه و تفي بما جعل اللّٰه لهم من ذمته و عهده و تكلهم اليه فيما طلبوا من انفسهم واجبروا عليه و تحكم فيهم بما حكم اللّٰه به علىٰ نفسك فيما جرىٰ بينك (و بينهم)من معاملة، وليكن بينك و بين ظلمهم من رعاية ذمة اللّٰه والوفاء بعهده و عهد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله حائل،فانه بلغنا انه قال : من ظلم معاهداً كنت خصمه ، فاتق اللّٰه ولا حول ولاقوة الا باللّٰه۔

لیکن اہل ذمہ یعنی اسلام کی پناہ میں رہنے والوں کا حق یہ ہے کہ ان کی اس چیز کو قبول کرلو جس کو خدا نے قبول کیا ہے اور اس عہد و ذمہ داری کو پورا کرو جو خدا نے ان کے لیے مقرر کی ہے اور اگر وہ مجبور ہوں یا اسے چاہیں تو وہ انھیں دو اور ان سے معاملہ میں خدا کے حکم پر عمل کرو اور چونکہ وہ اسلام کی پناہ میں ہیں لہٰذا خدا اور رسولؐ کے عہد و پیان کو وفا کرنے کے لیے ان پر ظلم نہ کرو کیونکہ ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ فرمایا: جس نے اس شخص پر ظلم کیا جس سے معاملہ کیا ہے میں اس کا دشمن ومخالف ہوں، اللہ سے ڈر خدا کی طاقت وقوت کے علاوہ کوئی طاقت نہیں ہے۔

''ذمّہ'' کے معنی عہد و پیان ہیں۔قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے:

لایرقبوا فیکم اِلّا وذِمّةً ولا یرقبون فی مومن اِلّا ولَا ذِمّه [1]

وہ کسی مومن کے لیے نہ قرابت کا خیال رکھتے ہیں اور نہ کسی عہد و پیان کی رعایت کرتے ہیں۔

اقرب الموارد میں تحریر ہے:الذِّمةُ اَلعَهدُ وَالاَمانُ والضّمانُ۔یہود ونصاریٰ میں سے ذمی اس شخص کو کہتے ہیں جو اسلام کی پناہ میں رہتا ہے اور مسلمانوں سے اس کا معاہدہ ہوتا ہے۔لفظ ذمہ قرآن مجید میں دوبار آیا ہے [2]

نہج البلاغہ میں لکھا ہے: ومنها اهل الجزية والخراجِ من اهلِ الذّمّةِ ومُسلمَةِ

---

[1] توبہ: ۸۔۱۰ [2] قاموس قرآن ج ۳ ص ۲۴

النّاس

امت کے طبقوں کے بارے میں فرمایا: ان میں جزیہ دینے والے، اہل ذمہ میں سے خراج دینے والے غیر مسلم اہل کتاب ہیں جو آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب کے ماننے والے ہیں کہ جن کا قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے۔ یہ اہل ذمہ ہیں۔ چونکہ یہ بیت المال کو ٹیکس ادا کرتے ہیں لہٰذا اسلامی ممالک میں رہ سکتے ہیں اور اسلام کی پناہ لے سکتے ہیں۔

اسلامی حکومت ان سے جزیہ لے کر ان کی جان و مال کی حفاظت کرے گی۔ اسلام کے قانون کے مطابق اہل کتاب اپنے اختلافات کے فیصلہ کے لیے اس صورت میں اپنے علما کے پاس جاسکتے ہیں جب ان کے مسائل ان کی آسمانی کتاب سے متعلق ہوں لیکن اگر یہ اختلافات مالی یا خصوصی حقوق کے بارے میں ہوں تو اسلامی قاضی کے پاس جائیں گے اور اسلامی قاضی ان کے مقررات کے مطابق فیصلہ کرے گا، انھیں چیزوں کے بارے میں اہل ذمہ اپنے علما سے بھی رجوع کرسکتے ہیں۔[1]

اہل کتاب سے متعلق ہمارا فریضہ

یہ تو واضح ہو گیا کہ اہل ذمہ یہود و نصاریٰ ہیں جو کہ اہل کتاب ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سے متعلق قرآن نے ہمارا کیا فرض بیان کیا ہے:

قاتلوا الذین لا یومنون باللّٰہ ولا بالیوم الاخر لا یحرمون ما حرم اللّٰہ و رسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخرت پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا ہے اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں تو ان سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں۔

درحقیقت اسلام نے مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان کچھ احکام و حدود مقرر کئے ہیں، کیونکہ

[1] نہج البلاغہ مکتوب ۵۳

اہل کتاب ایک آسمانی مذھب کی پیروی کرنے کے سبب مسلمانوں سے کچھ مشابہ ہیں۔ چنانچہ اسلام انھیں قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے لیکن انھیں اس صورت میں قریب آنے کی اجازت ہے جب وہ ایک صلح پسند اقلیت کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزاریں، اسلام کا احترام کریں اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانی نہ کریں۔

جزیہ کیا ہے؟

جزیہ ''جزأ'' سے مشتق ہے، اس مال کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے اس کو جزیہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کی جزأ میں یہ مال اسلامی حکومت کو دیتے ہیں۔ مفردات راغب سے یہی معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ [1]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل میں یہ عربی نہیں ہے بلکہ قدیم فارسی کے لفظ ''کزیت'' کا معرب ہے۔ کزیت اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو فوج کی تقویت کے لیے لیا جاتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ خالص عربی ہے اور یہ اس امن و امان کی جزا ہے جس کو اسلامی حکومت اقلیتوں کے لیے فراہم کرتی ہے۔ [2] ہم ہاتھ کے حق میں صلوبا سے خالد بن ولید کے معاہدہ کے متن میں جزیہ کی وضاحت کر چکے ہیں۔

جزیہ اسلام سے پہلے

بعض افراد کا نظریہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ساسانی بادشاہ انوشیرواں نے جزیہ لیا تھا اگر یہ ثابت نہیں ہے تو کم از کم یہ مسلّم ہے کہ انوشیرواں اپنی ملت سے جزیہ لیتا تھا اور جن لوگوں کی عمر بیس سال سے اوپر اور پچاس سال سے کم ہوتی تھی اور وہ حکومت کے رکن بھی نہیں ہوتے تھے تو ان میں سے ہر آدمی سے ۱۲ یا ۸ یا ۶ یا ۴ درھم جزیہ لیا جاتا تھا۔

اس ٹیکس کا فلسفہ ایک ملک کے وجود اور اس کی خود مختاری سے دفاع سمجھتا تھا جو کہ اس ملک کے

---

[1] حقوق بین الملل خصوصی ص ۱۰۸ [2] مفردات راغب: مادہ جزی

تمام افراد کا فریضہ ہے اس سلسلہ میں بعض لوگ ٹیکس ادا کرنے کے بجائے خود اس فریضہ کو انجام دیتے تھے اور دوسرے افراد مشغولیت کی بنا پر فوجیوں اور قانون کے محافظوں کے اخراجات کے لیے سالانہ ٹیکس ادا کرتے تھے۔

جزیہ دینے والوں کی عمر میں سے پچاس سال، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جو لوگ اسلحہ اٹھا سکتے ہیں اور مشغول بھی نہیں ہیں وہ جزیہ ادا کرنے کے بجائے خود ملک وقانون کی حفاظت کریں۔ اسلام میں مسلمانوں پر جزیہ واجب نہیں ہے ہاں ضرورت کے وقت جہاد کو سب کے لیے واجب کر دیا ہے اور چونکہ مذہبی اقلیتوں پر جہاد معاف ہے اس لیے ان کو جزیہ ادا کرنا ہوگا۔

اس طرح مذہبی اقلیتوں کے لڑکوں، عورتوں، بوڑھوں اور اندھوں پر بھی جہاد معاف ہے۔ گذشتہ بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جزیہ صرف ایک مالی مدد ہے جو اہل کتاب مسلمانوں کو اپنی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے عوض ادا کرتے ہیں۔[1] جبکہ وہ لوگ جزیہ کو ایک قسم کا حق تسخیر سمجھتے ہیں، افسوس کہ انہوں نے اس کے فلسفہ کی طرف توجہ نہیں کی اور اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا کہ جب اہل کتاب ذمہ کی صورت میں ہوتے ہیں تو اس وقت اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہر طرح سے ان کی حفاظت کرے اس حفاظت کے علاوہ ان کو میدان جنگ میں جانے اور دفاعی ذمہ داریوں سے معاف رکھا جاتا ہے۔ درحقیقت اہل کتاب یہ تھوڑا سا پیسہ ادا کر کے اسلامی حکومت کی پوری مراعات حاصل کرتے ہیں۔

اس آیت میں ارشاد ہے: حتی یعطوا الجزیة عن ید وھم صاغرون یعنی جو چھوٹا بننے پر راضی ہو جائے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جزیہ آئین اسلام اور قرآن کے سامنے جھک کر ادا کریں۔ بعبارت دیگر یعنی ایک اقلیت کی مسالمت آمیز زندگی گزارنے کی نشانی یہ ہے کہ اکثریت حاکم ہو۔[2]

جزیہ کا فقہی حکم

جزیہ کے فقہی حکم میں پہلی بحث اس سلسلہ میں ہے کہ جزیہ کس سے لیا جاتا ہے؟ دوسری

---

[1] تفسیر نمونہ ج ۷، ص ۳۵۶ [2] ایضاً ص ۳۵۵

بحث یہ ہے کہ اس کی مقدار کتنی ہے اور اس کے شرائط کیا ہیں؟ کس سے لیا جاتا ہے، اس کے بارے میں محقق شرائع میں لکھتے ہیں:

تؤخذممن يقر علی دينه وهم اليهود والنصاری ومن له شبهة كتاب و هم المجوس۔

جزیہ ان لوگوں سے لیا جاتا ہے جو اپنے دین کا اقرار کرتے ہیں اور وہ یہود و نصاریٰ اور مجوس ہیں کہ ان کے یہاں شبہ کتاب کا وجود ہے۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

المجوس إنّما الحقوا باليهود والنصارى في الجزية والديات لانه قد كان لهم فيما مضى كتاب۔

جزیہ دینے میں مجوس یہود نصاریٰ سے ملحق ہیں کیونکہ وہ ماضی میں اہل کتاب تھے۔

بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ ان کے پیغمبر کا نام "داماست" تھا اور ان کی کتاب "جاماست" تھی جو بارہ ہزار گایوں کی کھال پر لکھی ہوئی تھی۔

اہل کتاب کے علاوہ دوسرے لوگوں سے جزیہ قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ مشرکین کے بارے میں قرآن کہتا ہے: فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم جہاں بھی مشرکوں کو پاؤ قتل کردو۔ بت پرستوں کا حال آج بھی واضح ہے بنا بریں مذکورہ تین فرقوں ہی سے جزیہ لیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ذمہ کے شرائط پر عمل کریں اس سلسلہ میں عرب و عجم کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ بچوں اور پاگلوں سے جزیہ نہیں لیا جاتا۔

جزیہ کی مقدار

علماء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ جزیہ کی کوئی مقدار معین نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق امام کی صوابدید اور جزیہ دینے والوں کی استطاعت سے ہے تاریخ اسلام سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بہت کم جزیہ رکھا جاتا تھا کبھی تو ایک دینار ہی اور کبھی جزیہ دینے والے کی استطاعت کے مطابق رکھا جاتا تھا۔

جزیہ کے شرائط

جزیہ کے چھ شرائط ہیں۔ ۱۔ جزیہ قبول کرے ۲۔ امن وامان کے خلاف کوئی کام نہ کرے مثلاً مسلمانوں سے جنگ کا منصوبہ نہ بنائے۔ ۳۔ مسلمانوں کو مالی نقصان نہ پہنچائے اور ان کی ناموس کی ہتک نہ کرے چنانچہ اگر کوئی شخص ان کے رسولؐ کو برا کہتا ہے تو اس کو قتل کر دیا جائیگا۔ ۴۔ اسلام نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان پر کھلم کھلا عمل نہ کرے، مثلاً شراب خوری، سور کا گوشت کھانا اور محرم سے شادی کرنا اگر ان پر عمل کرے گا تو معاہدہ ٹوٹ جائیگا۔ ۵۔ اسلامی سرزمین پر کنیسہ نہ بنائے، ناقوس نہ بجائیں اور مسلمانوں سے اونچے مکان نہ بنائیں۔ ۶۔ ان پر مسلمانوں کے احکام جاری ہونگے۔ فقہا نے یہ شرائط جزیہ کے لیے بیان کیے ہیں۔ البتہ فقہی کتابوں میں فقہا نے جزیہ کو مفصل طور پر بیان کیا ہے ہم نے امام زین العابدینؑ کے بیان کی مناسبت سے اختصار سے کام لیا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ اخلاقی و انسانی لحاظ سے اہل ذمہ کے کیا حقوق ہیں؟

اہل ذمہ سے متعلق مسلمانوں کی ذمہ داری

حضرت علیؑ نے اپنے رزمیہ اور جہاد سے متعلق خطبہ میں اہل کوفہ سے فرمایا:

مجھے خبر ملی ہے کہ معاویہ کی فوج کا کوئی سپاہی کسی مسلمان عورت اور اہل ذمہ کی کسی عورت کے گھر میں گھس کر ان کی پازیب، کنگن، گلوبند اور گوشوارے چھین کر لے گیا ان کے پاس حفاظت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا بس یا فریاد کر کے اور انا للہ و انا الیہ راجعون، کہہ کر بیٹھ گئیں، اور وہ لوٹ کا سامان لے کر چلے گئے، نہ ان میں سے کسی کو کوئی زخم آیا اور نہ کسی کا خون بہا۔ اس صورت حال میں اگر کوئی مسلمان غم وغصہ میں مر جائے تو بہتر ہے، اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی، بلکہ اس کو اس کا حق پہنچتا ہے۔ [۱]

اس سلیس وسادہ بیان سے امام و رہبر کے دل میں قوم وملت کی محبت و ہمدردی کا پتہ چلتا ہے جو شخص اسلام کی پناہ میں ہے اس پر ایسے حملہ سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام ان لوگوں کا کتنا خیال رکھتا ہے جو اسلام کی پناہ میں ہیں۔

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۲۷

جب حضرت علیؑ نے ایک مسیحی آدمی کو لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ ایک عیسائی ہے۔ فرمایا: پہلے تم نے اس سے کام لیا اب وہ بوڑھا ہو گیا تو اس کو چھوڑ دیا؟ حکم دیا کہ اس کو بیت المال سے اتنا دیا جائے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے [1]

وعدہ وفائی

امام زین العابدین نے اہل کتاب و اہل ذمہ کے حق کے بارے میں بعض اہم اخلاقی موضوعات کی تاکید فرمائی ہے ان میں سے وعدہ وفائی اور اس عہد کا پورا کرنا بھی ہے جو اہل کتاب سے کیا جاتا ہے خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

واوفوا بالعهد انّ العهد كان مسئولا [2]

اپنے عہد کو پورا کرو بیشک عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

والّذين هم لاماناتهم وعهدهم راعون [3]

اور جو لوگ اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں۔

ان دو آیتوں میں وعدہ اور عہد کے پورا کرنے کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور ان کو مومنوں کی پہچان قرار دیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں انسان سے سوال کیا جائے گا اس بارے میں رسولؐ اور ائمہ سے جو روایات وارد ہوئی ہیں ان سے اسکی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

علی بن ابراہیم سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے امام صادقؑ سے سنا کہ فرماتے ہیں: مومن کا اپنے بھائی سے وعدہ کرنا اس نذر کی مانند ہے جس کا کفارہ نہیں ہے۔ [4] جس طرح نذر پر عمل کرنا انسان کا فریضہ ہے اسی طرح عہد و پیمان کو پورا کرنا بھی اس کے لئے واجب ہے۔

رسولؐ فرماتے ہیں: کل قیامت میں تم میں سے وہ شخص مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا جس نے اپنے وعدہ کو پورا کیا ہے۔ [5]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۴۹ [2] اسراء: ۳۴ ص [3] مومنون: ۸
[4] اصول کافی ج ۲ ص ۳۶۴ [5] ایضاً

دوسری حدیث میں فرماتے ہیں: کل قیامت میں تم میں سے وہ شخص مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا جو تم میں سب سے زیادہ سچا، سب سے زیادہ امانت ادا کرنے والا، سب سے زیادہ وعدہ وفا کرنے والا اور سب سے زیادہ خوش خلق اور سب سے زیادہ لوگوں سے نزدیک ہوگا۔ [1]

مسلمان یا کافر سے معاہدہ

رسولؐ فرماتے ہیں: تین چیزوں کی کسی کو چھوٹ نہیں دی گئی ہے ۱۔ مسلمان یا کافر سے کیے گئے عہد و پیمان کو پورا نہ کرنے کی، ۲۔ ماں، باپ کے ساتھ نیکی نہ کرنے کی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر، ۳۔ امانت ادا نہ کرنے کی خواہ وہ مسلمان کی ہو یا کافر کی۔ [2]

جو چیز روایات میں بیان ہوئی ہے اور جس پر عمل کرنے کی تاکید کی گئی ہے ان کو امام زین العابدینؑ نے اس حق میں بیان کر دیا ہے۔ بنا برایں جس شخص نے ذمی کا حق ادا کر دیا اس نے خدا اور رسولؐ کا حق ادا کر دیا۔ اور اگر اپنے عہد کو پورا نہ کیا تو اس نے ظلم کیا۔ رسولؐ فرماتے ہیں: روز قیامت میں اس سے نزاع کروں گا۔

قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ دشمنانِ اسلام میں سے جن لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے تم بھی ان کے ساتھ بدی نہ کرو۔

خدا تمہیں ان لوگوں سے چھیڑ خانی کرنے سے منع کرتا ہے جو دین کے بارے میں تم سے جنگ نہیں کرتے ہیں اور جنھوں نے تمہیں تمہارے وطن سے نہیں نکالا ہے ان کے ساتھ نیکی اور عدل کرو بیشک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ [3]

لیکن جنھوں نے تم سے جنگ کی ہے اور تمہیں وطن سے نکالا ہے خدا ان سے جنگ کرنے سے منع نہیں کرتا ہے۔ خداوند عالم تمہیں ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہے اور تم کو وطن سے نکالا ہے پھر جو ان سے دوستی کریگا وہ ظالم ہے۔ [4]

قرآن مجید اہل کتاب کو مشترک اعتقادی مسائل میں مسلمانوں سے متحد ہونے کی

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۹۲ [2] مجموعہ ورام ج ۲ ص ۱۲۱ [3] ممتحنہ: ۸ [4] ممتحنہ

دعوت دیتا ہے اور انھیں تفرقہ پردازی سے منع کرتا ہے۔

قل یا اهل الکتاب تعالوا الیٰ کلمةٍ سواءٍ بیننا و بینکم الّا نعبد إلّا الله ولا نُشرِكَ به شیئا لا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فَإنْ تَولّوا فقولوا اشهد بانّا مسلمون [1]

(اے رسولؐ) کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ اس بات پر متحد ہو جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم تم خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور خدائے واحد کے علاوہ ہم اپنے میں سے کسی کو خدا نہ مانیں۔ اس پر بھی اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ گواہ رہنا ہم مسلمان ہیں۔

حج کے حق میں ہم نے کتاب مکارم الاخلاق سے جو متن نقل کیا ہے وہ تحف العقول میں نہیں ہے لہٰذا شمارہ گزاری کے لحاظ سے ۵۱ حقوق ہوتے ہیں، ہم نے دونوں کتابوں کے شماروں میں ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کی غرض سے، مدعی اور مدعا علیہ کے حق کو ایک نمبر کے تحت بیان کیا ہے۔ اس لحاظ سے حقوق کی مقدار ۵۰ ہی ہوتی ہے۔

رسالۃ الحقوق کے خاتمہ پر امام زین العابدین فرماتے ہیں:

فهذه خمسون حقا محیطاً بك لا تخرج منها فی حال من الاحوال یجب علیك رعایتها والعمل فی تادیتها والاستعانة بالله جلّ ثناؤهُ علیٰ ذالك ولا حولَ ولا قوّةَ الّا بالله والحمد لله ربّ العالمین.

یہ پچاس حق ہیں جو تمہارے پورے وجود کو ڈھانکے ہوئے ہیں اور زندگی کے کسی موڑ پر بھی تم ان کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان کی رعایت کرنے اور ان کو ادا کرنے کی کوشش کرنا تمہارے اوپر واجب ہے اور خدا سے طلب کرو تا کہ وہ تمہیں ان حقوق کو ادا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور خدا کے علاوہ کوئی طاقت وقدرت نہیں ہے۔ ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جو عالمین کا پروردگار ہے۔

نثار احمد زین پوری

---

[1] آل عمران: ۳

عربی کی خوبصورت کتابت

اور سید فرمان علی کا بہترین ترجمہ وحواشی

حاصل کرنے کیلئے تشریف لائیں